ماہنامہ
کرن
جون 2017
عید نمبر
www.paksociety.com
کرن کا دسترخوان

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ------ 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے

مستقل سلسلے

جون 2017
جلد 40 شمارہ 3
قیمت 60 روپے

خط وکتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

ملیحہ

جس وقت یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہو گا رمضان المبارک کا ایک عشرہ گزر چکا ہو گا۔ اس دفعہ رمضان میں موسم کی حشر سامانیاں تو اپنی جگہ مگر لوڈشیڈنگ کے عذاب نے روزہ داروں کو آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے۔ رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ ہی ہمارے معمولات بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ذکر و تلاوت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور آخری عشرے کی طاق راتوں میں شب بیداری کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ رب کی قربت حاصل کی جائے اور اس سے تعلق کو مضبوط بنایا جائے۔

ایک مہینے کا تربیتی پروگرام جہاں روح کو پاکیزگی عطا کرتا ہے' وہاں عیدالفطر کا تہوار مسرت و اطمینان سے ہم کنار کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا تہوار ہے جسے ہر مسلمان بساط بھر منانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر مہنگائی کے طوفان نے ہمارے تہواروں کے حسن کو بھی گہنا دیا ہے۔ منافع خوروں کے باعث ناداروں کے لیے یہ خوشی بھی آزمائش سے کم نہیں۔

کوشش کیجیے کہ عید پر ان ناداروں کو نہ بھولیں جو ہماری مدد کے منتظر ہیں۔ ادارے کی جانب سے تمام قارئین کو عید مبارک۔

اس شمارے میں....

- ☆ "پھر عید آئی ہے" مختلف شخصیات سے شاہین رشید کا سروے
- ☆ اداکارہ "ماہم عامر" سے شاہین رشید کی ملاقات۔
- ☆ اداکار عمران اشرف کہتے ہیں "میری بھی سنیے"
- ☆ اس ماہ اقرا ممتاز کے "مقابل ہے آئینہ"
- ☆ "من مورکھ کی بات" آسیہ مرزا کا سلسلے وار ناول۔
- ☆ تنزیلہ ریاض کا سلسلے وار ناول "راہزن"
- ☆ "نمک پارے" ام طیفور کا دلچسپ مکمل ناول۔
- ☆ امت العزیز شہزاد کا مکمل ناول "دستگم"
- ☆ "مہجور نشیمن" مصباح علی سید کا مکمل ناول
- ☆ منشا محسن کا ناولٹ "بیلا"
- ☆ "کیسر" سحر ساجد کا ناولٹ
- ☆ صدف آصف کا ناولٹ "دم قدم"

نفیسہ سعید' نادیہ احمد' حمیرا نوشین اور فصیحہ آصف خان کے افسانے اور مستقل سلسلے

مفت

"کرن کا دسترخوان" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت پیش خدمت ہے۔

الٰہی سلسلہ ایسا زمیں تا آسماں کر دے
پڑھوں جب حمد تو ہر اک سخن اس کا اذاں کر دے

یہ کب خواہش ہے دل سے دور تو بے تابیاں کر دے
بس اپنی یاد میں گم کر کے مجھ کو بے نشاں کر دے

زباں حمد میں دل کھول کر تجھ سے کروں باتیں
مرے الفاظ و معنی کو عطا حسنِ بیاں کر دے

میں سوچوں بھی بجز تیرے کسی کے ذکر کا جس دم
مرے معبود تو مجھ کو اسی پل بے زباں کر دے

دلِ عابد کی ہر دھڑکن عبادت ہی کرے تیری
خدایا تو مری اس آرزو کو جاوداں کر دے

عابد شاہ جہاں پوری

دھوم ہے گلشنِ ہستی میں بہار آئی ہے
ذرے ذرے میں عیاں جلوہ رعنائی ہے

آپ آئے تو ہوا سبزۂ خفتہ بیدار
اور آغوشِ حلیمہ کو ملی تازہ بہار

بزمِ امکاں کے فقط آپؐ ہیں حاصل بے شک
آپؐ کے دم سے سجی دہر کی محفل بے شک

آپ ہی مخزنِ ہستی کے امیں ہیں بے شک
رونقِ دہر ہیں اور رونقِ دیں ہیں بے شک

سب یتیموں کے غلاموں کے ہیں والیٔ مولا
سب فقیروں کے ضعیفوں کے ہیں ماویٰ ملجا

نصیر احمد

سچ میں ہمارا ملک بہت اچھا ہے.... زمین کبھی بھی بری نہیں ہوتی' بس اس میں بسنے والے لوگ اچھے برے ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک کا مسئلہ یہ ہے کہ قانون کی پاس داری نہیں ہے یہی وجہ ہے کوئی اسلامی تہوار آئے یا دیگر .... مہنگائی اپنے عروج پہ پہنچ جاتی ہے.... میں کچھ ہی دن پہلے دبئی سے آئی ہوں۔ وہاں رمضان المبارک کے استقبال کی تیاریاں جس انداز میں کی جارہی ہیں دیکھ کر رشک آیا.... بیسن لیں 5 کلو تو ایک کلو فری یعنی ہر چیز کے ساتھ کچھ نہ کچھ فری لگا ہوا ہے۔ کسی کے ساتھ کھجور ہے تو کسی کے ساتھ شربت کی بوتلیں' کولڈ ڈرنک چھ کی قیمت میں آٹھ لے جایئے' دودھ' دہی کے ساتھ آفر.... نہ صرف ہر چیز کے ساتھ آفر ہے بلکہ قیمتوں میں بھی نمایاں کمی کردی گئی ہے۔ جب کہ ہمارے ملک میں شعبان کا چاند نکلتے ہی مہنگائی کا جن بھی باہر آگیا ہے مگر.... اس مہنگائی کے باوجود روزے داروں کی افطاری میں انواع واقسام کی چیزیں دیکھ کر دل بے ساختہ کہتا ہے کہ کون کہتا ہے کہ ہمارے ملک کے عوام غریب ہیں.... سچ تو یہ ہے کہ اگر ہم بے جا اسراف نہ کریں تو شاید مہنگائی بھی اتنی نہ ہو.... عید کے سروے کے حوالے سے اس بار ہم نے مختلف شخصیات سے پوچھا۔

1 : رمضان المبارک میں افطاری کا اہتمام کیا بے جا اسراف نہیں ہے؟ اگر نہیں ہے تو کیوں نہیں ہے اور اگر ہے تو اس کا تدارک بتایئے۔

2 : عمر کے ساتھ ساتھ عید کی تیاری کے انداز بدل جاتے ہیں۔ آپ کے انداز میں کتنی تبدیلی آئی؟

پھر عید آتی ہے

شاہین رشید

صائمہ اکرم چوہدری.... (افسانہ + ناول + ڈرامہ نگار)

1 : روزے کی فرضیت کا اولین مقصد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع ہے.... وہ سحری اور افطاری کے اہتمام کو پسند کرتے تھے' لیکن اسراف کو نہیں۔ رمضان المبارک رحمتوں اور بخششوں کا مہینہ ہے اور جو شخص اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرنا چاہتا ہے اس کے لیے یہ ایک سنہری موقعہ ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے یہاں خواتین کا زیادہ ٹائم سحری اور افطاری کے اہتمام میں کچن کے اندر ہی گزر جاتا ہے اور وہ اس مہینے کی فضیلت سے فائدہ نہیں اٹھاسکتیں یا اٹھاتیں.... کھانے پینے کے اہتمام میں بہت سی چیزیں بچ جاتی ہیں اور رزق ضائع ہوتا ہے۔ اس لیے حفظان صحت کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے افطاری کا اہتمام کریں اور اپنے اڑوس پڑوس کے لوگوں کو بھی اس میں شریک کریں اور اس مہینے کی اصل روح کو سمجھیں۔

2 : بچپن کی عیدوں کا جو لطف تھا وہ تو بہت عرصہ ہوا ختم ہو گیا اس وقت نئے سوٹ، چوڑیوں اور نئے جوتوں کی خوشی رات بھر سونے نہیں دیتی تھی... پھر عید کے دن ملنے والی عیدی کا بھی اپنا ہی سرور ہوتا تھا... بچپن میں بہت دن پہلے عید کی شاپنگ شروع ہو جاتی تھی... اور اس وقت وہی سب سے اہم کام لگتا تھا۔ شادی سے پہلے تک تو میں خود بھی عید کا اہتمام بہت شوق سے کرتی تھی، لیکن پھر جب ذمہ داریاں بڑھیں تو ترجیحات میں بھی فرق آگیا۔ اب صرف میاں کے کپڑوں کی ٹینشن ہوتی ہے، کیونکہ وہ اپنی میڈیکل کی ٹف روٹین میں ان چیزوں کے لیے بالکل بھی ٹائم نہیں نکال سکتے۔ تو مجھے ہی ان سب کو دیکھنا ہوتا ہے... لیکن عید کی تیاری میں رمضان سے پہلے ہی کر لیتی ہوں اور چونکہ ہمیں عید کے لیے اسلام آباد سے اپنے آبائی شہر "صادق آباد" جانا ہوتا ہے تو قریبی رشتے داروں کے لیے گفٹس وغیرہ کی بھی کافی ٹینشن ہوتی ہے اور ایسے میں اپنی ذات تو پس پشت ہی چلی جاتی ہے۔ پھر بھی میں عید کے لیے اسپیشل سوٹ ضرور بنواتی ہوں... یہ اور بات ہے کہ کچن میں زیادہ ٹائم گزارنے کی وجہ سے اسے پہننے کا موقعہ جب ملتا ہے جب آدھا دن گزر چکا ہوتا ہے۔

محسن عباس حیدر... (ڈی جے + اداکار + گلوکار)

1 : رمضان المبارک میرے پسندیدہ مہینوں میں سے ایک ہے بلکہ اگر کہوں کہ اسلامی مہینوں میں یہی پسندیدہ مہینہ ہے تو غلط نہ ہو گا اور مجھے اس کا بہت انتظار رہتا ہے اور سحری میں جب ہم اٹھتے ہیں تو میرا بیٹا بھی اٹھ جاتا ہے... سحر و افطار کا وقت مجھے ہمیشہ سے ہی بہت پرکشش لگتا ہے، سحری میں اٹھنا اہتمام کرنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ افطاری کے وقت اہتمام اسراف ہے کہ جواب میں میں یہ ضرور کہوں گا کہ چاہے رمضان ہو یا کوئی بھی موقعہ ہو رزق کا اسراف مجھے ہمیشہ سے ہی برا لگتا ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ جتنا کھانا ہو اتنا اہتمام کریں اور پلیٹ میں بھی اتنا ہی کھانا ڈالیں جتنی آپ کی ضرورت اور جتنی آپ کی بھوک ہو... اسراف کے ہمیشہ سے خلاف ہوں۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ رمضان المبارک کی رونق افطار سے ہے۔ جب دستر خوان پہ طرح طرح کے کھانے سجائے جاتے ہیں... مگر پھر بھی میں یہ ضرور کہوں گا کہ اگر افطار کے وقت 4 سے 5 لوگ ہیں تو اتنی ہی مقدار کی چیزیں بنائیں جتنی آپ کی ضرورت ہے۔ جیسے پکوڑے ہیں۔ فروٹ چاٹ ہے۔ چنے وغیرہ ہیں۔ اور اگر فرض کریں کہ ضرورت سے زیادہ چیزیں بن گئی ہیں تو گھر میں کام کرنے والیاں ہوتی ہیں۔ مستحق لوگ ہوتے ہیں کسی کا روزہ کھلوا دیں تو پھر کوئی اسراف نہیں ہو گا بلکہ ثواب ہی ملے گا... رمضان کی رونق افطاری ہے۔ جس میں ہم روٹین سے ہٹ کر اہتمام کرتے ہیں روٹین کے کھانے تو ہم پورا سال کھاتے ہی رہتے ہیں۔

2 : عید کے حوالے سے کوئی بڑا چیلنج تو خیر نہیں آیا... بچپن میں والدین عید کے کپڑے لا کر دیا کرتے تھے، اور بچپن میں عید کی ایکسائٹمنٹ ہوتی تھی، عیدی ملنے کی کپڑے پہننے کی، لیکن یہ دونوں ہی اٹریکشن مجھ سے چھن گئی ہیں کیونکہ اب میں بڑا ہو گیا ہوں... تو عیدی ملتی تو بہت ہی کم ہے۔ اب تو عیدی دینی ہوتی ہے۔ اور مجھے عیدی دینا بالکل بھی برا نہیں لگتا... اور جہاں تک کپڑے خریدنے کی بات ہے تو اب خرید کے

دینے والے بھی نہیں رہے۔ تو خود بھی بہت کم خریدتا ہوں اور اپنا کوئی سوشل سرکل بھی نہیں ہے۔ بس اب تو بچوں کے لیے ہی سوچتے ہیں انہی کی فرمائشیں بھی پوری کرتے ہیں انہی کو عیدیاں دیتے ہیں۔ تو لگتا ہے کہ اب مجھ پہ بزرگی آگئی ہے۔۔۔ تو عید اب پرکشش نہیں لگتی۔

آسیہ مظہر۔۔۔۔(رائٹر)

1 : سب سے پہلے تو ادارے کے لوگوں کو اور پڑھنے والوں کو میری طرف سے عید کی دلی مبارکباد قبول ہو' رمضان المبارک میں افطاری کو ہم اسراف کا نام تو نہیں دے سکتے۔ کیونکہ افطاری میں ہم چیزوں کا اہتمام تو کرتے ہیں مگر اتنا جتنی ضرورت ہو۔۔۔ یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اسراف کو کیسے کم کرسکتے ہیں۔۔۔ اور سنت بھی یہی ہے کہ افطار کے وقت سادہ اور عام کھانا کھایا جائے۔

2 : تہوار نہیں بدلتے وہ تو جیسے ہوتے ہیں ویسے ہی رہتے ہیں بس وقت اور انداز بدل جاتے ہیں۔ اور وقت اثر انداز ہوتا ہے۔۔۔ جدید دور کے آنے سے رہن سہن کے طور طریقے بھی جدید ہو جاتے ہیں۔۔۔ اب پہلے جیسا کچھ بھی نہیں رہا ہے آج کے دور میں خوشیاں مصنوعی لبادہ اوڑھ چکی ہیں۔۔ اب پہلے جیسی ایکسائٹمنٹ نہیں رہی۔

کرن تعبیر۔۔۔۔(فنکارہ)

1 : مجھے آپ کی بات سے اتفاق ہے کہ افطاری میں ہم جو اہتمام کرتے ہیں وہ اسراف ہے۔ رمضان المبارک کے روزے ہمیں کچھ سکھانے کے لیے فرض کیے گئے ہیں۔۔۔ اگر ہم صاحب حیثیت ہیں تو بجائے اپنے دسترخوان کو بھر بھر کر سجانے کے اگر وہی کھانا کسی غریب کے گھر بھجوا دیں گے تو روزے کی افادیت پہ بھی پورے اتریں گے اور کسی غریب کا بھلا بھی ہو جائے گا۔ ہم جو دسترخوان سجاتے ہیں وہ کھانے تو ہم سے پورے کھائے بھی نہیں جاتے اور عموماً'' کھانا

ضائع ہی ہوتا ہے تو بہتر ہے کہ ہم ضرورت مند کی مدد کریں اور رمضان میں روزے دار کا روزہ کھلوانا بہت ثواب ہے تو ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

2 : عمر کے ساتھ ساتھ عید منانے کے انداز میں بہت فرق آیا ہے بچپن میں عید کی ایکسائٹمنٹ ہی کچھ اور ہوتی تھی۔ نئے کپڑے نئے جوتے لینا۔۔۔ پھر عید کے دن عیدی لینا۔۔۔ پھر دوستوں کے ساتھ باہر جاکر گھومنا' کھانا پینا ان کا تو مزا ہی کچھ اور تھا' بڑے ہو کر عید کی خوشی تو ہوتی ہے مگر وہ بچپن والی ایکسائٹمنٹ نہیں ہوتی۔۔۔ ویسے مجھے لگتا ہے کہ مجھ میں تو ابھی بھی فرق نہیں آیا میں تو ابھی عیدیاں اکٹھی کرنے کے لیے ایکسائیٹڈ ہوتی ہوں۔ سب سے چھین کر مانگ کر لیتی ہوں 'گھر میں اپنے بھائیوں اور دیگر بڑوں سے یہ کہتے ہیں کہ ''میں تو ابھی بھی بچی ہوں۔''

آفان وحید۔۔۔۔(آرٹسٹ)

1 : کئی سالوں سے ہم رمضان المبارک کے روزے گرمیوں میں رکھ رہے ہیں اور آپ کو پتا ہی ہے کہ گرمیوں میں اتنا کہاں کھایا جاتا ہے۔ بس پانی پہ ہی زور ہوتا ہے۔۔۔ اور میز پہ جو چیزیں ہوتی ہیں وہ جوں کی توں ہی رہ جاتی ہیں۔۔۔ اس لیے روزے کی حالت میں

زیادہ کی طلب کرنے والوں کو سوچنا چاہیے کہ ضرورت سے زیادہ چیزیں بنانا اور پھر انہیں نہ کھانا اسراف ہے اور اس سے بچنا چاہیے اور روزہ ہمیں سادگی ہی سکھاتا ہے۔۔۔ اور اگر اس مبارک مہینے میں اگر ہم ضرورت مندوں کا خیال رکھیں تو رمضان کی افادیت سے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

2 : وقت کی ساتھ چیزیں بھی بدلتی ہیں اور انسان میں بھی میچورٹی آتی ہے سوچ میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ بچپن میں عیدی لینے اور نئے کپڑے پہننے کا بہت شوق ہوا کرتا تھا۔۔۔ عجیب سی خوشی اور ایکسائٹمنٹ ہوا کرتی تھی۔۔۔ اب ماشاء اللہ سے بہن بھائیوں کے بچے بھانجے، بھتیجیاں وغیرہ ہیں تو ان کو عیدیاں دینے کا مزا آتا ہے۔۔۔ اب دے کر خوشی کا احساس ہوتا ہے اور اگر رمضان اچھا اور خیر خیریت کے ساتھ گزر جائے تو اس چیز کی بھی خوشی ہوتی ہے اور میں تو اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ادا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں رمضان کا مہینہ عطا کرتا ہے اور ہم تھوڑی بہت اس کی عبادت بھی کر لیتے ہیں اور تحفے کی شکل میں ہمیں عید ملتی ہے۔

شہناز نقوی۔۔۔۔(رائٹر+شاعرہ)

1 : رمضان المبارک میں افطاری کا اہتمام ضرور کرنا چاہیے، مگر بے جا اسراف نہیں کرنا چاہیے گھر کے افراد کی پسند کا خیال رکھتے ہوئے ایک مناسب بجٹ میں سلیقے کے ساتھ "کم خرچ بالا نشین" جیسا اہتمام ہونا چاہیے، ہم اپنے روزانہ کے لنچ اور ڈنر میں اہتمام کرتے ہیں تو رمضان میں بھی صحت کا خیال رکھتے ہوئے اپنے محدود بجٹ میں اپنی حفظان صحت کا خیال رکھتے ہوئے اچھی خوراک کو ضرور شامل کریں۔

2 : بچپن کی عید کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔۔۔ ہمارے بچپن میں تو اسکول ڈریس کے علاوہ عید کے عید ہی کپڑے بنا کرتے تھے۔ "باٹا کے شوز" اور "پلاسٹک کی عینک" اور "ہاتھ کی گھڑی" سب چیزیں چاند رات کو سرہانے رکھ کر سوتے تھے۔ اس رات ہم خود کو دنیا کے امیر ترین لوگ سمجھتے تھے، عیدی کے پیسے اور ان کو خرچ کرنے کا مزا آج بھی فیل کرتی ہوں۔۔۔ شوہر کی سول سروس کی وجہ سے مختلف شہروں کی پوسٹنگ سے میں جوائنٹ فیملی کی عید انجوائے نہیں کر سکی۔۔۔ بچوں کی تعلیم اور راستوں کے فاصلے، عیدوں کے فاصلوں میں بدلتے گئے۔۔۔ اب عید میں وہ گرمجوشی محسوس نہیں ہوتی جو بچپن میں محسوس ہوتی تھی۔۔۔ میں عید کے دن زیادہ سینسٹو ہو جاتی ہوں۔ کہ نہ جانے کتنے لوگوں نے نئے ڈریس بنائے ہوں گے یا نہیں، کتنے ماں باپ اس مہنگائی میں تنبور ہوں گے

اپنے بچوں کی فرمائشیں پوری کرنے کے لیے... بس اس طرح گزر جاتا ہے عید کا دن' پہلے خود خوش ہوتے تھے اب دوسروں کو (رشتوں کو) خوش رکھتے ہیں... یہ فرق ہے عید کے دن کے بدلتے انداز میں۔

عاصم محمود..... (آرٹسٹ)

1 : میرے خیال میں تو افطاری کا اہتمام ضرور کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ سنت بھی ہے کہ اگر اللہ نے آپ کو دیا ہے تو اچھا کھاؤ' اچھا پہنو اور اچھے گھر میں رہو' لیکن دوسروں کے ساتھ انصاف بھی کرتے رہیں' اگر افطاری آپ نے زیادہ بنالی ہے اور بعد میں آپ کو احساس ہوتا ہے کہ کم چیزوں میں بھی گزارہ ہو سکتا تھا تو پھر وہ آدھی چیزیں آپ ان لوگوں کے گھروں میں بھیج دیں جہاں یہ چیزیں میسر نہیں ہیں... کیونکہ رمضان المبارک میں کسی کا روزہ کھلوانا بھی بہت ثواب ہے۔

2 : سب سے بڑی تبدیلی جو آتی ہے وہ یہ کہ پہلے عیدی لیتے تھے اب عیدی دیتے ہیں۔ دوسری تبدیلی یہ کہ جب چھوٹے تھے تو عیدی لے کر دوستوں کے ساتھ پارک چلے جاتے تھے یا گھومنے پھرنے نکل جاتے تھے کھاتے پیتے تھے' اپنی پسند کے کھلونے لیتے تھے۔ جو دل چاہتا تھا کرتے تھے... اب ایسا کچھ نہیں ہے... اب دوستوں رشتے داروں سے ملتے ہیں اور فیملی کے ساتھ وقت گزارتے ہیں۔ بچپن کی ایکسائٹمنٹ اب کہاں رہی ہے... عید کی جو حقیقی خوشی تھی وہ تو بچپن میں ہی ہوتی تھی... اب تو خرچے کا دن ہوتا ہے عید کا دن۔

ریاض فاطمہ..... (رائٹر)

1 : بچپن سے ہی رمضان کا تصور افطاری اور سحری کے حوالے سے ہی ہے اور افطاری کے نام سے جو اہتمام ہمارے تصور میں آجاتا ہے وہ اچھا لگتا ہے' کیونکہ بڑے اور بچے ایک مخصوص ٹائم پر اکٹھا ہو کر کھاتے ہیں۔ دسترخوان سجتا ہے... مجھے تو اہتمام کرنا بہت اچھا لگتا ہے بے جا اسراف ہم اس لیے نہیں کہیں گے کہ ہمیں کسی نے مجبور تو نہیں کیا ہے یہ ہماری اپنی روایات ہیں' اپنی پسند اور ناپسند کے مطابق ہم اہتمام کرتے ہیں۔ بہت سے ایسے گھرانے ہیں جو اس تکلف کو ضروری نہیں سمجھتے اور فروٹ چاٹ' پکوڑے اور کھانا کھا کر افطاری کرتے ہیں... تدارک تو کچھ بھی نہیں... بہنوں سے کہوں گی کہ اپنی حیثیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اہتمام کریں... اور اتنے ہی لوازمات دسترخوان پہ سجائیں جو با آسانی کھائے جا سکیں۔ اور ضائع نہ ہوں۔ شادی سے پہلے افطاری کا

دسترخوان سجانے کی ساری ذمہ داری میری ہوا کرتی تھی اور مجھے اب وہ وقت یاد آتا ہے تو بہت اچھا لگتا ہے۔

2 : پہلے ہمیں بہت کم وقت ملتا تھا اکٹھے ہونے کا' مل کر بیٹھنے کا تو عید کا دن 'بقرا عید یا شادی بیاہ کے موقع اچھے لگا کرتے تھے۔ مگر اب جب سے Days منانے کا سلسلہ شروع ہوا ہے... تو مجھے یہ Days منانا بہت اچھا لگتا ہے کیونکہ مل بیٹھنے کے مواقع مل جاتے ہیں اور جب ہم ڈیز Days مناتے ہیں تو وہ بھی عید کی ہی ایک شکل ہوتی ہے۔ کیونکہ سب ایک جگہ اکٹھے ہوتے ہیں اور کھاتے پیتے ہیں... زندگی بہت مختصر سی ہو گئی ہے تو جتنے لمحے مل جائیں' جتنا وقت مل جائے مل کر بیٹھنے کا اتنا ہی اچھا ہے... اور اپنی گفتار سے دوسروں کے دل میں اپنی جگہ بنائیں... اب عید کا کوئی خاص اہتمام نہیں کرتی بس بچے ہی کرتے ہیں... کوئی اچھا سا نیا سوٹ پہن لیا... بس اب اتنا ہی اہتمام ہوتا ہے۔

شہود علوی.....(آرٹسٹ+ڈائریکٹر+ پروڈیوسر)

1 : میرا خیال ہے کہ ہر چیز کو اسراف نہیں کہتے' کسی کے پاس کتنی حیثیت ہے اور اس میں سے وہ اللہ کی راہ میں کتنے فیصد خرچ کرتا ہے اور کتنا اپنے اوپر اور کتنا اپنے بیوی بچوں پر۔ اس چیز کو اگر وہ میانہ روی سے لے کر چلے تو اسراف نہیں ہے... اسراف ضرورت سے زیادہ خرچ کرنے کا نام ہے۔ اسراف غلط چیز پہ خرچ کرنے کا نام ہے۔ جہاں تک رمضان میں افطاری کے معاملات ہیں اور اہتمام کا تعلق ہے تو مجھے نہیں لگتا کہ اگر افطاری میں زیادہ چیزیں بنالی جائیں تو اسے ہم اسراف کہیں گے... کیونکہ یہ اللہ کی دی ہوئی نعمتیں ہیں جو ہر انسان کو ہر مومن کو اور ہر مذہب کے لوگوں کو اپنے عقیدوں کے اعتبار سے جو وہ روزے رکھتے ہیں تو کسی کے لیے بھی اسے اسراف نہیں کہا جا سکتا ہر انسان اپنی حیثیت میں رہ کر ہی خرچ کرتا ہے... ہاں اپنی ضرورت سے زیادہ اتنا بنا لیا جائے کہ اس کے ضائع ہونے کا خدشہ ہو تو یقیناً" یہ پیسے کا غلط استعمال ہے اور اللہ کی نعمتوں کا بھی غلط استعمال ہے اسلام میں اسراف کو پسند نہیں کیا گیا۔ اگر کوئی اپنی حیثیت کے مطابق اچھی افطاری بناتا ہے' کھاتا ہے' کھلاتا ہے تو میری نظر میں یہ اسراف نہیں ہے۔

2 : پہلے عید کے موقع پر کپڑے بنانے کا مزا آتا تھا... چھوٹی چھوٹی چیزیں بنانے کا مزا آتا تھا... ساری رات نیند نہیں آتی تھی یہ سوچ کر کہ صبح عید کے دن ہم یہ چیزیں پہنیں گے۔ تو وہ عجیب ہی خوشی ہوتی تھی... اب وقت کے ساتھ اس چیز کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے' کیونکہ پریکٹیکل لائف ہے۔ لوگ کمانے میں زیادہ مصروف ہیں... اپنے بچوں کی پرورش میں مصروف رہتے ہیں... تو وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی آتی ہے ہم اتنا انجوائے نہیں کرتے جتنا بچے کرتے ہیں۔

شگفتہ یاسمین.....(آر جے+ آرٹسٹ+ ہوسٹ)

1 : جہاں تک میرا موقف ہے تو ہمیں سال بعد رمضان کا مہینہ ملتا ہے اور افطاری کے اہتمام کے لیے تو کہا گیا ہے۔ اس کی ایک تیاری ہوتی ہے۔ مگر

اس تیاری کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اتنا زیادہ کھانا بنالیں کہ وہ ضائع ہو رہا ہو' اتنا ہی بنائیں جتنے افراد گھر میں ہیں۔ پھر یہ اسراف میں نہیں آئے گا... رمضان

کا مزا ہی سحری اور افطاری ہے۔ میری نظر میں اسراف یہ ہے کہ گھر میں چار افراد ہیں مگر کھانا آپ نے دس لوگوں کا بنایا ہو... پھر کیا ہوتا ہے... وہ فریج میں رکھ دیتے ہیں۔ دوسرے دن کسی نے کھایا نہ کھایا... یا تو وہ کھانا میڈ کو چلا جاتا ہے یا پھر ڈسٹ بن کی نذر ہو جاتا ہے... بہتر ہے کہ افطاری زیادہ بننے کی صورت میں آپ اسے کسی مستحق کو دے دیں یا کسی غریب کا روزہ کھلوا دیں اور ثواب کمائیں' میں... بہت ہی محدود

افطار بنالی ہوں اور ساتھ ساتھ کھانے کا اہتمام بھی کر لیتی ہوں۔ کہ روزہ افطار کرکے دو گھنٹے کے بعد آپ کھانا کھالیں۔ اگر کبھی افطاری زیادہ بن جائے تو پھر میں اس دن کھانا نہیں بناتی... فوڈ کو ضائع کرنا میرے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔

2 : بچپن میں امی عید کی تیاری کیا کرتی تھیں... اور ہمیں عید کا بڑی شدت سے انتظار رہتا تھا ظاہر ہے چھوٹے تھے... عجیب سی ایکسائٹمنٹ ہوتی تھی کہ میچنگ کے شوز بھی چاہئیں' چوڑیاں بھی چاہئیں۔ کان کے ٹوپس بھی لینے ہیں ہیر بینڈ بھی میچنگ کا ہو۔ بے فکری کی زندگی تھی... اور جب ہم بڑے ہوتے ہیں تو تیاریاں تو ہماری ہوتی ہیں ساتھ ذمہ داریاں بھی شامل ہو جاتی ہیں... اب تیاریاں ہوتی ہیں مگر میچنگ کا جنون نہیں ہوتا اور بچپن والی ایکسائٹمنٹ نہیں ہوتی۔ اب ہماری مصروفیات کا محور ہمارا کچن ہوتا ہے۔ شیر خورمہ بنانا ہے... کباب بھی بنانے ہیں۔ صبح کے ناشتے کی تیاری بھی کرنی ہے۔ کہ نماز کے بعد سب گھر آئیں گے تو ان کو ناشتا دینا ہو گا۔ پھر عید کے دن میری چھٹی نہیں ہوتی تو مجھے جاب پر بھی جانا ہوتا ہے پہلے اور دوسرے دن جاب پر ہوتی ہوں... اور سچ بات تو یہ ہے کہ اب جذبات بچپن والے نہیں رہے ہیں۔

✵ ✵

ضروری وضاحت

ہمیں پتا چلا ہے کہ فیس بک پر مختلف لوگ خواتین ڈائجسٹ' شعاع اور کرن کے نام مختلف پیج چلا رہے ہیں۔ ہم وضاحت کرنا چاہتے ہیں خواتین ڈائجسٹ' شعاع اور کرن کا ان گروپوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان پیجز پر جو آراء دی جاتی ہیں ادارہ کا ان سے متفق ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔

قارئین کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی کوئی باضابطہ ویب سائٹ نہیں ہے۔

ماہم عامر سے ملاقات

شاہین رشید

اس فیلڈ میں ماشاء اللہ کافی نئی لڑکیاں آگئی ہیں جو کافی خوش شکل ہیں مگر کامیاب وہی ہوتی ہیں جن میں ٹیلنٹ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ فیلڈ ایسی ہے کہ صرف خوب صورتی سے کام نہیں چل سکتا۔ ٹیلنٹ کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ نئی آنے والی لڑکیوں میں "ماہم عامر" نے اپنی صلاحیتوں سے اپنے آپ کو منوایا ہے ... آج کل آپ انہیں ڈرامہ سیریل "روشنی" میں روشنی کے کردار میں دیکھ رہے ہیں۔

★ "کیا حال ہیں ماہم؟"

☼ "جی اللہ کا شکر۔"

★ "کیا مصروفیات ہیں؟"

☼ "جی مصروفیات تو بس فیلڈ سے ہی متعلق ہیں۔ کچھ ڈرامے ریپیٹ آن ایئر ہیں۔ کچھ سوپ چل رہے ہیں۔ کچھ سیریلز اور کمرشلز تو چل ہی رہے ہیں... جن میں وسیم اکرم کے ساتھ کیا گیا کمرشل کافی ہٹ ہوا ہے۔"

★ "زندگی کافی مصروف گزر رہی ہے؟"

☼ "جی ماشاء اللہ سے... کافی مصروف گزر رہی ہے اور مجھے مصروف رہنا بہت اچھا لگتا ہے۔"

★ "ماہم آپ کا ایک سوپ جو آج کل ریپیٹ بھی ہو رہا ہے "بابل کا انگنا" اس میں آپ کا لک بالکل انڈین آرٹسٹوں والا تھا... کس نے کہا آپ سے؟"

☼ نہیں کہا تو کسی نے نہیں، لیکن شاید آپ کو اس وجہ سے ایسا لگا ہو گا کہ میں نے "ساڑھی" پہنی ہوئی تھی تا کہ میں عمر میں بڑی لگوں اور پچ جوان لڑکی کی ماں لگوں... کیونکہ جس لڑکی نے میری بیٹی کا رول کیا تھا وہ تقریباً" میری ہم عمر ہی تھی... اور پھر سلیم شیخ بھی بڑے ہیں تو بس اسی لیے ساڑھی والا گیٹ اپ لینا پڑا۔"

★ "ویسے ساڑھی پہننا کیسا لگتا ہے؟"

☼ "مجھے ساڑھی پہننا اچھا لگتا ہے۔ لیکن اس سیریل میں میں نے اتنی ساڑھیاں پہنی کہ اب میرا دل نہیں کرتا ساڑھی پہننے کو۔"

★ "اپنی ہی ہم عمر لڑکی کی ماں کا رول کرنا کیسا لگا تھا؟"

☼ "اچھا تھا... ؟ کیونکہ مجھے چیلنجنگ رول کرنا بہت پسند ہے اور جس لڑکی کی ماں کا رول کیا اس سے میری سب سے زیادہ اچھی دوستی تھی۔ اور ہم آف دی کیمرہ مستیاں کر رہے ہوتے تھے اور سیٹ پر بالکل سنجیدہ ہو جاتے تھے... تو اگر کردار پاور فل ہو تو آج میرے آڑے نہیں آتی۔"

★ "مگر ہمارے یہاں کا المیہ یہ ہے کہ جو جس کردار میں ہٹ ہو گیا... بس پھر اسے ایک سے ہی رول ملتے

ہیں... آپ کے ساتھ ایسا ہوا؟"

☼ "بدقسمتی سے یہ چیز ہماری فیلڈ میں بہت عام ہے۔ اگر کوئی ولن کے رول میں پسند کرلیا گیا تو وہ بے چارہ ولن ہی بن کے رہ جاتا ہے اور جو بہت معصوم ہے تو ہمیشہ معصوم ہی رہے گا۔ تو اللہ کا شکر ہے کہ مجھے دوبارہ ایسا کوئی کردار آفر نہیں ہوا... لیکن میں خود بھی اس معاملے میں بہت احتیاط کرتی ہوں کہ میرا کوئی کردار ریپیٹ نہ ہو... اور جیسا کہ میں نے کہا کہ ہر وہ رول کرنے کو تیار ہو جاتی ہوں جس میں کچھ کرنے کو ہو... اگر آپ کو یاد ہو تو ایک سیریل چلا تھا "تیری میری جوڑی" اس میں میں ایک پنجابن ملازمہ بنی تھی اور یہ ایک بڑا مختلف کردار تھا۔ انہی دنوں "بابل کا انگنا" بھی آن ایئر تھا جس میں میرا لیڈ رول تھا... تو میں نے یہ قطعی نہیں سوچا کہ ایک سیریل تو لیڈ رول کا چل رہا ہے اور دوسری میں گھر کی ملازمہ بنی ہوتی ہوں... مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا اگر کردار پاورفل ہو تو... اس طرح ایک سیریل تھا "رشتوں کی ڈور" اس میں میرا ایک نگیٹو رول تھا... اس کو دیکھ کر مجھے نگیٹو رولز کی کافی آفرز آئی تھیں مگر میں نے منع کر دیا کہ مسلسل ایک جیسے رول نہیں کروں گی... روشنی جو آج کل آپ دیکھ رہے ہیں اس میں میں ایک اسٹرانگ لڑکی کا کردار کر رہی ہوں۔ اور آنے والے سیریلز میں بھی میرے کافی اچھے رولز ہیں۔"

★ "اب پہلے آپ اپنے بارے میں بتائیں۔ پھر آگے چلتے ہیں؟"

☼ "میرا برتھ نیم "عائشہ عامر" ہے اور پیار سے مجھے ماہم بلاتے ہیں... تو امی بتاتی ہیں کہ جب میں پیدا ہوئی تو میرے والد جن کا تعلق ایڈورٹائزنگ ایجنسی سے تھا وہ شوٹ کے سلسلے میں ملک سے باہر تھے تو میری خالہ کی بیٹی نے امی سے کہا کہ اگر بیٹی ہوگی تو میں اس کا نام "ماہم" رکھوں گی... میں پیدا ہوئی اس نے میرا نام "ماہم" رکھ دیا۔ تین ماہ کے بعد جب والد صاحب واپس آئے اور انہوں نے مجھے پہلی بار دیکھا تو کہنے لگے کہ میں تو اس کا نام "عائشہ" رکھوں گا... چنانچہ میرے اسکول کالج کے تمام پیپرز میں میرے سرٹیفکٹ میں میرا نام عائشہ ہے... اور "ماہم" ٹی وی پہ غلطی سے اناؤنس ہو گیا تھا تو بس پھر "ماہم" ہی مشہور ہو گیا... اور جناب میں 26 دسمبر 1990ء میں کراچی میں پیدا ہوئی... اور فیملی بیک گراؤنڈ کچھ یوں ہے کہ میرے بابا پنجابی ہیں اور میری امی آدھی بلوچ ہیں اور آدھی پٹھان ہیں... اور وہ ایسے کہ میرے نانا بلوچ تھے اور میری نانی خالصتاً" پٹھان تھیں اور نانی کی امی کا تعلق ایران سے تھا اور وہ خالصتاً" ایرانی تھیں اور ان کی "لو میرج" تھی تو میرے نانا کی میری نانی کی شادی ہوئی تو پٹھان اور بلوچ کا مکسچر ہو گیا اور پھر امی اور بابا کی بھی "لو میرج" ہو گئی تو پٹھان پنجابی اور بلوچ کا مکسچر میں ہو گئی... تو بڑا کنجلک ہے میرا فیملی بیک گراؤنڈ۔"

★ "رنگ کس کا زیادہ آیا... مطلب پنجابیوں کا یا بلوچ پٹھان کا؟"

☼ "لوگ مجھے بولتے ہیں کہ تم پنجابی لگتی ہو، کیونکہ میں قد کاٹھ کے حساب سے پنجابی لگتی ہوں۔ مگر لمبے تو

پٹھان اور بلوچ بھی ہوتے ہیں۔ تو تینوں کا ہی رنگ آیا ہے۔۔۔ تو میرا قد 5 فٹ اور 10 انچ ہے اور میرا ایک ہی چھوٹا بھائی ہے۔۔۔ اور میں نے گریجویشن کیا ہے بزنس میں۔۔۔ اور بزنس پڑھ کر میں اداکاری کی فیلڈ میں آگئی اور اب "سی ایس ایس" کی تیاری کر رہی ہوں کیونکہ میری امی کو بہت شوق ہے کہ ان کی بیٹی بہت پڑھے۔ ماشاء اللہ سے میری امی حیات ہیں جبکہ والد صاحب کے انتقال کو 7 سال ہو گئے ہیں اور جب والد صاحب حیات تھے تو جیسا کہ میں نے بتایا کہ وہ ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں تھے تو ٹی وی پر میری پہلی اپیئرنس نو ماہ کی عمر میں ہوئی تھی۔۔۔ تو بچپن میں ٹی وی کمرشلز کیے۔۔۔ پھر چھوڑ دیا کیونکہ اسکول جانے لگ گئی تھی۔۔۔ تھوڑی بڑی ہوئی تو پھر تھیٹر کیا' یوں سمجھیں کہ اداکاری کا آغاز تھیٹر سے کیا۔"

★ "شادی نہیں کرنی۔۔۔ یا کام ہی کرنا ہے؟"

☼ "نہیں۔۔۔ ابھی ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ابھی بہت کام کرنا ہے۔ بہت فوکس کر رہی ہوں اپنے کام پہ۔۔۔ میرا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے۔ کوئی منگیتر نہیں ہے۔۔۔ کیونکہ ابھی ان معاملات کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔"

★ "کیمرے سے دوستی ہے بچپن سے ہے۔ ڈراموں کی فیلڈ میں کیسے آئیں؟"

☼ "9 ماہ کی تھی تو ٹی وی کمرشلز کیے' پھر بارہ سال کی ہوئی تب ٹی وی کمرشلز کیے۔۔۔ پھر چھوڑ دیا۔ پھر بڑی ہوئی تو ایک علاقائی چینل کا پروگرام ہوسٹ بھی کیا اور وہ سندھی چینل کے لیے ایک مارننگ شو تھا۔۔۔ حالانکہ مجھے سندھی نہیں آتی تھی۔۔۔ لیکن میں نے 10 دن میں سندھی سیکھی۔۔۔ پھر ڈراموں کی دنیا میں آنے کے لیے آڈیشنز دیے جن میں کئی میں ناکامی ہوئی اور کچھ میں کامیابی بھی ہوئی۔ دلچسپ بات بتاؤں کہ ایک بڑے ٹی وی چینل کے "اونر" ہیں انہوں نے مجھے ایک ٹی وی ڈرامے کے لیے خود بلایا تھا شاید انہوں نے میری کچھ تصاویر یا کلپس وغیرہ دیکھے تھے۔ مگر انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا کہ آپ تو بہت لمبی ہیں آپ کبھی ہیروئین نہیں بن سکتیں' ہیروین تو دور کی بات رہی آپ تو ایکٹنگ بھی نہیں کر سکتیں۔۔۔ مجھے بہت سی ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے آگے بڑھنے کے لیے اور میں نے کبھی مائنڈ نہیں کیا لیکن ان کا انداز کچھ ایسا تھا کہ میں بے ساختہ بول پڑی کہ میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے بلایا اور ہیروین بنوں نہ بنوں۔۔۔ مگر ایکٹر ضرور بنوں گی اور یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ اس کے بعد میں باہر نکل آئی اور یہ میری لائف کا ایک ٹرننگ پوائنٹ تھا۔"

★ "لمبا ہونا تو اعزاز کی بات ہوتی ہے۔ اللہ کا گفٹ ہے یہ؟"

☼ "اگر آپ لالی ووڈ بالی ووڈ اور ہالی ووڈ کی فلمیں دیکھیں تو لڑکیاں لمبی ہی ہوتی ہیں۔۔۔ اور عموماً ہیرو قد کے چھوٹے ہوتے ہیں۔۔۔ اور لمبا قد پرابلم ہوتا تو یہ انڈسٹری کبھی ترقی نہ کر پاتی۔۔۔ اور میں خوش ہوں کہ

میرا قد لمبا ہے اور میں ایک دم سے سب کی نظروں میں آجاتی ہوں۔"

★ "پھر ان سے دوبارہ ملاقات ہوئی؟"

✳ "اتفاق دیکھیں کہ دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی' انہوں نے ایک پروجیکٹ کے لیے کال کی مگر اتفاق سے میرے پاس ٹائم ہی نہیں تھا..... میں ان دنوں "بابل کا انگنا" میں مصروف تھی تو میں نے ان سے معذرت کی اور کہا کہ زندگی میں ایک بار آپ سے ضرور ملوں گی کہ میں ہیروئن بھی بنی ہوں اور ایکٹر بھی بنی ہوں۔

اس ریجکشن کے بعد میری پہلی انٹری تھیٹر کے لیے ہوئی اور مجھے بلایا بھی اسی وجہ سے گیا کہ میں لمبی ہوں اور میری آواز اچھی ہے اور میں نے ڈرتے ڈرتے آڈیشن دیا تھا۔ 20 امیدوار اور بھی تھیں مگر میرا انتخاب ہوگیا.... وہ میرا "کم بیک" تھا اور بس اس کے بعد سب کچھ اچھا ہوتا چلا گیا۔"

★ "آپ کے والد کی خواہش پوری ہوئی فیلڈ میں آنے سے؟"

✳ "نہیں .... میرے بابا کی خواہش تھی کہ میں اکاؤنٹ سیکھوں اور اس فیلڈ میں آؤں ۔۔ اور مجھے ٹیچنگ کا شوق تھا۔۔ تو بس قسمت مجھے یہاں لے آئی۔"

★ "اور یہاں آنے کے لیے بھی بہت محنت کرنی پڑی؟"

✳ "جی.... بالکل .... بہت محنت کرنا پڑی.... ہر چیز کے لیے بہت محنت کی' اپنے کام کے لیے بہت محنت کی' موبائل فون بھی بہت دیر میں ملا جب میں کلاس 10th میں آئی تو موبائل لیا۔ اس سے پہلے مجھے اس کا استعمال ہی نہیں آیا تھا.... میں بہت کم عمر بچوں کے ہاتھ میں دیکھتی ہوں تو حیران ہوتی ہے.... اگرچہ برائی نہیں ہے مگر پھر بھی بچوں کے ہاتھ میں اتنی جلدی موبائل نہیں آنا چاہیے۔"

★ "کام کے سلسلے میں کبھی تلخ باتیں سننے کو ملیں؟"

✳ "اگر آپ کا مطلب ہے کہ اداکاری کے بارے میں تو میں اپنے اوپر کی گئی تنقید کو بہت پوزیٹو لیتی ہوں۔ بشرطیکہ وہ واقعی تنقید ہو اور تعریف تو ہر کوئی کرتا ہے اس کو اتنا زیادہ نوٹس نہیں کرتی۔"

★ "محنت کر کے یہ مقام حاصل کیا۔۔ ویسے کبھی برا وقت گزارہ؟"

✳ "محنت کر کے جو مقام حاصل کیا۔۔ اسے میں برا وقت نہیں کہوں گی....ہاں جو برا وقت میں نے گزارہ وہ اپنے "بابا" کے انتقال کے بعد گزارہ... بلکہ ان کے انتقال کے فوراً بعد گزارہ.... ایسا کہ پتا ہی نہیں ہوتا تھا کہ کل کیا ہوگا اور پھر میرے حالات میں لوگوں کے چہرے نظر آنے لگتے ہیں۔ ان کا سلوک نمایاں ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ جو آپ کے بہت قریب ہوتے ہیں ان کے بارے میں بھی پتا چل جاتا ہے.... میں نے ہر طرح کا وقت دیکھا ہے اور بہت برا وقت بھی دیکھا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب اگلا مہینہ کیسے گزرے گا.... اور اب اللہ کا شکر ہے کہ بہت اچھا وقت گزار رہی ہوں۔"

★ "ملک سے باہر ٹریولنگ کا موقع ملا؟"

✳ "جی.... ملائشیا جا چکی ہوں.... بہت ہی ایمان دار اور اچھے لوگ ہیں وہاں کے.... اور وہاں "مسجد" اور "چرچ" ساتھ ساتھ ہیں' مگر کوئی کسی کو بری نظر سے نہیں دیکھتا.... وہاں کے لوگوں میں انسانیت بہت ہے ... اپنا ملک اچھا ہے مگر یہاں انسانیت کا فقدان ہے۔ وہاں میں نے روڈ پر ایک بندے کو گرے ہوئے دیکھا ... (بعد میں پتا چلا کہ وہ نشے میں ہے) پولیس والے آئے اسے بڑے پیار سے اٹھایا... اسے ایک طرف لے جا کر پانی پلایا اس سے پوچھا کہ کچھ کھایا بھی یا نہیں ... بعد میں پتا چلا کہ وہ نشے میں تھا.... مگر یہ انسانیت دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ ہمارے ملک ایسا ہوتا تو پہلے تو اس کی جیبوں کا صفایا کیا جاتا اور پھر یہ سوچا جاتا کہ اسے ذلیل کس طرح کرنا ہے۔ پولیس میں کیسے دیا جائے اور اس کی بے چارگی کا فائدہ کس طرح اٹھایا جائے۔"

★ ”یہ تو ہے... بہت افسوس ہوتا ہے اپنے ملک کے لوگوں پہ۔ خیر یہ بتاؤ کہ کوئی خاص کردار کے انتظار میں ہو؟“

✳ ”بہت سے ایسے کردار ہیں جن کا مجھے انتظار ہے۔ بس بہت اچھے مزیدار اور چیلنجنگ ٹائپ کے رول کرنا چاہتی ہوں... اونچی لمبی ہوں تو پنجاب کی جٹی کا رول مل جائے تو کیا ہی بات ہے۔“

★ ”غصے کی تیز ہیں؟“

✳ ”کہہ سکتے ہیں... کوشش کرتی ہوں کہ غصہ نہ آئے مگر جب آتا ہے تو میرا پورا جسم غصے سے کانپنے لگتا ہے آؤٹ آف کنٹرول ہو جاتی ہوں... اور اس وقت یا تو مجھے چھوڑ دیا جائے۔ یا پھر میں خود کسی طریقے سے چپ ہو جاؤں... بہت برا غصہ ہے میرا۔“

★ ”اس ملک کے لیے کچھ کرنے کو دل چاہتا ہے؟ ... جو باہر سے آتا ہے اس کا دل بہت کچھ کرنے کو چاہتا ہے؟“

✳ ”میرا دل چاہتا ہے کہ ان لوگوں کے لیے کچھ کروں جن کے پاس جاب نہیں ہے اور جو لوگ واقعی کمانا چاہتے ہیں۔ کام کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں... پھر روڈ پر ہمارے مظلوم لوگوں کے ساتھ تو برا ہو ہی رہا ہے۔ لیکن جانوروں کے ساتھ جو کہ بے زبان ہوتے ہیں ان کے ساتھ بھی بہت برا سلوک کیا جاتا ہے ان کے لیے بھی کچھ کرنا چاہوں گی ... بلکہ ان کے لیے تو لاء بنا دوں گی ان کے تحفظ کے لیے۔“

★ ”کھانا پکانے سے دلچسپی ہے؟“

✳ ”بہت زیادہ نہیں ہے... لیکن کچھ نہ کچھ بنا لیتی ہوں اور کچھ نئی چیز بن جاتی ہے۔ وہ الگ بات ہے...“ قہقہہ۔

★ ”فیوچر پلان کرتی ہیں؟“

✳ ”میں فیوچر پلانر بالکل بھی نہیں ہوں... مجھے لگتا ہے کہ جب میں پلاننگ کرتی ہوں تو کچھ کامیابی ہوتی نہیں ہے... میں اچھا کرنے کی کوشش کرتی ہوں اور سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیتی ہوں۔“

★ ”مار کھانے والے یا تھوڑے تشدد والے سین رئیل میں کرواتی ہیں یا کیمرہ ٹرک استعمال کرتی ہیں؟“

✳ ”میں رئیل میں سب سین کروانے کی قائل ہوں... رونے والے سین ہوں تو حقیقت میں روتی ہوں سین کو اپنے اوپر طاری کر کے اور اکثر اداکار بولتے ہیں کہ جی ہمیں مار نہیے گا نہیں لیکن میں اپنے کام کے لیے اتنی جنونی ہوں کہ سب حقیقت میں کرواتی ہوں ... ایک ڈرامے میں ایک تھپڑ کھانے کا سین تھا تو میں نے کہا کہ ٹھیک ہے ایک تھپڑ ہی تو ہے لیکن میرے ساتھ بہت برا ہوا... مجھے ایک تھپڑ نہیں بلکہ چھ تھپڑ پڑے... اور اتنے برے کہ میں حقیقت میں رو پڑی‘ مجھے ایسا لگا کہ جیسے ڈائریکٹر نے کوئی بدلا نکالا ہو۔ وہ ڈرامہ تھا ”رشتوں کی ڈور“ جس میں میری ماں مجھے تھپڑ مارتی ہے وہ چھ ٹیک میں اوکے ہوا اور حقیقت میں چھ تھپڑ کھائے... مگر میری بد قسمتی دیکھیں کہ وہ سین سنسر ہو گیا۔ تو مجھے بہت افسوس ہوا کہ کیا فائدہ ہوا چھ تھپڑ کھانے کا۔“

★ ”کن باتوں میں لوگوں سے مختلف ہو؟“

✳ ”میں سوچتی بہت ہوں... جذباتی بہت ہوں... مجھے غصہ آتا ہے مجھے کبھی لوگوں کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بری لگ جاتی ہیں۔ بہت سی باتوں میں بہت سے لوگوں سے مختلف ہوں۔“

★ ”کوئی ایسی خوبی بتانا چاہتی ہوں؟“

✳ ”میں ڈانس بہت اچھا کرتی ہوں اور گاتی بھی اچھا ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے... مگر یہ بات ابھی صرف مجھے ہی معلوم ہے۔“

اور اب یہ بات سب کو معلوم ہو جائے گی... اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ”ماہم عامر“ سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ٹائم دیا۔

✪ ✪

میری بھی سنیے

عمران اشرف

شاہین رشید

1 "میرا نام؟"
"عمران اشرف۔"

2 "لاڈ پیار کا نام؟"
"کسی نے لاڈ پیار کیا ہی نہیں تو نام کیا لیں گے۔"

3 "کب کہاں پیدا ہوا؟"
"11 ستمبر 1989ء کو۔۔۔ اسلام آباد میں۔"

4 "اسٹار؟ قد؟"
"اسٹار تو میں ٹی وی کا ہوں۔ ویسے ورگو ہے میرا اسٹار اور قد اچھا دیا ہے اللہ نے ماشاء اللہ چھ (6) فٹ لمبا ہوں۔"

5 "تعلیمی ڈگری؟"
"ایک ہی ہے گریجویٹ ہوں۔"

6 "بہن بھائی؟ میرا نمبر؟"
"میرا نمبر تو آخری ہے۔ ٹوٹل ہم پانچ ہیں۔ تین بہنیں اور دو بھائی۔"

7 "شوبز کی پہلی کمائی؟"
"ایک ٹیلی فلم میں کام کیا تھا اور مجھے 500 روپے ملے تھے۔ تاثرات ملے جلے تھے۔ نہ بہت خوش تھا نہ بہت اداس۔"

8 "آن ایئر ڈرامے؟"
"چلتے رہتے ہیں کب ختم ہو جائیں تو ایسا نہ ہو کہ میں بتاؤں اور ڈرامے ختم ہو چکے ہوں۔ ویسے حال ہی میں جو سیریل شروع ہوئے ہیں ان میں "الف اللہ اور انسان" "دل جانم" "کتنی گرہیں باقی ہیں" وغیرہ وغیرہ۔"

9 ”نیند کب نہیں آتی؟“
”عموماً“رات کو نہیں آتی۔“

10 ”میرا فوکس ہے؟“
”اپنے فیوچر پہ... بہت آگے جانا ہے مجھے 'شادی وادی نہیں کرنی ابھی۔“

11 ”بچپن کی کوئی شرارت؟“
”شرارت؟ سارا بچپن کرائسس میں گزرا' شرارت کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔“

12 ”فضول خرچ ہوں؟“
”نہیں... ہرگز نہیں... بہت محنت سے کماتا ہوں۔“فضول خرچی میں نہیں اڑاتا۔

13 ”پرائیویسی کیا ہوتی ہے؟“
”دوسروں کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ میری پرائیویسی یہ ہے کہ دل کی باتیں کسی سے شیئر نہ کروں... اپنی کمائی کسی کو نہ بتاؤں... اپنا اکاؤنٹ بھی سنگل ہونا چاہیے۔“

14 ”مخلص کون ہوتے ہیں؟“
”وہ جن کو آپ سے بہت زیادہ مطلب ہوتا ہے۔ وہ مخلص ہوتے ہیں۔“

15 ”لڑکیاں کب اچھی لگتی ہیں؟“
”ہمیشہ۔ اچھی لگتی ہیں۔“

16 ”مجھے ڈر لگتا ہے؟“
”اپنے آپ سے' کیونکہ میرا غصہ بہت تیز ہے۔“

17 ”کس عمر کی خواتین اچھی لگتی ہیں؟“

”مجھے ہر عمر کی خواتین اچھی لگتی ہیں... ہر روپ خوب صورت ہے 'ماں' بہن 'بیوی۔“

18 ”بے ساختہ گلے لگالیتا ہوں؟“
”جب کوئی بہت بڑی خوش خبری ملے... جو سامنے نظر آتا ہے اسے گلے لگالیتا ہوں۔“

19 ”مجھے انتظار ہے؟“
”اچھے دنوں کا۔“

20 ”کیا جمع کرتا ہوں؟“
”کچھ نہیں... زندگی ناقابل اعتبار ہے... ویسے

بھی مجھے بانٹنے کا زیادہ شوق ہے۔"
21 "میں خوف زدہ ہو گیا تھا؟"
"جب راہ چلتے ڈاکوؤں نے مجھے گن پوائنٹ پر سب کچھ دینے کو کہا۔ اور میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ بس ڈر گیا تھا اور خوف زدہ ہو گیا تھا کہ نہ جانے کیا سلوک کریں۔"
22 "کام کی چیزیں کہاں رکھتا ہوں؟"
"اپنی جیب میں والٹ میں نہیں کیونکہ بندہ والٹ کو ادھر ادھر رکھ کر بھول بھی جاتا ہے۔ پھر لٹیروں کے ہاتھ والٹ لگے تو زیادہ نقصان نہ ہو۔"
23 "کن کیڑوں سے پریشان ہو جاتا ہوں؟"
"لوگوں کی "سوچ" کے کیڑوں سے پریشان ہو جاتا ہوں۔"
24 "دوسروں کی کیا بات بری لگتی ہے؟"
"عموماً" لوگ جب نصیحت کرتے ہیں تو اس میں خلوص کا پہلو کم اور "حسد" اور "بغض" کا پہلو زیادہ نظر آرہا ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بھئی گھما پھرا کے بات مت کرو جو کہنا ہے صاف صاف کہہ دو۔"
25 "کہاں بیٹھ کر کھانا کھانے کا مزا آتا ہے؟"
"کھانے کی پلیٹ بھری ہوئی ہونی چاہیے۔ جگہ بھلے کوئی سی بھی ہو۔"
26 "دنیا والوں سے کیا تحفہ لینا چاہتا ہوں؟"
"کچھ نہیں۔۔۔ اور دنیا کون ہوتی ہے مجھے ریوارڈ یا ایوارڈ دینے والی۔ دینا تو مجھے میرے رب نے ہے۔"
27 "جب کوئی اچھا لگتا ہے تو؟"
"تو آسان بات ہے۔۔۔ میں اسے فرینڈ ریکوسٹ بھیج دیتا ہوں۔"
28 "زندگی بری لگنے لگتی ہے؟"
"جب سوچتا ہوں کہ اس نے تو ایک دن ختم ہو جانا ہے۔ تب زندگی اچھی نہیں لگتی۔"
29 "زندگی بدلتی ہے یا انسان؟"
"انسان خود بدلتا ہے۔ زندگی کو تو ہم خود گزارتے ہیں زندگی ہمیں نہیں گزارتی۔۔۔ زندگی تو روح کا نام ہے۔"

30 "کھانے کے دوران کیا چیز لازمی ہونی چاہیے؟"
"اگر کھانا اپنے پورے لوازمات کے ساتھ ہو تو اسے بونس سمجھ کر انجوائے کرتا ہوں۔۔۔ ویسے مجھے کھانے سے محبت ہے انجوائے کر کے کھاتا ہوں۔"
31 "ایک شخصیت جن سے ملنا چاہتا ہوں؟"
"علامہ اقبال بہت پسند ہیں مجھے۔"
32 "میں بچنا چاہتا ہوں؟"
"نگیٹو سوچ سے۔۔۔ جو مجھے کبھی کبھی بہت پریشان اور خوف زدہ کر دیتی ہے۔"
33 "کیا کیا چیزیں لے کر گھر سے نکلتا ہوں؟"
"بہت سادہ بندہ ہوں۔ صرف فون سیل لے کر ہی چلا جاتا ہوں۔"
34 "میری خوبی؟"
"کہ میں حقیقت پسند ہوں۔۔۔ اس لیے میری اکثر باتیں گھر والوں کو بری لگتی ہیں۔ میرے دوستوں اور دیگر لوگوں کو بری لگتی ہے۔"
35 "کون اچھی رائے دیتا ہے دل یا دماغ؟"
"میری دونوں سے دوستی ہے۔۔۔ دونوں ہی اچھی رائے دیتے ہیں۔ جس کی رائے اچھی لگے پھر وہی کام

کرتا ہوں۔"

36 "میرے ہٹ کردار؟"

"ماشاء اللہ میرے ہر کردار ہٹ ہوتے ہیں "گل رعنا" "کالا جادو" اور اب "الف اللہ" اور "انسان" اور جتنے بھی سیریل کیے وہ ناظرین نے پسند کیے۔"

37 "کہاں وقت گزارنا اچھا لگتا ہے؟"

"تنہائی میں وقت گزارنا اچھا لگتا ہے۔"

38 "کھلونے جو سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں؟"

"کھلونے؟... یہ تو بچپن میں ہوتے ہیں اور میں نے اپنے بچپن میں کوئی کھلونا نہ دیکھا اور نہ ہی کھیلا ہے۔"

39 "اس فیلڈ کی اچھی بات؟"

"شہرت... ہر فیلڈ میں پیسہ ہوتا ہے مگر شہرت نہیں تو میں تو شہرت انجوائے کرتا ہوں... شہرت بہت خوب صورت نعمت ہے اللہ کی۔"

40 "مجھے غصہ آتا ہے؟"

"جب لوگ کہتے ہیں۔ لوگ تو خیر نہیں جب دوست یار کہتے ہیں کہ تھوڑے دبلے ہو جاؤ... بھئی کسی کو کیا مسئلہ ہے۔"

41 "اگر اچانک پیسہ مل جائے تو؟"

"نہیں... مجھے اچانک ملنے والا پیسہ پسند نہیں جو مزا محنت کر کے کمانے میں ہے وہ کسی میں نہیں ہے۔"

42 "شہرت نے بگاڑا یا سنوارا؟"

"سنوارا ہی ہے کیونکہ میں اللہ کا بہت ہی عاجز اور اس سے ڈرنے والا بندہ ہوں۔"

43 "مجھے شکایت ہے؟"

"اپنے لوگوں سے بلکہ پوری عوام سے کہ جو قوانین ہمارے فائدے کے لیے بنائے گئے ہیں اللہ کا واسطہ اسے مت توڑیں بلکہ خود بھی عمل کریں اور دوسروں کو بھی کرائیں۔"

44 "کون سا دن منانا چھوڑ دیا؟"

"ایک وقت تھا جب ویلنٹائن ڈے بہت شوق سے منایا کرتا تھا... مگر جب احساس ہوا کہ محبت کرنے کے لیے ایک ہی دن کیوں؟... تو بس پھر اس دن کو منانا چھوڑ دیا۔"

45 "موت کب نظر آ رہی ہوتی ہے؟"

"جب شدید بھوک لگی ہوئی ہوتی ہے (قہقہہ) سچ میں بھوک برداشت نہیں ہوتی۔"

46 "کہیں نہیں جاتا جب؟"

"جب بہت تھکا ہوا ہوتا ہوں۔ کیونکہ میرے لیے میری بہترین جگہ میرا گھر' میرا بستر' میرا ٹی وی اور میرا موبائل فون ہے۔"

47 "بستر جلدی چھوڑ دیتا ہوں؟"

"بستر کو چھوڑنا بہت مشکل کام ہے' مگر اس کو چھوڑے بغیر گزارہ بھی نہیں... کیونکہ کام تو کرنا ہی ہوتا ہے۔"

48 "چھٹیاں کہاں گزارنا پسند کرتا ہوں؟"

"مجھے ایک دو چھٹیاں تو اچھی لگتی ہیں۔ مگر زیادہ نہیں کیونکہ مجھے کام کرنا زیادہ اچھا لگتا ہے... مجھے [illegible]

[illegible]

49 [illegible]

[illegible]

50 [illegible]

"بالکل ہے... [illegible]

کریں مگر ملے گا وہ ہی جو [illegible]"

51 "مارنے کو دل چاہتا ہے؟"

"جب کوئی کسی کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتا ہے۔"

52 "اچھے لگتے ہیں وہ آرٹسٹ؟"

"جو اپنے کام سے سنجیدہ ہوں۔ اپنے کام کو سمجھتے ہوں اور جو سین کی گہرائی کو جانتے ہوں۔"

53 "اگر پاور میں آ گیا تو؟"

"تو پھر میں اپنے خدا کے زیادہ قریب آ جاؤں گا اور اس کے لیے اس کے بندوں کی خوشنودی کے لیے زیادہ کام کروں گا۔"

54 "کچھ غلط ہو جائے تو؟"

"تو صاف گوئی سے بتا دیتا ہوں کہ یہ بات یہ کام مجھ سے غلط ہو گیا ہے۔ صاف گوئی سے ڈرتا نہیں ہوں۔"

☆ ☆

مقابل ہے آئینہ

اقراء ممتاز

شاہین رشید

س "اصلی نام کیا ہے؟ گھر والے پیار سے کیا کہتے ہیں؟"
ج "پورا نام اقراء ممتاز ہے گھر والے اقراء ہی کہتے ہیں۔"
س "آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟"
ج "آئینہ مجھے تو کچھ نہیں کہتا؟ بس آئینہ مجھے دیکھتا رہتا ہے اور میں آئینے کو۔"
س "حسین صورتیں دیکھ کر دل میں کیا خیال آتا ہے؟"
ج "دل میں یہی خیال آتا ہے کہ خدا کی تخلیق کردہ چیزیں کتنی حسین ہیں چاہے وہ حسین صورتیں ہوں یا حسین چیزیں۔"
س "اگر آپ کے پرس کی تلاشی لی جائے تو؟"
ج "پرس میں فالتو کاغذوں کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ملے گی۔"
س "بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟"
ج "اتنے خوف ناک سوال کیوں پوچھتی ہیں بھوتوں کا نام سن کر ہر کوئی ڈر جاتا ہے۔"
س "مہمان کیسے لگتے ہیں؟"
ج "مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں مجھے تو مہمانوں کا انتظار رہتا ہے کہ کوئی مہمان آجائے اور میری بوریت دور ہو جائے۔"
س "کھانے میں کیا پسند ہے؟"
ج "کھانے میں بریانی اور پالک گوشت میٹھے میں کسٹرڈ۔"
س "اگر آپ کو حکومت مل جائے تو کیا کریں گی؟"
ج "اگر مجھے حکومت مل جائے تو سوچا جا سکتا ہے کہ کیا کروں۔"
س "پسندیدہ شاعر؟"
ج "فیض احمد فیض اور وصی شاہ۔"
س "مزاجاً" لڑاکا ہیں؟"
ج "کیا پوچھ لیا بہت زیادہ لڑاکا ہوں۔"
س "گھر سے باہر جاتے ہوئے کیا کیا چیزیں ساتھ رکھتی ہیں؟"
ج "اول تو میں باہر جاتی نہیں ہوں اگر کبھی بازار جانا پڑے تو پیسے ہاتھ میں رکھتی ہوں کیونکہ پرس مجھے پسند نہیں ہیں۔"
س "کس مزاج کے لوگ پسند ہیں؟"
ج "شوخ و چنچل لوگ بہت اٹریکٹ کرتے ہیں۔"
س "اگر لوڈشیڈنگ نہ ہوتی تو؟"
ج "پھر رونا ہی کس بات کا ہوتا۔"
س "اللہ پاک کو یاد کرنے کا سب سے بہترین وقت؟"
ج "جب آپ کسی مشکل میں ہوتے ہیں۔"
س "آپ کفایت شعار ہیں یا فضول خرچ؟"
ج "میں بہت فضول خرچ ہوں۔ پیسے تو میرے پاس رہتے ہی نہیں۔"
س "کیا نام شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے؟"
ج "اس سوال کا کوئی اندازہ نہیں۔"
س "وہ کون سے کام جن کو کرتے ہوئے خیال آتا ہے کہ دنیا کیا کہے گی؟"
ج "دنیا کا تو کام ہی باتیں بنانا ہے انسان کو کسی بھی

حال میں خوش نہیں ہونے دیتی۔"

س "آپ کسی سنسان راستے سے گزر رہی ہوں اور کتا پیچھے لگ جائے تو؟"

ج "میں "او کھ بوک کتنے واساں سکھ" کہہ کر گزر جاؤں گی۔"

س "آپ کی نظر میں محبت کیا ہے؟"

ج "صرف دھوکا۔"

س "کن لوگوں کی احسان مند ہیں؟"

ج "پہلے تو اپنے والدین دوسرے نمبر پر اپنی ٹیچر مس مہ جبیں اور باجی صدف کی ہوں۔"

س "اپنی تعریف سن کر خوشی ہوتی ہے؟"

ج "اگر کوئی بھول کر تھوڑی سی تعریف کرلے تو تھوڑی سی خوشی ہو ہی جاتی ہے۔"

س "ڈرامے دیکھتی ہیں؟"

ج "جی ہاں! بہت زیادہ۔"

س "اگر دوست ناراض ہو جائیں تو کیسے مناتی ہیں؟"

ج "اپنی غلطی ہو تو سوری کہہ لیتی ہوں زیادہ تر دوست ناراض ہی نہیں ہوتیں۔"

س "حقیقی خوشی کس وقت حاصل ہوتی ہے؟"

ج "جب کسی کے چہرے پر میری وجہ سے مسکراہٹ آئے تو اس وقت حقیقی خوشی صحیح معنوں میں حاصل ہوتی ہے۔"

س "زندگی سے کیا سبق سیکھا؟"

ج "کبھی بھی ہمت نہ ہاروں کیوں کہ آپ کی ہار میں ہی آپ کی بھی جیت ہے۔"

س "ستاروں پہ یقین رکھتی ہیں؟"

ج "تھوڑا بہت۔"

س "کوئی آخری بات؟"

ج "کوئی نہیں۔"

س "کوئی ایسی بات جو ہمیشہ ذہن میں رہتی ہے؟"

ج "کہ یہ دنیا ایک تلخ حقیقت کی طرح ہے جس میں رہنے کے لیے آپ کو بہت سی باتوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔"

٭ ٭

وضاحت

کہانیاں معاشرے کا عکس ہوتی ہیں۔ رائٹرز اپنے اردگرد جو کچھ دیکھتے ہیں وہ کہانی کی شکل میں پیش کر دیتے ہیں۔ کہانیوں میں بہت سی ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جو شرعی احکامات سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ دراصل شرعی احکامات و مسائل کے بارے میں عام آدمی کی معلومات بہت محدود ہیں۔ علمائے کرام ہی ان معاملات کی نزاکت کو سمجھتے ہیں اور ان پر فتویٰ دینے کے مجاز ہیں اور یہ اسی صورت ممکن ہے جب ان سے کسی معاملے میں رہنمائی لی جائے۔

پچھلے ماہ نادیہ احمد کی کہانی "حاصل زیست" شائع ہوئی تھی۔ یہ کہانی ایک سچے واقعے پر مبنی تھی۔ اس کہانی میں مصنفہ کا مقصد یہ احساس دلانا تھا کہ بچوں کے معاملے میں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ذرا سی لاپروائی یا کوتاہی کسی بڑے نقصان کا باعث ہو سکتی ہے۔ ہم وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ اس کہانی کو شریعت کی روشنی میں نہ دیکھا جائے۔ کہانی میں بیٹے نے محبت، غصہ اور باپ سے نفرت کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کر جو قدم اٹھایا وہ شرعی احکام کے منافی اور غلط تھا۔ شریعت کی رو سے ایسی شادی جائز نہیں۔ بہت سے قارئین نے اس نکتے پر اعتراض کیا کہ یہ شادی شریعت کی رو سے جائز نہیں تھی۔ ہم وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ مصنفہ کا مقصد اسے صحیح ثابت کرنا نہیں تھا۔

قارئین اسے صرف ایک کہانی یا واقعہ سمجھ کر پڑھیں اور اسے شریعت کے احکامات کی روشنی میں نہ دیکھیں۔

آسیہ مرزا

من موکھ کی بات سناؤ

عباد گیلانی بلڈ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہے۔ وہ اپنی بیوی مومنہ کو طلاق دے کر اپنے بیٹے حازم کو اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور دوسری شادی عاظمہ سے کر لیتا ہے۔ حازم اپنی ماں عاظمہ اور بھائی بابر کے ساتھ اچھی زندگی گزار رہا ہوتا ہے، مگر اپنے باپ عباد گیلانی کی بیماری کی وجہ سے فکر مند رہتا ہے۔ جب کہ عاظمہ اور بابر اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ عباد گیلانی کو اپنی بیماری میں احساس ہوا ہے کہ اس نے حازم کی ماں مومنہ کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ عباد گیلانی مومنہ کے باپ یاور علی کو بلاتا ہے اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگتا ہے اور حازم کو خاص طور سے اس کے نانا یاور علی سے ملواتا ہے، مگر حازم اپنے نانا سے مل کر اچھے تاثرات کا اظہار نہیں کرتا، مگر بعد میں اپنے باپ کی خواہش پر ان کے ساتھ اپنے نانا کے گھر جاتا ہے اور اپنی ماں مومنہ سے ملتا ہے۔ ماں سے مل کے تمام شکوے بھول جاتا ہے اور اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کے باپ نے اس کی ماں کے ساتھ زیادتی کی ہے۔

حوریہ مومنہ کی بھتیجی ہے۔ بے حد محبت کرتی ہے اور مومنہ بھی اسے بے تحاشا چاہتی ہے، حازم جب حوریہ کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں حوریہ کے لیے پسندیدگی کے جذبات ابھرتے ہیں اور یہی حال حوریہ کا بھی ہوتا ہے۔ عباد گیلانی حوریہ سے مل کر بہت خوش ہوتا ہے کیونکہ حوریہ میں اسے مومنہ کا عکس نظر آتا ہے اور حازم سے پوچھ کر اس کے نانا یاور علی سے دونوں کی شادی کی بات کرتا ہے۔

حوریہ اپنی دوست فضا سے بہت محبت کرتی ہے، فضا کی ایک امیرزادے سے دوستی ہے اور وہ گھر والوں سے چھپ کر اس سے ملتی ہے۔ حوریہ کو اس بات سے اختلاف ہے، وہ فضا کو بہت سمجھاتی ہے کہ اس راستے پر نہ چلے، مگر فضا نہ مانی اور آخر کار ایک دن محبت کے نام پر بربادی اپنی قسمت میں لکھوا لیتی ہے اور اس بات کا پتا اس کی سوتیلی ماں جہاں آرا کو چل جاتا ہے اور وہ اپنے بھانجے نصیر سے اس کی شادی کرنے کا پروگرام بنا لیتی ہے جبکہ فضا اس پر راضی نہیں ہوتی۔ حوریہ کو جب پتا چلتا ہے تو وہ فضا کو سمجھاتی ہے اس امیرزادے کو کہے کہ وہ اس سے شادی کرے اور فضا اس کو مجبور کرتی ہے کہ یہ بات

"محبت تو میں نے تم سے ہی کی تھی عباد گیلانی اور سچ تو یہ ہے کہ محبت تم نے بھی اک مجھ سے ہی کی۔۔۔ اور یہ انکشاف مجھ پر ایک طویل عرصے بعد ہوا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں تمہیں بھول جانے کی کوشش کے باوجود بھول نہ پائی۔"

وہ کھڑکی میں جانے کتنی دیر کھڑی رہتی۔ دروازے پر کھٹکے کی آواز سے اپنے خیالات سے باہر نکلی۔

یاور علی کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ پردہ گرا کر بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔

"آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں ابا جی!"

"ہوں۔" وہ ہلکے سے ہنکارا بھر کر اندر چلے آئے۔ مومنہ کے چہرے پر نگاہ پڑی تو ان کے دل پر چوٹ سی پڑی۔ آج اس کے چہرے پر بے حد سناٹا دکھائی دے رہا تھا۔ آنکھوں میں جیسے اندھیرے اترے ہوئے تھے۔ سرخ سرخ آنکھیں جن میں کوئی رمق نہ بچی ہو۔ سب کچھ کھو دینے کا ویران بنجر سناٹا۔

وہ تو خود بھی عباد گیلانی کی موت پر بستر سے لگ کر رہ گئے تھے آج بہت حوصلہ اکٹھا کر کے مومنہ کے کمرے میں آئے تھے۔

باپ کو دیکھ کر مومنہ بھی جیسے تڑپ سی گئی تھی مگر یونہی بیڈ پر پیر لٹکائے بیٹھی رہی۔۔۔ اسے لگ رہا تھا وہ اگر سر اٹھائے گی یا اٹھ کر ان کے نزدیک جائے گی تو سارا درد کہیں بہنے نہ لگ جائے۔ وہ جو خود کو سنبھالنے میں لگی بیٹھی ہے بکھر نہ جائے۔۔۔ مگر بکھر تو گئی تھی۔۔۔ اور بہت بری طرح بکھری ہوئی تھی۔ بس یونہی بظاہر بھرم کی چادر اوڑھ کر بیٹھی تھی۔

"میں تمہیں کوئی نصیحت کرنے نہیں آیا مومنہ۔۔۔ میں نہیں کہوں گا کہ تم تو حوصلہ مند رہی ہو۔ ہر مقام پر حالات کا مقابلہ کیا ہے تو اب بھی کرو۔" یاور علی پژمردہ قدموں سے اس کے نزدیک آرکے۔

"نہیں تم پتھر نہیں ہوں۔ گوشت پوست کی انسان ہو۔ جذبات احساسات پر چوٹ پڑے تو انسان نہ بلبلائے۔ ممکن نہیں۔۔۔ اپنی ہی آنکھوں سے کسی کو ڈوبتے دیکھنا آسان نہیں ہوتا اور ڈوبنے والا بھی جو۔۔۔"

"ابا جی۔۔۔ وہ کچھ نہیں تھے میرے۔" مومنہ نے تڑپ کر ان کی بات کاٹ دی۔ "میں نے اسی احساس سے نکلنے میں پوری زندگی صرف کردی۔ اپنی تمام تر توانائیاں لگا دیں کہ وہ "کچھ نہیں تھے میرے۔" اس کی آواز بکھرنے لگی یاور علی اس کے نزدیک بیٹھ گئے اور اس کے کندھے پر نرمی سے اپنا کمزور سا ہاتھ پھیلا لیا۔

"یہی تو جنگ مار ڈالتی ہے بندے کو اندر سے کہ کسی احساس کو نکالنے کے لیے ہم پوری عمر رائگاں کر دیتے ہیں۔" یاور علی کے لہجے میں سارے جہاں کا درد تھا۔

"عجیب آدمی تھا وہ بھی۔۔۔ بھنور میں گر کر بھی ساحل کی امید پر جی رہا تھا۔"

"مگر میں اسے مایوس نہ کرتی تو کیا کرتی ابا جی۔" مومنہ نے احتجاجاً ان کی طرف دیکھا میں اسے ساحل تک کیسے لا سکتی تھی۔ میں تو خود بھنور میں تھی۔۔۔ میرے پاس کوئی کنارا تھا ہی نہیں۔۔۔ مگر جب میں نے اسے معاف کر دیا تھا تو پھر اس کی تسلی کیوں نہیں ہو رہی تھی۔"

وہ بچوں کی طرح بلکنا چاہ رہی تھی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہ رہی تھی۔ اس لیے جو اس کا کچھ نہیں تھا مگر سب کچھ تھا۔ مگر اب جبکہ وہ دنیا سے ہی چلا گیا تھا تو وہ اپنا بھرم کیسے توڑ دیتی۔ وہ کیسے یہ ظاہر کر دیتی کہ وہ اتنی ہی کمزور ہے جتنی مضبوط دکھائی دیتی ہے۔ مگر یاور علی بھی باپ تھے اس کے۔۔۔ اس کے حوصلوں سے بھی واقف تھے اور اس کے دل کے ہوتے ان ٹکڑوں سے بھی۔

"وہ ایسی بیماری سے لڑ رہا تھا کہ تمہارا ساتھ مل بھی جاتا تب بھی زیادہ جی نہیں سکتا تھا۔ مگر تمہاری معافی نے اس کے لیے اس کی آخری آرام گاہ کو ضرور اس کے لیے کشادہ کر دیا ہو گا اور خدا کرے ایسا ہی ہو۔" یاور علی اس کا

سر تھپکتے ہوئے بولے۔

"دنیا کا ساتھ تو بس پل بھر کی کہانی ہے گویا۔ اس دار فانی سے جانے والے کے لیے آنسو کوئی معنی نہیں رکھتے ہاں ہماری معافی، ہمارا اس کے لیے اچھا سوچنا۔ مغفرت کے لیے دعا کرتے رہنا بہت بڑا احسان ہے اور میں فخر کرتا ہوں تم پر آج بھی مومنہ کہ تم ایک احسان کرنے والی عورت ہو۔" وہ آنکھوں میں اترنے والی نمی کو پلکوں کی جنبش سے ہٹانے لگے "چلو ایک بار میرے ساتھ تم بھی رو ہی لو۔ کہ ان آنسوؤں میں سارا درد، ساری یادیں بہہ جائیں ۔ایک اندھیرا سا ٹھہر گیا ہے آنکھوں کے آگے۔ ان آنسوؤں نے دیوار سی کھڑی کر رکھی ہے آج اسے گرا دیتے ہیں۔"

یاور علی بہتے آنسوؤں کے درمیان مسکرانے کی کوشش کرنے لگے مگر ان کے لب کپکپانے لگے۔ مومنہ ان کے سینے سے لگ کر بے آواز رو رہی تھی۔ وہ بھی آنسوؤں کی کھڑی دیوار ہٹانے لگے۔

☆ ☆ ☆

گیلانی ہاؤس میں آج بھی حوریہ نے قل پڑھوائے تھے قرآن پاک ختم کروایا تھا۔ مدرسے کے حافظ بچے پڑھ کر جا رہے تھے۔ بے غرض پڑھنے والے ان بچوں کے چہروں پر نور برس رہا تھا۔ شلوار سوٹ اور سفید ٹوپیوں میں یہ دس بارہ اور پندرہ سال کے یہ بچے۔۔۔ روحانیت کا احساس پیدا کر رہے تھے۔ ان کے لبوں سے نکلنے والی آوازیں روح کو گرما رہی تھیں۔ ایک پاکیزہ اور پر نور ماحول دل پر از خود طاری ہو رہا تھا۔

گیلانی ہاؤس کی بے نور غفلت سے ڈوبی سیاہ دیواروں میں جیسے نور ہی نور اتر گیا تھا۔ ملازم بھی بے خود سے ہو کر ان کی خوب صورت قرأت پر جھوم رہے تھے۔۔۔ پھولوں کی مہک سبزے کی مہک درختوں کے رنگ میں، پتھروں کی سختی اور زمین کی نرمی۔ سب جگہ جیسے ایک نادیدہ ہستی کا جلوہ نظر آنے لگا تھا۔

بچے ایک ایک کر کے جا رہے تھے عاظمہ ٹیرس پر رکھی کرسی پر بیٹھی انہیں جاتا دیکھتی رہیں۔ ان کی آنکھوں میں پانی جمع تھا۔ پتا نہیں یہ آنسو دنیا کی بے ثباتی پر تھے اپنی برسوں کی غفلت پر یا جانے والے کے بعد اپنے تنہا ہو جانے پر۔

شاید سچ ہی ہے حقیقت شناسی کے لیے موت کا گھر یا قبرستان سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ بچے جا چکے تھے عاظمہ اپنی خواب گاہ میں بند ہو گئی تھیں۔ ملازم باغیچے کے اس احاطے سے دریاں چاندنیاں اٹھا رہے تھے۔ حوریہ وہیں ایک کونے میں بیٹھ گئی اور خالی خالی نظروں سے ملازموں کو مستعدی سے کام کرتے دیکھتی رہی۔۔۔ کام سمٹ گیا ملازم چلے گئے مگر وہ یونہی بیٹھی رہی۔ اندھیرا دھیرے دھیرے اپنے قدم جما رہا تھا۔ باغیچے کی مدھم لائٹس آن کر دی گئیں۔ مگر وہ یونہی بیٹھی رہی۔ عباد گیلانی کی موت در حقیقت اس کے لیے کسی سانحے سے کم نہ تھی۔ تین روز گزر چکے تھے مگر وہ اعصابی طور پر اب بھی منتشر تھی اس کے ذہن میں اب بھی بے یقینی تھی۔

ایک خوف تھا جو مستقبل کے لیے تھا۔

اسے لگا حازم کے بعد عباد گیلانی کی موت بھی اس کے لیے کسی زلزلے سے کم نہ ہو۔۔۔ اس کی دنیا کو تہس نہس کر دیا ہو اور اسے "کچھ بھی سجھائی" نہ دے رہا ہو۔ اس کی ذہنی حالت بے حد خستہ تھی۔

وہ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی۔ معاً" قدموں کی ہلکی دھمک پر سر اٹھایا۔

سفید شلوار قمیص میں بابر اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔

"یہاں اس طرح کیوں بیٹھی ہو اندر جا کر ریسٹ کرو۔" اس کا لہجہ نرم تھا۔ حوریہ نے اٹھایا ہوا سر جھکا دیا اور خاموشی سے بینچ سے اٹھ گئی۔

"تم نے سچ ہی کہا تھا شاید۔ آزاد سمجھنے اور آزاد ہونے میں بہت فرق ہے۔" بابر کی آواز نے اس کے اٹھتے قدم کو روک دیا۔

"انسان جتنا بھی بااختیار سمجھ لے خود کو۔ مگر جلد یا بدیر اسے اپنے اختیارات کے کھوکھلے پن اور اپنے وجود کے بے معنی ہونے کا احساس ہو ہی جاتا ہے۔ وہ پاور جو اٹل ہے وہ ایک وقت ضرور اپنے ہونے کا شدت سے احساس دلاتی ہے۔"

حوریہ نے ذرا سا رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ مگر وہ حوریہ کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا اس کی نظریں درخت کے سرسراتے پتوں پر جمی تھیں اور دونوں ہاتھ سینے پر بندھے ہوئے تھے۔ وہ دل گرفتہ اور عجیب پژمردہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ حوریہ نے عباد گیلانی کی موت پر اسے پہلی بار بری طرح ٹوٹتے بکھرتے دیکھا تھا۔ بابر جیسا متکبر شخص جو شاید آنسوؤں کا مطلب بھی نہ جانتا تھا عاظمہ کے سینے سے لگا بچوں کی طرح آنسوؤں کا دریا بہا رہا تھا۔ وہ حقیقتاً" حیران ہوئی تھی۔

"میں نے بہت کوشش کی تھی حوریہ کہ پاپا کو مومنہ آنٹی سے ملواؤں۔ پاپا کو چھوٹی سی خوشی دے سکوں۔ میں کچھ کرنا چاہتا تھا ان کے لیے۔ مگر اپنی تمام طاقت محنت اور ہر کوشش کو میں نے قدرت کے سامنے بے بس پایا۔ قدرت نے پاپا کو مہلت ہی نہ دی۔" وہ مغموم سا کہہ رہا تھا۔

(حیرت ہے تم جیسے متکبر انسان نے بھی قدرت کی طاقت کو پہچانا) وہ ہلکی سی سانس کھینچ کر رخ موڑ کر قدم اٹھانے لگی کہ وہ بولا۔

"کاش پاپا چند پل اور جی لیتے۔"

"کیا فائدہ ہوتا۔ جن راستوں پر منزل ہی نہ ہو۔ ان راستوں پر چل کر فقط پیر ہی زخمی ہوتے ہیں۔" وہ دھیرے سے بولی۔ بابر نے نہ جانے کیوں بڑی گھائل نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر ایک افسردہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر کر ٹوٹ گئی۔

"ہاں۔ مگر یہ بھی کتنی عجیب بات ہے نا کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی پیر زخمی کرنا اور ان زخموں کی کسک کو دل کو محسوس کرنا بھی کبھی اچھا لگتا ہے۔"

حوریہ کے قدم ذرا سا ٹھٹکے۔ اس نے ڈھلکتے دوپٹے کو پیشانی تک کھینچتے ہوئے ایک ترچھی نگاہ اس پر ڈالی اور چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میں پھپھو کی بات کر رہی ہوں۔"

"مگر میں اپنی بات کر رہا ہوں۔" بابر بلا تامل بولا۔ اس کا لہجہ قطعی تھا۔

"وہ زخم جو آپ کو بینائی دے دیں۔ آپ کو آپ کی ذات کا تعارف کرائیں۔ اس کی شدت احساسات کی لو بڑھا دے۔ وہ زخم بڑے انمول ہوتے ہیں۔"

حوریہ کا دل ایک پل سینے کی دیوار میں کانپ کر رہ گیا دوسرے پل وہ سرعت سے اس حصے سے قدم اٹھاتی چلی گئی۔ بابر اسے جاتا دیکھتا رہا۔ پھر اسی بینچ پر بیٹھ گیا جہاں وہ کچھ دیر پہلے بیٹھی تھی وہ وہیں بیٹھ کر اس کی موجودگی کو محسوس کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

فضا کی نظریں سیاہ چھوٹے سے بدرنگ پرانے سے موبائل پر جمی تھیں وہ نگاہوں کے سامنے اسے جھلاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ جہاں آرا نے اسے یہ دے کر اس کے ساتھ اچھا کیا ہے یا برا۔

اباکی طرف شام کو واپسی پر جہاں آرا نے اس کے ہاتھ میں اس کا پرانا موبائل تھماتے ہوئے کہا۔
"فضا... یہ تمہاری امانت۔"
ایک پل اس کی آنکھیں یوں چمکیں جیسے کسی اجڑے مزار کا بجھتا دیا بجھتے ہوئے ذرا سا لو دے اٹھے۔ مگر دوسرے پل وہ سر جھکا گئی۔
"میں نے چھین لیا تھا ناں تم سے۔ تاکہ تم اس لڑکے سے رابطہ نہ کر سکو۔" جہاں آرا نظریں چراتے ہوئے بولیں۔ "میرے دل میں یہی تھا کہ تمہاری اس امیرزادے سے شادی نہ ہو جائے کہیں۔ اسی لیے میں نے یہ چھین لیا تھا تم سے... پلیز مجھے معاف کر دینا۔"
فضا کا دل چاہا وہ اتنا زور سے قہقہہ لگائے۔ اتنا زور سے...
مگر بس لب بھینچ کر جہاں آرا کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔
"مجھے تو یاد بھی نہیں تھا۔" وہ فقط اتنا ہی کہہ پائی اور گھر لوٹ آئی۔
رات نصیر کے سونے کے بعد چپکے سے وہ موبائل پرس سے نکال لائی۔ مگر اس کے کانٹیکٹ لسٹ میں جاتے ہوئے اس کی انگلیاں کانپ گئیں۔ اس نے موبائل کو یوں دیکھا جیسے وہ کوئی خوش رنگ سانپ ہو۔ ابھی ڈس لے گا۔
"یہ کیا کیا امی آپ نے۔" اس نے ڈھیلے ہاتھ سے موبائل تکیے کے نیچے ڈال دیا۔
"کتنی یادیں دفن تھیں اس میں... اور اب وہ دفن ہی رہنے دینا چاہتی تھی۔ اس نے اپنا موبائل اٹھایا جو نصیر نے اسے دیا تھا۔ بے حد قیمتی نیا نکور... اور کتنی محبت اور معصومیت سے دیتے ہوئے بولا تھا۔
"تم بور ہوتی ہو ناں... اب اسی کھلونے سے کھیلتی رہنا اور اپنی تمام سہیلیوں سے رابطہ کر لیا کرنا خوب باتیں کرنا۔ بوریت دور ہو جائے گی۔" اس نے ذرا سا چہرہ موڑ کر سوئے ہوئے نصیر کو محبت بھری نظروں سے دیکھا۔
کتنا اعتماد کرتا تھا وہ اس پر... کتنا بھروسا تھا اس کی آنکھوں میں۔ جیسے یقین ہی تو تھا کہ وہ بس اسی کی ہے۔ اس کا اعتماد کبھی مجروح کر ہی نہیں سکتی۔
آہ... ہاں کبھی کبھی آپ کے پیروں میں چاہنے والے کا اعتماد ان دیکھی زنجیر ڈال دیتا ہے۔ ایسی زنجیر جس میں بندھ کر ایک آسودگی بھی ہوتی ہے اور کہیں کہیں ہلکی ہلکی چبھن اور کسک بھی... اور فضا کو بھی لگ رہا تھا وہ نصیر کی محبت اور بھروسے کی اس زنجیر میں بندھی آسودہ بھی ہے اور تحفظ بھی محسوس کر رہی تھی۔
"تم جاگ رہی ہو ابھی تک۔" نصیر نے کروٹ لی اور موندی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ چونکی۔
"آں۔ بس یونہی جی متلا رہا تھا۔"
"ارے تو مجھے اٹھا دیتیں۔" وہ جھٹکے سے چادر ہٹا کر اٹھ بیٹھا۔
"نن، نہیں... بس اب بہتر محسوس کر رہی ہوں۔" وہ خفیف سی ہو گئی، پریگننٹ ہوئی تھی جب سے نصیر حد سے زیادہ اس کی پروا کرنے لگا تھا۔
"آپ سو جائیں۔ میں بھی سو رہی ہوں اب۔"
"ہاں... زیادہ دیر جاگنا تمہاری صحت کے لیے اچھا نہیں ہے۔ سونے کی کوشش کرو۔" وہ پچکارتے ہوئے بولا اور تکیہ بغل میں دبا کر کروٹ بدل گیا۔
"ایسا کچھ ہونے لگے تو مجھے جگا دیا کرو۔ اکیلے اٹھ کر باتھ روم میں نہ بھاگنے لگنا۔" وہ فکر مندی سے بولا۔
"جی... بہتر۔" وہ دوسری طرف کروٹ بدل گئی۔

☼ ☼ ☼

عباد گیلانی کے انتقال کو ہفتہ بھر ہو چلا تھا۔ تعزیت کرنے والوں کا سلسلہ بھی تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ حوریہ نے عاظمہ سے گیلانی ہاؤس سے ہمیشہ کے لیے چلے جانے کی بات کی تو عاظمہ بے چین ہو گئیں۔

"یہ کیسی بات کر رہی ہو حوریہ۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر رو پڑیں۔ "تمہارے اور علی شاہ سے تو مجھے بڑا سہارا ہے۔ تم چلی جاؤ گی تو یہ کوٹھی تو بالکل ویران ہو جائے گی۔ علی اور تم سے تو میرا دل بہل جاتا ہے۔۔۔ زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ تم چلی جاؤ گی تو زندگی جیسے رک سی جائے گی۔"

وہ حد سے زیادہ دل گرفتہ اور مضطرب دکھائی دے رہی تھیں۔

حوریہ نرمی اور اپنائیت سے ان کا ہاتھ تھپکنے لگی۔

"زندگی کسی کے جانے سے رک نہیں جاتی آنٹی۔ ہاں پہلے پہل لگتا کچھ ایسا ہی ہے۔ مگر رکتی نہیں ہے اور پھر لائبہ ہے نا۔ وہ آپ کے پاس آتی رہے گی۔ بلکہ آپ بابر کی شادی کر دیں لائبہ سے اور اسے ہمیشہ کے لیے کوٹھی میں لے آئیے۔ کوٹھی میں کچھ رونق ہو جائے گی۔" وہ پورے خلوص سے ان کی تسلی کا معاملہ کر رہی تھی۔ ان کی تنہائی کو دور کرنے کا حل بتا رہی تھی۔ اس سے پہلے عاظمہ کچھ کہتیں کہ دروازے تک آیا بابر۔ یکدم اندر چلا آیا۔

اس کے چہرے پر خطرناک حد تک سنجیدگی بلکہ درشتی بھی تھی۔ حوریہ کے الفاظ تیروں کی طرح اس کے دل میں اتر گئے تھے۔

"ہاں ٹھیک کہا تم نے۔۔۔ زندگی کسی کے جانے سے رک نہیں جاتی ہاں بے رنگ ضرور ہو جاتی ہے۔" وہ حوریہ کے مقابل آکر خاصے استہزائیہ آمیز انداز میں ابرو کو جنبش دے کر بولا۔

"اور اس بے رنگ زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے آپ کسی کا بھی ہاتھ تھام لیں۔ رنگ بھر جائیں گے۔ ہے نا۔۔۔ دل میں نہ سہی کوٹھی میں ہی سہی۔" اس کا لہجہ چبھتا ہوا بھی ہو گیا۔ وہ قدرے اس کی طرف جھکا براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ حوریہ یکدم خفیف سی ہو کر پیچھے ہٹی۔ اسے گمان تک نہ تھا کہ وہ یوں اچانک آجائے گا اور اس کے جملوں پر اس کا رد عمل اس قدر شدید ہو گا۔

"مگر صرف کوٹھی کو ہی کیوں دل کو بھی کیوں نہ آباد کر لیا جائے تمہارا ہاتھ ہمیشہ کے لیے تھام کر۔" ایک لمبے توقف کے بعد وہ اسے گھورتے ہوئے بولا تو حوریہ کو اپنے اعصاب تڑختے محسوس ہوئے۔

"بابر۔۔۔ یو۔" وہ غصے سے اس کی طرف مکمل گھوم گئی۔

"کیوں؟ بہت برا لگا نا۔" بابر تحقیرانہ انداز میں مسکرایا مگر دوسرے پل اس کی مسکراہٹ گم ہو گئی۔ "میں کچھ کہوں تمہیں برا لگے اور تمہیں یہ حق کب سے حاصل ہو گیا کہ تم میری ذات سے کسی کو بھی منسوب کرنے کا مشورہ دیتی پھو ماما کو۔" عاظمہ اس صورت حال پر پریشان دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ بابر کی جانب بڑھیں۔

"یہ تم اس کے ساتھ مس بی ہیو کیوں کر رہے ہو۔ وہ تو بس میری دل جوئی کی خاطر کہہ رہی تھی۔" وہ شاکی نظروں سے بابر کو دیکھنے لگیں ان کے لہجے میں خفگی بھی نمایاں تھی۔

"دل جوئی۔" وہ ہلکے سے سلگتے ہوئے انداز میں ہنسا۔ "آپ کی دل جوئی کے لیے اور اس کوٹھی کی ویرانی دور کرنے کے لیے اس رونق کے لیے میں کسی کا بھی ہاتھ تھام لوں۔"

اوہو بابر تو مچ۔ یہ تو ایک بات کر رہی تھی اور لائبہ کا ہی کہہ رہی تھی کوئی غلط بات نہیں کر رہی تھی۔" عاظمہ نے جھنجلا کر گھرکا۔ حوریہ بابر پر ایک سلگتی نظر ڈال کر عاظمہ کے جہازی سائز بیڈ پر سوئے علی شاہ کو اٹھانے لگی "تم بات کو نگیٹو کیوں لے رہے ہو۔"

"ہاں تو اکس او کے۔ میری شادی سے آپ کی دل جوئی ہو رہی ہے آپ کا دل بہل جائے گا تو پھر یہ کیوں نہیں اس کا ہی ہاتھ کیوں نہ تھام لوں۔ کوٹھی کو ہی کیوں! اپنے دل کو بھی آباد کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔"

"بابر اسٹاپ اٹ۔ کیا بدتمیزی ہے یہ۔" عاظمہ کا بس نہیں چلا وہ اٹھایا ہوا ہاتھ بابر کے چہرے پر جما دیتیں۔
حوریہ جھٹکے سے پلٹی تھی اور بابر کو بے حد خفگی اور رنج سے دیکھا۔ احساس تذلیل سے اس کا چہرہ سرخ انگارہ ہونے لگا۔

"اس میں بدتمیزی کیسی.... میں نے کون سی غلط بات کردی۔ میں بھی آپ کی دل جوئی کی بات کر رہا ہوں۔" وہ ایڑیوں کے بل عاظمہ کی طرف گھوما۔ جو سخت فہمائشی نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہی تھیں پھر سٹپٹا کر حوریہ کو دیکھا جو علی شاہ کو بیڈ پر دوبارہ لٹا کر غصے اور خفگی سے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

بابر کو اپنے اعصاب ایک پل کھنچتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس نے ہلکی سی سانس بھر کر عاظمہ کی طرف دیکھا۔
"تم نے اسے ہرٹ کر دیا بابر۔ اس طرح کی بات کرتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے تھی بدقسمتی سے تم ہر احساس سے عاری انسان ہو۔ تمہیں دوسروں کے جذبات احساسات کا کوئی خیال نہیں ہوتا۔ بس جو دل چاہتا ہے کرتے پھرتے ہو جو دل چاہے منہ سے نکال دو۔" عاظمہ بیڈ کے کنارے سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

"اب تو عباد بھی نہیں رہے۔ جن پر میں سارا غصہ نکال لیا کرتی تھی۔ تمہاری شکایتیں کر دیا کرتی تھی اور وہ تسلی کے دو لفظ تو بول دیا کرتے تھے۔" عاظمہ یکدم آزردہ سی نظر آنے لگیں۔ انہیں حوریہ کا یوں دل برداشتہ ہو کر کمرے سے چلے جانا بے حد دکھی کر گیا تھا۔

"میں نے کوئی ایسی غلط بات نہیں کی ہے نہ شرعاً" قانوناً ناجائز بات کر دی ہے۔ کیا ہمارے دین میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔" بابر کا لہجہ مدافعتی تھا۔

"شریعت دین.... تم دین کی بات کر رہے ہو۔" عاظمہ کاٹ کھانے کو گویا دوڑیں۔ "تمہیں پتا ہے دین کیا ہے کتنا جانتے ہو تم اپنے مذہب کو؟ تہ تمہارے منہ سے شریعت دین کا لفظ ہی اتنا آکورڈ لگتا ہے۔"

وہ طنز کر رہی تھیں یا اپنا غصہ اور خفگی نکال رہی تھیں۔ بابر نے متاسفانہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا پھر ہاتھ میں پکڑی ہوئی گاڑی کی چابی میز پر پھینکی اور چلتا ہوا دیوار گیر صوفے پر گر سا گیا۔

"ضروری تو نہیں، جو مذہب کو کبھی سمجھا نہ ہو وہ کبھی سمجھے گا ہی نہیں۔ جو لا علم ہو وہ علم حاصل کر ہی نہیں سکتا۔"

"بکواس بند کرو۔ تم جانتے ہو ابھی ہم سب کے زخم تازہ ہیں کتنے بڑے سانحے سے گزرے ہیں ہم لوگ۔ اس تکلیف اور غم کا ہی احساس کر لیا ہوتا بابر۔" عاظمہ تنگ سی گئیں۔

"مام۔ پاپا علی شاہ اور حوریہ کو اس کوٹھی میں ہنستا بستا دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ وہ انہیں آباد دیکھنا چاہتے تھے۔"

"تو تم اسے آباد کرنا چاہتے ہو۔" عاظمہ استہزائیہ مسکرائیں۔ بابر نے بلا تامل سر کو اثباتی جنبش دی۔
"باپ کے کندھے کا سہارا مت لو بابر۔" عاظمہ نے اسے باقاعدہ گھورا۔
"یہ کہو یہ خواہش تمہارے اپنے اندر مچل رہی ہے۔ تمہاری نظریں بدل رہی ہیں۔ تم بھٹک رہے ہو.... تم اپنے بھائی کی...."

"مام پلیز۔" بابر یکدم غرایا۔ دوسرے پل اس کے جبڑے باہم سختی سے بھینچ گئے تھے اور رگوں میں دوڑنے والا لہو آنکھوں کی سطح پر اڈنے لگا۔ اس کے ہاتھ کی گرفت غیر محسوس طور پر ہاتھ میں پکڑے اپنے موبائل پر سخت ہو گئی۔ دوسرے پل کڑچ کی آواز آئی اور جیسے اسے اپنی شریانوں میں خون رواں ہوتا محسوس ہوا۔ اس نے پٹختے ہوئے موبائل پر ایک نظر ڈالی اور اسے ایک طرف پھینک کر صوفے سے جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔

"بابر۔" لپک کر عاظمہ اس کے آگے آئیں انہیں اپنے لفظوں کی کاٹ کی شدت کا احساس ہو گیا تھا وہ خفیف

سی ہو کر رہ گئی تھیں۔
"میرا مقصد یہ تھا کہ وہ حازم کو نہیں بھول پائی ہے۔ وہ حازم کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچنا بھی گناہ سمجھتی ہے۔" ان کا انداز مدافعتی تھا بابر نے ایک گہری سانس بھر کر عاظمہ کو فقط ایک نظر دیکھا۔
"وہ بے وقوف ہے مگر آپ تو نہیں۔ اس کے دل و ذہن سے اس احساس کو ختم کرنا آپ کا کام ہے۔" وہ پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔
عاظمہ دم سادھے رہ گئیں پھر اس کی نظریں صوفے پر پڑے اس کے چیختے ہوئے موبائل پر ٹھہر گئیں۔ اور جیسے بابر کے جذبات کی شدت کا احساس انہیں اپنی رگوں میں خون کے ساتھ دوڑتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ ڈھیلے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئیں۔

☆ ☆ ☆

وہ یونہی منہ پر چادر لپیٹے پڑی تھی تخت پر جب رقیہ بھابھی جائے نماز لپیٹ کر اس کے سر پر پہنچ گئیں۔
"آخر تم گیلانی ہاؤس جا کیوں نہیں رہیں۔ علی شاہ کو بھی وہیں چھوڑ آئی ہو۔"
اس نے لب دانتوں پر جکڑ کر رقیہ بھابھی کو دیکھا پھر یونہی مومنہ کی طرف جو ایک طرف بیٹھی کپڑے تہ کر رہی تھی وہ بھی آج اس سے یہی پوچھنا چاہ رہی تھی کہ وہ کل سے آئی ہے اور علی شاہ کے بنا۔
کل تو اس نے بہانہ گھڑ لیا تھا کہ علی شاہ کو عاظمہ اور بابر اپنے ساتھ لے گئے ہیں اس کی کچھ شاپنگ کرنے اور رات کو چھوڑ جائیں گے مگر آج دوسرا دن بھی ڈھلنے لگا تو رقیہ بھابھی سے رہا نہ گیا تھا۔
"اتنے چھوٹے بچے کو چھوڑ کر آنے کی کیا تک ہے۔" وہ تخت سے اٹھنے لگی کہ انہوں نے اس کا بازو تھام لیا۔
"ٹھہرنے آنا تھا تو اسے بھی ساتھ لے آتیں۔"
"میں نہیں جاؤں گی گیلانی ہاؤس کبھی نہیں جاؤں گی وہاں اب....." وہ جیسے پھٹ پڑی۔ "تنگ آگئی ہوں میں خود اپنی زندگی اس بے اختیاری اور اس بے بسی سے۔" رقیہ بھابھی کے ساتھ مومنہ بھی ششدر رہ گئی۔
"مم..... میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ ابھی وہ موت والا گھر ہے اور تم اکیلے آگئیں۔ ان سب کو....." رقیہ بھابھی آہستگی سے کہنے لگیں۔
"اور میں، میں جو روز مر رہی ہوں۔ جی رہی ہوں اپنی لاش اٹھائے گھوم رہی ہوں۔ دکھائی نہیں دیتی آپ کو۔"
"اچھا سکون سے بیٹھو۔ میں پانی لاتی ہوں۔" رقیہ بھابھی سٹپٹا کر پانی لینے دوڑ گئیں۔
وہ سخت منتشر دکھائی دے رہی تھی تخت پر پڑی چادر اٹھا کر فرش پر پھینکی اور دوبارہ تخت کے کنارے بیٹھ گئی۔
مومنہ نے اٹھ کر اس کے نزدیک آکر بیٹھ کر اس کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔
"کل سے ہی میں تمہیں واچ کر رہی ہوں۔ مگر یہ سوچ کر چپ رہی کہ تم شاید سنبھل جاؤ گی جو مسئلہ ہو گا خود ڈسکس کرو گی مگر مجھے لگتا ہے۔ تم بہت زیادہ اپ سیٹ ہو۔" اس نے بے بسی سے لب چباتے ہوئے آنسو پینے کی کوشش کرتے ہوئے سر اٹھایا۔
"میں تھک گئی ہوں حالات سے لڑتے لڑتے پھپھو بہت تھک گئی ہوں۔" اس کی آواز رندھ گئی۔ آنسوؤں کا گولا سا جیسے حلق میں پھنس گیا ہو۔ اس نے مومنہ کے غمگسار کندھے پر سر رکھ دیا۔
"اسی لیے تو کہتی ہوں خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دو۔"
"چھوڑ ہی تو دیا تھا مگر....." اس نے شدت کرب سے لب بھینچ لیے۔
"لو پانی پی لو۔" رقیہ بھابھی پانی کا گلاس تھامے چلی آئیں "میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا۔ مجھے کیا خبر کہ تم اتنی

پریشان ہو گی۔" اس نے رقیہ بھابھی کے ہاتھ سے گلاس تھام لیا اور دھیرے دھیرے گھونٹ بھرنے لگی۔ پھر گلاس دیتے ہوئے ماں کے چہرے پر پھیلی پریشانی اور دکھ پر نادم سی ہو گئی۔

"میں بس کچھ دن رہنا چاہتی ہوں۔ وہ سب علی شاہ کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ وہ بھی ان سے خوش ہے پریشانی کی بات نہیں ہے امی۔" وہ سنبھل کر نظریں چراتے ہوئے بولی۔

مومنہ نے اسے دیکھا۔ اس لمحے انہیں اس پر بہت پیار آیا۔ پھر نرمی سے تھپکنے لگی۔

"چلو۔ جتنا مرضی چاہے رہ لو یہاں۔ علی شاہ بھی آجائے گا۔ فکر کی بات نہیں ہے۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تم کوئی بوجھ ہو ہم پر۔ تمہارے آنے سے تو تمہارے پاپا بھی بڑے خوش ہوتے ہیں اور اباجی بھی۔" رقیہ بھابھی اس کا دل پرچانے لگیں۔ پیار سے اس کا سر سہلایا۔

"تمہارے لیے کچھ اچھا سا کھانا بنواتی ہوں آج۔ کل بھی تم نے ٹھیک سے نہیں کھایا تھا۔" وہ پلٹ گئیں۔ وہ یونہی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ شاید اپنی اس جذباتی حرکت پر افسوس ہو رہا تھا یا دل گرفتگی کا احساس روح کو کاٹ رہا تھا۔ بے بسی کچوکے لگا رہی تھی۔

"میں اب وہاں کبھی نہیں جاؤں گی پھپھو۔ کبھی بھی نہیں۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" وہ چند لمحے توقف کے بعد سر اٹھا کر مومنہ سے بولی۔ اس کا لہجہ اٹل تھا۔

مومنہ نے دل گرفتگی سے اسے دیکھا۔

"پاگل ہو گئی ہو کیا۔ علی شاہ۔۔۔"

"علی شاہ کو وہ میرے پیروں کی زنجیر بنا رہے ہیں۔ مگر میں وہ زنجیر ہی اتار آئی ہوں۔"

"تم دراصل ابھی اس حادثے سے سنبھلی نہیں ہو۔ یہ محض تھکن ہے تمہاری ہمت حالات کا مقابلہ کرنا چاہتی ہو۔ جبکہ میں کہتی ہوں خود کو حالات کے بہتے دھارے پر چھوڑ دو۔"

"چھوڑ ہی تو دیا ہے اور اپنی کل متاع بھی چھوڑ آئی ہوں۔"

"حوریہ۔" مومنہ نے تڑپ کر اسے دیکھا وہ اتنی ٹوٹی اور بکھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی کہ اس کے دل پر چوٹ پڑی۔

"مجھے لگ رہا ہے حازم نہیں تو میرے سر سے چادر کھینچ لی گئی ہے میں تپتی ریت میں کھڑی ہوں۔ خدا کے لیے پھپھو۔ مجھے تھام لیں۔"

وہ یکدم مومنہ کے دونوں ہاتھ اپنے مرتعش ہاتھوں میں تھام کر کسی خوف زدہ بچے کی طرح بے آواز بلکنے لگی۔ مومنہ دکھ کے گہرے احساس کے ساتھ گم صم اسے دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

کہانی ایک ہے لیکن ' جدا ہیں واقعے اپنے
تمہیں محشر اٹھانا ہے ہمیں محشر میں رہنا ہے
تمنا نے ہمیں پایا تغافل ان کو راس آیا
کہ ہر احساس کو امجد کسی پیکر میں رہنا ہے

وہ آفس میں بے دلی سے کام نمٹاتا رہا۔ پھر یکدم گھٹن کا احساس بڑھنے لگا تو وہ آفس کی بلڈنگ سے ہی باہر نکل آیا۔ اس کا رخ پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کے بجائے ڈرائیوے کی جانب تھا وہ ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے دھیرے دھیرے ٹہلنے کے انداز میں چلنے لگا۔ تھوڑا آگے جا کر رک کر ذرا سا سر اٹھا کر دفتر کی خوش نما

بلڈنگ کو دیکھنے لگا اور سوچنے لگا کہ کبھی یہاں عباد گیلانی کروفر سے آتے رہے تھے۔ پھر اس بلڈنگ میں حازم کا کھلکھلاتا ہشاش بشاش وجود تھرکتا رہتا تھا۔ وہ خود تو شاذ و نادر ہی آتا تھا۔ مگر کتنی کم مدت میں سب کچھ بدل گیا تھا۔ کتنی ویرانیاں اتر آئی تھیں۔ ان راستوں پر جیسے روح بھی خالی خالی ہو کر رہ گئی ہو۔ دفعتاً" ایک عجیب سی تلخی اور اداسی نے اس پر غلبہ پالیا اسے اپنی رگوں میں دوڑتا لہو بھی افسردہ سا محسوس ہونے لگا۔ وہ سر جھٹک کر گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔

مسلسل دو دن سے وہ ایک ذہنی آزار سے گزر رہا تھا۔ حوریہ علی شاہ کو گیلانی ہاؤس میں ہی چھوڑ کر یاور ہاؤس جا چکی تھی۔ مگر وہ جانتا تھا یہ اس کا وقتی غصہ یا ضد ہے وہ ایک دن سے زیادہ علی شاہ سے دور نہ رہ سکے گی۔ مگر دوسرا دن بھی گزر گیا۔

ایک عجیب پژمردہ تجربات سے جیسے زندگی دو چار تھی۔ اسے لگ رہا تھا ایک الجھاؤ ہے۔ ایک آزار ہے ایک دکھ کے پیچھے دوسرا صدمہ رقم ہے۔

وہ دانستہ حوریہ کو کوئی دکھ کوئی آزار نہیں دینا چاہتا تھا مگر نادانستگی میں وہ اس کے ہاتھوں ہر بار ہرٹ ہوئی تھی۔ وہ اس کے سامنے ایک بہتر انسان کے روپ میں آنا چاہتا تھا۔ مگر ہر بار وہ پہلے سے بھی زیادہ برا بن کر سامنے آیا تھا۔

اس نے ڈرائیونگ سیٹ کی بیک سے سر ٹکائے ٹکائے لمبی گہری سانسوں کے ساتھ خود کو اس اعصابی کشیدگی سے باہر نکالنے کی کوشش کی پھر ڈھیلے ہاتھوں سے اگنیشن میں چابی ڈال کر گھمادی۔

اسے کہو کہ ہے بہت نامراد شے جنوں
اسے کہو کہ مجھے ہے بہت جنوں اس کا

☼ ☼ ☼

"میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ معاملہ کیسے ہینڈل کروں اس لڑکے نے تو مجھے ٹینشن میں رکھا ہوا ہے۔" عاظمہ برش پٹخنے کے انداز میں ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ کر بال لپیٹتے ہوئے جھنجلاہٹ سے بولیں۔ حوریہ کا یوں علی شاہ کو چھوڑ کر چلے جانے پر وہ متفکر تھیں چاہتے ہوئے بھی وہ یاور ہاؤس فون نہ کر پارہی تھیں نہ حوریہ سے بات کرنے کا یارا تھا۔ بابر نے انہیں مخمصے میں ڈال کر رکھ دیا تھا۔ وہ دو دن سے اسی کشمکش میں تھیں آج لائبہ کے آنے پر ساری بات اس کے سامنے کھول کر رکھ دی۔ اپنے تئیں انہیں کسی غمگسار کی طلب ہورہی تھی۔ وہ چاہ رہی تھیں ان کی یہ الجھن کوئی سلجھادے۔ جبکہ ادھر لائبہ کے لیے بابر کے یہ جذبات کسی شاک سے کم نہ تھے۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ بابر حوریہ کی محبت میں گرفتار ہوگا۔ اس کے دل میں دھواں سے بھرنے لگا۔ آنکھوں میں مرچیں سی لگنے لگیں۔

"مائی فٹ" اس کا دل چاہا اٹھ کر بھاگ جائے مگر مارے باندھے بیٹھی رہی۔

"حوریہ تو خود یہ چاہتی ہے کہ بابر سے تمہاری شادی ہو جائے۔" عاظمہ کہہ رہی تھیں۔ "وہ تمہیں لائک کرتی ہے تمہاری تعریفیں بھی کرتی رہتی ہے مجھ سے۔" جواباً" ایک زہر خند مسکراہٹ لائبہ کے لبوں پر پھیل کر سکڑ گئی۔

"میں نے حازم کی ڈیتھ کی بعد ہی کہا تھا آپ سے آنٹی کہ حوریہ کا کوٹھی سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔ اسے جانے دیں مگر آپ لوگ۔"

"ہاں مگر تب بھی بابر ہی اسے یہاں رکھنے پر بضد تھا وہ تو جانا چاہتی تھی۔"

"اس کا مطلب تو یہی ہے کہ آپ کے ان لاڈلے بیٹے کا دل اپنے بھائی کی بیوی پر پہلے ہی آچکا تھا۔" وہ ہونٹ سکوڑ کر تمسخرانہ انداز میں ہنسی۔

عاظمہ کا چونکنا کچھ غلط بھی نہیں تھا اس نے لائبہ کی طرف دیکھا۔ دوسرے پل لائبہ کے اس جملے کی ان کا دل نفی کرنے لگا۔

"ارے نہیں نہیں... وہ تو علی شاہ کو بہت چاہتا ہے اسی وجہ سے۔ اسے جانے نہیں دے رہا تھا۔" لائبہ ہنوز ہونٹ سکوڑے رہی۔

"آپ بہت بھولی ہیں آنٹی۔ اور آپ کا بیٹا بہت چالاک ہے... آپ کی ناک کے نیچے یہ کھیل ہوتا رہا اور آپ کو پتا ہی نہیں چلا۔" لائبہ کے انداز میں زہر ہی زہر تھا جیسے زہر کا کوئی پیالہ الٹ گیا ہو۔ نفرت سے اس کی آنکھیں سلگ رہی تھیں۔ گیلانی ہاؤس کی بہو بننے کا خواب۔ دھواں کی طرح اٹھتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

"کم آن لائبہ... حوریہ کو تم کیوں انوالو کر رہی ہو۔" عاظمہ ذرا برا مان گئیں۔ بابر کے بارے میں تم کہہ سکتی ہو۔ اس سے کسی بھی قسم کی بے ہودگی کی امید کی جاسکتی ہے مگر حوریہ کی نیچر اس طرح نہیں ہے۔ میں نے بہت کم وقت میں ہی اسے بہت گہرائی تک جان لیا ہے۔ کمال کی لڑکی ہے۔"

لائبہ بدمزاسی ہو کر میز سے چائے کا مگ اٹھا کر دھیرے دھیرے چسکیاں بھرنے لگی۔

"اٹس ٹرو۔ حوریہ کے اندر عجیب سی اٹریکشن ہے۔ مجھے لگتا تھا میں اس سے نفرت کے سوائے کچھ نہیں دے سکوں گی۔ وہ مومنہ کی بھتیجی ہے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ اس سے کوئی نفرت کر ہی نہیں سکتا۔ یقین کرو اس کے چلے جانے سے کوٹھی بھی مجھے کاٹنے کو دوڑتی ہے۔"

"آئی تھنک۔ بابر کے ساتھ ساتھ آپ بھی اس کے عشق میں گرفتار ہو گئی ہیں۔" لائبہ چٹختے ہوئے لہجے میں بولی۔ اس کے لہجے میں تمسخر تھا تپش تھی۔ کھولن تھی۔ مگر عاظمہ نے دھیان نہیں دیا سر کو ہلکے سے اثباتی جنبش دے کر چائے کا مگ اٹھاتے ہوئے بولیں۔

"ایسا ہی لگتا ہے کچھ... "ارے کیا ہوا؟" وہ چونکیں لائبہ یکدم اپنا پرس اٹھا کر صوفے سے اٹھ رہی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"بس اب چلوں گی۔ ماما ویٹ کر رہی ہوں گی۔"

"ارے کوئی ویٹ نہیں کرے گی میں سبینہ کو کال کر دیتی ہوں۔ اسے کہہ دیتی ہوں لائبہ آج میرے پاس ہی رہے گی۔ کیا خیال ہے۔" عاظمہ کے لہجے میں بے چارگی تھی جیسے انہیں اپنی تنہائی کے لیے کسی ساتھی کی طلب ہو رہی ہو... وہ لائبہ کو بصد اصرار روکنا چاہ رہی تھی۔

ادھر لائبہ کا دل چاہا وہ پلٹ کر کہہ دے "حوریہ کی موجودگی میں تو کبھی اس طرح کی آفر نہیں کی۔ آج تنہا ہو جانے کے خوف سے اسے محض استعمال کرنا چاہ رہی ہیں۔" وہ محض سر جھٹک کر رہ گئی۔

"پھر آؤں گی۔ ابھی چلتی ہوں۔" وہ بیگ کی زپ کھول کر اپنا موبائل نکالتے ہوئے یکسر بے کیفیت لہجے میں بولی اور دروازے کی جانب بڑھی۔

"لائبہ۔" عاظمہ نے نرمی سے اسے پکارا وہ رک گئی مگر پلٹی نہیں۔ "تم شاید ہرٹ ہو رہی ہو۔ ہے ناں۔ سوری مجھے شاید تم سے اس میٹر پر ڈسکس نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پتا نہیں کیوں۔" وہ مگ تپائی پر رکھ کر بالوں میں انگلیاں پھنسا کر صوفے کی پشت سے کمر ٹکالی۔

"بابر کی اس احمقانہ ضد نے مجھے اس قدر ڈپریسڈ اور ٹینس کر دیا ہے کہ میں خود کو بالکل الون فیل کر رہی ہوں۔ کچھ سمجھ نہیں آرہی ہے کیا کروں۔"

"آپ ان فیکٹ۔ حوریہ کے جانے سے اپ سیٹ ہوگئی ہیں اس کی کمی محسوس کررہی ہیں۔" لائبہ کے لبوں سے ہلکی سی سانس گرم گرم دھواں کی طرح خارج ہوگئی۔ "آپ خود بھی وہی چاہتی ہیں کہ حوریہ یہیں رہے چاہے کسی بھی حوالے سے۔" وہ ایک سلگتی نظر عاظمہ پر ڈال کر پلٹ کر کھٹ کھٹ ہیل بجاتی چلی گئی۔

عاظمہ اسے روک بھی نہ پائیں۔ اس کے جملے کے سحر میں جکڑی بیٹھی رہ گئیں۔

بابر نے کھلے گیٹ سے اپنی گاڑی پارکنگ لاٹ میں ڈالی تو برابر سے لائبہ کی گاڑی بے حد رش انداز میں پارکنگ سے نکلی۔

اس نے چونک کر بیک مرر سے دیکھا۔ گاڑی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی چوکیدار پھاٹک بند کررہا تھا۔ وہ کندھے اچکا کر رہ گیا اور گاڑی سے اتر کر چابی چوکیدار کی طرف اچھال دی اور ماربل کی چمکتی روش کی جانب بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

"حالات انسان کے اپنے پیدا کردہ نہیں ہوتے' اس لیے وہ ہمارے لیے غیر متوقع ثابت ہوتے ہیں ہمارے اعصاب کو متاثر کرتے ہیں وقتی طور پر ہمارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے۔ مگر جب اعصاب سنبھلتے ہیں تو سوچنے سمجھنے کا عمل شروع ہوتا ہے تب انسان نفع نقصان کے بارے میں اندازہ لگاتا ہے۔ اور تم جو کرنے چلی ہو وہ سراسر نقصان دہ سودا ہے۔ اولاد کل متاع ہے تمہاری۔ اس کا نقصان معمولی نہیں ہوتا۔" یاور علی اس کے سر کو تھپکتے ہوئے افسردگی سے کہہ رہے تھے۔ وہ سر جھکائے خفگی سمیٹے بیٹھی تھی۔ اس کا دل غم سے بھاری ہو رہا تھا۔

عادل بھائی کرسی سے اٹھے اور ٹہلنے لگے۔ پھر اس کے نزدیک رک کر نرمی سے بولے۔

"اباجی ٹھیک کہہ رہے ہیں حوریہ۔ تم جذباتی ہو رہی ہو۔ اپنی اولاد سے کون دستبردار ہوتا ہے۔"

جواباً" اس نے بھیگی پلکیں جھپک کر عادل بھائی کی طرف دیکھا اور کرسی سے اٹھ گئی۔

"آپ سب ٹھیک ہیں اپنی جگہ۔ میں ہی غلط ہوں۔ میرے اندر ہی برداشت نہیں رہی۔" وہ خفگی سے پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔ عادل بھائی اس کے پیچھے جانے لگے کہ مومنہ نے انہیں روک دیا۔

"میں دیکھتی ہوں۔" وہ کمرے سے باہر آگئی۔ وہ لائی کے صوفے پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ مومنہ نے اس کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھا تو اس نے ڈبڈبائی نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"میں جانتی ہوں۔ آدمی پر جب گزرتی ہے تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج ہوجاتی ہیں اسی طرح بددلی' بے زاری اور منفی سوچیں اسے چاروں طرف سے جکڑ لیتی ہیں۔ ہوا تھا میرے ساتھ بھی یہی کچھ۔ مگر وہ فقط لمحے ہوتے ہیں' کمزور لمحے۔" چلو آؤ۔ روم میں چلو۔" مومنہ اسے تھام کر کمرے میں لے آئی۔ وہ نڈھال سی بیڈ پر بیٹھ گئی۔

اس کے چہرے پر پہلے سے زیادہ غمزدگی دکھائی دے رہی تھی۔ مومنہ جانتی تھی یہ علی شاہ سے جدائی کی اذیت ہے جو وہ اندر ہی اندر سہہ رہی تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی یاور ہاؤس آئی تھی۔ مگر اتنی ملول' افسردہ اور ٹوٹی ہوئی دکھائی نہ دی تھی اس لیے کہ اس کے سینے سے علی شاہ کا وجود چمٹا ہوا تھا۔

"جانتی ہو۔ جدائی عفریت ہے۔ خون چوسنے والی عفریت۔ عمر بھر رلاتی ہے۔ مرنے والوں پر تو صبر آجاتا ہے مگر جو زندہ ہوں۔ ہم سے جدا کردیے گئے ہوں۔ ان پر نہیں آتا یہ غم دل کو چھید دیتا ہے' رگ رگ کو کاٹ دیتا ہے۔" وہ مومنہ کی گود میں سر رکھ کر لیٹی تھی۔ مومنہ کی انگلیاں اس کے بالوں کو سہلانے لگیں۔

"میں رہ لوں گی... اس کے بغیر رہنا سیکھ لوں گی۔ آخر آپ نے بھی تو زندگی گزار دی نا... حازم کے بنا... اس اذیت کو سہتے ہوئے۔"

"زندگی گزار چکی ہوں اسی لیے تو تمہیں نہیں گزارنے دوں گی پل پل تمہیں مرتا ہوا دیکھوں گی کیا۔"

وہ کروٹ بدل کر چت لیٹ گئی اور مومنہ کی طرف دیکھنے لگی۔

"آپ کو لگتا ہے میں اب بھی زندہ ہوں۔" وہ مجروح انداز میں مسکرائی۔

"اولاد ایسی قوت ہے، جو عورت کو مرنے نہیں دیتی۔ لاکھ تکلیفوں سے گزر جائے مگر تھکنے نہیں دیتی۔ تھک تو وہ اس وقت جاتی ہے جب۔ یہ قوت چھین لی جائے اس سے۔" مومنہ کی آنکھوں میں ایک پل کے لیے ہزار محرومیاں چیخنے لگیں۔ اس کی بھوری آنکھوں کے پار۔ اپنا ماضی کروٹیں لینے لگا تھا۔

"عورت اولاد کے لیے تو ہر محاذ پر ڈٹ جاتی ہے اور تم، تم اتنی جلدی ہمت ہار گئی ہو حوریہ۔" حوریہ اضطراری انداز میں لب کاٹنے لگی۔

"ہاں میں ٹوٹ چکی ہوں۔ ہار گئی ہوں نہیں کر سکتی میں حالات کا مقابلہ۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "میں جس ذہنی آزار سے گزر رہی ہوں اس کا اندازہ کسی کو بھی نہیں ہے۔" وہ بیڈ کراؤن سے لگ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں کے کانچ پر آنسو کرسٹل کی طرح چمک رہے تھے۔

"دراصل پے در پے اموات دیکھنا تمہارے لیے صبر آزما ثابت ہوئی ہے۔ مگر حوریہ... زندگی روتے ہوئے بھی گزرے گی اور صبر و استقامت کے ساتھ۔ فیس کرتے ہوئے بھی اور جب ہمیں ان حالات سے گزرنا ہی ہے تو پھر خوف سے سہم کر کیوں اللہ کے بھروسے پر ڈٹ کر مقابلہ کرو۔"

"کس کا مقابلہ کروں۔ بابر گیلانی کا۔ اس کے جذبات کے بہتے دھاروں کا رخ کیسے موڑوں۔ اتنی طاقت نہیں ہے مجھ میں۔" وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔ مومنہ دم بخود رہ گئی۔

"کیا مطلب۔" حیرت آمیز لمحے گزر جانے کے بعد خود کو سنبھالنے کے عمل سے گزرنے کے بعد اتنا ہی بول پائی تھی۔

"ہاں... میرے پاس بس یہی فرار کا راستہ تھا۔ جس میں اپنے پندار کو بچا سکتی تھی۔" اس نے نظریں جھکالیں۔ اور یکدم رو پڑی۔ مومنہ کے لیے یہ کسی دھچکے سے کم نہیں تھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم حوریہ۔ بابر کا کسی قسم کا پریشر ہے تم پر۔" حوریہ نے غم زدہ سی سانس کھینچ کر مومنہ کی طرف دیکھا اور نظریں جھکالیں۔

"کیا... اس نے کوئی نازیبا حرکت کی ہے۔" مومنہ کی آواز کانپ گئی۔

"نہیں۔" اس نے رخسار کو ہتھیلی سے پونچھتے ہوئے سر نفی میں ہلایا۔ پھر آنکھیں ایک پل بند کر کے کھولیں۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ کہاں سے شروع کرے۔

"مجھے بتاؤ۔ حوریہ پلیز اصل مسئلہ کیا ہے۔" مومنہ کے لہجے میں وحشت برس رہی تھی۔ حوریہ نے دھیرے دھیرے انہیں بتانا شروع کر دیا۔

☼ ☼ ☼

انا کے قید سے نکلے مقابلہ تو کرے
وہ میرا ساتھ نبھانے کا حوصلہ تو کرے
کبھی نہ ٹوٹنے والا حصار بن جاؤں

وہ میری ذات میں رہنے کا فیصلہ تو کرے

وہ اپنے بیڈ پر آڑھا ترچھا لیٹا تھا۔ علی شاہ بیڈ پر ہی اپنے کھلونوں سے کھیلنے میں مصروف تھا۔ کبھی کبھی کوئی کھلونا اٹھا کر اپنے چھوٹے ہاتھوں سے اٹھا کر بابر کی طرف بڑھاتا اور اپنی زبان میں بولنے کی کوشش کرتا۔ بابر اپنے خیالات میں گم بے دھیانی سے کھلونا تھام لیتا ساتھ میں اس کا ننھا منا گداز ہاتھ کو چوم لیتا۔ پھر اپنی سوچ میں گم ہو جاتا۔

"کیا فائدہ جن راستوں پر منزل ہی نہ آتی ہو۔ ان راستوں پر چلنے سے فقط پیر ہی زخمی ہوتے ہیں۔" حوریہ کی آواز کی بازگشت اسے سنائی دینے لگی پھر اچانک ہر منظر پر جیسے حوریہ کی آبگینوں جیسی شفاف آنکھیں ابھر آئیں۔

بھیگی متورم متوحش نظریں۔

اس کے جملوں پر غصے سے گلابی ہو جانے والا چہرہ۔

پھر سارے منظر کسی فلم کی طرح اس کی نگاہوں میں پھرنے لگے۔

جب پہلی بار اسے فضا کے ساتھ کیفے میں دیکھا تھا اور اس کا تصور غلط ثابت ہوا تھا۔ وہ فضا سے یکسر مختلف ثابت ہوئی تھی۔ اس کے لیے کوئی آزمائش بن کر۔

پھر اس کی نازیبا آفر اس کا وہ کرارا تھپڑ۔۔۔ جس نے اسے ایک منتقم شخص بنا ڈالا تھا۔ ذلت کا احساس ایک عرصے تک روح سے چمٹا رہا۔ پھر جب وہ حازم کی منکوحہ کے روپ میں اس کے سامنے آئی۔

خوف زدہ ہرنی کی طرح جو اپنی ساری چوکڑی طراری بھول جائے۔۔۔ اسے بھی وہ اس لمحے ایسی ہی بدحواس ہرنی لگی تھی جب گیلانی ہاؤس میں اس کے داخل ہونے پر اس نے اسے بوکے پیش کیا تھا اور وہ وحشت زدہ سی ہو کر چکرا گئی تھی۔۔۔ اس لمحے کو اس نے بڑی بے رحمی سے انجوائے کیا تھا۔

"پھر گاہے بگاہے اس کا سامنا۔ کبھی اس کی وحشت، کبھی نفرت اور کبھی بے زاری کا سامنا ہوتا رہا تھا۔ وہ ہر لمحے سے حظ اٹھاتا تھا۔ اس کا جلنا کڑھنا۔ اس کا متوحش ہونا۔ اس کی بے زاری۔۔۔ اس کی نفرت۔۔۔ اسے سب اچھا لگتا تھا۔

پھر حازم کی موت کا دھچکا۔ جو اس کے دل کی دنیا کو بھی تہہ و بالا کر گیا تھا۔ اس کا پہننا اوڑھنا۔ بننا سنورنا۔ گزرے دنوں کی باتیں ہو کر رہ گیا۔ بس سفید یا کبھی سیاہ چادر میں وہ سمٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ ایک سہاگن سے ایک بیوہ کے روپ میں اس کی نگاہوں کے سامنے جب بھی آتی ایک بے نام اذیت اس کے دل کو کاٹ جاتی تھی۔ اس کا رونا۔ افسردہ ہونا۔ اس کا آئی سولیٹ ہو جانا۔ اس کے دل کو تسکین نہیں بلکہ بے قراری بخشنے لگا تھا۔

وہ یکدم گھبرا کر بیٹھ گیا۔ پھر سگریٹ سلگا کر دھیرے دھیرے کش لگاتے ہوئے یہ سوچ کر حیران ہونے لگا کہ۔۔۔ ہر منظر اس کے دل کے گوشے میں لاشعوری طور پر نقش تھا۔ اس کا ہر انداز۔ ہر روپ تصور کے پردے پر یوں چمکتا دکھائی دے رہا تھا جیسے سینما میں اندھیرا ہوتے ہی پردے پر موجود تصویریں زندگی میں ڈھل کر متحرک ہو جاتی ہیں۔۔۔ اس نے ایک ہلکی سی سانس لی۔ اور علی شاہ کی طرف متوجہ ہوا تو اسے بیٹھے بیٹھے اونگھتا دیکھ کر جلدی سے ادھ جلی سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دی اور اسے احتیاط سے گود میں بھر لیا اور خود چت لیٹ گیا اور اسے اپنے سینے پر لٹانے لگا۔ وہ ذرا سا کسمسایا۔ پھر اس کے کشادہ سینے پر بے حد اطمینان سے ننھے ننھے ہاتھ پھیلا کر سو گیا۔ بابر دھیرے دھیرے اسے تھپکنے لگا۔ اس کے بال سہلانے لگا۔ اور خود بھی آنکھیں موند لیں۔

اداس موسم کے رتجگوں میں

ہر ایک لمحہ بکھر گیا ہے
پھر ایسے موسم میں کون آئے

کوئی تو جائے
تیرے نگر کی مسافتوں کو سمیٹ لائے
تیری گلی میں ہماری سوچیں بکھیر آئے
تجھے بتائے کہ کون کیسے
اچھالتا ہے وفا کے موتی تمہاری جانب
کوئی تو جائے میری زبان میں
مجھے بلائے، تجھے منائے
تو اپنے دل کو بھی چین آئے

☼ ☼ ☼

مومنہ خالی خالی نظروں سے حوریہ کو دیکھ رہی تھی بولنے کو جیسے کوئی الفاظ نہ تھے۔
کبھی کبھی باتیں واضح ہو کر بھی اس قدر مبہم ہو جاتی ہیں انسان خامشی کی چادر میں چھپنا چاہتا ہے۔
مومنہ کے وجود پر بھی ایسی ہی گمبھیر خامشی چھا گئی تھی جیسے ہوا سے محروم چاند پر اترتی ہو گی۔ جیسے ریل گزر جانے کے بعد اسٹیشن پر پھیل جاتی ہے ویران، گمبھیر، وحشت ناک اور دل دہلانے والی خامشی۔
حوریہ نے لب دانتوں میں دبا کر پلکیں جھپکیں۔ جیسے ان میں اترتی نمی کو جھٹکنے کی کوشش کی ہو۔ پھر مومنہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے آہستگی سے ہٹا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔
مومنہ چاہتے ہوئے بھی اس کے پیچھے نہ جا سکی۔ بس چپ کی دہکتی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

کچن اور آپ

اس ماہ میمونہ عارفہ نواب شاہ کو "کچن اور آپ" میں انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے ' ادارے کی طرف سے میمونہ عارفہ کو تین ماہ کے لیے "ماہنامہ کرن" مفت دیا جا رہا ہے۔

بات تو بہت معمولی سی تھی مگر وہ اتنا بڑھ کیسے گئی یہ ثنا کی سمجھ میں نہ آیا! ابھی دو دن پہلے کی تو بات ہے جب ہفتہ والے دن جاذبہ آپا میکے آئیں عین اس وقت جب وہ اپنا سامان لیے اندر داخل ہو رہی تھیں بھابھی بڑی تیزی سے گیٹ کھول کر باہر نکلیں غالباً" وہ بھی میکے ہی جا رہی تھیں اب اللہ بہتر جانتا ہے انہوں نے واقعی جاذبہ آپا کو نہیں دیکھا یا جان بوجھ کر نظر انداز کیا جو بھی تھا آپا نے جتنی دیر میں ٹیکسی والے کو پیسے دے کر فارغ کیا اتنی دیر میں بھابھی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر یہ جا اور وہ جا نہ پوچھا جاذبہ "تم کیسی ہو؟" اور نہ ہی کہا کہ میرا انتظار کرنا میں جلد ہی واپس آجاؤں گی۔ ورنہ عام طور پر ایسا ہوتا نہ تھا۔ وہ تو ہمیشہ جاذبہ سے بہت محبت

نفیسہ سعید

رائی کا پہاڑ

ے ملتی تھیں۔ آج جو ذرا سی کوتاہی سرزد ہوئی مانو جاذبہ آپا کا تو دم ہی لبوں پر آ گیا وہ تیز تیز سیڑھیاں چڑھتی اوپر آئیں ثناء کے سلام کو قطعی نظرانداز کرتیں کچن میں مصروف امی کے سر پر جا پہنچیں۔

"امی یہ مائرہ بھابھی کو کیا ہوا ہے؟ مجھ سے ناراض ہیں؟"

امی نے پلٹ کر ہانپتی بیٹی کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔

"ایسا کیا کر دیا مائرہ نے جو تم ماں کو بھی سلام دعا کرنا بھول بھال گئیں۔"

"سوری امی! السلام علیکم دراصل بھابھی ابھی کہیں جا رہی تھیں جب میری ان سے گیٹ پر ملاقات ہوئی بہت تیزی میں تھیں بنا میری طرف دیکھے گاڑی میں بیٹھ یہ جا اور وہ جا۔" یہ بھی نہ دیکھا کہ نند پورے دو ماہ بعد گھر آئی ہے کم از کم اس کی خیریت ہی دریافت کر لیتیں۔"

ثناء کو اب پتا چلا کہ وہ پریشانی جو آپا کے چہرے پر چھائی نظر آ رہی ہے اس کے پس پردہ کیا حقائق ہیں۔

"جلدی میں ہو گی نہیں دیکھا ہو گا تمہیں!" امی نے معاملہ رفع دفع کرتے ہوئے سرسری سے انداز میں جواب دیا۔

"واہ! ایسا کیسے ہو سکتا ہے آپ کے پاس سے کوئی اپنا گزر جائے اور آپ کو دکھائی بھی نہ دے اور وہ بھی گھر کے دروازے پر، میں نہیں مانتی اصل میں بھابھی نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی ہے، ہم بھی بھرے سسرال میں رہتے ہیں مجال ہے جو کسی نند کے آنے پر یوں نظریں چرائے غائب ہو جائیں۔" جاذبہ کے دل میں بھابھی کے خلاف بدگمانی پوری طرح اپنے ڈیرے ڈال چکی تھی جس کا اندازہ اس کی گفتگو سن کر بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔

"دیکھو بیٹا' بلا سبب بدگمانی کو دل میں جگہ نہ دو یہ محبتوں کے درمیان فاصلے پیدا کرتی ہے۔ مائرہ آ جائے تو اس سے پوچھ لینا ویسے بھی کل سے اس کی امی کی طبیعت خراب ہے بلڈ پریشر کنٹرول نہیں ہو رہا ہو سکتا ہے اسی پریشانی میں تمہیں نہ دیکھا ہو۔"

"کمال ہے ماں کی پریشانی میں بھی بھابھی کے چہرے پر ترو تازہ میک اپ جگمگا رہا تھا۔"

جاذبہ بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے ہٹ گئی جبکہ وہ یہ بھول چکی تھی کہ اس سارے قصہ میں اس نے خود بھی ثناء کو بری طرح نظرانداز کر دیا تھا یہاں تک کہ ثناء کے سلام کا جواب دینے کی بھی زحمت گوارہ نہ کی اب اگر ثناء بھی اس مسئلہ کو لے کر فساد کھڑا کر دیتی تو بات جانے کہاں پہنچتی ویسے بھی ثناء کو اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کا برا ماننے کی عادت نہ تھی اور اس کی یہ عادت جاذب کو بہت پسند تھی جس کا وہ اکثر سب کے سامنے ذکر بھی کرتا۔

☼ ☼ ☼

جاذبہ نے رات تک بڑا انتظار کیا' کئی بار اوپر جا کر بھابھی کا دروازہ بھی دیکھ آئی وہ بند تھا اس کی بھابھی سے تو ملاقات نہ ہوئی البتہ ان سے ملنے کے لیے جاوید بھائی ضرور آئے انہیں ویسے بھی اپنی اکلوتی بہن سے خاصی انسیت تھی جس کے لیے نیچے آتے ہوئے وہ آم اور آئسکریم کا پیکٹ بھی اپنے ساتھ لے آئے۔

"بھابھی گھر واپس نہیں آئیں!" آئسکریم فریج میں رکھتے ہوئے اس نے جاوید بھائی کی جانب دیکھا جو امی سے باتوں میں مصروف تھے۔

"ابھی تک تو نہیں آئی کیوں تمہاری آج ملاقات نہیں ہوئی۔"

"ملاقات تو خیر نہیں ہوئی البتہ بیرونی گیٹ پر ٹکراؤ ضرور ہوا تھا اور اس ٹکراؤ میں بھی وہ مجھے ایسے نظرانداز کر کے نکلیں کہ جیسے جانتی بھی نہ ہوں۔"

"دیکھا نہیں ہو گا ورنہ مائرہ ایسی نہیں ہے۔" امی نے جلدی سے دخل اندازی کی تاکہ جاذبہ کوئی غلط بات نہ کر دے۔

"خیر' دیکھا تو تھا مگر مجھے ایسا لگا' جیسے بھابھی کسی بات پر مجھ سے ناراض ہیں ورنہ عام طور پر وہ ایسا نہیں کرتیں۔"

بھائی کو سامنے دیکھ کر جاذبہ کے دل کا شکوہ لبوں تک آ ہی گیا اور مانو جیسے یہ قیامت ہو گئی جاوید بھائی نے

فوراً" جیب سے فون نکال کر بھابھی کا نمبر ملالیا ان کے
ماتھے پر پڑی تیوریاں ظاہر کر رہی تھیں بیوی کا بہن کو
نظر انداز کرنا انہیں بھی پسند نہیں آیا۔ ثناء نے دیکھا
جاوید بھائی کے دو، تین بار نمبر ملانے کے باوجود شاید
دوسری طرف مائرہ بھابھی نے فون نہیں اٹھایا جس کے
دو ہی مطلب ہو سکتے تھے یا تو وہ کہیں بری طرح
مصروف تھیں یا پھر فی الحال ان کا موڈ جاوید بھائی سے
بات کرنے کا بھی نہیں تھا۔ کیونکہ اتنے سالوں میں ثناء
کا یہ تجربہ رہا تھا کہ جب بھابھی کا موڈ آف ہوتا یا وہ جاوید
بھائی سے بات نہ کرنا چاہتیں تو لاکھ بیل بجنے پر بھی فون
ریسیو نہ کرتیں۔ چونکہ وہ ثناء کے سامنے اکثر ایسا کر
چکی تھیں اس لیے ثناء ان کی ڈھکی چھپی ساری عادتوں
سے بخوبی واقف تھی اور اس وقت تو اس نے دل ہی
دل میں شکر ادا کیا کہ بھائی کا رابطہ بھابھی سے نہ ہو سکا
ورنہ شاید یہ چھوٹی سی بات دونوں میاں بیوی کے
درمیان کھٹ پٹ کی وجہ بن جاتی۔

لیکن ثناء کا یہ اندازہ سو فیصد غلط تھا کہ اگر بھابھی
نے فون ریسیو نہیں کیا تو مسئلہ حل ہو گیا بلکہ اصل
مسئلہ تو شاید شروع بھی اب ہوا تھا جس کا علم امی اور
ثناء کو اگلے دو دنوں میں ہو گیا اور وہ دونوں صرف یہ ہی
سوچتی رہیں کہ آخر اتنی سی بات کو اتنا بڑھانے میں
غلطی کس کی تھی مائرہ بھابھی یا جاذبہ آپا کی یا پھر جاوید
بھائی کی جنہوں نے جاذبہ کی چھوٹی سی شکایت پر بجائے
اسے سمجھانے کے بلاوجہ ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ ورنہ
عام طور پر تو انہوں نے غلط بات پر بھی بھابھی کی حمایت
ہی کی تھی مگر شاید رب نواز والے قصہ کے بعد ان میں
کچھ تبدیلی رونما ہو گئی تھی جس کا عملی مظاہرہ ثناء کو بھی
نظر آ ہی گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

جاذبہ صبح ہی اپنے گھر واپس گئی تھی اپنے دو دن کے
قیام میں اسے سوائے بڑی بھابھی کے بدلتے رویہ کے
کوئی دکھ نہ تھا وہ مسلسل شاکی تھی کہ بھابھی نے اس
سے بات کیوں نہ کی؟ جبکہ بھابھی اور جاذبہ کے درمیان
اچھی خاصی دوستی تھی مگر اب اس بات کا بھی کیا کیا
جائے کہ اس سارے شکوہ شکایت میں اس کی اپنی انا
بھی مسلسل سر اٹھائے کھڑی تھی لاکھ امی نے سمجھایا
کہ تم خود فون کر کے اس کی امی کی خیریت دریافت کر لو
اس طرح جو غلط فہمی تم دونوں کے درمیان پیدا ہوئی
ہے وہ خود بخود دور ہو جائے گی مگر جاذبہ نہ مانیں اور اسی
طرح دل میں بدگمانی لیے گھر واپس چلی گئی جبکہ اسی
رات مائرہ بھابھی بھی گھر واپس آ گئیں جن کی آمد کا علم
اوپر ہونے والے برتنوں کی اٹھا پٹخ سے ہوا ضرور مگر
چونکہ رات زیادہ ہو گئی تھی اس لیے ثناء نے سوچا وہ
صبح ہی اوپر جائے گی تاکہ آنٹی کی خیریت دریافت کر سکے
مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی ابھی امی اور ثناء ناشتے سے
ہی فارغ ہوئی تھیں جب بیرونی دروازہ کھول کر بڑی
تیزی سے کوئی اندر داخل ہوا ثناء نے پلٹ کر دیکھا وہ
بڑی بھابھی تھیں بنا پاؤں میں چپل اور دوپٹا کے اسے
محسوس ہوا شاید وہ رو کر آئی ہیں۔

"الٰہی خیر آنٹی کی طبیعت ٹھیک ہو۔" ان کا حلیہ
دیکھتے ہی ثناء کے دل سے بے اختیار یہ ہی دعا نکلی۔

"جاذبہ کہاں ہے؟" بھابھی کا یہ سوال اس وقت اتنا
غیر متوقع تھا کہ امی اور ثناء دونوں بیک وقت چونک
اٹھیں۔

"وہ تو رات ہی واپس چلی گئی تھی۔" امی نے ثناء کی
جانب دیکھتے ہوئے بھابھی کو جواب دیا۔

"ایک بات بتائیں امی! میں نے ایسی کون سی جاذبہ کی
بے عزتی کر دی جو وہ اپنے بھائی سے میری چغلیاں لگا
گئی۔ میں بھی نند ہوں اور ابھی اپنے میکے سے واپس
آئی ہوں مجال ہے جو ہم بہنوں میں کسی کی یہ عادت ہو
بلاوجہ بھائیوں کے کانوں میں گھس کر بھابھیوں کی
برائیاں کرنا رسوں مجھے بھی اچھا نہیں لگا تھا جب جاذبہ
بنا سلام دعا کے ٹیکسی والے سے ایسے مصروف تھی
جیسے مجھے دیکھا بھی نہ ہو مگر میں نے تو کوئی واویلا نہیں
کیا۔ یہاں تو الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے ماتھے پر تیوریاں
خود کے پڑی تھیں اور بدنام زمانے بھر میں بھابھی کو کر
دیا۔ واہ مولا تیری شان! پوچھیں فون کر کے جاذبہ سے

کیا اس نے مجھے سلام کیا تھا جس کا میں نے جواب نہ دیا ہو وہ تو ایسے تھی جیسے مجھے جانتی ہی نہ ہو تو پھر میں کیوں اس سے بات کرتی۔"

غصہ میں بولتی بڑی بھابھی کی باتیں سن کر ثناء اندازہ لگا چکی تھی کہ دونوں طرف ہی غلط فہمی نے دل میں بدگمانی پیدا کر دی تھی جس نے بڑھ کر رائی کا پہاڑ بنا دیا تھا اب اس پہاڑ کو دوبارہ رائی میں تبدیل کرنا ناممکن نہ سہی مشکل ضرور تھا۔

"اے بیٹا! چھری تلے دم تو لو جب سے آئی ہو مسلسل بولے ہی جا رہی ہو تم نے سر دکھا دیا میرا۔"

بڑی بھابھی کو مسلسل بولتا دیکھ کر بالاخر امی تنگ آتے ہوئے بولیں۔ پچھلے دو دن سے یہ ہی رام کتھا وہ مسلسل جاذبہ سے سن رہی تھیں اب چہرے کی تبدیلی کے ساتھ وہ ہی کہانی لے کر مائرہ نیچے آگئی تھی آخر وہ تنگ نہ آتیں تو کیا کرتیں۔

"آپ پوچھیں جاذبہ سے کیا کہا ہے انہوں نے جاوید کو' وہ رات سے مسلسل مجھ سے لڑ رہے ہیں۔"

"اے بیٹا! پچھلے بارہ سال سے تم اس گھر میں ہو اور اتنا تو اب میں بھی جان گئی ہوں کہ میرے بیٹے میں اتنا دم خم نہیں کہ وہ تم سے لڑ سکے' ہاں البتہ کچھ پوچھنے کا خطاوار ضرور ہوا ہو گا جس کی سزا کے طور پر اب تم یہاں کھڑی اتنا واویلا کر رہی ہو اور بہتر ہو گا کہ اس معاملے میں تم اور جاذبہ مجھے علیحدہ ہی رکھو تمہارے پاس اس کا فون نمبر ہے فون کرو اور جو کہنا ہے کہہ ڈالو کوئی نہیں روکے گا۔"

ٹھنڈی ٹھار چائے کا کپ واپس ٹرے میں پٹختے ہوئے امی نے غصہ میں مائرہ کو خوب باتیں سنا ڈالیں جس کے بعد وہ وہاں رکی نہیں اور جس رفتار سے آئی تھی اسی رفتار سے واپس اوپر جانے والی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

رمضان شروع ہو گئے تھے جاذبہ کے بچوں کے امتحانات چل رہے تھے اس لیے وہ کافی عرصے سے نہ آئی تھی اور نہ ہی امی یا ثناء میں سے کسی نے اسے یا بھابھی کو کریدا لیکن یہ علم تھا کہ دونوں کی بات چیت آپس میں قطعی طور پر بند ہے ثناء نے کئی بار امی سے کہا کہ وہ ان دونوں کو ایک ساتھ بٹھائیں اور کوشش کریں کہ دونوں کی آپس میں صلح ہو جائے مگر اس بار امی بھی اکڑی ہوئی تھیں ان کا کہنا تھا کہ بچوں کی طرح بنا کسی وجہ کے آپس میں لڑی ہیں تو صلح بھی خود کریں اور ثناء کو فکر تھی عید کی کہ اگر اس وقت تک دونوں خواتین آپس میں اس طرح بگڑی رہیں تو سمجھو عید کا تو مزا ہی خراب ہو جائے گا۔ اسی فکر میں رمضان کا دوسرا عشرہ شروع ہو گیا پندرہ روزے والے دن بھابھی کے گھر افطار کا اہتمام تھا جس میں پورا خاندان مدعو تھا مگر شاید انہوں نے جاذبہ آپا کو نہ بلایا تھا اور پہلی بار ایسا ہوا کہ امی نے نہ بھابھی سے پوچھا اور نہ ہی جاذبہ کو' ان کا کہنا تھا کہ دونوں کو آپس میں ملنا ہے تو ملیں کوئی زبردستی نہیں۔ حالانکہ ثناء جانتی تھی کہ امی کو اس بات کا بہت دکھ ہو گا جب سارا خاندان جمع ہو گا اور جاذبہ نہ ہو مگر اپنے اس دکھ اور تکلیف کا احساس وہ اپنی زبان سے نہیں کر رہی تھیں یہ ہی وجہ تھی کہ ثناء نے بھی بھابھی سے جاذبہ کے متعلق کوئی سوال نہ کیا۔ بالاخر پندرہ رمضان آگیا بھابھی رات سے ہی افطار کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ جتنی مدد ثناء ان کی کر سکتی تھی کر آئی تھی اب وہ بھی نیچے آکر جلدی جلدی تیار ہو رہی تھی۔ جاذب پچھلے ایک ہفتہ سے آفس کے کام کے سلسلے میں لاہور گیا ہوا تھا لہٰذا گھر میں صرف وہ اور امی ہی تھیں مکمل طور پر تیار ہو کر اس نے اچھی طرح اپنا جائزہ لیا اور کمرہ بند کر کے باہر نکلی تو دیکھا امی سامنے لاؤنج کے تخت پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی ہیں۔

"آجائیں امی مغرب ہونے والی ہے۔"

"تم جاؤ میں نیچے ہی افطار کروں گی دو کھجور اور دودھ کا ایک گلاس دے دو۔"

"ارے کیوں! آپ نے اوپر بھابھی کے گھر نہیں جانا؟" امی کے غیر متوقع جواب نے ثناء کو حیران کر دیا۔

"نہیں میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" تکیہ

درست کر کے وہیں لیٹ گئیں انہیں دیکھ کر ثناء اندازہ
لگا چکی تھی کہ اب کچھ کہنا بے کار ہے امی نے اوپر نہ
جانے کا فیصلہ کرلیا ہے تو انہیں اس فیصلے سے کوئی بھی
نہیں ہلا سکتا۔ یہ سب سوچ کر اس نے جلدی جلدی
امی کی افطاری کا سامان نکال کر ایک ٹرے میں رکھا اور
اسے امی کے پاس تخت پر رکھا ہی تھا کہ بیرونی دروازہ
کھول کر کوئی اندر داخل ہوا ثناء نے دیکھا خوب بنی
سنوری بڑی بھابھی سامنے ہی کھڑی تھیں' لال رنگ
کے لان کے سوٹ کے ساتھ ہم رنگ لپ اسٹک اور
چوڑیاں' جنہوں نے ان کی تیاری میں خوب چار چاند لگا
دیے تھے۔

"ارے یہ کیا امی آپ اوپر نہیں آرہیں۔" اندر
داخل ہوتے ہی ان کی پہلی نظر امی کے سامنے رکھے
ٹرے پر پڑی تو حیرانی سے پوچھ بیٹھیں

"امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" ثناء نے امی کے
پاس سوئی ہوئی پری کو اٹھا کر کندھے سے لگاتے ہوئے
جواب دیا۔

"کیا ہوا امی کی طبیعت کو۔" یہ آواز یقیناً بھابھی کی
نہ تھی ثناء کے ساتھ ساتھ امی بھی چونک کر اٹھ
بیٹھیں دیکھا۔ سفید نیٹ کے سوٹ میں ملبوس جاذبہ
فکر مند حالت میں امی کے پاس ہی تخت پر آبیٹھی۔

"اے بہو اٹھاؤ یہ سارا سامان اور جلدی سے میرا
سفید دوپٹا استری کر دو میں افطار اوپر جا کر ہی کروں
گی۔" کچھ دیر قبل والی امی کی بدلی جیسے اڑن چھو ہو گئی
بیٹی کی محبت ایک طاقت بن کر ان کے چہرے پر بکھری
صاف نظر آرہی تھی بھابھی نے مسکرا کر پہلے ثناء اور
پھر جاذبہ کو دیکھا۔

"تم تو مائرہ سے ناراض تھیں۔" تخت سے اترتے
اترتے امی کو جیسے یاد آگیا۔

"ناراضی کا کیا ہے امی وہ تو زندگی کے ساتھ چلتی
رہتی ہے اصل چیز تو رشتے ناطے ہیں جنہیں معمولی سی
ناراضی کی آڑ لے کر ختم کرنا بہت بڑا ظلم ہے جو ہم خود
اپنے ساتھ کرتے ہیں ویسے بھی رات بھابھی اور جاوید
بھائی گھر آئے تھے مجھے منانے کے لیے اور کوئی ایسی
وجہ تو تھی نہیں جو میں نہ مانتی ایک چھوٹی سی غلط فہمی
تھی جو بیک وقت ہم دونوں کے دل میں پیدا ہوئی۔ میں
سمجھی انہوں نے نظر انداز کیا انہیں محسوس ہوا میں
بات نہیں کرنا چاہ رہی اور بس آپس میں بیٹھ کر ہم
دونوں نے اپنی یہ غلط فہمی دور کرلی۔" جاذبہ نے ہر بات
کی وضاحت کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ویسے بھی امی یہ رمضان کا مقدس مہینہ ہے جس
میں شیطان کے قید ہوتے ہی میرے دل میں موجود
سارے وسوسے اور شیطانی خیال بھی خود بخود دور ہو
گئے۔" بھابھی ہنس کر بولیں۔

"اچھا کیا بیٹا جو تم دونوں نے اپنی ناراضی ختم کرلی
کیونکہ دلوں میں بغض' غلط گمان اور وسوسے پیدا کرنا
شیطان ہی کا کام ہے اور اگر اس مقدس ماہ میں روزے
رکھنے کے باوجود ہم لوگ ایک دوسرے کی چھوٹی چھوٹی
غلطیوں کو بھی درگزر نہ کرسکے تو کیا فائدہ' بلا ضرورت
بھوکے پیاسے رہنے کا۔"

"ارے تم سب یہاں بیٹھی باتیں کررہی ہو اوپر
مہمان تمہارے منتظر بیٹھے ہیں۔" دروازے سے
جھانک کر جاوید بھائی کے آواز لگاتے ہی سب کو یاد آگیا
کہ روزہ کھلنے میں صرف پندرہ منٹ رہ گئے ہیں۔

"میں اوپر جارہی ہوں امی آپ سب لوگ جلدی
سے آجائیں۔" بھابھی' جاوید بھائی کے پیچھے ہی اوپر
بھاگ گئیں ثناء نے دیکھا سب کو ایک ساتھ دیکھ کر امی
کے چہرے پر ایک آسودگی سی چھا گئی ہے اور وہ یاسیت
جس کا وہ آج صبح سے شکار تھیں اب کہیں دکھائی نہ
دے رہی تو سچ ہے ہر ماں کی یہ دلی خواہش ہوتی ہے کہ
اس کی ساری اولاد ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر
رہے۔ ہنستے کھیلتے بچوں کو دیکھنا ہی ماں کو آسودہ کرتا ہے
بے شک وہ بچہ چھ ماہ کا ہو یا چھ سال کا یا شادی شدہ'
خوشیوں کے لیے ماں کے نزدیک عمر اہمیت نہیں رکھتی
اوپر جاتی امی کو دیکھ کر ثناء بھی مطمئن ہوگئی ویسے بھی
خوشیاں ہوں یا غم اپنوں کے ساتھ ہی اچھی لگتی ہیں۔

☆ ☆

ام طیفور

چھن، چھن، چھناک! زور دار آواز کے ساتھ اسٹیل کا گلاس کمرے سے اچھال کر باہر صحن میں پھینکا گیا تھا، ساتھ افراد خانہ کے لیے خصوصی پیکیج کے تحت نادر کلمات بھی جاری ہو رہے تھے، جنہیں سب کان دبائے نظرانداز کر رہے تھے، کیونکہ کوئی ایک بھی از راہ ہمدردی دادی کے سامنے آنے کی کوشش کرتا تو اگلا ہدف اس کی پسلیاں ہوتیں، دادی پہ یہ جلالی کیفیت اگلے کئی دن تک طاری رہنے کا امکان تھا کیونکہ ان کا مطالبہ پورا ہونے کے امکان واضح نہیں تھے ان کا بس چلتا مریم کو دریا برد کر دیتیں مگر کسی بھی قیمت پر دبئی نہ جانے دیتیں!

کئی دن سے چلتی سرد جنگ میں حدت پیدا ہو گئی تھی، حالانکہ سب کو امید تھی کہ دو دن میں دادی بھول جائیں گی مگر وہ بھی اپنی ہٹ کی پکی نکلیں، ایسی ضد باندھ رکھی تھی کہ کھانا پینا حرام کیے ہوئے تھیں، عمر کا تقاضا، اوپر سے سو بیماریاں جان کو لگی ہوئی تھیں، ایسے میں رزق سے بیر باندھے ہوئی تھیں، اولاد الگ پریشان تھی، بیٹے سمجھا سمجھا کر تھک گئے، بیٹیاں بھی چلی آتیں، گھٹنے پہ ہاتھ دھر کے ماں کو ضد چھوڑ دینے کا کہتیں پھر ذرا سا دبا کے ہلاشیری بھی دے جاتیں۔!

"ارے اماں! ایسی بھی کیا خود غرضی، چلیں اگر آپ اتنی ضد کر رہی ہیں تو یہ کل کے بچے ہی ڈھل جائیں، ایسی بھی کیا تو تا چشمی! آخر آپ نے ہی تو پال پوس کے قابل کیا ہے تا کہ آج دبئی بیٹھے عیش کر رہے ہیں۔ جمعہ جمعہ چار دن کی آئی ہوئی بیویاں لے جاسکتے ہیں تو جس دادی نے بچپن سے جوانی تک چوزوں کی طرح پروں میں لیے رکھا، اسے لے جاتے مروڑ اٹھتے ہیں، بتاؤ بھلا!"

چلو جی، قصہ ختم! ذرا جذبات ٹھنڈے ہونے لگتے، دو چار ایسی ہی تیلیوں سے بھانبڑ کی طرح بھڑ بھڑ سلگنے لگتے، دادی کھڑکھڑاتے سینے میں دوبارہ سے جوش محسوس کرتیں اور بیٹیوں کے جانے کے بعد پھر کسی اسٹیل کے برتن کی شامت آتی جو بھرپور آواز کے ساتھ صحن میں لوٹنیاں لیتا ساکت ہو جاتا اور دادی کی آواز پوری گھن گرج کے ساتھ سارے میں گونجتی۔

"میں دیکھتی ہوں، سمیع اور مریم کیسے اکیلے دبئی جاتے ہیں، مجھے لیے بغیر!" جملہ افراد بے چارگی سے اسٹیل کے برتن کو دیکھتے سر پکڑ کر بیٹھ رہتے۔!

☆ ☆ ☆

"حد ہی ہو گئی بھابھی! بھلا بتاؤ، اپنے ہی پوتے اور پوتی سے ضد باندھ لی اماں نے چار دن نہیں رہ گئے زندگی کے اور انہیں دبئی دیکھنے کا شوق چرایا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ یہ سب بیٹیوں کا سکھایا پڑھایا ہے شروع سے ہی بڑی باجی اور منی باجی کو میرے ساتھ بیر رہا ہے۔ اب وہی کڑھن میری بچی کی خوشیوں کے آڑے آ رہی ہے۔" نل کے نیچے پچ پچ کے برتن دھوتی شازیہ بانو کا بس چلتا تو اماں جی کو بھی چائے کی پیالی بنا کے دھو ڈالتیں، آج کل انہیں اپنی ساس پھانس کی طرح چبھتی تھی، مریم کی کملاہی صورت دیکھ کے غصہ مزید دوچند ہو جاتا، اکلوتی بیٹی تھی، دو بھائیوں کی اکلوتی بہن، اس کی تکلیف کیسے گوارہ کرتیں۔"

ایک اور نازک شیشے کی پیالی سنک میں پھینکے جانے پر عقب میں بیٹھی ماجدہ بیگم نے قدرے تیکھی نگاہ سے دیورانی کو گھورا' پالک کے پتے توڑتے ان کے ہاتھ ذرا دیر کو تھمے اور جتاتے لہجے میں گویا ہوئیں۔

"ذرا حوصلے سے دھو میری بہن' ان برتنوں میں چھ کپ اور بارہ پلیٹیں میری ہیں' کوئی ٹوٹ گیا تو مانو زخم میرے دل پر آئے گا۔" اس چھچھورے انداز پر شازیہ بانو نے پلٹ کر چلچلاتی نظر جیٹھانی پر ڈالی اور لاپرواہی سے بولیں۔

"تو ایسا ہے نا بھابھی کہ آپ ہی سارے برتن دھو لیجیے' میرے تو ہاتھوں میں سوراخ ہیں' پھسل پھسل جاتا ہے سب کچھ۔!" ان کا نل بند کرنے کی نیت سے بڑھتا ہاتھ دیکھ کر ماجدہ بیگم یک دم بوکھلائیں۔ اب بھلا اتنی سردی میں کون پانی میں ہاتھ ڈالتا' لہجہ میٹھا کیا اور نگاہ کڑوی' اور بولیں۔

"ارے نہیں رے پگلی! ناراض کاہے کو ہوتی ہے' بھلا برتن تم سے زیادہ قیمتی ہیں' ایک آدھ چیز غرق بھی ہو گئی تو کیا' تمہارے تو ہاتھوں میں سوراخ ہیں نا' مرے ہاتھوں کو مانو گریس لگی ہے' برتن ریشم کی مانند ہاتھ سے پھسلتا ہے' قسم لے لو!"

اس تشبیہہ پر شازیہ بانو نے تلخ و طنزیہ نگاہ جیٹھانی پر ڈالی اور سر جھٹک کر دوبارہ برتن پٹخنے لگیں' ماجدہ بیگم نے دیورانی کا منہ پھولا دیکھا تو دل جوئی کی خاطر بولیں۔

"کہتی تو تم ٹھیک ہو۔ یہ اماں جی کو بھی اس بڑھے ویلے تو پلے چالے چڑھے ہیں' ورنہ بھلا بتاؤ' ساری عمر نظام آباد سے باہر نہیں نکلیں اور کہتی ہیں دبئی جانا ہے' باتھ روم تو اپنے آپ جایا نہیں جاتا اور دبئی تو جیسے دیوار پار ہے' بوڑھے منہ مہاسے' ہونہہ۔!" ماجدہ بیگم نے خوب دل کی بھڑاس نکالی تھی' شازیہ بانو کو گویا شہہ مل گئی' "نل بند کرتی فوراً" دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتی قریب ہی پیڑھی گھسیٹ کر آن بیٹھیں' آواز کو قدرے دباتے ہوئے بولیں۔

"اب دیکھیں نا بھابھی' کتنی مشکل سے سمیع وہاں سیٹ ہوا ہے' اسٹوڈیو فلیٹ میں رہتا ہے ایک کمرہ اور اسی میں ایک کونے پہ بیڈ تو دوسرے میں دو کاؤنٹر جوڑ کر کچن کے نام پر چار برتن رکھ لیے ہیں' اسی کمرے کے تیسرے کونے میں کم بختوں نے سمیع کو دو دیواریں کھڑی کر کے فلش اور ٹنکی لگا دی ہے کہ لو ادھر اسی کمرے میں پکاؤ بھی اور اسی کمرے میں' آہو۔" شازیہ بانو نے اسٹوڈیو فلیٹ کا الم ناک نقشہ کھینچ کر آخر میں کراہیت سے ناک سکوڑ کر اس پر دوپٹے کا پلو بھی دھر لیا۔ دیکھا دیکھی ماجدہ بیگم کے تاثرات بھی کچھ کچھ ایسے ہی ہو گئے' شازیہ بانو دوپٹے کے گولے کے پیچھے سے ہی بولیں۔

"اب آپ خود ہی بتائیں بھابھی اس کمرے میں دونوں میاں بیوی رہیں گے یا اماں جی' جنہیں ساری ساری رات جاگنا اور سارا سارا دن سونا مرغوب ہے۔ اوپر سے مریم میری پھر سے دوسرے جی سے ہے اور ایک بچی کی ذمہ داری پہلے ہی سر پر ہے۔ میری تو کچھ سمجھ نہیں آتی کہ اماں جی یہ کیسے بند باندھوں۔ وسیم صاحب سے کہوں تو وہ بے بسی سے کندھے اچکا کے چلتے بنتے ہیں کہ ماں ہیں۔ کیسے روکوں اور میں کروں تو کیا کروں۔"

شازیہ بانو نے دونوں ہاتھوں پر سر گرا لیا۔ وہ واقعی بے حد اکتائی اور تھکی ہوئی لگ رہی تھیں۔ ماجدہ بیگم نے پورے انہماک سے پالک کاٹتے ہوئے ایک اچٹتی نگاہ دیورانی پر ڈالی اور دوبارہ کام میں لگ گئیں۔ وہ بھلا کیا جواب دیتیں۔ ان کی تو تکلیف ہی نرالی تھی۔ ساری عمر میاں نے باہر گزاری۔ ترلے منتیں کرتے عمر گزر گئی کہ "مجھے بھی بلا لیں۔ میں نے آپ کے پاس آنا ہے۔" پر نہ جی۔ آخر کار میاں جی پاس آ گئے۔ ہوائی جہاز میں بیٹھنے کی حسرت ہی رہ گئی۔ پہلے پہل مریم کے جانے کا معلوم ہوا تو دل کو قلق سا لاحق ہوا۔ بھلا بتاؤ چار دن شادی کو نہیں ہوئے اور میاں کو جدائی کاٹنے لگی۔ حالانکہ ان "چار دنوں" کا حساب یہ تھا کہ مریم کی گود میں دس ماہ کی عنایہ اور کوکھ میں اگلے کی آبیاری تھی جبکہ ماجدہ بیگم کا اپنا داماد بھی ملک سے باہر

تھا۔ بیٹی کے بچے جوان ہو چلے تھے مگر باہر نہیں جا سکی تھی۔ ایسے میں مریم کا جانا دل میں انی کی طرح گڑا جا رہا تھا کہ اس غم کو اگلے، ہم نے اڑا کر رکھ دیا۔ اماں جی اینٹھ گئیں کہ وہ بھی دبئی جائیں گی پوتے کے پاس۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے مریم جائے نہ جائے پر انہیں نہ روکا جائے۔

ماجدہ بیگم تو جیسے جلتے انگاروں پر دھری گئیں۔ ایسا ہونے سے بھلا تو مریم کا جانا تھا۔ جب انہوں نے ہوائی جہاز کو اندر سے نہیں دیکھا تھا تو بھلا اماں جی کو کیا حق پہنچتا تھا کہ وہ اس عمر میں آ کر جہاز کے "جھولے" لیتیں۔ سو اس فیصلے کی مخالفت میں وہ بھی دیورانی کو بھرپور کمک پہنچانے میں پیش پیش تھیں۔ مریم جاتی نہ جاتی ان کی بلا سے، مگر یہ اسی سالہ "مائی" چلی جاتی تو دکھ واندوہ کی سب بلائیں ماجدہ بیگم کی جان کو آن چمٹتیں۔

☼ ☼ ☼

کمرے میں گمبھیر خاموشی تھی صرف سانسوں کے زیر و بم کی آوازیں تو کبھی ننھی عنایہ کے ہلکے ہلکے سے خراٹوں کی آواز ابھرتی اور معدوم ہو جاتی۔ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی مریم کی باریک لانبی انگلیاں عنایہ کے ریشمی بالوں میں سرسرا رہی تھیں۔ نگاہیں سامنے دیوار پر گڑی تھیں اور سوچیں نہ جانے کہاں اڑتی پھر رہی تھیں۔

"کدھر کھوئی ہوئی ہو۔ کوئی بات ہی کرو۔ کب سے یوں ہی دیوار کو گھورے جا رہی ہو جیسے اس میں سے دبئی دیوار پھاڑ کے باہر آ جائے گا۔" بیڈ پر دراز ہاتھ میں موبائل تھامے سمیع نے چھیڑنے والے انداز میں مریم کو ٹوکا اور ہنس دیا۔ وہ یک دم چونک کے سپاٹ نظروں سے سمیع کے چہرے کو دیکھنے لگی گو کہ سمیع اس کے نظروں کا مفہوم بخوبی سمجھتا تھا، مگر پھر بھی چڑ کر اٹھ بیٹھا۔ موبائل کو بیڈ پر پٹخا اور بولا۔

"اس طرح کرنے سے کیا ہم تینوں میں سے کسی ایک کا ارادہ بھی بدل جائے گا۔ تینوں یعنی تم میں اور دادی، تم چاہتی ہو کہ ہر حال میں میرے ساتھ جاؤ اور دادی کسی نہ کسی طرح بیچ سے نکل جائیں۔ دادی چاہتی ہیں تم جاؤ نہ جاؤ وہ لازمی جائیں اور میں، میں چاہتا ہوں کہ تم دونوں کو لے جاؤں، مگر فی الوقت یہ ممکن ہی نہیں۔ اول تو وہاں میرے فلیٹ کی نوعیت ایسی ہے کہ تین افراد نہیں سما سکتے ورنہ تمہیں اور مجھے ایک ہی کمرے میں اجنبیوں کی طرح رہنا پڑے گا۔ دادی کے ہوتے ہمیں دور سے ہی ایک دوسرے کو سات سلام جھاڑنے پڑا کریں گے، دوسرے یہ کہ میری جیب ابھی اتنا خرچ برداشت نہیں کر سکتی۔ دادی کی دوائیں، تم اور عنایہ کے اخراجات۔ ساتھ ہی یہ اگلا سلسلہ" اس نے ایک نگاہ مریم کے وجود پر ڈالی۔ وہ کسمسا کر رہ گئی۔ سمیع شرارت سے مسکرا دیا اور پھر رسان سے بولا۔

"دیکھو مریم!" اس نے تھوڑا سا آگے کھسک کے مریم کا ہاتھ تھاما۔ "میں یہ جانتا ہوں کہ دادی کو وہاں لے جانا سراسر بے وقوفی ہے۔ وہ کتنی ہی ضد کریں، مگر میں ان کو نہیں لے جاؤں گا۔ کیونکہ میں انہیں ہر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

گز سنبھال نہیں سکتا۔ میں وہاں سارا دن ڈیوٹی پر رہتا ہوں گھر بیٹھ کر دادی کی دوا اور کھانے پینے کا خیال کیسے رکھوں گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم بھی یہیں رہو۔ دادی کے پاس۔ انہیں چین پڑا رہے گا اور وہ کہہ بھی تو یہی رہی ہیں کہ اگر میں نہ گئی تو مریم کو بھی نہیں جانے دوں گی۔ تو پھر ٹھیک ہے نا۔ تم بھی یہیں رہو۔۔۔ قصہ ختم۔۔۔" اس نے سکون سے ہاتھ جھاڑے اور تکیے سے کمر ٹیک کر بیٹھ گیا۔ مریم جامد تاثرات کے ساتھ ٹھس سی بیٹھی تھی۔

"کتنے آرام سے کہہ دیا کہ "تم بھی یہیں رہو' قصہ ختم۔۔۔" کیا یہ سب ایک قصہ ہے؟ چار حرفوں میں سمٹی ہائیکو وہ تو پل میں جیسے بھسم ہوئی تھی۔ سلگتے لہجے میں بولی۔ "میری زندگی کوئی قصہ نہیں ہے سمیع کہ کوئی چٹخارے لے کر ہاتھ جھاڑ دے۔" ایسا گہرا طنز سمیع لیٹے سے دوبارہ اٹھ بیٹھا۔ ماتھے پہ بل پڑے، اور بھنویں سکڑ کر باہم آن ملیں۔

"تین سال ہو گئے ہیں نہ ہماری شادی کو اور یہ تین سال میں نے آپ کے بغیر آپ کے کیے گئے وعدوں کے سہارے ہی تو گزارے ہیں۔ وہ وعدے جو آپ مجھ سے شادی سے پہلے اور بعد میں وقتاً" فوقتاً" کرتے رہے، مگر ایک بھی ایفا نہ کر سکے۔ آپ کو لگتا ہے کہ میں یہاں آپ کے بغیر مزے اور سکون سے ہوں جبکہ میں جانتی ہوں کہ میرا ایک پل کیسے کانٹوں پر گھسٹتا ہے۔ کوئی وجہ بھی تو ہو میرے پاس آپ سے دور رہنے کے لیے 'کس لیے اور کس کے لیے؟ نا میری ساس نا سسر' نندیں اپنے اپنے گھروں میں آباد' جیٹھ صاحب شادی کے دوسرے ماہ ہی بیوی کو لے کے دبئی روانہ ہو گئے۔ آخر مجھے یہاں کس کے لیے رکھ چھوڑا ہے آپ نے؟ مجھ پر ان ذمہ داریوں کا بار کیوں ڈال رہے ہیں جو میرے لیے ہیں ہی نہیں۔" وہ ہانپ اٹھی۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ ذرا سی مشقت سے سانس دھونکی کی طرح چلنے لگتا۔ سمیع شدید غصے میں یک دم اس کا بازو دبوچتے ہوئے بولا۔

"کیوں دادی تمہاری کچھ نہیں لگتیں کیا؟"

"دادی لگتی ہیں نا۔۔۔ ساس نہیں' ماں نہیں کہ جن کی خدمت کرنا میرا ہی فرض اولین ہو۔ وہ بھی ایسی صورت میں جبکہ وہ اپنے دو بیٹوں' بہوؤں اور ان کی آل اولاد کے ہمراہ پورے ٹھاٹ سے رہتی ہوں۔" جواب میں وہ بھی اتنے ہی غصے سے بولی تھی۔ اس کا بازو ابھی بھی سمیع کے مضبوط ہاتھ کے شکنجے میں تھا۔

"کتنی خود غرض ہو تم۔ میں سوچتا تھا کہ تمہارے چہرے کی طرح تمہارا دل بھی خوب صورت ہو گا' مگر۔" اس نے تاسف سے سر جھٹکا۔ "کان کھول کر سن لو۔۔۔ دادی تمہاری نا سہی' لیکن میری ماں بھی ہیں اور باپ بھی۔ اگر وہ خوش دلی سے تمہیں میرے ساتھ روانہ کرتی ہیں تو ٹھیک بصورت دیگر تم یہیں رہو گی تب تک جب تک دادی حیات ہیں اور اگر میرے ساتھ زیادہ ضد کی تو یقین مانو میں سچ میں صرف انہیں اپنے ساتھ دبئی لے جاؤں گا اور تم جانتی ہو کہ میں ایسا کر گزروں گا۔" ایک جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑتا وہ تنفر سے اسے دیکھتا کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ مریم ہکا بکا اس کی پشت دیکھتی رہ گئی۔

اس نے ایک نظر بے یقینی سے اپنے بازو کو دیکھا جس پہ دبوچے جانے کی جلن ابھی تک محسوس ہو رہی تھی۔ آنکھ میں امڈ امڈ کے آتی نمی جھپک کے آستین الٹ کر بازو کی سرخی دیکھی۔ اسی پل یادداشت کے پنے پہ تحریر ایک سنہری منظر نگاہوں کے سامنے لہرا کر کچھ دیر کے لیے اسے ہر اذیت سے غافل کر گیا۔

ماجدہ تائی کے بڑے بیٹے کی شادی تھی۔ اس نے سیکنڈ ایر کے امتحان دیے تھے۔ ایک تو ذہنی فراغت' دوسرے گھر میں شادی کی تقریب' وہ تتلی بنی اڑتی پھرتی تھی ہر کام میں پیش پیش ہر تیاری میں حصے داری' چہرے پہ گلال سا چھایا رہتا' نئی نئی امنگوں اور ترنگوں پر ڈولتی کمسنی کا روپ لیے جوانی جیسے انوکھے راگ چھیڑتی تھی۔ سمیع ان دنوں باہر جانے کے لیے پر تول رہا تھا حالانکہ دادی اس حق میں نہیں تھیں کیونکہ سمیع سے بڑا فہد پہلے ہی دبئی سیٹ ہو چکا تھا اور دادی کو بھلا ان دونوں بھائیوں کے بغیر کب کچھ سوجھتا تھا۔

ایک تو چلا گیا دوسرا بھی چلا جاتا تو ان کی سانسیں کیسے چلتیں؟ آج کل سمیع دادی کو راضی کرنے میں ہی جتا تھا اور وہ مان کے نا دے رہی تھیں۔

طیب بھائی کے سسرال والے رسما" دن ڈالنے آئے تو اس دن بھی دادی سے تکرار ہو گئی۔ جلتا بھنتا چھت پر جا بیٹھا۔ دوپہر سے شام کردی مہمان نیچے آچکے تھے اور سمیع صاحب ساری دنیا سے ناراض چھت پر پڑی ٹوٹی چارپائی پر لیٹے غم منا رہے تھے۔ دو دفعہ تو ماجدہ تائی نے بچوں کو ہی بھیج کر نیچے بلوایا' مگر سمیع ڈھیٹ بنا پڑا رہا۔ طیب بھائی تو ابھی سے دولہا بنے بیٹھے تھے اور گھر کے بزرگ مرد مہمانوں کے پاس تھے ایسے میں کسی سیانے لڑکے کی بھی ہمہ وقت ضرورت تھی اور سمیع بے حد چست اور چالاک تھا' ایسے موقعوں پر ہر چیز بڑی مہارت سے ہینڈل کرتا تھا سو اب جو اس کے نام کی پکار پڑ رہی تھی تو بے جا نا تھی۔

تنگ آکر ماجدہ تائی نے مریم کو بھیجا تھا اسے چھت سے بلانے کے لیے وہ بھی لپک جھپک سارا دن کام نمٹاتی رہی تھی۔ اب بڑی فرصت سے بیٹھی طیب بھائی کی سالی کے ساتھ بیٹھی گپیں مار رہی تھی۔ ہاتھ میں سبز چائے کا کپ تھا۔ ماجدہ تائی کے کہنے پر وہ چائے کا کپ ڈھک کر چھت کو جاتی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ پیروں میں خوب صورت ہیل والے سینڈل تھے جن کی ٹک ٹک سے اوندھے لیٹے سمیع کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ کوفت سے اٹھ کھڑا ہوا کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ اب کہ کوئی بچہ اسے بلانے نہیں آیا اور جو آیا ہے وہ اسے لیے بغیر نہیں جائے گا۔ وہ غصہ میں تنتناتا ہوا سیڑھیوں کی طرف آیا۔ آخری اسٹیپ پر کھڑی مریم اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اس کے تیور دیکھتے ہوئے اس نے سائڈ پر ہو کر فورا" اسے راستہ دیا اور ٹھیک اسی پل اس کا نازک اور نفیس جالی دار دوپٹا اس کی ہیل کے نیچے آیا تھا۔ دوپٹا پھنس گیا اور پاؤں رپٹ گیا۔ وہ لڑکھڑا کر بری طرح گرنے کو تھی جب ایک جھٹکے سے سمیع نے اس کا بازو تھاما تھا۔ سسکاری کی تیز آواز مریم کے نیم وا ہونٹوں سے خارج ہوئی تھی۔ وہ گرنے سے

تو بچ گئی تھی، مگر سمیع کی پکڑ سے اس کے بازو کی گداز جلد بری طرح رگڑی گئی تھی۔ آنکھیں میچے تکلیف برداشت کرتی مریم، سمیع کے دل کو اک نئے درد سے روشناس کروا گئی۔ چند پل وہ یوں ہی یک ٹک اسے تکتا رہا اور پھر اس کی تکلیف کا احساس جیسے اسے بے کل کر گیا اس نے سر جھٹک کر اس کا بازو ٹٹول کر زخم دیکھنے کی کوشش کی، لیکن کسی غیر معمولی احساس کے تحت مریم نے فوراً" بازو اس کے ہاتھ کی گرفت سے نکالا۔

"کوئی بات نہیں سمیع بھائی۔۔۔ ایسا بھی کچھ نہیں ہو گیا ابھی جلن ٹھیک ہو جائے گی۔" یہ کہتے ہی وہ تیزی سے واپس مڑی اور سیڑھیاں اترتی چلی گئی، مگر اس کے کانوں نے سمیع کے منہ سے نکلنے والا فقرہ ضرور سنا تھا۔

"یہ تو ٹھیک ہو جائے گی، مگر اس دل کی جلن کا کیا کروں؟" مریم کا چہرہ یک دم لال انار ہوا تھا، مگر اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ ایک میٹھا سا احساس دل میں لیے وہ اس دن جیسے سب سے چھپتی پھری تھی۔ خاص طور پر سمیع سے جس کی نگاہوں کے تیور یکسر تبدیل ہو گئے تھے۔ اس دن کے بعد سے سمیع نے دن رات ایک ہی رٹ لگا کر دادی کو راضی کیا اور دبئی جا کر دم لیا۔ جاتے سے صرف دو پل کے لیے اس کے قریب ٹھہرا اسے امید کی تتلی تھماتے ہوئے سرگوشی کی۔

"میں نہیں چاہتا کہ آنے والے کل میں تمہیں کانٹا بھی چبھے تمہاری چھوٹی سی تکلیف بھی اب مجھے گوارہ نا ہو گی اسی لیے آج جا رہا ہوں، تمہارے لیے ایک خوب صورت کل لے کر آؤں گا۔" اور مریم نے اس سرگوشی کے تمام خوش نما رنگ اعتبار کی صورت دل پر ثبت کر لیے۔ جاتے جاتے سمیع نے پلٹ کر ایک نگاہ اس پر ڈالی تو بے اختیار مریم کا ہاتھ اس بازو پر ٹھہر گیا۔ جدھر اب تک اس کے ہاتھ کا لمس تازہ تھا۔

عنایہ کے رونے کی آواز نے سارا فسوں توڑ دیا وہ خوش رنگ خواب دیکھتی یک دم حقیقت کی تلخی جھیلنے حال میں آ پہنچی۔ کتنی جلدی بدل گیا تھا سب کچھ یہ وہی سمیع تھا جو اسے اذیت میں دیکھ کر خود زیادہ بے قرار ہو جاتا تھا اور آج کتنی بے حسی سے رخ موڑ کر لیٹ گیا تھا۔ بلکہ اب تو کمرے میں اس کے ہلکے ہلکے خراٹے گونج رہے تھے اپنے تمام عہد و پیماں بھلائے وہ اسے تنہائی کی بھٹی میں جھلسنے کے لیے چھوڑ کے جانے کو پر تول رہا تھا۔ بلاوجہ اور بلاجواز۔ اس نے ڈبڈبائی نگاہوں سے اپنے مجروح بازو کو دیکھا اور پھر سمیع کی پشت کو تکتے دو بے بس آنسو پلکوں سے ٹوٹ کر اس کے عارضوں پر بکھر گئے۔

☼ ☼ ☼

جاتی سردیوں کی دھوپ سارے میں پھیلی تھی۔ صحن کے بائیں جانب بنی کیاریوں میں وسیم صاحب گوڈی کر رہے تھے وہیں ایک جانب شازیہ بانو سلائی مشین رکھے اماں جی کی قمیصوں کے ٹانکے تروپے لگانے میں مصروف تھیں۔ صبح ہی انہوں نے پورا ڈھیر پرانی قمیصوں کا شازیہ بانو کے آگے ڈھیر کیا تھا اور بھنویں اچکاتے ہوئے بولی تھیں۔

"یہ ذرا ان قمیصوں کی حالت تو سدھار دے شازی۔ سوچ رہی ہوں کہ سب ہی دبئی لے جاؤں اور تھوڑی "پھٹنگ" بھی کر دے آج کل کے حساب سے۔"

"اماں جی ان کی پھٹنگ کی تو یہ "پھٹنگ" ہو جانی ہیں۔" شازیہ بانو چٹکی میں ایک قمیص کو تھامتے ہوئے نخوت سے بولیں "اور آپ کو بھلا کیا کرنا ہے فٹنگ کروا کے۔ مینا کماری لگنے سے تو رہیں آپ۔" دل کی جلن زبان پر آ رہی تھی کیونکہ یہ سارے جتن دبئی جانے کے تھے۔ اماں جی اپنا کوئی بھی کپڑا ذرا کم ہی دیتی دلاتی تھیں۔ سالہا سال چلتے تھے حتی کہ گھس گھس کے چھس جاتے۔ نئے بھی سلواتی رہتیں، مگر اسٹاک کیے جاتیں اب انہی گھسے پٹے کپڑوں کو شازیہ بانو بھلا کیا سلائی کرتیں۔ اتنے باریک ہو چکے تھے کہ قابل مرمت نہیں بلکہ قابل مذمت بن گئے تھے، مگر وہ بھی اماں جی تھیں اپنی منوا کے دم لیتی تھیں۔ کپڑے وہیں پٹخ کے بولیں۔

"تیرے سارے جلاپے سمجھتی ہوں میں۔ تو تو جب سے بیاہ کے آئی ہے مجھ سے سڑتی ہے۔ ساری دنیا کہتی تھی مجھے "اقبال بی بی تو اپنی نوکی سس کم اور نان زیادہ لگتی ہے" ایسی جوان دکھتی تھی میں کہ میرے آگے تیرا رنگ روپ پھیکا پڑ گیا تھا۔" اماں جی کے فخریہ لہجے نے شازیہ بانو کو آگ کی لپٹوں میں لپیٹ دیا تھا۔ وہ سلگ کر بولیں۔

"اماں جی۔ لوگ آپ کی منہ زور جوانی کو دیکھ کر نہیں بلکہ آپ کی حرکتیں دیکھ کر کہتے تھے جس طرح آپ نئی نویلی لائی بہو کے ساتھ پہننے اوڑھنے میں مقابلے بازی کیا کرتی تھیں ایسی کرتوتیں کپٹی نندوں کی ہوا کرتی ہیں۔"

"زیادہ بک بک نہ کر۔ اب خاموشی سے سارے کپڑے صحیح کر کے دے ورنہ دبئی سے تیرے لیے ککھ نہیں بھیجوں گی۔" اماں جی نیم باز آنکھوں سے شازیہ بانو کو ناڑتی دھمکاتی ہوئی بولیں۔ آج کل ایسی ہی بے تکی خماری چڑھی ہوئی تھی انہیں۔ جو رہ رہ کر دونوں بہوؤں کا کلیجہ جلائے رکھتی تھی۔ فارغ ہو کر شازیہ بانو اچاٹ جی کے ساتھ مشین لے کر بیٹھ گئیں۔ چہرے کے بگڑے زاویے خراب موڈ کا پتا دیتے تھے۔ وسیم صاحب بھی کن انکھیوں سے کئی بار دیکھ چکے تھے مگر ٹھنڈی سانسیں بھرنے کے علاوہ لاچار تھے۔

اماں جی چپلیں گھسیٹتی وہیں چلی آئیں۔ ایک طائرانہ نظر سارے میں ڈالی اور وسیم صاحب کے پاس آکر کھڑی ہو گئیں۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے عطر لگائے وہ پوری تیاری میں تھیں۔ وسیم صاحب نے حیرت سے ماں کو دیکھا اور سنجیدگی سے پوچھ بیٹھے۔

"کدھر چلی ہیں اماں جی؟؟"

"پاس کے لیے "صورت" بنوانے۔" اماں جی نے گردن اکڑا کر جواب دیا۔

"پاس یعنی پاسپورٹ اور یہ شوشا آپ کے آگے کس نے چھوڑا اماں جی؟" وسیم صاحب نے رسان سے پوچھا۔

"یہ اپنی ننھی کے چھوٹے نے مجھے کہا کہ دبئی جانے کے لیے پاس بنوانا پڑتا ہے پھر بولا آپ فکر نہ کریں، میں ہی آپ کو لے چلوں گا ابھی کچھ دیر میں آتا ہی ہو گا۔" اماں جی گھٹنوں کا درد چھپاتی، نزاکت سے وہیں کرسی پر ٹک گئیں۔ آوازیں سن کے ماجدہ بیگم بھی اپنے پورشن سے ادھر ہی چلی آئیں۔ شازیہ بانو کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا یہ سب کچھ۔ بس نہیں چلتا تھا کہ اماں جی کو کہاں غائب کروا دیں۔ دانت پیستے ایک جھٹکے سے دھاگا توڑا اور جلبلا کر بولیں۔

"صورت کو تصویر کہنا تو آپ کو آج تک نہ آیا اور چلی ہیں دبئی کی خاک چھاننے۔ اماں جی اگر آپ کو وہاں کچھ ہو گیا تو کیسے منگوائیں گے اُدھر سے؟" اتنا بچہ کوئی بھی نہ تھا کہ شازیہ بانو کا اشارہ نہ سمجھتا۔ ماجدہ بیگم نے حیرت اور رشک سے دیورانی کو دیکھا، لیکن وسیم صاحب کو بیوی کی بات ذرا نہ بھائی۔ کچھ بھی تھا وہ ان کی ماں تھیں۔ انہیں سچ میں ان کی فکر تھی۔ خفا لہجے میں شازیہ بانو سے بولے۔

"تم اپنا منہ بند نہیں رکھ سکتیں۔ تمہیں اس قدر تکلیف ہے کہ اب تمہارے دل کی کھولن ابل ابل کر تمہاری زبان سے باہر آنے لگی ہے۔ ذرا سوچ سمجھ کے بولو ورنہ مت ہی بولو۔ یہی اچھا ہو گا۔" شازیہ بانو طیش سے سیاہ پڑتا چہرہ پھیر کر سلائی مشین پر جھک گئیں۔ ماجدہ بیگم مسکراہٹ چھپانے کی غرض سے صحن میں نظریں گھمائے جا رہی تھیں جبکہ اماں جی کا اطمینان قابل تحسین تھا۔ بیٹے کو بہلاتے ہوئے بولیں۔

"ارے وسیم پتر کیوں فکر کرتے ہو تم لوگ۔ میں اگر اُدھر مر مرا بھی گئی تو میرا ڈبا (تابوت) ادھر نہ منگوانا بلکہ میں وصیت کر جاؤں گی کہ جب میری بہو شازیہ مرے تو اسے میرے پاس دبئی لا کے دفنانا۔ قسمے! ہم دونوں کا ہی دل لگا رہے گا۔" ماجدہ بیگم کے حلق سے قہقہہ تو نکلا ہی تھا۔ وسیم صاحب بھی ہنسی روک نہ پائے۔ اماں جی سے کم از کم ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔ شازیہ بانو نے پلٹ کر کچا چبا جانے والی نظروں

سے ساس کو دیکھا اس سے پہلے کہ وہ جوابی کارروائی کرتیں۔ گیٹ کے باہر گاڑی کا ہارن ہوا اماں جی اسی کی اسپیڈ سے کھڑی ہوئیں اور خاص شازیہ بانو کی نظروں میں نظریں ڈال کر بولیں۔

"آ گیا میری ننھی کا چھوٹا۔۔۔ تم لوگوں سے شام میں ملتی ہوں۔"

لو جی یہ اماں جی تھیں۔ وہ اماں جی جنہیں یہ تک نہیں معلوم تھا کہ گلی کے نکڑ پر کریانے کی دکان تھی یا دودھ دہی کی ہٹی، جو آج بھی اپنی گلی سے دو گلی آگے جا کر راستہ بھول جاتی تھیں۔ جنہوں نے اپنے شہر کے علاوہ کبھی کوئی دوسرا شہر نہیں دیکھا تھا۔ بیٹیاں بھی آس پاس کی گلیوں میں بیاہی گئی تھیں۔ عزیز رشتے دار بھی محلے دار تھے یہیں پیدا ہوئے اور یہیں کہیں مر بھی چکے ایسے میں کبھی نوبت ہی نہ آئی کہ اماں جی کہیں دور دراز کا سفر کرتیں۔ آج کے دور کا عجوبہ تھیں۔ کبھی کسی دوسرے شہر جانے کی ضرورت پڑ بھی گئی تو بہوؤں کو بھیج دیا۔۔۔ اللہ اللہ خیر صلا۔۔۔

اب ایسے میں اچانک دماغ میں دبئی جانے کا کیڑا کا بلایا تھا۔ بھلا کدھر نظام آباد کی اماں جی اور کدھر دبئی۔۔۔ لے دس! کینہ توز نظریں جمائے ماجدہ بیگم کے بس میں ہوتا تو اماں جی کے اندر حلول کر جاتیں اسی بہانے وہ خود دبئی تو جاتیں! دونوں ہاتھ مسلتی ماجدہ بیگم نے پرسوچ انداز میں سر دھنتے ہوئے ایک دم سے کوئی فیصلہ کیا تھا اور ایک میسنی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر آکر ٹھہر گئی۔

☆ ☆ ☆

بڑے سے صحن میں چیخ و پکار مچی تھی۔ بیچ صحن میں جاوید کی میت پڑی تھی۔ اقبال بی بی پچھاڑیں کھا رہی تھی ایک ہی ہفتے میں دوسری موت تھی دہرے صدمے نے اقبال بی بی کی رگ رگ میں غم بھر دیا تھا۔ ابھی تو بہو کو رو کر بیٹھی تھی بیٹا ایسا تھڑدلا نکلا کہ ہفتے بعد ہی بیوی کے غم میں زہر چاٹ لیا چار چھوٹے چھوٹے بچے رلنے کے لیے چھوڑ گیا۔ بھلا ان کے بارے میں تو کچھ سوچتا مرد بنتا حوصلے سے سامنا کرتا۔

اللہ کی مشیت تھی کسی کا بھلا کیا زور ایک ہفتے پہلے اقبال بی بی کی منجھلی بہو کے باورچی خانے میں آفت ٹوٹی تھی۔ مٹی کے تیل کا چولہا پھٹا اور یک دم نجمہ لپیٹے میں آ گئی جب تک چیخ پکار پر سب اکٹھے ہوتے آگ اپنا کام دکھا گئی تھی۔ جاوید نے ہی نجمہ کے انگارہ جسم پر کمبل ڈالا تھا اس قدر ہمت والی تھی کہ خود چل کر ایمبولینس میں لیٹی تھی مگر پیروں پہ واپسی نصیب نہ ہوئی۔ تیسرے دن جھلسی ہوئی نجمہ کی سانسیں پوری ہو گئیں۔

لاش گھر آنے تک جاوید کا سکتہ نہ ٹوٹا۔ چھوٹے چھوٹے چار بچوں کا بلکنا عرش پھاڑے دے رہا تھا مگر باپ ساکت بیٹھا بیوی کا مردہ تکے جاتا اور اقبال بی بی ڈبڈبائی آنکھوں سے بیٹے کو تکے جاتی۔ یہ گمان تو ہرگز نہ تھا کہ وہ اتنا کم ہمت نکلے گا۔ کسی کے بھی بارے نہ سوچا اور زہر پھانک لیا۔ ٹھیک سات دن بعد جاوید بیوی کے پہلو میں جا سویا۔ اقبال بی بی کی کمر ٹوٹ گئی۔ اپنی اولاد کی ایسی کم ظرفی نے کلیجہ پھونک دیا مگر کوئی کو سنا بھی نا دے سکی پہلے ہی حرام موت مرا تھا کیسی سخت پکڑ میں ہو گا یہ خیال آتا تو سجدے میں گر کر گڑگڑائے جاتی اور پھر اقبال بی بی نے ہمت پکڑی کمر کسی اور ماں باپ کے یوں اچانک نگاہوں سے اوجھل ہونے پر آلنے سے گرے بوٹ جیسے سہمے سہمے روتے چاروں بچے اپنے دامن میں سمیٹ لیے۔

اقبال بی بی کے سبھی بچوں کے گھر ایک ہی گلی میں ساتھ ساتھ تھے۔ ماجدہ بیگم اور شازیہ بانو نے اپنے گھروں کی درمیانی دیوار میں دروازہ نکال رکھا تھا۔ اقبال بی بی بھی انہی کے ساتھ ہوتی تھی۔ بالکل سامنے والا گھر جاوید اور نجمہ کا تھا۔ درمیان میں محض چھ فٹ چوڑی گلی تھی زیادہ تردد نہ کرنا پڑا اور اقبال بی بی نے اپنے چار جوڑے تھامے اور بچوں کے ساتھ جاوید مرحوم کے گھر آن بسی۔ جہاں باورچی خانے کی دیواریں ہنوز سیاہ تھیں اور نجمہ کی آہ و زاریاں سارے میں چکراتی تھیں۔

جیسے تیسے بھی ہوا دوسرے دونوں بیٹے وسیم اور مقصود خرچ دینے لگے، لیکن اپنی بھی اولادیں تھیں اور چار یہ تھے۔ پورا کرنا بے حد مشکل ایسے میں وہ وقت بھی آیا جب اقبال بی بی نے جی پر پتھر رکھ کر رمضان میں چپکے سے زکوۃ بھی لی اور فطرانہ بھی۔ دونوں پوتوں کو آلو چنے کے تھال دے کر کچہری کے باہر بھی کھڑا کیا۔ اس سے زیادہ ہاتھ پاؤں مارنا اقبال بی بی جیسی سادہ لوح عورت کے بس سے باہر تھا۔ اکثر لوگ ہاتھ دکھا جاتے اور وہ منہ دیکھتی رہ جاتی۔ مہنگے داموں چیز خرید لیتی اور کوڑیوں کے مول بک جاتی۔

ایسا کڑا وقت تھا کہ مانو تھم ہی گیا ہو۔ یوں جیسے کھلے منہ کے برتن میں بوند بوند ٹپکتا پانی اقبال بی بی کا بس چلتا تو وقت کے گھوڑے کو چھانٹے مار مار کر سرپٹ دوڑاتی' مگر اس کی اپنی رفتار بے ڈھنگی تھی۔ وہ بھلا کب کسی کے اشارے پر سر دھنتا ہے۔

ادھر سے چھن کر ادھر سے کھا کر بچے پل ہی گئے۔ فہد نے میٹرک کر کے ایک آدھ ڈپلومہ کورسز کیے اور اپنے کسی ننھیالی رشتے دار کے توسط سے دبئی چلا گیا۔ سمیع ابھی آٹھویں میں تھا اور پڑھائی کے میدان میں وہ بھی کوئی جھنڈے گاڑتا نظر نہیں آتا تھا' لیکن پھر بھی اقبال بی بی جوتے کے زور پر اسے ہانکے ہوئے تھی۔

فہد سے بڑی ناعمہ کا ایف اے کرتے ہی مناسب رشتہ آیا۔ اقبال بی بی نے شکرانے کے نفل ادا کیے اور دو ماہ کے اندر پوتی کو بیاہ دیا۔ ننھیال' ددھیال نے مل ملا کر خاصا جہیز اکٹھا کر دیا یوں ذمہ داری کی پہلی سل سرک گئی۔ رابعہ ابھی کافی چھوٹی تھی اس لیے اس کی ابھی فکر کرنے کی حاجت نہیں تھی۔

سمیع نے میٹرک کرتے ہی گھر میں اعلان کر دیا کہ اسے بھی دبئی جانا ہے۔ سب نے سوچا کہ دیکھا دیکھی نرالی سوجھ رہی ہے برخوردار کو' کیونکہ اس عرصہ میں فہد نے بڑی مناسب رقم گھر خرچ کی مد میں بھیجنی شروع کر دی تھی۔ اقبال بی بی کے تو مانو دن ہی پھر گئے۔ ساری زندگی اتنے روپے ہاتھ میں تھام کر نا دیکھے تھے۔ اب بھی جب بڑا نوٹ پکڑتی تو سر کو چکر چڑھ جاتے۔ خرچ کرنے کی سدھ بدھ اب تک نا تھی۔ شازیہ اور ماجدہ کو دیتیں اور جو چاہیے ہوتا منگوا لیتیں۔ دونوں بہوئیں موقعے کا فائدہ اٹھاتیں اور دس کے بیس بنا کے بتاتیں۔ اقبال بی بی خاموشی سے پکڑا دیتی کہ ساری عمر دکانوں کا رخ نا کیا تھا بڑے بازار کا تو رستہ ہی معلوم نا تھا ایسے میں شازیہ اور ماجدہ کی بھی موجیں لگ گئی تھیں۔

سمیع کو گھر کی حالت سدھارنے کا خیال یک دم آیا تھا۔ اس نے تایا اور چچا سے کہہ کر سب سے پہلے کچن کی کایا بدلی۔ سارا کچن اکھڑوا کر رکھ دیا۔ کاؤنٹرز' کیبنٹس' ٹائلز یوں لگتا تھا جیسے کسی نے ٹاٹ میں مخمل پرو دیا ہو۔ سمیع کو سارا گھر گدلا گدلا لگتا جی چاہتا بس کچن میں بیٹھا رہے۔ اقبال بی بی نے چار دن تو کاؤنٹر پہ سجے چولہے پر ہانڈی روٹی کی' لیکن دیسی زمانے کی عورت تھی' پانچویں دن اس جدید کچن کے ایک کونے میں مٹی کے تیل والا چولہا دھرے' سرسوں کا ساگ گھوٹتے اقبال بی بی نے سکون کا سانس لیا تھا۔ دھیرے دھیرے سمیع نے حساب کتاب رکھنا شروع کر دیا تو تائی' چچی کی گونٹیوں (ڈنڈی مارنا) میں خاطر خواہ کمی آئی تھی۔ کچن سے لاؤنج' لاؤنج سے ڈرائنگ روم اور پھر بیڈ روم آخر میں وسط میں بنا چھوٹا سا صحن سب کچھ بدلتا چلا گیا۔ سمیع اور فہد کی بدولت۔

جب جب فہد اسی دوران کسی نا کسی حصے کی مرمت کروا کے چلا جاتا۔ پیچھے سمیع چوکس ہر چیز پر نگاہ رکھتا پیسے دھیلے کا حساب کتاب غیر محسوس طریقے سے سمیع نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ کچھ چھوٹی بہن رابعہ کو ہوشیار کیا۔ یوں تائی اور چچی کا عمل دخل مکمل طور پر ختم ہوا' لیکن سمیع کو دبئی جانے کا ہڑکا لگ گیا۔ اقبال بی بی نے ٹال دیا کہ پہلے تھوڑا اور پڑھ پھر بے شک چلا جا۔ دو سال مزید لگا کے سمیع نے ایف اے کیا تو وسیم چچا نے بڑے طریقے سے اسے ڈپلوموں میں الجھا دیا۔ اس بار بغیر کسی تکرار کے اس نے بات مان بھی لی' سب کو یہ ہی لگا کہ دبئی جانے کا بھوت اتر گیا' مگر یہ خاموشی وقتی تھی۔

ذرا وقت سرکا تو سمیع کا جنون دوبارہ سر چڑھ کر بولنے

لگا۔ پیسہ کمانے کی دھن بہتر سے بہترین مستقبل کی لگن اسے قرار نہیں لینے دیتی تھی اور اب کہ وہ کسی کے سمجھانے سے ٹلنے والا نہیں تھا۔ اقبال بی بی نے بہتیرے ترلے لیے ناراضی بھی اختیار کی، لیکن الٹا سمیع خفا ہو گیا۔

اور پھر انہی دنوں مریم کی محبت نے سمیع کے دل پر دستک دی۔ اب سے پہلے اس نے مریم پر کبھی بھی دھیان نہ دیا تھا جیسی دوسری کزنز تھیں ویسی ہی وہ۔ سارا بچپن ایک دوسرے کے ساتھ بیتا تھا، لیکن کبھی ساتھ نہیں کھیلے تھے۔ ناعمہ اور رابعہ سے مریم کی دوستی تھی اور تینوں اکثر اکٹھی پائی جاتیں، مگر سمیع نے کبھی اس کے ہونے کا نوٹس نہیں لیا تھا، کچھ غصیلا تھا سو مریم بھی فاصلہ رکھتی تھی، مگر ایک چھوٹے سے خوش نما حادثے نے دونوں پر محبتوں کے در کھول دیے تھے۔ وہ جو کہیں نہیں تھی اب ہر جگہ وہ تھی۔ مریم کی محبت نے اس طور سمیع کو جکڑا تھا کہ وہ چاروں شانے چت ہوا تھا۔ اب دن رات تھے اور خیال یار تھا، مگر اس الفت وچاہت نے سمیع کی پیسہ کمانے کی دھن کو مہمیز کیا تھا۔

اقبال بی بی نے ہار مان لی اور سمیع چلا گیا۔ مریم کے ہاتھوں میں ملن کے عہد کے جگنو تھما کے وہ اسے خود سے باندھ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

فہد کے توسط سے بہت کم وقت میں وہ دبئی سیٹ ہو گیا تھا، مگر نوٹ پتے تو نہیں ہوتے جو توڑ توڑ کر بھیج دیے جائیں۔ سمیع کے لیے بھی پردیس کوئی "دکھیں" تو نہیں تھا جسے اوڑھ کر وہ سو جاتا اور بے فکر ہو رہتا۔ ویسے بھی سمیع فہد کے ساتھ نہیں رہ رہا تھا۔ فہد کی نوکری اجمان میں تھی اور سمیع دبئی میں تھا۔ بھائی سے دوری کی وجہ سے بھی اسے یہ وقت بہت کٹھن لگتا تھا، لیکن ایک بات کا اطمینان بہرحال تھا کہ وہ پاکستان رقم بھیج رہا تھا۔ کچھ وقت گزرتا تو فہد کی شادی کے فوراً" بعد دادی سے مریم کے لیے بات کرتا۔

مگر اس عرصے میں ایک عجیب سی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ پچھلی دفعہ جب فہد پاکستان گیا تھا تو دادی نے اس کی منگنی کر دی تھی۔ سمیع نے فہد کو اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا تھا جتنا وہ اس دفعہ واپسی پر اسے محسوس ہوا تھا۔ ہر وقت نازش کی باتیں اور اس کے قصے، فہد کا بس چلتا تو ہاتھ میں تسبیح تھام لیتا اور نازش، نازش جپتا۔ سمیع حیران تھا کہ محض بائیس دن کے لیے فہد گیا تھا۔ اسی دوران منگنی بھی ہوئی اور وہ دونوں اس قدر قریب آ گئے کہ فہد کو اب یہ تک معلوم تھا کہ نازش کو سبزی بنانے اور پکانے سے متلی ہوتی ہے۔ اسے کچن میں کام کرنے سے درد شقیقہ کی شکایت ہو جاتی ہے۔ بڑی عمر کے لوگوں کے بیچ زیادہ دیر بیٹھے تو پٹھوں میں اینٹھن شروع ہو جاتی ہے اور پیاسنگ کسی دور دیس میں بسنا اس کا ایسا خواب ہے جس کی تعبیر کے لیے اسے کسی شہزادے کا انتظار تھا اور فہد کی صورت میں وہ شہزادہ (کاٹھ کا الو) اسے مل چکا۔

فہد خود کو کسی حسینہ کے خوابوں کا راجکمار تصور کیے جانے پر ہی پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اسے بائیس دن میں نازش سے غضب کا عشق ہوا تھا کہ سمیع کو لگنے لگا تھا کہ اگر اگلے چکر میں ہی فہد میاں کا نکاح نازش بی بی سے نا پڑھوایا گیا تو کوئی اور ہی "غضب" ڈھے جائے گا۔ دبئی واپس آ کر فہد کی مصروفیات میں ٹاپ آف دی لسٹ، واٹس ایپ پہ نازش کے ساتھ فیوچر پلاننگ تھی۔ اس "فیوچر پلاننگ" پر ایک دفعہ غلطی سے سمیع کی نظر پڑ گئی تھی اگلے چار دن وہ بے چارہ بھائی سے نظر نہیں ملا سکا تھا۔ پھر بھی وہ فہد کی خوشی میں خوش تھا۔

ماں باپ سے محرومی نے ان بھائی بہنوں کو بے حد کٹھنائیاں دکھائی تھیں اب اگر فہد کی زندگی میں کوئی اسے چاہنے والا آیا تھا تو یہ سمیع کے لیے بھی خوشی کی بات تھی، لیکن اصل گڑبڑ کہیں اور تھی، دادی نے سمیع کو بتایا تھا کہ فہد نے دو ماہ سے گھر کے خرچ میں بے حد کمی کر دی ہے۔ فون پر بھی روتا ہے کہ بہت تنگی میں ہوں کھانے کے لالے پڑے ہیں تنخواہ کا بڑا حصہ تو یہیں کھپ جاتا ہے۔ دادی بے حد پریشان تھیں۔

سمیع سے پتا کرنے کو کہا کہ فہد کسی مشکل میں تو نہیں؟ رہ رہ کر دادی کو ہول اٹھ رہے تھے۔ ان کا بس چلتا تو اڑ کر فہد کے پاس چلی جاتیں، لیکن اصل ہول تو سمیع کو اٹھے جب پتا کروانے پر دوسرا ہی سلسلہ سامنے آیا۔ فہد نا صرف بالکل فٹ تھا بلکہ اتنا فٹ تھا کہ دو ماہ سے اپنی تنخواہ کا بڑا حصہ نازش کے گھر بھجوا رہا تھا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی۔

چند باتیں تو فون پر رابعہ نے بھی بے حد اچنبھے سے بتائی تھیں کہ "نازش بھابھی کے بھائی نے نئی نکور ہیوی بائیک لی ہے۔ نازش بھابھی نے نیا آئی فون سیون لیا ہے، یہ اور بات کہ انہیں اس کے فنکشنز پلے نہیں پڑ رہے نازش بھابھی کے گھر یہ بڑی سی ایل سی ڈی لگ گئی کڑی سے کڑی مل رہی تھی اور سمیع کا خون کھولے جا رہا تھا۔ دونوں کی اس دیدہ دلیری پر جتنی بھی حیرت کا اظہار کرتا، کم تھی فہد اس کا بھائی، منگیتر کی محبت میں اس قدر اندھا ہو گیا تھا کہ دادی سے جھوٹ بولتے حیا نہ آئی اپنی محنت کی کمائی پچھلے دو ماہ سے وہ نازش اور اس کے گھر والوں پر بے دریغ لٹا رہا تھا اور دادی کو اعصاب شکن پریشانی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ بے چاری اس کے لیے ہلکان ہوئی پھر رہی تھیں۔ شادی سے پہلے یہ حال تھا تو بعد کا تو اندھے کو بھی دکھائی دے رہا تھا کہ فہد میاں نازش کے اشاروں پر تھا، تھیا کریں گے۔

دادی شادی کی تیاریوں میں لگی تھیں اور جو خرچ سمیع بھیج رہا تھا اسی میں سے بچا بچا کر نازش کی بری تیار ہو رہی تھی۔ سمیع کو ہرگز اعتراض نہ ہوتا جو فہد کی کمائی برباد ہوتے نہ دیکھ رہا ہوتا۔ اس صورت میں جبکہ وہ خود بھی باخبر تھا کہ سمیع ہی کی آمدن سے اس کی شادی کی تیاری ہو رہی ہے ایسا خود غرض ہو چکا تھا وہ، لیکن خاموشی کے علاوہ چارہ نہیں تھا۔ دادی کو پتا چلتا تو سہہ نہ پاتیں اس لیے انہیں کچھ بھی کہنے کے بجائے سمیع نے رابعہ کو الرٹ کیا جو جو جس حد تک بتا سکتا تھا بتا دیا۔

رابعہ نے فوراً" ناعمہ کو ساری صورت حال سے مطلع کیا، فی الوقت وہ سسرال میں بیٹھی تو کچھ نہیں کر سکتی تھی، لیکن اس نے رابعہ کو مہنگی اور قیمتی اشیاء لینے سے سختی سے منع کیا، ہلکی کوالٹی کا سامان خریدنے کو بولا تاکہ کل کو نازش استعمال نہ کرتی تو اتنا افسوس نہ ہوتا جتنا اسے سمیع کے پیسوں سے خریدی گئی اشیاء برتتے دیکھ کر ہوتا۔ سونے کے زیور بنانے سے بھی منع کر دیا اور آرٹیفیشل خریدنے کو کہا۔ رابعہ بھی جیسے تپی بیٹھی تھی ساری کسریں نکال دیں۔ جتنا گھٹیا اور سستا میک اپ، کپڑا لے سکتی تھی اس نے کر دکھایا۔ دادی حیران ضرور ہوتی رہیں، لیکن خود چونکہ کبھی بازار نہیں گئی تھیں لہٰذا چپکی بیٹھی رہیں۔ زیور ایسا بدوضع تھا کہ کام والی رانو بھی دیکھ کر بولی۔

"اتنا کوجا سیٹ تو ہمارے پنڈ کی چھوریاں بھی نا پہنیں آپ نے کس کے لیے لیا ہے رابعہ باجی۔۔۔؟"

"جس کے لیے لیا ہے وہ جب پہنے گی تو تمہیں خود ہی پتا لگ جائے گا۔"

"وہ پہنے گی تو تب نا سیدھا کچرے کے ڈھیر میں پھینکے گی اس کی شکل ہے بھلا پہننے والی۔"

"ہاں تو اسی لیے تو لیا ہے۔"

"لے دس بھلا کوڑے میں ہی پھینکنا ہے تو رابعہ باجی آپ مجھے دے دو۔" رانو نے آنکھوں میں لالچ سموتے ہوئے کہا۔

"تمہارے ہی پاس آئے گا یہ ذرا صبر کرو جس کے لیے لیا ہے وہ تمہیں خود ہی دے دے گی، لیکن فی الحال یہ اس کے نظارے کے لیے رہنے دو۔" اس کے لہجے کی یاسیت پہ غور کیے بغیر رانو برا سا منہ بنا کے اٹھ گئی تھی، لیکن ٹھیک سوا مہینے بعد یہ سیٹ حقیقتاً" رانو کے ہاتھ میں تھا اور وہ ہک دک اسے تکے جا رہی تھی۔

فہد کی شادی کو تیسرا دن تھا اور کافی ساری بدمزگی اور کافی ساری دھوم دھام کے ساتھ یہ شادی انجام پائی تھی۔ دادی پہ فہد کے تیور آشکار ہو چکے تھے اور وہ صدمے کی سی حالت میں فرض کی ادائیگی کی خاطر شامل رہی تھیں ورنہ بس چلتا یا جی کڑا کیا ہوتا تو ہرگز بھی اس اوپری رونق کا حصہ نہ بنتیں۔ ہوا یہ کہ مایوں

میں ابھی دو دن باقی تھے۔ دادی نے کسی کام سے نازش کے ہاں کال ملوائی اٹھانے والا کوئی ننھا بچہ تھا۔ دادی نے نازش کو یا اس کی ماں کو بلوانے کو کہا جواباً" جو اس بچے نے کہا اس نے دادی کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی۔

"نانو تو بازار گئی ہیں اور نازش خالہ اپنے ہونے والے دولہا کے پاس بیٹھیں ہیں۔ فہد انکل کے پاس۔" سیسہ تھا جو دادی کے کانوں میں اتر گیا۔ انہوں نے ایک بھی لفظ بولے بغیر فون رابعہ کو پکڑا دیا اور رابعہ نے بھی خاموشی سے کال منقطع کردی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ فہد دبئی سے سیدھا اپنی سسرال لینڈ کرچکا ہے اور یہ بات کل رات ہی سمیع نے اسے بتادی تھی۔ وہ دو دن وہاں فہد کو ڈھونڈنے میں ہلکان ہوتا رہا تھا وہ بے حد خوش تھا کہ دونوں بھائی اکٹھے پاکستان جائیں گے اور دادی کو حیران کردیں گے، لیکن یہاں وہ فہد کی اچانک گمشدگی پہ حیران رہ گیا تھا اس کے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ فہد اسے بغیر بتائے پاکستان جاچکا ہے اتفاقاً" فہد کی ہی کمپنی میں ملازم اس کا دوست ٹکرایا تھا اس نے بتایا کہ وہ تو پرسوں رات کی فلائٹ سے جا بھی چکا۔ سمیع نے دل برداشتہ ہو کے اپنا ٹکٹ کینسل کروادیا۔ کیا کرتا تھا اسے بھلا اپنے ہی بھائی کی شادی میں غیروں کی طرح جاکے!

شادی ہوگئی۔ دادی نے گونگے بہرے بن کے شادی میں شرکت کی تھی۔ یوں جیسے پرائے بیاہ میں مہمان بلائی گئی ہوں یہی حال رابعہ اور ناعمہ کا تھا جب اپنا بھائی ہی اہمیت دینے کو تیار نہ تھا تو شکوہ شکایت کیسی؟ دادی کا رویہ دیکھتے ہوئے کوئی تائی، چاچی بھی آگے آگے نہیں ہوئی تھی بلکہ ہر ہر رسم میں نازش کے گھر والے پیش پیش تھے۔

جب ولیمہ والے دن صبح صبح فہد کے کمرے سے جھگڑے کی آوازیں باہر آنی شروع ہوئیں۔ نازش ولیمہ کے جوڑے کو لے کر اونچا اونچا بولے جارہی تھی۔ باہر صحن میں چارپائی پہ کروٹ کے بل لیٹی دادی کی ٹانگیں دباتی رابعہ اور کچن میں رانو کے ساتھ مہمانوں کا ناشتا تیار کرتی ناعمہ کے کلیجے بیچ میں ٹھنڈ سی پڑگئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد فہد کے کمرے کا دروازہ کھلا اور نازش دندناتی ہوئی رابعہ کے سر پر تھی۔

"تم... تم مکار لڑکی... تمہیں کیا لگتا ہے کہ تم نے میرا دن برباد کردیا ہرگز نہیں میرا نام بھی نازش ہے۔ ابھی... ابھی۔" دو انگلیوں سے چٹکی بجائی گئی۔ "ابھی فہد کے ساتھ جاؤں گی اور بہترین جوڑا بھی لاؤں گی ساتھ میں اعلا پائے کے زیورات' یہ گھٹیا اور سستا سامان تمہیں ہی مبارک ہو۔" ہاتھ میں تھاما نقلی زیور کا ڈبا اس نے رابعہ کے سامنے پٹخ دیا جو ہنوز اسی تسلسل اور اطمینان سے ٹانگیں دبانے میں مگن تھی۔ جیسے یہ ساری بک بک کسی اور کے ساتھ ہورہی ہو۔ نازش کوئی بھی جواب نہ ملنے پر مزید زچ ہوتے ہوئے تنفر سے رابعہ اور دادی کی پشت تکنے لگی۔ چند ثانیے دل کا زہر آنکھوں کے رستے نکال کر وہ پیر پٹختی گیٹ کی جانب چل دی۔ مسکین اور عاجز غلاموں کی مانند ہاتھ جوڑے کھڑے فہد نے بھی فوری اس کی تقلید کی' لیکن وہ بیوی کے حق میں بہن کو لتاڑنا نہیں بھولا تھا۔

"کیا ملا رابو تمہیں اپنے بھائی کی خوشی غارت کرکے۔"

"کیوں... ؟ کیا یہ زیور کپڑا آپ نے پہننا تھا۔" رابعہ نے بھی ترنخ کے جواب دیا۔ فہد سٹپٹا گیا فوراً" تردید کرتے ہوئے بولا۔

"وہ پہنے یا میں... بات تو ایک ہی ہے نا۔" دھت تیرے کی' بول کے احساس ہوا کہ کیا بول بیٹھا لیکن اب کیا ہوسکتا تھا' رابعہ کا چھت پھاڑ قہقہہ تو گونجا ہی تھا ساتھ میں اس کے کانوں میں ناعمہ اور رانو کے ہنسنے کی آوازیں بھی پڑیں' مارے شرمندگی اور طیش کے پھولتے پچکتے نتھنے لیے وہ قدرے بلند آواز میں گویا ہوا۔

"اب جو کرتوت تم کرچکی ہو اس کا ازالہ کرنا بے حد ضروری ہے' میں نازو کو بازار لے کر جارہا ہوں' اس کی پسند اور مرضی کی چیزیں لینے' اب میں اسے آج کے دن ناراض تو نہیں کرسکتا نا' ایک ہی تو ولیمہ آتا ہے

انسان کی زندگی میں.....!" بڑا پائے کا فلسفہ جھاڑتے فہد صاحب بیوی کے پیچھے پیچھے نکل لیے۔

"بے غیرت!" کروٹ کے بل لیٹی دادی نے کل سے اب تک میں یہ پہلا لفظ بر آمد کیا تھا' رابعہ نے ان کی بات پہ مسکراتے ہوئے چھوٹی انگلی سے آنکھ کے کنارے آئی نمی پونچھ لی.....!

اس اثنا میں کچن سے ناعمہ اور رانو بھی نکل کر ان کے قریب چلی آئیں' رابعہ نے رانو کو دیکھ کر جھٹ سے باری باری پاس دھرا نازش کا پٹخا ہوا سامان اس کی طرف اچھال اچھال کر کیچ کرانا شروع کیا.....

"یہ لے' یہ بھی لے' بولا تھا ناسب کچھ تیرے ہی پاس آئے گا' لے اب موجیں مار.....!" اور رانو نے ہر شے یوں کیچ کی تھی جیسے نکاح کے بعد مہمان بد کیچ کرتے ہیں..... اس کے لیے' یہ کوجا ترین سامان خزانے سے کم نہیں تھا.....!

✡ ✡ ✡

آتے آتے دادی کو بھی صبر آ ہی گیا' اب ان کا سارا دھیان سمیع کی طرف اور سمیع کا ان کی طرف..... رابعہ کا بڑا اچھا رشتہ آیا تھا..... دادی کو لوگ بہت پسند آئے تھے۔ ماجدہ تائی کو ساتھ لے کر فٹافٹ بات پکی کر آئیں۔ فہد کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں اور آج کل وہ جی جان سے بیوی کی ناز برداری میں لگا تھا' دن رات اسے تسلی دیتا تھا۔

"جانم بس زیادہ سے زیادہ دو ماہ..... پھر تم میرے پاس ہوگی دبئی۔"

قریب ہی دادی بیٹھی گندم پھٹک رہی تھیں' نخوت سے سر مارتے ہوئے بولیں۔

"بیگ میں ٹھونس اور ساتھ ہی لے جا' ورنہ تیری جانم کا منہ پلپلے جامن جیسا ہو جانا ہے.....!"

"دیکھا' دیکھا فادی' تمہارے سامنے یہ میرے ساتھ ایسا سلوک کر رہی ہیں' پیچھے سے تو نچوڑ کے رکھ دیں گی.....!"

نازش نے تڑپ کے فہد کا ہاتھ تھام کے ماتھے سے لگاتے ہوئے کہا۔ یہ خالص فلمی انداز' دادی نے تیکھی نظر ڈالی اور منہ میں بدبدائیں۔

"فادی" یہ ان کا آج کل کی شوخی لڑکیوں کے لیے پسندیدہ لقب تھا۔

"کیا دادی آپ بھی نا' ایسے تو نازو کمزور ہو جائے گی' اسے میں آپ کے پاس اپنی امانت چھوڑے جا رہا ہوں' اس کا دھیان رکھنا ہے آپ سب نے.....!"

"امانت ہے تو میرے کمرے کی سیف میں بند کر جا' باہر سے جندرا (تالا) بھی مار کے جا' رب دی سونہہ (قسم) تیری دادی نہیں جو تیرے آنے سے پہلے اسے کھول کے بھی دیکھا تو.....!"

کچن میں آٹا گوندھتی رابعہ کا ہنس ہنس کے حشر ہو گیا' نازش طیش سے دانت کچکچاتی دادی کو دیکھے چلی گئی' اسے سچ میں جواب نہیں سوجھ رہا تھا' فہد نے کان کھجایا اور اس کا دھیان بٹانے کو بولا۔

"اچھا چھوڑو نا' یہ بتاؤ کہ میرے جانے میں چند دن رہ گئے ہیں' کہیں گھومنے چلنا ہے تو بولو' ایک دن کے لیے ہو آتے ہیں!"

"ہائے! فادی یہ تو آپ نے میرے دل کی کہی' میں سوچ رہی ہوں کہ ہم سب مری سے ہو آئیں!"

"ہم سب کون.....؟ ارے دادی کہاں جا سکتی ہیں' وہ تو آج تک دو محلے چھوڑ کے اگلی گلی نہیں گئیں' مری کیسے جائیں گی!" فہد نے حیران ہوتے ہوئے ترنت تفصیلی جواب دیا مبادا دادی تیاری ہی نا پکڑ لیں۔

"ارے نہیں بابا! میں دادی کی نہیں امی لوگوں کی بات کر رہی ہوں' میری بڑی خواہش ہے کہ ان کے ساتھ مری جاؤں' ان لوگوں نے آج تک مری نہیں دیکھا' چلو اس بہانے وہ سب بھی ہو آئیں گے' کیا کہتے ہیں؟" نازش نے بڑی ادا سے فہد کی شرٹ کا کالر جھاڑتے ہوئے کہا۔ اس نے جواباً" تھوک نگل کے بات حلق سے اتاری اور مسکین سے لہجے میں بولا۔

"ایسا ہے..... نازو کہ ان سب کو پھر کبھی لے چلیں گے ابھی بس میں اور تم چلتے ہیں نا یہ وقت تو ہمارا ایک دوسرے کے سنگ بیتنا چاہیے نا اب بندو لینے

سارے ٹبر کے ساتھ ہنی مون پہ جاتا اچھا تھوڑی نا لگتا ہے۔"

"کیوں جی اتنے سارے لوگ کون' صرف امی ابا میرا چھوٹا بھائی مٹھو بڑی آپا اور ان کے تین بچے اور میری ایک چھوٹی بہن یہ کوئی اتنا بڑا ٹبر ہے کیا؟" تیکھے چتون لیے اس سے استفسار کرتی وہ جیسے سب کچھ پلان کیے ہوئے تھی اور بھلا فہد اس کے آگے سر اٹھا سکتا تھا۔

اس دن شام تک سارا پروگرام ترتیب پا گیا۔ نازش کے گھر والے تو جیسے اس ہنی مون کے ہی منتظر بیٹھے تھے۔ سب کے سب یوں تیار ہو کر اگلے دن فجر کے فوراً" بعد پہنچے جیسے مری ان کی جاگیر تھی۔ دادی نے زبردستی رابعہ کو بھی تیار کروایا وہ ہرگز بھی ان چھچھوروں کے ساتھ جانے پہ رضامند نہیں تھی اور دادی بھیجنے پہ بضد' لیکن دلوی اڑ گئیں فہد کو چار پانچ "دسسرال مریدی" کے طعنے مار کے بہن کو بھی ساتھ لے جانے کو راضی کیا۔ اس غریب نے نازش کو راضی کرنے کو کیا کیا پاپڑ بیلے یہ تو وہ خود یا نازش ہی جانتے تھے بہت احسان کر کے وہ صرف یہ سوچ کے راضی ہوئی کہ چلو آپا کا چھوٹو ہر وقت گود میں چڑھا رہتا ہے۔ رابعہ اس کو سنبھال لے گی ورنہ وہ آپا کو سکون سے تفریح کہاں کرنے دے گا بھلا۔

اگلے دن فجر سے بھی کچھ پہلے نازش کا سارا خاندان دادی کے ہاں موجود تھا۔ رابعہ کی آنکھ انہی کی آوازوں سے کھلی تھی۔ وہ اچاٹ جی کے ساتھ تیار ہو کر باہر آ گئی تھی۔ نکلتے وقت اتنا بھاری بھر کم ناشتا کرنے کے باوجود بیکری آئٹمز کا ایک خزانہ ہمراہ تھا۔ پیٹیز' کیک رسک' کریم رولز اور پیسٹریز تو اتنی تعداد میں تھیں کہ ان کو دیکھ کے رابعہ کو ایک ہی خیال آیا تھا کہ یہ تمام عقل مند قریبی پارک میں جا کر پکنک کیوں نہیں منا لیتے کیونکہ مری پہنچنے تک کریم سے بنی تمام اشیا کا کیا حشر ہونا تھا وہ صاف دکھائی دے رہا تھا' مگر وہ لوگ رابعہ کی سوچ سے زیادہ "عقل مند" تھے پہلے اسٹے میں ہی جو کہ محض آٹھ کلو میٹر دور ایک پیٹرول پمپ تھا۔ ان سب کو شدید بھوک لگ چکی تھی۔ رابعہ جو پہلے ہی بے زار ترین شکل بنائے اس کیری ڈبے میں ٹھنس ٹھنس کے بیٹھے افراد میں بمشکل تھوڑی سی جگہ میں سمائی ہوئی تھی ان کو کیک پیسٹریز کے ڈبے کھولتا دیکھ کے اس کا دم گھٹنے کے قریب ہو چلا تھا۔ اس نے تو محض چائے کے ساتھ ایک آدھ بسکٹ ہی لیا ہوگا' مگر طبیعت اتنی صبح صبح اتنی سی خوراک سے بھی بوجھل سی تھی۔ یہ سب تو "آنے وا" کھا کے نکلے تھے۔

* * *

بڑی دقتوں سے یہ سفر تمام ہوا تھا۔ مری پہنچ کے بھی اس سارے قافلے کا ایک ہی شغل تھا ہر جگہ کھانا اور ہر چیز کھانا۔ نازش کے ابا جی کو ویسے تو اپنے وزنی تن و توش کی وجہ سے چلنے تک میں دشواری تھی اوپر سے یہاں ہر دوسرے ٹھیلے سے لے کر ہر تیسرے ڈھابے پہ رک رک کر خود بھی سیر ہو رہے تھے اور باقی افراد خانہ کو بھی فیضیاب کر رہے تھے' لیکن فہد کی جیب سے۔ وہ بھی بغیر چون و چرا کیے جیب خالی کیے جا رہا تھا کیونکہ یہ ڈھابے پھر بھی سستے پڑتے بجائے اس کے کہ ان سب کو اچھے ریسٹورنٹ میں لے جاتا جو ان سب کے حالات تھے' فہد کو پوری امید تھی کہ ایسی صورت میں یہ لوگ ہوٹل کے دیگچیاں' کڑاہیاں بھی چاٹ کے نکلتے۔ وہ دل ہی دل میں شرمندگی سی محسوس کر رہا تھا' مگر کر ہی کیا سکتا تھا۔ اس لیے وہ ٹھنسا ٹھنسا کے مہنگا ٹھونسنے جوگا چھوڑنا ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ رابعہ کا اس ساری صورت حال سے جی بری طرح اچاٹ ہو رہا تھا۔

آپا نے بہتیری کوشش کی کہ کسی طرح منے کو رابعہ کے حوالے کریں' مگر وہ بھی اپنے نام کی ایک تھی۔ ہر دفعہ منے کے ساتھ ایسی واردات کر دیتی کہ بے چارہ لپک کے ماں کی طرف بھاگتا۔ ابھی ان لوگوں نے مری میں دیکھا ہی کیا تھا۔ سیدھے مال روڈ پہ آ گئے تھے اور صرف کھانے پینے کو ہی تفریح سمجھے ہوئے تھے۔ ابھی جب کہ پیٹ کے ٹینک اوور لوڈ ہو چکے تھے تو آپا نے

پتریاٹہ جانے کے لیے شور ڈالا۔ نازش کی چھوٹی بہن نے فوراً "پرس سے اپنے جتنا ہی چھوٹا شیشہ نکالا وہ سارا میک اپ جو گھر سے نکلتے وقت پورے اہتمام سے چہرے پر لیپا ہوا تھا اور اب اجڑے کھنڈر جیسا منہ بن چکا تھا۔ اس نے جھٹ سرخی پاؤڈر کی دکان نکالی اور وہیں ایک بنچ پہ سیلون سجا کے اپنی لپائی میں مصروف ہو گئی۔ پتریاٹہ کا نام لینے پر ہی فہد بمشکل اپنے تاثرات نارمل رکھے ہوئے تھا۔ رابعہ مسلسل اسے نوٹس کر رہی تھی اس کا نفیس ترین بھائی اس وقت سسرال کے ہاتھوں کھلونا بنا ہوا تھا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ فہد کے مزاج سے ایسے لوگ ہرگز لگا نہیں کھاتے، مگر ہائے ری جورو....

پتریاٹہ پہنچ کے بھی ان سب کے الگ ہی ڈھب کے تماشے تھے۔ رابعہ نے شعوری کوشش سے خود کو ان سے ذرا فاصلے پر رکھا۔ پہلے ہی بے حد شرمندگی بھگت لی تھی۔ وہاں پہنچتے ہی یہ سب گاڑی سے یوں نکلے جیسے جیل سے قیدی چھوٹے ہوں۔ چیئر لفٹ دیکھ کے بھی ان سب کی خوشی دیدنی تھی۔ اس طرح کے تماشوں میں کسی طرح یہ تمام ٹبر اس پار سے اس پار لگا تو رابعہ تو رابعہ، فہد نے بھی جی ہی جی میں اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔

ہر طرف بس انہی کی ہاہا کار مچی تھی۔ موقع ہاتھ لگنے کی دیر تھی فہد نازش کو لے کے چپکے سے وہاں سے کھسک لیا۔ ہنی مون کا بیڑا غرق تو ہوا ہی تھا۔ اب بس چند پل دونوں میاں بیوی کے ہاتھ لگے تو غنیمت جان کے انہوں نے نظروں سے اوجھل ہونے کی کی تھی پیچھے رابعہ ان سب کے رحم و کرم پر تھی۔ خاموش اور بددل سی ان کی آپس میں ہونے والی گفتگو کو سنتی رہی جو ظاہر ہے ان کے آپسی معاملات کے حوالے سے ہی تھی تو ایسے میں رابعہ کے لیے وقت کاٹنا دوبھر ہوا جا رہا تھا۔ بے زار سی اپنے موبائل پہ ارد گرد کے نظاروں کی تصاویر محفوظ کرتی جا رہی تھی۔ سوچا گھر جا کر دادی کو دکھائے گی۔ دور سے فہد اور لدی پھندی نازش کی صورت نظر آئی تو رابعہ کے اعصاب پرسکون ہوئے۔

فہد نے قریب پہنچ کر سرسری سا بہن سے [illegible] لیا۔

"بور تو نہیں ہوئی" اور بس...! وہ بھلا کیا جواب [illegible]۔ نفی میں سر ہلا کر منہ پھیر لیا۔ آنکھیں خوامخواہ بھر آئی تھیں۔ کبھی یہی بھائی تھا جس کے کندھے سے لٹک کے فرمائشیں کیا کرتی تھی۔ اب اس کی جگہ فہد کی سالیوں نے لے لی تھی اور اپنی ہی بہن سے بات کرتے لہجے میں کس قدر تکلف در آیا تھا کہ دل کو تکلیف تو ہوئی تھی نا۔

مری سے واپسی پر نازش اڑ گئی کہ اسے اسلام آباد کے مشہور ہوٹل سے ڈنر کرتے ہوئے گھر جانا ہے گو کہ کھانے سے زیادہ رابعہ کو یہ ہوٹل دیکھنے کا شوق تھا جس کی کافی شہرت سن رکھی تھی۔ اندرون بیٹھ کے کھانے سے بڑھ کر ٹیرس پہ بیٹھ کے دلکش مناظر کا مظاہرہ کرنا بے حد خوش نما تھا۔ دن کی روشنی میں یہاں خاصا رش رہتا تھا تو رات کو یہاں ارد گرد پہاڑوں پہ بنے گھروں کی ٹمٹماتی روشنیاں اتنی دل آویز دکھائی دیتیں کہ ایک پل کو دنیا بھول جاتی تھی گو کہ اب رابعہ کا بھی تھکن سے برا حال تھا، لیکن یہاں آکر اس کی طبیعت کی ساری بے زاری اڑن چھو ہو گئی تھی۔ باقی سب ہوٹل کا لذیذ کھانا کھانے کے ساتھ خوش گپیوں میں مگن تھے جبکہ وہ دادی کے لیے موبائل میں ان خواب ناک دیوں جیسی ٹمٹماتی روشنیوں کو محفوظ کر رہی تھی۔

خدا خدا کر کے یہ سب یہاں سے اٹھے اور واپسی کے لیے ایک دفعہ پھر گاڑی میں ٹھنسنا شروع کیا۔ آپا حسب سابق رابعہ کے ساتھ ہی بیٹھی تھیں، لیکن اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے سب پہلے کی نسبت تنگ تنگ سے ہیں۔ یقیناً "ان سب نے کھا کھا کے سارے دن میں وزن بڑھا لیا تھا یہ خیال خالصتاً" رابعہ کا ذاتی تھا کسی حکیم کی تشخیص نہیں تھی۔

ہوٹل خاصی اونچائی پہ تھا جاتے ہوئے چڑھائی چڑھی تھی تو اب آتے ہوئے اترائی تو تھی۔ اچھے بھلے بندے کو ایسی صورت میں کم از کم سر چکرانے کی شکایت ہو ہی جاتی ہے، لیکن کچھ لوگوں کو متلی کی

شکایت بھی ہوتی ہے۔ اوپر سے بھرے پیٹ یہ لوگ گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔ نازش کی چھوٹی بہن کا جی متلانے لگا تھا۔ اباجی نے بھی اماں سے چورن لے کے چاٹنا شروع کر رکھا تھا۔ ڈرائیور کو انھوں نے الرٹ کردیا کہ اگر ان کے منہ سے "ہاؤ" کی آواز آئے تو فوری طور پہ گاڑی روک دے، لیکن اباجی تو بخیر رہے۔ نازش کی بہن کو بیچ میں الٹی ہوگئی۔ اماں نے شور ڈالا۔

"گڈی رو کو گڈی رو کو یہ اپنی چھوٹی کو الٹی ہونے لگی۔" پر سینڈوچ بنی چھوٹی بھلا کرتی بھی کیا۔ اباجی نے جو بچی کچھی بوٹیاں ہوٹل میں پیک کروائی تھیں ان کا شاپر گود میں تھا جھٹ سے کھولا۔

"جا تیرا بیڑا غرک جائے چھوٹی کمینی' ناس پھیر دیا تو نے اتنی پیاری بوٹیوں کا ایسا ایسا سوہنا لیگ پیس بچایا تھا لے کے سارے کا دلیہ بنا دیا۔"

"ہاں اس کا منہ اب اسی میں گھسیڑ دیں۔ ایک سالم لیگ پیس میرا تھا اندر۔" مشو نے روہانسے ہوتے ہوئے فریاد کی تھی۔

رابعہ نے اکتاہٹ سے بھرپور ایک گہرا تاسف زدہ سانس چھوڑا اور سب پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ تھکے ہارے سب ہی بوجھل بوجھل سے ہلکی پھلکی جھپکیاں لے رہے تھے۔ فہد اور نازش پہ نگاہ پڑی تو وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز سر جوڑے سرگوشیاں کرنے میں مگن تھے۔ رابعہ نے بھی گاڑی کی بیک سے سر ٹیک کے آنکھیں موندلیں واپسی کا سفر نا جانے کیوں بے حد اعصاب شکن محسوس ہوتا ہے۔

☼ ☼ ☼

دو ماہ کے اندر فہد نے نازش کو دبئی بلوا لیا تھا۔ دادی بے حد آزردہ سی کئی دن سب سے کٹی کٹی سی کمرے میں پڑی رہیں۔ رابعہ اور مریم دل جوئی کی خاطر آنے بہانے ارد گرد منڈلاتی رہیں، مگر دادی کو سمیع ہی کا دلاسا کام آیا۔ اس نے فون کر کر کے دادی کا اتنا دل بہلایا اور اپنی محبت کا اس قدر یقین دلایا کہ فہد کی بے حسی کے غم کو بھلانے پہ مجبور ہوگئیں۔ سمیع کی جب بھی اتفاقاً مریم سے بات ہوتی تو وہ اسے دادی کا خصوصی خیال رکھنے کو کہتا۔ وہ کسی کٹھی میٹھی بات کی منتظر رہتی مگر سمیع کی تان دادی سے شروع ہو کر دادی پہ آٹوٹتی۔

دادی تو وہ اس کی بھی تھیں، مگر سمیع اور اس کے بہن بھائیوں کا جھکاؤ زیادہ ہونا فطری عمل تھا۔ آخر پالنے والا کا درجہ پیدا کرنے والا سے بڑا یونہی تو نہیں۔ مریم کو اس چیز کا احساس بھی تھا اور وہ سمیع کی خوشی کی خاطر پہلے سے زیادہ دادی کی دیکھ بھال کرنے کی کوشش کرتی تھی، مگر ایک کسک سی دل میں ہر وقت سوئی چبھوتی رہتی کہ کہیں سمیع بدل تو نہیں گیا۔ آخر وہ اشارے کنائیوں میں ہی سہی اظہار کیوں نہیں کرتا۔ کیا وہ پر فسوں لمحات بھلا بیٹھا تھا جب مریم کا بازو اس کے ہاتھ میں قید تھا اور نگاہیں' نگاہوں میں الجھی تھیں۔ اسے تو اب بھی دن رات سوتے جاگتے ان لمحات کا تصور گدگدا دیتا تھا' لیکن سمیع نے دبئی واپسی کے بعد کبھی بھولے سے بھی ایسی کوئی رس بھری بات مریم کے کان میں نہیں انڈیلی تھی جس کی بنیاد پہ اس کے بے قرار دل کو قرار آیا رہتا۔

دن ان ہی بے زاریوں کے تانے بانے بنتے گزر رہے تھے۔ دادی نے اچانک رابعہ کی شادی کا اعلان کردیا اس کے سسرال والوں کو خصوصی دعوت پہ گھر بلوایا اور شادی کی تاریخ طے کردی۔ عام طور پر لڑکے والے اس رسم کو نبھاتے ہیں، مگر دادی چونکہ بزرگ تھیں اور رابعہ کے ہونے والے سسر کی سگی ممانی تھیں وہ بڑا لحاظ کرتے تھے ان کا' سو جیسا انہوں نے طے کیا رابعہ کے سسرال والوں نے بخوشی مان لیا۔

مریم کے جامد روز و شب جیسے کسی گہری نیند سے جاگ اٹھے۔ رابعہ کی شادی پر سمیع کو تو آنا ہی تھا لہٰذا اس کی چال میں آج کل پھر مور رقص کرتا تھا۔

سمیع آیا سب سے ملا۔ وہ بھی صحن کے ایک طرف بنی ڈیوڑھی میں چھپی کھڑی تھی۔ سب صحن میں اکٹھے تھے اور ملنے ملانے کے بعد سمیع کو اوپر اپنے کمرے میں جانے کے لیے ادھر سے ہی گزرنا تھا اور پھر اس نے اس کے بھاری قدموں کی چاپ سنی وہ دل

کی دھڑکنیں سنبھالے ساکت کھڑی تھی۔ ہاتھ میں سفری بیگ تھامے سمیع وہاں سے گزرنے لگا تو ایک کونے میں دبکی کھڑی مریم کو دیکھ کے اچنبھے سے اس کے قریب آیا۔ مریم نے سہمی نگاہوں سے اس کی آنکھوں میں جھانکا آیا کوئی محبت کا رنگ اب بھی جھلکتا ہے کہ نہیں۔ چند پل یوں ہی سرک گئے سمیع نے اپنا بایاں ہاتھ بلند کیا۔ اس کے چہرے کے قریب لایا اور ایک جھٹکے سے ماتھے پہ جھولتی لٹ کھینچ کر بولا۔

"کہاں تھیں تم کتنے مہینے سے ترس رہا تھا تمہاری دید کو اور تم یہاں چھپ کے بیٹھی ہو۔ اتنی ہی محبت ہے بس۔" سارے اندیشے دم توڑ گئے۔ روح تک میں سرور سا اتر گیا تھا۔ بے خودی میں مریم نے آنکھیں میچ لی تھیں۔ فدیک ٹک اس کے ملیح چہرے کو تکے جا رہا تھا کسی کے قریب آتے قدموں کی چاپ نے ان دونوں کے ارتکاز کو توڑا تھا۔

"اس دفعہ تمہیں اپنے نام کروانے آیا ہوں... تیار رہنا۔" سرگوشی میں اسے کہتا وہ جلدی سے سیڑھیاں چڑھ گیا تھا اور پیچھے مریم اپنی اتھل پتھل ہوتی دھڑکنوں کو سنبھالتی اس کی پشت تکتی رہ گئی۔

✡ ✡ ✡

"تو باؤلا ہوا ہے کیا... بہن کے ہاتھ پیلے کرنے آیا ہے یا اپنا سہرا سجانے اور پھر کتنا خرچ ہو گا یہ سوچا ہے۔ مجھ میں تو ہرگز ہمت نہیں کہ میں بھاگ دوڑ کروں۔ رابعہ بے چاری نے بھی مریم اور اس کی ماں کے ساتھ جا جا کے تیاری کی ہے ورنہ مجھ جھلی کو کیا پتا کہ بچیاں کیا پہنتی اوڑھتی ہیں آج کل اور تجھے کیا لگتا ہے وسیم ایک دفعہ کہے پہ اپنی لڑکی پکڑا دے گا۔ اتنی پسوڑی میں کوئی رشتہ دیتا ہے کیا؟؟"

دادی نے سمیع کی بات سنتے ہی اچھی بھلی تقریر کر ڈالی تھی اور سمیع اس ردعمل کے لیے تیار تھا اس نے ایک طویل سانس بھری اور کھسک کے دادی سے قریب ہو بیٹھا۔ گھٹنے تھام کے نرم ہاتھوں سے دباتے ہوئے بولا۔

"دادی یہ سب میں سوچ کے آیا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں سب ہو جائے گا۔ رابعہ کی شادی میں ابھی پورے دو ہفتے ہیں اور اتنے دن میں آرام سے تیاری ہو جائے گی۔ آپ بس جا کر چاچو سے بات کریں۔ مجھے یقین ہے وہ نا نہیں کریں گے۔"

"کیوں... تجھے کیسے یقین ہے... ہاں بول..." دادی نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ اس کے نظر چرانے پہ وہ لمحے میں بات کی تہ تک پہنچی تھیں۔ مسکراہٹ دباتے ہوئے بولیں۔

"تب ہی آج کل مریم میرے اردگرد منڈلاتی ہے ورنہ پہلے تو کبھی دادی کا خیال اتنا نہیں آیا تھا۔ ہمم...! یعنی یہ کھچڑی کب کی پک چکی ہے اب بس دم کھولنا باقی ہے۔"

"تو آپ کھول آئیں نا جا کر تاکہ خوشبو ہر سو پھیل جائے۔" اس نے شرارت سے کہا تو دادی نے پیار سے اسے دھپ رسید کی۔

"میں چاہتا ہوں دادی کہ رابی کی شادی کے بعد آپ یہاں اکیلی نا ہوں۔ مریم آپ کے ساتھ ہو گی تو میری ٹینشن ختم ہو جائے گی۔ ورنہ کون آپ کا دھیان رکھے گا۔ چاچو یا تایا کی طرف آپ رہ نہیں پائیں گی۔ اس لیے ساری پلاننگ کر کے آیا ہوں۔ جتنا بجٹ ہے نا میرا اسی میں شازیہ چچی کو بول دیں گے کہ ضروری شاپنگ کر لیں باقی شادی کے بعد شوق پورے کر لے گی وہ۔ میں چلا جاؤں گا تو آپ اور آپ کی پوتی کپڑے زیور سے دل بہلائے رکھیے گا۔"

وہ پرسکون انداز میں نیم دراز ہوتے ہوئے ساری فیوچر پلاننگ دادی کے آگے رکھتے ہوئے بولا۔ دادی کی پرسوچ نظریں اسی پہ جمی تھیں جو آنکھیں موندے سہانے تصور میں گم مسکرا رہا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ وہ کیا غلطی کر بیٹھا ہے۔

✡ ✡ ✡

خواب یوں پورے ہوتے ہیں مریم نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ دلہن بنی بیٹھی تھی سمیع کے

سجے سجائے کمرے میں... زرتار لہنگے اور جڑاؤ زیورات پہنے وہ سرتاپا محبت کے حسین رنگ میں رنگی سمیع کی منتظر تھی۔ اس کے چہرے پہ تھکن کا شائبہ تک نا تھا۔ وہ کئی دن سے صبح سے شام بازار میں خوار ہو ہو کر شادی کی تیاری میں مشغول رہی تھی۔

دو دن پہلے زبردستی دادی نے گھر بٹھا دیا کہ اب بس کرو جتنی تیاری ہوگئی بہت ہے۔ باقی شادی کے بعد ساتھ ساتھ کرتی رہنا۔ اس کے لیے تو سمیع کا اچانک شادی کا شوشا کھڑا کردینا ہی خاصے اچنبھے کی بات تھی جبکہ ابھی تک دادی نے اس کا رشتہ بھی نہیں مانگا تھا' لیکن جب نصیب میں سنجوگ لکھے ہوں تو سب کچھ ایک مقررہ لائحہ عمل کے تحت ہوتا چلا جاتا ہے۔

دادی شام چار بجے مٹھائی کا ڈبا لے کے ان کے پورشن میں آئیں اور اگلے آدھے گھنٹے میں اس کا رشتہ طے ہو کر اس کے ہاتھ میں شگن کے پیسے بھی رکھ دیے گئے۔ وسیم صاحب کا تو بھتیجا تھا' انہیں پیارا تھا' لیکن شازیہ چچی کو بھی کوئی اعتراض نا ہوا کیونکہ سمیع پہ دبئی کا ٹیگ لگا تھا۔ داماد دبئی میں نوکری کرتا تھا کل کو بیٹی بھی چلی جاتی۔ یہ شو میکے میں مارنا انہیں یقیناً" بے حد بھاتا۔

ماجدہ تائی کے تیور کوئی بہت خوش کن نہیں تھے' لیکن جی کڑا کر کے مبارک بھی دی اور دعا بھی۔ بس ایک جلاپا ہوتا ہے نا جو بے وجہ ہوتا ہے۔ وہ کم بخت کسی کی خوشی میں خوش نہیں ہونے دیتا۔ وہی حال ماجدہ تائی کا تھا۔ مریم کے لیے تو سمیع کے ساتھ سے بڑھ کر بھلا کیا تھا وہ تو قسمت کی اس مہربانی پہ نازاں تھی۔

دروازے کی چرچراہٹ پہ اس کا دھیان بٹا تھا۔ وہ سمٹ کے بیٹھی تھی مزید سکڑ گئی۔ سمیع نے دروازہ بند کیا اور دھیمے قدموں سے چلتا سیج پہ اس کے قریب آکے بیٹھ گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے وجود سے پھوٹتی جاں فزا مہک کو سانسوں میں اتارا تھا۔ سمیع نے ایک گہری سانس بھر کے مریم کا ہاتھ تھاما اور اپنی چوڑی ہتھیلی میں دبا لیا۔ شرم سے دہری ہوئی مریم کے کان منتظر تھے اپنے پیا کے محبت کے رس میں ڈوبے اظہار سننے کو... اس نے آنکھیں میچ لیں۔ وہ صرف سننا چاہتی تھی اور سن کے محسوس کرنا چاہتی تھی۔

"کہا تھا نا تمہیں اپنے نام کروانے آیا ہوں... لو دیکھ لو میں اپنے قول کا کیسا پکا ہوں۔ آج سے تم میری ہو۔" مریم کے لب مسکرائے' مگر اس نے آنکھوں کے جھروکے نہیں کھولے تھے۔ وہ یہ فسوں توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ "دیکھو مریم جس جلدی میں یہ شادی ہوئی ہے' مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے تمام ارمان پورے نہیں کرپایا' لیکن دادی کو میں نے کہہ دیا ہے کہ وہ تمہیں میرے جانے کے بعد ایک ایک چیز دلوائیں گی۔ سال بعد جب میں آؤں گا تو تمہاری سب شکایات دور ہو چکی ہوں گی۔"

چھکڑ' چھکڑ' چھکڑ... دادی کے گھر کے قریب ہی ریل گاڑی گزرتی تھی۔ اس وقت رات کے سناٹے میں اس کی آواز نے پوری شدت سے سماعت کو چیرا تھا' لیکن مریم کو لگا تھا اس کا وجود دھجیوں میں بٹ گیا ہے۔ بھلا یہ کیا کہہ رہا ہے سمیع... ایسا کیوں بھلا...؟ کیا سمیع اسے دبئی نہیں بلوائے گا...؟ کیا وہ پورا ایک سال سمیع کے بغیر دادی کے ساتھ اکیلی یہاں رہے گی...؟ لیکن کیوں...؟ دادی اس کی ساس نہیں تھیں اور نہ ذمہ داری... یہاں ان کے دو بیٹے تھے۔ دادی کی دیکھ بھال تو اصولاً" ان کے ذمے تھی۔ پھر وہ کس لیے سمیع کے بن یہاں تنہائی کا بن باس کاٹے جبکہ سمیع نے کئی بار اشاروں کنائیوں میں اسے شادی کے فوراً" بعد دبئی بلانے کا وعدہ کیا تھا۔ اب اسے آج کی ہی رات ملی تھی اس کے سر پہ بم پھوڑنے کو... جب وہ اس کی ساتھ آنے والے کل کے خوش کن سپنے بننے کی چاہ رکھتی تھی۔

سمیع اسے پریشانی کے گہرے سمندر میں دھکیل کے نیم دراز اس کا ہاتھ تھامے اس کی چوڑیوں کی گنگناہٹ سے محظوظ ہو رہا تھا' مگر اب یک دم اس کا دل بوجھل ہوگیا تھا۔ آج کی رات کی شرم و حیا اس پہ حاوی تھی جو وہ کچھ پوچھ بھی نہیں سکتی تھی کہ لیکن آنے

والے دنوں کا سوچ کے اس کی دھڑکنیں اٹک گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

دادی نے اس کے خوب چاؤ اٹھائے تھے۔ ایک تو وہ پوتی تھی دوسرے لاڈلے پوتے کی بیوی۔ وہ جتنا کرتیں کم تھا۔ رابعہ کی اپنی نئی نئی شادی تھی' لیکن ایسے میں بھی وہ اور ناعمہ مریم کا بھرپور خیال رکھ رہی تھیں۔ نازش کی دفعہ جتنا دل برا ہو چکا تھا' وہ بھولی نہیں تھیں پر اس دفعہ بھابھی من چاہی تھی اور سب سے بڑی بات اپنی ہی کزن تھی۔ دادی کی طرف سے رابعہ کی شادی کے بعد کی جو فکر تھی وہ یکسر دور ہو گئی تھی۔ دادی کسی صورت چاچو یا تایا کے گھر رہنے کو تیار نہ ہوتیں یہ بات طے تھی۔ ایسے میں سمیع کے جانے کے بعد مریم ان کے پاس تھی۔ ان کا خیال رکھنے کو۔ بھلا اپنی پوتی سے بڑھ کر کون دیکھ ریکھ کر سکتا تھا۔

وہ سارا دن ایسی ہی باتیں سنتی رہتی۔ ان بہنوں کو بڑا مان تھا اس پر اور وہ کیسے ان سب کا بھروسا توڑتی کس منہ سے کہتی کہ اسے سمیع کے ساتھ جانا ہے جبکہ وہ خود دور دور تک ایسا سوچ کے نہیں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ تو اس سے شکوہ بھی نہیں کر پائی تھی ان چند دنوں میں اتنی چاہت دی تھی اس نے کہ کسی سطحی بات کے زیر اثر وہ کسی رنجش کو پنپنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے اور وہی ہوا دو ماہ بعد سمیع واپس جا رہا تھا تو اس نے جی کڑا کر کے پوچھ ہی لیا۔

"آپ جا رہے ہیں... میں کیسے رہوں گی آپ کے بغیر...؟" اس کی شرٹ کا اوپری بٹن بند کرتے آنسوؤں سے بھیگی آواز میں اس نے پوچھا۔

"ارے کیسے رہو گی مطلب... جیسی پہلے رہتی تھیں اور کیسے...." وہ اس کی بے چینی سمجھتے ہوئے بھی انجان بنتے ہوئے بولا۔

"پہلے کی بات اور تھی سمیع... پہلے میں آپ کی بیوی نہیں تھی۔ اب ہوں۔ میرا جی اداس رہے گا مجھے یہ دوری کھائے گی۔" وہ لبریز آنکھوں کے ساتھ مان بھرے لہجے میں بولی۔ سمیع نے ٹھنڈی سانس اندر کو کھینچی اور اپنے کالر پہ جمے اس کے دونوں ہاتھ تھام کے سینے پہ رکھتے ہوئے بولا۔

"میں بے خبر نہیں ہوں موم' لیکن میں مجبور ہوں' میں مانتا ہوں کہ میں نے تمہیں جلد از جلد بلانے کا وعدہ کیا تھا پر اب فی الوقت یہ ذرا مشکل ہے۔ دادی ابھی تک فہد کو لے کے دکھی ہیں جس نے میری شادی پہ آنا تو دور کی بات مبارک باد کا فون بھی نہیں کیا۔ ایسے میں' میں بھی وہی حرکت کر ڈالوں تو سوچو دادی کا کیا ہوگا۔ ان کا تو سب کچھ ہم دونوں پوتے ہی تھے۔ وہ کہتی ہیں کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کا نہیں اپنے پوتوں کا بچپن جیا ہے۔ اب اگر میں تمہیں بلا بھی لیتا ہوں تو دادی کا کیا کروں گا۔ وہ تو کسی کے ہاں رہنے کی عادی بھی نہیں تو میں انہیں یہاں کس کے آسرے پہ چھوڑ دوں' ذرا سا صبر کر لو موم... ہو سکتا ہے دادی خود مجھے' تمہیں بلانے کا کہہ دیں۔ یہاں اپنے پاس وہ بڑی پھوپھو کو بلا لیں وہ بیوہ ہیں آ بھی سکتی ہیں' لیکن یہ سب قیاس ہیں حتمی طور پر میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا پر میرا وعدہ ہے کہ میں اپنی موم کو خود سے زیادہ دیر دور رکھ کے پگھلنے نہیں دوں گا۔"

اپنی لمبی چوڑی بات کے آخر میں وہ شرارت سے اس کے سر سے سر جوڑ کر بولا۔ جواب میں مریم مسکرا بھی نہ سکی۔ کتنا پیارا لگتا تھا جب سمیع اسے پیار سے موم بلاتا تھا۔ کتنا منفرد طرز تخاطب تھا اس کے محبوب کا۔ پر اس وقت کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ دل مسوس کر رہ گئی تھی۔ احتجاج کرتی بھی کیسے' سمیع کے اتنے مدلل طریقے سے سمجھانے کے بعد اس کے تمام لفظ حلق میں ہی دم توڑ گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

ان ہی حیلے بہانوں میں مریم نے تین سال گزار دیے تھے۔ کس طرح گزارے یہ بس وہ جانتی تھی' لیکن سمیع نے اس کو اپنے پاس بلوا کے نا دیا۔ شادی

کے ایک ماہ بعد گیا سمیع جب عنایہ دو ماہ کی ہوئی تب آیا۔ اپنی پہلی اولاد کے لیے چیزوں سے بھرا سوٹ کیس لے کر مریم اسے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ عنایہ سے لاڈ کرتے دیکھتی تو جی میں آتا کہ اس سے ڈھیر سارا لڑے۔ اسے بتائے کہ اس کے جانے سے لے کر عنایہ کے ہونے تک اس نے ایک ایک پل کیسے اسے یاد کر کر کے گزارا ہے، مگر وہ بھی ایک کائیاں تھا، ایسا باتوں میں الجھاتا کہ مریم شکوے بھولے بس اس کے قصے سنے جاتی۔

کتنا پکا عہد کیا تھا اس نے خود سے کہ اس بار جو بھی ہو جائے وہ سمیع کو منا کے رہے گی۔ وہ دبئی جا کے رہے گی۔ ایک ماہ رہا تھا وہ اور اس ایک ماہ میں اتنی مصروفیت رہی چھوٹے بڑے کئی کام نمٹاتے اس کی واپسی کا دن آگیا۔ جس دن اسے واپس جانا تھا اس سے ایک رات پہلے سب لاؤنج میں اکٹھے تھے۔ رابعہ اور ناعمہ بچوں سمیت آئی ہوئی تھیں، رونق دیکھ دیکھ دادی کھلی جا رہی تھیں۔ وہ سب کے لیے سبز چائے بنا لائی، سمیع کو بہت پسند تھی۔ اپنا کپ لے کر وہ سمیع کے پہلو میں آبیٹھی۔ رابعہ کی گود میں اس کا دو ماہ کا بیٹا سو رہا تھا وہ اس کے سر کو سہلاتی ہوئی بولی۔

"سمیع اب کے جا رہے ہو تو بیوی اور بیٹی کو بلوانے کا بھی سوچو... مریم کے ادھر رہنے کی بھلا کیا تک اور ادھر تمہیں بھی تو ضرورت ہے۔"

"کیوں میں مرگئی ہوں کیا...؟ ادھر مجھے کسی کی نہیں ضرورت...؟" دادی یک دم تڑخ کر بولی تھیں۔ سب ایک ساتھ حیران سے انہیں دیکھتے رہ گئے۔ ان کا رد عمل جارحانہ تھا۔ ناعمہ نے رابعہ کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور خود رسان سے گویا ہوئی۔

"اللہ نہ کرے دادی آپ کو کبھی کچھ ہو، لیکن مریم آخر سمیع کی بیوی ہے اور اس کا بھی تو دل کرتا ہوگا نا اپنے شوہر کے ساتھ رہنے کو اور آپ اپنی فکر کیوں کرتی ہیں، ہم سب ہیں نا آپ کے پاس، تایا اور چاچو تو کب سے آپ کو بول رہے ہیں کہ ان کے پورشن میں چل کے رہیں پر آپ مانتی ہی نہیں اور پھر مریم آپ ہی کی پوتی ہے، آپ کو تو بلکہ سمیع کے کان کھینچنے چاہئیں کہ اس نے آپ کی پوتی کو ابھی تک دبئی کیوں نہیں بلایا... کیوں سمیع...!"

اس نے سبھاؤ سے بات مکمل کر کے شرارتاً سمیع کو دیکھا تو وہ مسکرا دیا، لیکن نگاہیں دادی پر ہی تھیں جن کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا ایک جا رہا تھا اور وہ سمیع ہی کیا جو دادی کے ڈھنگ نا جانے۔ بالوں میں ہاتھ پھیرتا جماہی روکتا، سست سے لہجے میں بولا۔

"ابھی نہیں آپا... ایک آدھ سال ٹھہر کر دیکھوں گا... ابھی میں فیملی افورڈ نہیں کر سکتا۔ جب اس قابل ہو جاؤں گا تو بلوالوں گا آپ کوئی اور بات کریں۔" اس نے بات بدل دی تھی۔ دادی کے تنے ہوئے اعصاب یک دم نارمل ہوئے تھے۔ ناعمہ نے اپنا کوئی سسرالی مسئلہ چھیڑ دیا تھا۔ رابعہ نے سمیع کو تاسف سے دیکھا وہ بھی اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔ اس نے ساری بات خود پر لے کر دادی کا بھرم رکھا تھا، لیکن سمیع کے دوٹوک رویے نے مریم کے دل میں ایک اور گرہ لگا دی تھی۔

☆ ☆ ☆

سمیع چلا گیا اور مریم کو یکسر چپ لگ گئی۔ وہ لگے بندھے انداز میں روز مرہ کے امور نمٹائے جاتی نہ کوئی شوق نہ امنگ۔

تھکے تھکے سے حلیے میں دن سے رات کرتی اور عنایہ کو سنبھالتی۔ دادی کا خیال اسی طرح کرتی تھی بس اب پاس بیٹھ کے دکھ سکھ سننے کو دل نہیں کرتا تھا۔

اس دفعہ جب سے اس کی واپسی ہوئی تھی مریم نے اس سے فون پر صحیح سے بات تک نہ کی تھی۔ وہ اسے نظر انداز کر رہی تھی۔ اسے بے چینی لاحق ہوگئی تھی۔ وہ مریم کی فیلنگز سمجھتا تھا، مگر بے بس تھا۔ دادی اس کی زندگی میں اس قدر اہمیت رکھتی تھیں جتنی کسی اور کے لیے نہیں۔ اس نے زمانے کے سرد و گرم دادی کی ساتھ کی وجہ سے جھیلے تھے تو اب وہ انہیں اس بڑھاپے میں تنہائی جھیلنے کے لیے کیسے چھوڑ دیتا۔

بھلے سے وہ اکیلی نہیں تھیں، لیکن خوددار اور انا پرست تھیں۔ ساری عمر کسی کے گھر نہیں رہی تھیں خواہ بیٹے کا ہی کیوں نہ ہو۔ دوسری طرف مریم کے لیے بھی دل بے بس ہوا جارہا تھا۔ اس سے شادی بعد میں کی تھی اور دبئی بلانے کا وعدہ پہلے۔ پر حالات ایسے رخ پر آگئے تھے کہ ممکن نہیں ہوپا رہا تھا۔ اوپر سے مریم کا اگنور کرنا الگ تکلیف دے رہا تھا۔ وہ بات تو کررہی تھی، مگر ہوں، ہاں سے آگے کچھ بھی نہیں اور پھر اس کا حل سمیع نے یہ نکالا کہ پہلی دفعہ وہ پورے چھ ماہ بعد ہی چھٹی لے کر پاکستان آگیا تھا مرجھائی بولائی مریم کھل اٹھی تھی۔ ساری ناراضی بھلائے وہ سمیع کے گرد منڈلانے لگی۔ بس دن پلک جھپکتے گزر گئے اور سمیع کی واپسی کا دن آگیا۔ ایئرپورٹ نکلنے سے پہلے ہی وہ دوبارہ سے چپ کے خول میں بند ہوچکی تھی۔ دادی کو اسے دیکھ دیکھ غصہ آرہا تھا۔ ڈرامے باز، چلتر کا خطاب جی ہی جی میں کئی بار وہ اپنی پوتی کو دے بیٹھی تھیں۔

سمیع چلا گیا اور پرانے روزوشب لوٹ آئے۔ دادی پوتی میں ضرورت کے علاوہ دوسری کوئی بات نہ ہوتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنا حریف سمجھے بیٹھی تھیں۔ ان ہی ادھ موئے دنوں میں مریم کو ایک بار پھر امید سے ہونے کا احساس ہوا۔ فطری بات تھی دادی بھی خوش ہوئیں اور سمیع نے تو ہونا ہی تھا۔ چھٹا مہینہ لگا تو وہ ایک بار پھر پاکستان تھا، لیکن اس دفعہ جو صورت حال اسے پیش آنے والی تھی اس کے سان و گمان میں نہ تھی۔ مریم ڈنکے کی چوٹ پر میدان میں اتر آئی تو مقابلے میں دادی بھی ہتھیاروں سے لیس مدمقابل تھیں۔ اس بار دونوں کا ایجنڈا ایک ہی تھا۔ ”مجھے دبئی جانا ہے۔“

لو بتاؤ بھلا... دادی کو کیا سوجھی سب حیران پریشان رہ گئے تھے۔ سمیع خود بے یقینی کی کیفیت میں گھرا تھا۔ بھلا پچھتر سال کی دادی اور وہ بھی چھوٹی بڑی کئی بیماریوں میں مبتلا جہاز کا سفر کیسے کریں گی اور کر بھی لیں تو وہاں انہیں رکھنا ہرگز آسان نہیں تھا، ایک چھوٹے سے کمرے میں سارا سارا دن گزار دینا بغیر کسی مصروفیت کے مذاق نہیں تھا۔ مریم تو ایسا کرسکتی تھی کہ عنایہ کے کام ہی نہیں ختم ہوتے تھے، مگر دادی کا سارا دن صحن میں گزرتا تھا۔ کمروں میں تو ان کا دم گھٹتا تھا۔

جس گھڑی سے شازیہ بانو اور ماجدہ تائی کو دادی کے پلان پتا چلے تھے۔ دونوں کا بس نہیں چلتا تھا ان کی سانسیں وقت سے پہلے پوری کردیں۔ شازیہ بانو تو اپنی بیٹی کے لیے روتی تھی جبکہ ماجدہ تائی کو دادی سے بلا کی جلن محسوس ہورہی تھی۔ وہ مائی جس نے ساری عمر اپنا محلہ ”پھلانگ“ کے نہ دیکھا، اب جاکے دبئی دیکھ آئے۔ اوہیں! مریم البتہ قدرے نارمل تھی۔ اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ سمیع بھلے ان دونوں کو لے جائے۔ اسے تو بس سمیع کے پاس ہونے سے مطلب تھا۔ بھلے سے وہاں کیسی ہی صورت حال پیش آتی۔

ویسے بھی وہ جانتی تھی کہ دادی کے ذہن میں یہ ساری کھچڑی نھی پھوپھو نے پکائی ہے۔ پچھلے کئی دن سے ان کے کافی چکر لگے تھے دادی کی طرف۔ دونوں کمرہ بند کرکے بیٹھی رہتیں نہ کبھی مریم نے پوچھا نہ کبھی انہوں نے بتایا ہاں جب بات کھل گئی تو پھوپھو آتے جاتے برملا کہتی پھرتیں کہ ”اماں کا حق مریم سے زیادہ ہے سمیع پر... پلا پلایا سمیع اماں نے مریم کے حوالے کردیا اس لیے نہیں کہ انہیں یہاں اکیلا چھوڑ کر بیوی لے اور پتلی گلی سے نکل لے۔“

”تو یہ ہے سارے فساد کی جڑ۔“ ماجدہ تائی اور شازیہ بانو اٹھتے بیٹھتے نند کو کوستی تھیں۔ انہوں نے دادی کو اتنا پر اعتماد کردیا تھا اتنے سے دنوں میں، مانو دن کے دس پھیرے دادی ہوائی جہاز کے مارتی ہوں۔ نھی پھوپھو کا چھوٹا لڑکا ہر کام میں پیش پیش تھا۔ پاسپورٹ کے لیے ساری بھاگ دوڑ اس نے اپنے ذمے لے لی تھی۔ ناعمہ اور رابعہ کو معلوم ہوا تو دونوں نے سر پیٹ لیا۔ ناعمہ تو کراچی میں تھی ایک دم نہیں آسکتی تھی، کچھ اس کے سسر قریب المرگ تھے۔ ان کو چھوڑ کر آنا تو کسی طور مناسب نہیں تھا۔ رابعہ کے گھر اس کی چھوٹی نند کی شادی تھی۔ سو بکھیڑے تھے پھر بھی گھڑی بھر کو آئی اور ماتھا پھوڑ کے چلی گئی۔ دادی کس

سے مس نہ ہوئیں۔

سمیع اس ساری صورت حال سے بوکھلا گیا تھا۔ مریم کو لے جانے کو اس کا خود کا بھی من تھا اس دفعہ اس نے دادی سے بات کرنے کا ارادہ بھی باندھ رکھا تھا' مگر یہاں ساری گیم الٹی ہوئی پڑی تھی۔ وہ دونوں کو نہیں لے جاسکتا تھا اور دادی کا اٹل فیصلہ تھا کہ مریم بھلے نہ جائے' وہ جا کے رہیں گی۔ دل کی مریضہ وہ شوگر کی بیماری انہیں۔۔۔ دمے کی شکایت ان کو۔۔۔ افف! سمیع کرتا تو کیا کرتا۔۔۔! ایسے میں بس ایک ہی حل تھا کہ نہ مریم جائے اور نہ دادی۔۔۔ پر دادی اس پہ بھی راضی نہ تھیں۔ انہیں بس جانا ہی جانا تھا۔ اس کھینچا تانی کا ماجدہ تائی اور شازیہ بانو کو ایک ہی حل سجھائی دے رہا تھا۔ ارجنٹ نوٹس پر ''اخلاق پائین'' کو بلاوا بھیج دیا گیا تھا دونوں کو شدت سے ان کے پہنچنے کا انتظار تھا۔

☼ ☼ ☼
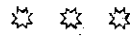
ماجدہ تائی کے پورشن میں اس وقت مکمل سناٹا تھا کیونکہ تمام افراد خانہ ڈرائنگ روم میں اخلاق پائین کو گھیرے بیٹھے تھے۔ جہاں اخلاق پائین اپنی اخلاقیات بگھارنے کے بعد شازیہ بانو اور ماجدہ تائی کی چپتا سن رہے تھے۔

ابھی پون گھنٹا پہلے ہی وہ پہنچے تھے۔ دورنگی جرابیں پہنے اور جرابوں پر قینچی چپل پھنسائے بقول ان کے' انہیں اتنی پسوڑی ڈالی گئی تھی فون کال پہ کہ وہ دودھ تک ابلتا چھوڑ آئے تھے۔ (اخلاق پائین کو لمبی لمبی چھوڑنے کا مرض بھی لاحق تھا) دونوں جرابوں کے انگوٹھے جراب پھاڑ کر باہر نکلے رونمائی کروارہے تھے ہر دو منٹ بعد اخلاق پائین انہیں یوں اچکاتے جیسے وہ اخلاقیات دکھاتے ہوئے سامنے والے کا حال پوچھتے ہوں۔ اصل میں اخلاق پائین پیدائشی طور پر نرالی حرکتیں کرتے پیدا ہوئے تھے۔ یہ واحد بچے ہوں گے جو اپنی پیدائش کے وقت روتے سے زیادہ ہنستے محسوس ہوتے تھے۔ یہ عادت شاید فطرت کا حصہ تھی کہ آئندہ زندگی میں بھی انہیں ہر رونے والی بات پہ ہنسنا آیا۔

ہمیشہ اپنے فیل ہونے کی اطلاع دیتے ہوئے ہنس ہنس کے دوہرے ہوجاتے۔

ماں بے چاری ساری عمر ان کے ہنسنے پہ روتی ہی رہی۔ بڑے جتنوں سے شادی کی تھی اچھی بھلی بیوی تھی پر اخلاق پائین کے لچھن ہی نہیں تھے ''بسنے'' والے۔ بے چاری خرچا مانگتی تو کہتے۔

''خرچا تو خرچ کردیا (ہنسی) اب اگلے مہینے وقت سے پہلے مانگ لینا خرچ سے پہلے دے دوں گا (ہنسی)۔'' ناراض ہو کر میکے جاتی تو ماں۔۔۔ بے چاری منا منالے آتی اخلاق پائین کو اس بات پہ بھی ہنسی آتی ایک دن ہنستے ہوئے بیوی سے بولے۔

''میکے بار بار نہ جایا کرو۔ ایک ہی دفعہ دفع ہوجاؤ۔'' (ہنسی)۔ لو جی ہنستے ہنستے طلاق دے دی۔ قرین قیاس یہ ہی تھا کہ تین دفعہ طلاق کے بجائے تین دفعہ ہنسے ہوں گے اور یہ پہلا موقع تھا جب ان کی بیوی رونے کے بجائے ہنستے ہنستے میکے گئی۔ اماں ان کی' ان کے ہنسنے کے دکھ میں گزر گئیں' اور اب یہ مزے سے ہنستے ادھر ادھر پھرا کرتے۔ دولت وافر بھی صد شکر اسے ہنسی میں نہ اڑایا تھا' لیکن طرز زندگی سادہ تھا جی میں سماتا تو ملک سے باہر کا رخ بھی کرلیتے ورنہ اپنے وطن کے کئی گوشے ابھی ایسے تھے جہاں جاکر ابھی انہیں ہنسنا تھا آج کل کوئٹہ میں تھے وہاں سے ماجدہ تائی کی ایک کال پر بھاگے آئے تھے۔

دادی سے ان کی رشتے داری تھی۔ سگے بھانجے تھے۔ دادی کو ان سے پیار بھی تھا اور ان کی حرکتوں سے چڑتی بھی تھیں اس کے باوجود سب کو امید تھی کہ اخلاق پائین اس مسئلے کو حل کرلیں گے کیونکہ ایسے مسئلے مسائل اخلاق پائین سونگھتے پھرتے تھے وہ ''جگت پائین'' تھے بچے بڑے سب کے پائین ان کو یہ لاحقہ بے حد بھاتا تھا۔ اپنا آپ معتبر محسوس ہوتا تھا یہ بھی اخلاق پائین کا اپنا ذاتی ''پائندہ'' خیال تھا۔

دادی آج کل سارا سارا دن ننھی پھوپھو کے گھر پائی جاتی تھیں' اس لیے ماجدہ تائی نے موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مرچ مسالا لگا کر پوری صورت حال

اخلاق پائین کے سامنے رکھ دی تھی' ساری کتھا سننے کے دوران وہ بیسیوں بار ہنسے تھے۔ سمیع زچ ہو کر بولا۔

"میں سچ میں بے حد پریشان ہوں' دادی کو تکلیف نہیں دے سکتا اور مریم کو بھی کب تک خود سے دور رکھوں' بیوی ہے میری' آخر اس کا بھی حق ہے' مجھ پر' اور دونوں کو لے جانے کی میری پسلی نہیں!" وہ بائیں ہاتھ سے بھنویں سہلاتا ہوا بے بسی کی انتہا پہ تھا' ماجدہ تائی اور شازیہ بانو نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا' چائے کا خالی کپ ٹیبل پر رکھ کر ماجدہ تائی عجلت میں بولیں۔

"دیکھ اخلاق! تجھے ٹھٹھے کرنے کو نہیں بلایا' اس کام کے لیے ہمارے گھر بندوں کی کمی نہیں' تیرے پاس ہر قسم کے ذلیل سے ذلیل مسئلے کا حل ہوتا ہے' اس سیاپے کو مکا جس نے ہماری نیندیں حرام کر رکھی ہیں' کسی طرح روک اماں کو دبئی جانے سے ورنہ میں تجھے کھالوں گی' ہاں نہیں تو!"

سب کی گردنوں کا رخ یک دم ماجدہ تائی کی طرف ہوا تھا جو جوش میں ہوش کھوتے ہوئے "اُنے وا" اپنے خیالات کا اظہار کر گئی تھیں۔

اخلاق پائین نے اک نگاہ مستانہ ماجدہ تائی پہ ڈالی اور لہک کے ہنس دیئے۔

"ہاہا' ہاہا' ہاہاہا! اصل پیڑ تو تیرے اندر ہے ماجدہ آپا' تجھے خالہ کے دبئی جانے کا صدمہ سب سے زیادہ ہے' تیرا بس چلے تو تو خالہ کو چلتے جہاز سے دھکا دے دے' شوہدی نا ہووے تے' ہاہا' ہاہا' ہاہاہا!"

اخلاق پائین کی زبان کے آگے کھائی تو تھی ہی' اب انہیں کیا لگے کس کو دھکا مار گرا ڈالا' ماجدہ تائی یوں پول کھلنے پر پھیکی ضرور پڑ گئیں پر یہ موقع اخلاق پائین سے بگاڑنے کا نہیں تھا' اس کام کے لیے وہ پھر بھی کمر کس سکتی تھیں' فی الحال وہ نرخ کر بولیں۔

"قیانے ناں گیا کر اخلاق! اب اصل مدعے پر آ' کسی طرح اماں کو روک اور مریم کی راہ سیدھی کر' چل میرا ویر' سوچ شاباش!"

"ویسے خالہ کو سوجھی کیا' بیماریوں کی پوٹ ہے وہ' اس کا ساہ' راہ میں ہی بند ہو جانا ہے' جب جہاز نے اوپر اٹھنا ہے تو اس نے ککڑی بن کے سیٹ کے نیچے جا گھسنا ہے' ہاہا' ہاہا' ہاہا!"

"اخلاق پائین پلیز! دادی کے لیے بات کرتے اخلاقیات کا خیال رکھیں!" سمیع نے انہیں ناگواری سے ٹوکا' آگے بھی اخلاق پائین تھے' جن پہ کسی بات کا اثر ہوتا تو ان کا فالتو کا ہنسنا پالتو بن کے گلے کے اندر بند ہوا ہوتا...!

"او باؤ' تیری دادی میری ماسی' سمجھا' میں اس کی رگ رگ سے واقف' میرے ہی ہاتھوں میں بوڑھی ہوئی ہے وہ' ہاہا' ہاہا' ہاہاہا' اب سن میری بات تو اپنی تیاری پوری رکھ' مریم کے ساتھ جانے کی' لیکن تجھ سے پہلے خالہ دبئی دیکھ کے واپس بھی آجائے گی' بس تم سب دیکھو کہ تمہارا اخلاق پائین کرتا کیا ہے' ہاہا' ہاہا' ہاہاہا!"

سب نے اچنبھے سے اک دوسرے کو یوں دیکھا جیسے کسی نیورو سرجن کو ڈسکو کرتے دیکھ لیا ہو' اک مریم تھی جس نے فراغت سے سانس سینے میں اتاری تھی اور وہاں سے اٹھ کے کمرے کا رخ کیا تھا' یوں جیسے اسے یقین تھا کہ اب وہ دبئی جا کے رہے گی!

☼ ☼ ☼

"لے کھا میرا پتر' یہ بھی کھا' قسمے میں بڑا یاد کر رہی تھی تجھے' آج کل میں تجھے بلانے والی تھی میں' تجھ سے ملے بغیر دبئی تھوڑی نا جا سکتی تھی میں!"

دادی کیلئے' انگور اور خربوزے جو بڑی بڑی ڈشوں میں کاٹ چھیل کے اخلاق پائین کے آگے دھرے گئے تھے' انہیں بڑی محبت سے کھلائے جا رہی تھیں' حالانکہ اخلاق پائین کو کہنے کی ضرورت نہیں تھی' وہ خود ہی بے دریغ کھا رہے تھے دادی شام پڑتے ہی گھر واپس آ چکی تھیں' بھانجے کو دیکھ کے فرط مسرت سے بے تحاشا رو دیں اور اخلاق بھائی بے تحاشا ہنسے' شازیہ بانو اور ماجدہ تائی بھی وہیں بیٹھی تھیں' ماجدہ تائی تو

انہیں یوں کھاتا دیکھ کر دسیوں بار جی جی میں انہیں "کمینہ چول" کہہ چکی تھیں' شازیہ بانو بھی پہلو پہ پہلو بدلے جارہی تھیں' دونوں کو ہی جلدی تھی کہ وہ کب بلی تھیلے سے باہر نکالیں گے!

"دبئی!" اخلاق یامین نے انجان بنتے ہوئے دادی سے پوچھا "خالہ تم دبئی جارہی ہو' ارے واہ' بتایا بھی نہیں کیسے جاؤ گی' ریل پر یا بس پر؟ ہاہا' ہاہاہا!"

"ارے میں نے تو بہتیرا زور لگایا تھا اپنی نبھی کے چھوٹے کو کہ مجھے ریل کا ہی ٹکٹ کٹادے' پر وہ بولا۔ نانی۔ اب دبئی تو جہاز پر ہی جانا ہوگا۔ بس میں بھی چپکی ہوگئی' اب اپنے سمیع کے ساتھ اڑن کھٹولے (ہوائی جہاز) پر ہی بیٹھ کر جانا پڑے گا!"

"اشکے وئی اشکے" نبھی کے چھوٹے کی اتنی اپ ٹوڈیٹ معلومات پر اخلاق یامین نے اس پر غائبانہ "لعنت منہ" بھیجی' کچھ دادی کو بھی ٹٹول رہے تھے کہ ان کے اندر کتنے فیصد "ہوشیاری" کے جراثیم سرایت کرچکے ہیں۔

"ہمم! ہاں کہتی تو ٹھیک ہی ہو خالہ پر ذرا چوکنی رہنا' یہ مردود جہاز والے بڑے خرانٹ ہوتے ہیں' بیبیوں کو الگ بٹھاتے ہیں اور مردوں کو الگ' تم اپنا ٹکٹ کس کے پکڑے رکھنا' بہانے سے لے لیتے ہیں اور بعد میں مکر جاتے ہیں' تم ٹھہری بڈھی مائی' تم نے آگے سے بھلا کیا کہہ لینا ہے' وہ تو سمیع ساتھ ہو تو نبٹ بھی لے پر تم اکیلی' ہا' ہاہا' ہاہاہا!" انہیں یاد آگیا کہ وہ ابھی تک ہنسے نہیں' لہٰذا دادی کے چہرے کی سراسیمگی کو نوٹس کرکے پہلے ہنس کی فل ان دی بلینک پوری کی تھی۔

"پر تم گھبراؤ نہیں خالہ' اگر وہ تمہیں ٹکٹ واپس نا کریں تو چھپ کے کسی نکڑ میں بیٹھ رہنا' ورنہ ان کی نظر میں آگئی تو چلتے جہاز سے اتار دیں گے ہاہاہا۔" دادی کے چہرے پہ ہوائیاں پسینے کے قطروں کے ساتھ بہنے لگیں' انہوں نے ہاتھ میں تھاما انگوروں کا گچھا واپس پلیٹ میں رکھا اور بھانجے سے دھیمی آواز میں پوچھنے لگیں۔

"یہ... اپنا... جہاز سے اتارتے وقت پوڑھی (سیڑھی) تو جوڑ ہی دیتے ہوں گے کھوتے کے پتر؟"

"کیسی بات کرتی ہو خالہ' کھوتوں کا سیڑھی سے کیا کام' کھوتے کی طرح لات چلاتے ہیں خالہ لات' ایک ہی دھکا دیتے ہیں بس اور مسافر بے چارہ وہیں سے سیدھا اوپر یا پھر سیدھا نیچے' فکر نا کر خالہ' راہ کوئی بھی ہو' ہے بالکل سیدھی' ہا' ہاہا' ہاہاہا!"

ماجدہ تائی اور شازیہ بانو اس دوران ایک دم چپ بیٹھی رہی تھیں' ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا تھا' اور اب دادی کو پانی پیتے دیکھ کر ان دونوں کو قوی امید تھی کہ وہ ابھی کے ابھی دبئی جانے سے انکار کرنے والی ہیں' لیکن ابھی ان کے ارمانوں پہ گرانے کے لیے دادی کے پاس اوس موجود تھی۔

"وے پتر اخلاق!" ایسے کر کہ تو گولی مار ریل گڈی کو بھی اور جہاز کو بھی' سمیع کو بول کہ اپنا اور میرا بس کا ٹکٹ کٹائے' میں نے سوچ لیا ہے' میں اپنے سمیع کے ساتھ بس میں ہی دبئی جاؤں گی!"

ماجدہ تائی اور شازیہ بانو کے بس میں ہوتا تو دادی کی ہیشگی "دبس" کرادیتیں' لیکن ان دونوں کو اخلاق یامین کے ترکش کے تیروں کا انتظار تھا۔

"ہا' ہاہا' ہاہاہا' او خالہ تمہیں کیا لگتا ہے کہ ہیشہ جہاز پہ بیٹھ کے آنے والا سمیع تمہارے ساتھ بس میں جائے گا' اس کو پتا چلا تو تمہیں گھر بٹھائے گا' پھر تم گھر بیٹھ کے اپنی نبھی کے چھوٹے سے دبئی کی باتیں کرنا' ہا' ہاہا' ہاہاہا!"

"نا' اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ تیری خالہ دبئی نا جا۔ ہاں تو میرا پتر کوئی راہ نکال کہ سمیع آپوں آپ مجھے بس میں لے جائے' کچھ سوچ نا اخلاق پتر!" دادی ڈری ضرور تھیں لیکن جھکی نہیں تھیں' ماجدہ تائی تو مایوس ہوکر وہاں سے اٹھنے ہی لگی تھیں جب اخلاق یامین کی بات پہ واپس ٹک گئیں۔

"دیکھو خالہ' صاف اور کھری بات تو یہ ہے کہ سمیع کو پتا لگا کہ تم بس سے جانا چاہتی ہو تو اول وہ مانے گا

نہیں، دوسرا، ماں بھی گیا تو خود تمہارے ساتھ نہیں جائے گا، اس لیے ایک تیسرا حل ہے میرے پاس اگر تم ہاں بولو تو، ٹھہرو میں پہلے ہنس لوں، ہا، ہاہا، ہاہاہا!"

"فٹے منہ تیرے ہاسے پہ پتر، کبھی دہانہ بند بھی رکھ لیا کر، اب بول، تیسرا حل بتا، اور مجھے بس دبئی پہنچا!"

دادی نے پہلے تو اخلاق پائین کو ہنسنے پہ لتاڑا اور پھر بمشکل کھسک کر آگے ہوئیں، ویسے بھی کچھ کچھ اونچا سنتی تھیں، لیکن محسوس نہیں کرواتی تھیں۔

"تو پھر سنو خالہ، وہ تیسرا حل یہ ہے، ہا، ہاہا، ہاہاہا!"

کمرے میں موجود نفوس سانس روکے ہنسی کے ہچکولوں میں تیسرا حل سن رہے تھے!

☆ ☆ ☆

دادی بس کے ذریعے دبئی جارہی تھیں، یہ بات صیغہ راز میں رکھی گئی تھی، اخلاق پائین نے کسی کو بھی بتانے سے منع کیا تھا، اور دادی نے اس ڈر سے کہ کہیں سمیع ان کو جانے سے روک نا دے، پھپھو کو بھی اطلاع نہیں دی تھی، مبادا ان ہی کے ہاتھوں یہ راز افشا نا ہوجائے، دادی کو ہر صورت سمیع کے پہنچنے سے پہلے دبئی پہنچنا تھا، چونکہ وہ بس سے جارہی تھیں لہٰذا وقت ضائع کیے بغیر کل صبح صبح انہیں نکلنا تھا ورنہ سمیع کے ساتھ جانے میں تو ابھی ایک ہفتہ باقی تھا!

ایک دفعہ وہ دبئی چلی جاتیں، سمیع وہاں خود سے پہلے انہیں پاکر حیران رہ جاتا، پھر بھلے وہ ان کے بس کے ذریعے دبئی آنے پہ خفا ہوتا، کچھ کرتو نا پاتا نا، ان ہی سوچوں میں غلطاں انہوں نے بمشکل رات کاٹی تھی۔

فجر پڑھتے ہی دادی نے لباس تبدیل کرلیا تھا، نک سک سے تیار وہ شازیہ بانو کا "پھٹنگ" کرکے دیا ہوا شلوار قمیص سلیقے سے پہنے، تیل لگا کر بال سنوار کر، پیروں میں چپلی سجا کر اور رہی سہی کسر سر پر اخلاق پائین کی اسپیشل دی گئی کالے شیشوں والی عینک ٹکا کر وہ یوں تیار تھیں جیسے شریکوں کے ولیمہ میں جارہی ہوں۔

بلی کی چال چلتی وہ ڈیوڑھی تک آئیں تاکہ کسی کو خبر نا ہو، جبکہ وہ خود اس قدر بے خبر تھیں، نہیں جانتی تھیں کہ اپنے کمروں میں سب ہی جاگ رہے ہیں اور ان کے گھر سے نکلنے کے منتظر ہیں، وسیم چاچو اور تایا جن کو اعتماد میں لیے بغیر چارہ نہیں تھا، لیکن وہ دونوں اپنی بیویوں کے سمجھانے پہ خاموش ہورہے تھے، اس تیسرے حل میں ہر مسئلے کا حل تھا، اور وہ بھی بخوبی سمجھتے تھے کہ ان کی دمے، شوگر اور ہائی بلڈ پریشر کی مریض ماں جہاز کا سفر نہیں کرسکتی جبکہ بڑھاپا بھی اپنے "جوبن" پر تھا، صرف سمیع تھا جسے اپنے کمرے میں اس وقت شدید بے چینی لاحق تھی، اسے سچ میں دادی کی فکر تھی اور وہ کئی بار اخلاق پائین کو ان کے کمرے میں جا، جا کر کہہ آیا تھا کہ دادی کا بہت خیال رکھنا، مگر جب بار بار کی گردان سے اخلاق پائین کا اخلاق تیل لینے جانے لگا تو مجبوراً سمیع دوبارہ ان کے کمرے میں تو نہیں گیا لیکن فون پہ میسج کرکے مسلسل انہیں زچ کیے جارہا تھا۔

"اخلاق پائین، دادی نے ساری عمر سفر نہیں کیا، پلیز ذرا خیال سے۔"

"او تم فکر ہی نا کرو، تمہاری دادی کی شروعات ہی یادگار رہے گی، ہا، ہاہا، ہاہاہا!"

"یار اخلاق پائین! انہیں چھوڑ کر ادھر ادھر نا ہونا، وہ گھبرا جائیں گی، کہیں بھی گئیں نہیں نا!"

"او میں اپنی قبر کے علاوہ ہر جگہ گیا ہوں، اس لیے مجھ پر بھروسا رکھ، دو دن میں تیری دادی دبئی گھوم کر واپس آجائے گی، ہا، ہاہا، ہاہاہا!"

"اور اگر تو دادی ادھر کھو گئیں تو؟"

"او نہیں کھوتی اوئے! میری جیسے کھوتے کہ ہوتے بھلا کوئی کھو سکتا ہے کیا، ہا، ہاہا، ہاہاہا، اور اب اگر تیرا میسج آیا تو میں تیرا ٹینٹوا دبادوں گا۔"

فٹافٹ موبائل جیب میں ڈال کر اخلاق پائین نے اپنا ننھا سا سفری بیگ ہاتھ میں اٹھایا اور جاسوسوں کی طرح چلتی ڈیوڑھی میں دادی کے پاس آکر کھڑے ہوئے اور جلدی جلدی چلنے کا بولا، لیکن انہیں کچھ یاد آگیا۔

"خالہ! تم نے اپنا "نلکا" لے لیا ہے؟"

"آئے ہائے! کیوں کیا اب موئے دبئی میں پانی بھی نہیں ہے کیا؟" دادی نے کمر پہ ہاتھ ٹکاتے ہوئے نخوت سے پوچھا۔

"او نہیں خالہ' تمہارا نلکا' وہ جسے تم دمے کے وقت منہ کو لگا کے کیرتی ہو (ان ہیلر) ہاہاہاہاہا!"

"تو بھی نا جلے کا جلا ہی رہے گا اخلاق پتر' اسے نلکا تھوڑی نا کہتے ہیں' ٹوٹی' بولتے پتر' ٹوٹی' اور رکھ لی ہے میں نے اپنی ٹوٹی' تو بس اب نکلنے کی کر' چل میرا پتر!"

اور فجر کی مدھم روشنی میں یہ خالہ بھانجا دبئی جانے کے لیے ڈائیوو کے اڈے پہ پہنچ گئے!

"چل بیٹھ خالہ' بیٹھ جا اور بے فکر ہو جا' اس بس کو بھی تو جہاز ہی سمجھ' شام تک ہم نے دبئی پہنچ بھی جانا' ہاہا' ہاہاہا!"

دادی بے چاری پہلی دفعہ سفر پر نکلی تھیں' بوکھلائی ہوئی تھیں' ہوش حواس سب اڑے ہوئے تھے' اوپر سے اخلاق پائین نے کالی عینک لگوا کر جان اور عذاب میں ڈلوادی تھی' پیر رکھ کہیں رہی تھیں پڑتا بار بار اخلاق پائین کے پاؤں پر تھا' پکے جوتے تھے' پیر پر پڑتے تو اخلاق پائین بلبلا کے ہنس دیتے' بس میں بیٹھ کر انہوں نے ہینڈز فری دادی کے کانوں میں زبردستی ٹھونس دیں۔

"او خالہ' یہ "ڈھکن" لگا کے رکھ' دبئی جانے والوں کے کانوں میں جب تک یہ نا ہوں' ایسے ہی لگتا ہے جیسے دبئی نہیں کالا شاہ کاکو جا رہے ہیں' ہا' ہاہا' ہاہاہا!"

دادی کو الجھن تو بہت ہوئی مگر خاموشی سے وہ ڈھکن لے کر لگا لیے' وہ اس وقت مکمل طور پر اخلاق پائین کے رحم و کرم پر تھیں' دبئی پہنچنے کے لیے یہ سودا مہنگا نہیں تھا کہ خاموشی سے عمل کیے جاتیں' کچھ بھی تھا دل کے اندر جیسے امنگیں جوان ہو کر شرارے مار رہی تھیں' رواں رواں خوشی کے احساس سے مغلوب تھا۔

"کتنا خوش ہوگا سمیع جب دبئی پہنچ کے آگے مجھے دیکھے گا' ظاہر ہے شام تک جب ماجدہ اور شازیہ نے بتا دینا ہے اسے کہ تیری دادی تو دبئی جا بھی چکی تو پریشان تو ہوگا نا' بس یہ دونوں مرجانیاں بڑھا چڑھا کے نا بتائیں' بڑی تکلیف ہے ان دونوں کمینیوں کو میرے دبئی جانے کی' بار بار بولتی تھیں کہ بھلا بتاؤ اماں تو کبھی شہر سے باہر نا گئیں' دبئی کیا کریں گی جا کر' کیوں جی' میں کیوں نہیں جا سکتی' میں تو نکل بھی پڑی' ادھر جا کر سمیع کو کہوں گی مریم کو بھی ساتھ ہی لیتا آئے' آخر اس نمانی کا بھی تو دل کرتا ہے نا میاں کے ساتھ رہے' میں اک نکڑ ہی تو لیتی بس' کروٹ لے کر پڑی رہا کروں گی' کبھی کبھی فہد کے پاس بھی چلی جایا کروں گی' اس کی بیوی ہے تو بڑی منحوس' لیکن چل خیر ہے' مجھے تو اپنے پوتے سے مطلب ہے نا' اس سے مل ملا کے واپس سمیع کے پاس آجایا کروں گی' اللہ اللہ خیر صلا!"

ایسی ہی سوچیں سوچتی دادی کی نا جانے کس گھڑی آنکھ لگ گئی۔ فجر سے پہلے کی اٹھی ہوئی تھیں' اخلاق پائین نے چھیڑنے کی ہرگز کوشش نہیں کی' کم از کم چار گھنٹے کی نیند بھی لے لیتیں تو بھی ان کے حق میں بہتر تھا' دل میں کہیں خلش بھی تھی کہ سادہ لوح خالہ کے ساتھ' ہاتھ کر رہے ہیں' لیکن یہ ان کے لیے ہی بہتر بھی تھا!

* * *

دادی کی آنکھ کھلی تو نا صرف دوپہر ہو چکی تھی' بلکہ سب مسافر بس سے اتر رہے تھے' دادی نے گھبرا کے اپنی آنکھوں پر لگی بڑے بڑے کالے شیشوں والی عینک اتاری تو قریب ہی بیگ ہاتھ میں پکڑے اخلاق پائین کو دیکھ کے جان میں جان آئی' وہ کسی مسافر سے پشتو میں بات چیت کر رہے تھے' دادی کو جاگتا دیکھ کر آگے بڑھ کر سہارے سے انہیں کھڑا کیا اور چلنے کو کہا۔

"وے اخلاق پتر! ہم دبئی پہنچ گئے؟"

"بس خالہ پہنچ ہی گئے سمجھو' ایک اور بس بدلنی ہے اور دبئی کے دروازے پہ جا اتریں گے' ہا' ہاہا' ہاہاہا!"

نیچے اتر کر دادی نے حیرانگی سے گرد و نواح کا جائزہ لیا اور اچنبھے سے استفسار کیا۔

"پتر! اپنا سمیع تو کہتا تھا کہ دبئی میں ریت ہے' صحرا

ہے' پہاڑ بھی ہیں یہ تو اس نے کبھی نہیں بتایا مجھے!"
اخلاق پائین منرل واٹر کی بوتل کو منہ لگا کر دو گھونٹ حلق سے اتار رہے تھے' وہیں اٹک گئے بمشکل دھکا دے کر گھونٹ نیچے کیا اور دانش مندی سے مدبرانہ انداز میں جواب دیا۔

"اصل میں خالہ' یہ بدو بڑے چول ہوتے ہیں' ان کا دماغ چالو رہتا ہے' اب یہی دیکھ لو نا ان کے بھیجے میں سمائی اور انہوں نے ریت میں پانی ڈال کر ٹیلے کھڑے کر لیے' چار مہینے بعد جب جی بھر جائے گا تو ان ہی ٹیلوں پر گاڑیاں دوڑا دوڑا کر فرش کر دیں گے' ہا' ہاہا' ہاہاہا!" دادی جواب میں کچھ نا بولیں بس حیرت اور شوق سے سب دیکھتی رہیں' اخلاق پائین نے کون سی سواری پکڑی' کس میں بٹھایا' کہاں اتارا' انہوں نے یکسر دھیان نا دیا' وہ ایک ایک منظر کو جی جان سے ذہن میں محفوظ کیے جا رہی تھیں۔

"لو خالہ! آ گیا دبئی' چلو اترو!"

اخلاق پائین کے کہنے پر وہ بچوں سا شوق چہرے پہ سجائے بمشکل کھڑی ہوئیں' اتنے گھنٹے کا سفر تھا' جوڑ جوڑ جڑ گیا تھا' اخلاق پائین نے سہارا دے کر نیچے اتارا' اور کھنکتے لہجے میں بولے۔

"یہ رہا تمہارے سمیع کا دبئی خالہ' آخر پہنچا ہی دیا نا تمہیں' اب آتے رہیں گے سمیع اور مریم جہاز سے پورے ہفتے بعد' تب تک تم پورا دبئی گھوم چکی ہو گی' ہا' ہاہا' ہاہاہا!"

ارد گرد کا نظارہ بڑا ہی دلفریب تھا' دبئی تو دادی کی سوچ سے بڑھ کر حسین تھا' ان کے وہم و گمان میں بھی نا تھا کہ ایک دن وہ دبئی دیکھیں گی' وہ' جنہوں نے پوری زندگی ہمسایہ شہر نا دیکھا تھا!

اتنی ہریالی' ایسی خوب صورتی کہ دادی پلکیں جھپکنا بھول گئیں' دیو ہیکل پہاڑ دیکھ کر تو ان کا پتا پانی ہوا تھا' لیکن پھر بھی کن انکھیوں سے دیکھتیں اور چہرہ جھکا لیتیں۔

وہ ایک ٹرانس کی کیفیت میں اخلاق پائین کا ہاتھ تھامے دھیرے دھیرے چلے جا رہی تھیں' تھکن سے چور تھیں' ان کا بلڈ پریشر گڑبڑ ہونے کے آثار رونما ہو رہے تھے' سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا' کمر کے مہروں کی تکلیف بری طرح سے پریشان کر رہی تھی' اور سب سے بڑھ کر بڑھاپا' جوان کے ساتھ لاٹھی ٹیکتا چلتا ہوا انہیں استہزائیہ دیکھ رہا تھا' اخلاق پائین سب دیکھ رہے تھے پر جان بوجھ کر وقت لگا رہے تھے' وہ دادی کو باور کرانا چاہتے تھے کہ دبئی میں رہنا خالہ جی کا گھر نہیں' آخر ایک ہوٹل کا کمرہ جو اخلاق پائین نے ہی کسی دوست کے توسط سے بک کروا رکھا تھا' سیدھے وہیں لے گئے۔

کمرے تک پہنچتے پہنچتے دادی کی حالت غیر ہو چکی تھی' ہوٹل کا اسٹاف بوائے کمرے کے باہر سے ہی چھوڑ کر واپس ہو لیا' بستر پہ لیٹیں تو جوڑ جوڑ کڑک گیا' پورے جسم میں اینٹھن کے ساتھ ساتھ سانس بھی تنگ ہوتا محسوس ہو رہا تھا' سینہ جکڑا جانے لگا تھا' آنکھوں ابلنے کو تیار تھیں اور رنگت پھوک سی ہو رہی تھی' جب تک اخلاق پائین کمرے میں آئے دادی کو دمے کا اٹیک ہو چکا تھا' یک دم ہاتھ پیر پھول گئے' ہاتھوں میں تھامے بیگز وہیں پھینکے اور فٹافٹ دادی کا ہنڈ بیگ پھول کے تلکا یقینی تم کہ ان ہیلر نکال کر دادی کے منہ سے لگایا' چند ثانیوں بعد ان کی حالت بحال ہونا شروع ہوئی تو اخلاق پائین کے کب کی پینڈنگ ہنسی بر آمد ہوئی۔

"ہا' ہاہا' ہاہاہا! لے خالہ تجھے دبئی مہنگا پڑنے لگا تھا' آدھا سانس تیرا ادھر رہ جانا تھا اور آدھا میں نے واپس لے جانا تھا' ہا' ہاہا' ہاہاہا!"

"دبئی مجھے نہیں' دبئی کو میں مہنگی پڑنے والی تھی باؤلے' چل چھڈ' اب مجھے ذرا آرام کرنے دے' میں بہت سخت تھک گئی ہوں' اٹھوں تو گھر والوں سے بات کرا دینا' انہیں بھی تو اطلاع کر دوں نا کہ میں ساتھ خیریت کے دبئی پہنچ گئی ہوں' تب تک تو ادھر اکیلا بیٹھ کے ہنس لے!"

دادی یہ کہہ کر کروٹ کے بل لیٹ گئیں اور اخلاق پائین آ کر کھڑکی کے پاس کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔

"خالہ تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ ہم سمیع کے فلیٹ میں کیوں نہیں گئے سیدھا' اصل میں اس کے فلیٹ کی چابیاں لانا تو میں بھول ہی گیا' اب ہمیں ایک ہفتہ اس ہوٹل میں رک کر اس کا انتظار کرنا پڑے گا' ویسے بھی یہ پاکستانی ہوٹل ہے' اس کا مالک میرا بہت اچھا دوست ہے' مدت سے دبئی میں ہوٹل کھول رکھا ہے' تم سو کے اٹھو تو ملواتا ہوں اس سے' خالہ' خالہ...!" وہ بولے جارہے تھے' انہیں محسوس ہوا کہ دادی سو چکی ہیں' پکارنے پر بھی جواب نا آیا تو گردن پھیر کر کھڑکی سے باہر کے نظارے کو پرسوچ نگاہوں سے تکتے ہوئے وہ اگلا لائحہ عمل ترتیب دینے لگے!

☆ ☆ ☆

مگر اگلا لائحہ عمل دادی نے طے کر رکھا تھا' فجر کے وقت دادی اٹھیں تو مضمحل ضرور تھیں لیکن محسوس نہیں کروا رہی تھیں۔ ناشتے کا پوچھا تو صرف چائے کا کپ مانگا' وہ کندھے اچکا کر ہنستے ہوئے ناشتا کرنے لگے' ساتھ ساتھ دادی سے باتیں بھی کیے جاتے مگر دادی ہوں' ہاں سے زیادہ جواب نہیں دے رہی تھیں۔ ناشتا کرنے کے بعد دادی نے خود منہ سے بولا کہ وہ آج سارا دن دبئی گھومیں پھریں گی' اخلاق پائین ان کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے جز بز تھے مگر دادی کی ضد کے آگے گھٹنے ٹیکتے ہوئے ان کا ضروری سامان ہینڈ بیگ میں رکھ کر نکل پڑے دبئی کی برف چھاننے' کیونکہ ان دنوں دبئی میں جگہ جگہ برف پڑ رہی تھی' اور دادی کو برف باری دیکھنے کی کبھی بڑی حسرت تھی۔

وہ سارا دن یوں ہی تمام کیا دادی نے' کبھی ادھر تو کبھی ادھر پھرتے پھراتے' دادی کے پاؤں سوج گئے تھے' بلڈ پریشر اور شوگر کی دوا کھا بیٹھی تھیں' دادی کو اس بات کی بہت خوشی تھی کہ دبئی میں پاکستانی ہی پاکستانی ہیں' جس طرف دیکھو اردو' پنجابی' پشتو بولتے پاکستانی' انہیں ابھی تک ایک بھی ایسا بندہ نہیں دکھا تھا جس نے لمبا سا ٹخنوں کو چھوتا سفید چغہ پہنا ہوا اور سر پہ سفید رومال رکھ کے اسے "ڈھکر کے ربڑ" سے ٹکا رکھا ہو' اخلاق پائین کو تو خود یہ بات اپنی خالہ سے اب پتا چلی کہ ککر کے ڈھکن کا ربڑ کس استعمال میں آسکتا ہے' وہ حقیقتاً "عش عش کر اٹھے۔

آب و ہوا کی تبدیلی اور موسم کی شدت نے دادی پہ ہرگز اچھا اثر نہیں ڈالا تھا۔ اوپر سے وہ سارا دن جیسے ضد باندھے "دبئی" پھرتی رہی تھیں' کتنی ہی جگہوں پر رک رک کر وہ فطرت کی رعنائیوں کو بغور دیکھے جاتیں اور ایسی مگن ہوتیں کہ اخلاق پائین کو ان کا ارتکاز توڑنا پڑتا' ایک نمی سی دادی کی بوڑھی آنکھوں میں تیر سی جاتی' اخلاق پائین سمجھ رہے تھے کہ وہ گھر اور گھر والوں کے لیے اداس ہیں' زندگی میں پہلی دفعہ وہ یوں سب سے دور ہوئی تھیں' رات ہونے تک دادی بخار میں پھنک رہی تھیں۔

جب دمے کا دوسرا اٹیک ہوا تو اخلاق پائین کو ڈاکٹر بلانا پڑا' ہوٹل کا مالک دوست تھا ورنہ وہ انجان جگہ پر مشکل میں پڑ جاتے' ڈاکٹر نے مکمل آرام کرنے کا کہا تھا' اور کسی بھی قسم کی مشقت سے سختی سے منع کیا تھا' ورنہ حالت سنگین ہوسکتی تھی' اس نے مشورہ دیا کہ بہتر ہے کہ ان کو واپس اپنوں میں لے جائیں یا کسی اپنے کو یہاں بلالیں' اخلاق پائین نے بمشکل رات نکالی تھی' اور اگلے دن صبح صبح دوست کی گاڑی میں نیم غنودہ دادی کو ڈالا اور واپسی کا قصد کیا' دادی کی مسلسل "میرا سمیع' میرا سمیع" کی پکار نے ان کے حواس معطل کیے رکھے!

جس وقت اخلاق پائین دادی کو لے کر گھر پہنچے' بڑے سے صحن میں سب ہی گھر کے افراد اکھٹے تھے' چائے کا دور چل رہا تھا اور موضوع سخن دادی ہی تھیں اخلاق پائین کے ہمراہ نیم مردہ سی دادی کو دیکھ کر تایا جی اور وسیم صاحب کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔ سمیع ہک دک کرسی پھلانگتا دادی کے پاس پہنچا اور انہیں بازوؤں میں تھام کر صحن میں بچھے انہی کے تخت پر لا لٹایا' سب ہی ان کے گرد اکٹھے ہوچکے تھے۔ تایا جی اور وسیم صاحب نے کھا جانے والی نظروں سے ماجدہ تائی اور شازیہ بانو کو دیکھا' اور مریم کو سمیع نے' حالانکہ اگر

قصوروار تھے تو سب تھے اور نہیں تھا تو کوئی نہیں تھا۔
اخلاق پائین پر سوالات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی' کب' کیسے' کیوں کا جواب دیتے ہوئے وہ ہنس کم رہے تھے اور کھسیا زیادہ رہے تھے' ان کو کیا علم تھا کہ لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں' انہوں نے اپنی طرف سے بھلائی چاہی تھی جس نے کم از کم دادی کی تو "ملائی" بنا کے رکھ دی تھی۔ سمیع بھاگم بھاگ ڈاکٹر کو بلا لایا تھا' دونوں پھوپھو در رابعہ بھی پہنچ چکی تھیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں اور قیافے' مریم کا دم' دم بہ دم خشک ہوا جا رہا تھا' ڈاکٹر نے فوری انجکشن لگا کر اور ضروری ٹرٹمنٹ کے بعد فیس وصولی اور واپس ہو لیا' کچھ دیر میں دادی کی رنگت میں بہتری کے آثار نمودار ہونا شروع ہوئے تو ایک بار پھر سب کے سب ان کے گرد جمع ہو گئے۔
نقاہت زدہ آنکھیں کھولیں' اپنے سب پیاروں کے چہرے آس پاس دیکھ کے کھل سی گئیں' ہاتھ بڑھا کے سب سے پہلے سمیع کا سر سینے سے لگایا' اور پھر اسے اشارے سے اٹھا کے بٹھانے کو بولا' آنکھوں کی نمی آستین سے صاف کرتے ہوئے اس نے دادی کو ٹیک لگوائی اور خود بھی ان کے تخت پہ بیٹھ کر محبت سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ شرمندہ شرمندہ سے سب ہی ہولے ہولے حال احوال پوچھنے لگے' دادی اب قدرے فریش سی چھوٹے چھوٹے جواب دے رہی تھیں' سب کے دل مطمئن ہوئے تھے' اور مردوں کے تیور نارمل!
شام تک دادی بہت بہتر تھیں اور وہ اپنی "دبئی یاترا" کے قصے بڑے ذوق و شوق سے سنا رہی تھیں جنہیں سب ایک دوسرے سے نظر چراتے بظاہر مسکراتے سن رہے تھے سوائے اخلاق پائین کے جن کی کب کی رکی ہنسی اب رکنے کا نام نا لیتی تھی!
اگلے دو دن دادی نے سب کو دبئی کے برف پوش پہاڑوں اور ان پہ بنے کھلونے جیسے دکھتے مکانوں کے قصے سنا سنا کر مرعوب کیے رکھا' منی پھوپھو' ننھی پھوپھو اور ننھی پھوپھو کا چھوٹا تو مارے حیرت کے ہاتھوں کو دانت کاٹتے تھے' مگر انہیں کسی بھی طرح دادی سے کچھ بھی پوچھنے سے منع کیا گیا کہ ڈاکٹر نے خاص تلقین کی ہے دادی کو ہرگز نا کریدا جائے ورنہ ان کے لیے اچھا نہیں ہوگا' اور اس کام کا بیڑا بھی اخلاق پائین نے اٹھایا تھا' وہ ہی ہنس ہنس کے دونوں پھوپھیوں کو باز رکھے ہوئے تھے' مگر وہ دونوں اخلاق پائین سے یہ جاننے پہ بضد تھیں کہ دادی آخر دو دن کے لیے گئی کہاں تھیں۔
"دیکھیں اخلاق پائین' ہم بچے نہیں ہیں' ہمیں پتا ہونا چاہیے کہ اماں کہاں تھیں؟"
"دبئی' ہا' ہاہا' ہاہاہا!"
"پاگل بنا رہے ہیں آپ' اماں کو بھی جھانسا دیا' کہاں گئے تھے آپ؟"
"دبئی' ہا' ہاہا' ہاہاہا!"
"اچھا دو دن میں واپس بھی ہو گئی' آخر ایسی کون سی دبئی ہے جہاں سے اتنی پھرتی دکھا کے واپس بھی آیا جا سکتا ہے؟"
"ہا' ہاہا' ہاہاہا! دبئی!"
اور دونوں بہنوں نے سر پیٹ لیا' مگر اخلاق پائین نے بھی سرا پکڑا دیا!
سمیع اور مریم کے دبئی جانے میں دو دن رہ گئے تھے' دادی کا رد عمل بالکل نارمل تھا' اور اس بات کو لے کر گھر والے بے حد مطمئن تھے' یعنی "دبئی" دیکھ لینے کے بعد دادی کو مریم کے دبئی جانے پر اب کوئی اعتراض نہیں تھا' وہ جان گئی تھیں کہ اس عمر میں' بیماریوں کا پلندہ لیے وہ گھر والوں کے بغیر کہیں نہیں رہ سکتیں' تایا جی اور وسیم صاحب دونوں نے سمیع کو دادی کی طرف سے بے فکر رہنے کو کہا تھا' وہ ان کی ماں تھیں ان کی ذمہ داری' اس لیے وہ دادی کو ابھی سے ہی اپنے پورشن میں لے گئے تھے۔
دادی اپنے گھر کو خالی دیکھ کر خالی نظروں سے تکتی رہی تھیں مگر احتجاج نہیں کیا تھا' سمیع اور مریم کے بیچ جو دراڑ سی در آئی تھی وہ آپوں آپ ختم ہو گئی تھی' دونوں کے دل پوری شدت سے ایک دوسرے کے لیے دھڑک اٹھے تھے' وہ جی جان سے پیکنگ کرنے

میں مصروف تھے' اخلاق بائین کے شکر گزار کہ آج ان کی وجہ سے دادی مریم کو بھیجنے پہ رضامند ہوئی تھیں' اگر بروقت وہ ترکیب نالڑاتے اور دادی کو ہینڈل نا کرتے تو اس بار بھی سمیع اکیلا واپس جاتا بلکہ مریم اس سے مزید دور ہو جاتی!

دادی کی کچھ ضروری چیزیں دینے مریم ان کے کمرے میں آئی تھی' کھلی کھلی اور تر و تازہ' دادی نے جی ہی جی میں سب بلائیں لے ڈالیں' یک ٹک اسے دیکھے گئیں' پھر ہاتھ تھام کر اسے اپنے سے قریب کیا' سر سینے سے لگا کر بھینچا' اور سرگوشیانہ انداز میں بولیں۔

"میرے سمیع کا خیال رکھنا' اب اس کی دادی نہیں ہوگی' تو اس کا کمی محسوس نا ہونے دینا اسے ہر رشتہ تیرے پلو سے بندھا ملے' میں جانتی ہوں' وہ مجھے بہت یاد کرے گا' جی بڑی جلدی ہلکا کرتا ہے' تو اسے سنبھالے رکھنا' اور سن' میری ایک آخری بات' کان میرے قریب لا!"

مریم جو دادی کے سینے سے لگی پر سکون انداز میں آنکھیں موندے حرف حرف دل میں اتار رہی تھی یک دم چونک گئی' اور تھوڑا سیدھی ہو کر کان دادی کے ہونٹوں کے قریب لے آئی' اتنے قریب کہ دادی نے جو بولا اس نے مریم کی سماعت کے پرخچے اڑا دیے!

☼ ☼ ☼

چاہنے والا ہمراہ ہو تو زندگی کتنی مکمل ہے' تتلیوں کی مانند خوشیاں ارد گرد رقصاں نظر آتی ہیں اور دکھ کا احساس زائل ہو جاتا ہے' مریم آج کل ایسے ہی بادلوں کے سنگ اڑتی تھی' وہ اور سمیع ساتھ تھے یہ خواب تعبیر کی صورت اس کی مٹھی میں تھا' وہ سمیع اور عنایہ ایک مکمل تکون' مکمل فیملی!

اسے بہتر گھنٹے ہو چکے تھے دبئی آئے' اور ان بہتر گھنٹوں میں بہتر منٹ بھی ایسے نہیں گزرے تھے جن میں سمیع نے اسے ایک پل کو بھی نظر سے اوجھل ہونے دیا ہو' اسٹوڈیو فلیٹ کی محدود فضا میں سمیع کی چاہت کی کوئی حد نہیں تھی' ایسی وارفتگی تو سمیع نے پچھلے تین سال میں نہیں دکھائی تھی' اس لیے کہ وہاں پہریدار کی صورت دادی ہر وقت سر پر مسلط رہتی تھیں' ان کی محبت کو تنہائی درکار تھی سو آج کل سمیع کا التفات جوبن پر تھا! وہ ابھی ابھی گھوم پھر کر واپس آئے تھے' مریم کو اس نے چینج کرنے سے منع کیا تھا' وہ آج بہت پیاری لگ رہی تھی اور سمیع کا موڈ اسے سامنے بٹھا کر ہاتھ تھام کر ڈھیر ساری باتیں کرنے کا تھا۔

"تم پہلے اپنے نرم ہاتھوں سے گرم کافی بنالاؤ' تاکہ کمبخت نیند تو اڑے' جو دیدار یار میں حائل ہونے کو بے تاب سرہانے کھڑی ہے' اور میں نہیں چاہتا کہ ہم دونوں کے بیچ اس وقت کوئی بھی تیسرا مداخلت کرے!"

ڈھیروں شدتیں نگاہوں میں سموئے وہ مدھم لہجے میں بولا' مریم محجوب سی کافی بنانے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم کافی بناؤ' تب تک میں اپنی پرنسس کو سلاتا ہوں!" سمیع نے نیند کی شدت سے بند ہوتی آنکھوں کے باوجود کھلونوں سے کھیلتی عنایہ کو گود میں بھرا اور تھپکنے لگا۔

مریم کافی بیٹ کر کے دودھ ڈالنے والی تھی جب سمیع کے موبائل کی بیل پہ یک دم اس کا ہاتھ چھلکا' اس نے کوفت سے پلٹ کر سمیع کو دیکھا جو موبائل کان سے لگا چکا تھا' وہ رخ واپس موڑنے ہی لگی تھی پر اس نے سمیع کو چلا کر کھڑے ہوتے دیکھا۔

"کیا! دادی مر گئیں' نہیں' جھوٹ' بکواس' یہ نہیں ہو سکتا' میں نہیں مانتا' بات کرائیں میری دادی سے' وہ ایسے کیسے' نہیں' نہیں...!"

دودھ مگ میں بھر کر اب باہر چھلک رہا تھا' پر مریم کا ہاتھ تھم نا سکا' وہ سناٹے میں رہ گئی تھی' اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا' دادی مر گئی تھیں' یوں اچانک' ایک دم!

"جاہل ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ میں شعور سے بھی عاری ہوں' تم لوگ مجھے بہلا ضرور سکتے ہو' ٹہلا نہیں سکتے۔" "میں جانتی ہوں اخلاق مجھے دبئی نہیں' مری لے کر گیا تھا' میری یادداشت اچھی ہے پتر' جب رابعہ' فہد اور نازش کے ساتھ مری گئی تھی تو اپنے موبائل میں وہاں کی ساری تصویریں اتار کر لائی تھی' اور میں نے وہ ایک ایک تصویر بڑے شوق سے دیکھی تھی' اس لیے میں فوراً" جان گئی تھی کہ اخلاق مجھے کدھر لے کر آیا ہے۔

لیکن میں جھگڑا نہیں کر سکی اور نا میں نے واپس آکر کسی کو کچھ بھی محسوس ہونے دیا' کیونکہ پتر مجھے وہاں جا کر سب سے دور ہو کر احساس ہوا کہ میں نے اپنی پوتی کے ساتھ خواہ مخواہ کی ضد باندھ لی تھی' میں کہاں اس عمر میں سب سے دور رہ پاتی' اور میرا بچہ الگ خوار ہوتا' اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ تم سمیع کے ساتھ جاؤ گی' میں مزید رکاوٹ نہیں بنوں گی۔

میرا کیا ہے پتر! آج مری کل دوسرا دن' لیکن تم لوگوں کو ابھی جینا ہے' دنیا دیکھنی ہے' میرا تو اب گلا جہان دیکھنے کا وقت ہو گیا! لیکن ایک بات یاد رکھنا میرا بچہ' چھوٹے اور بڑے کی لڑائی میں اگر بڑا ہار مان لے تو اسے اس کی کمزوری نہیں اس کا "بڑا پن" سمجھو' کیونکہ گھر کا بڑا چھتنا ور درخت کی مانند ہوتا ہے' جس کے سائے تلے سب چھوٹے سما جاتے ہیں!"

دادی کے آخری الفاظ جو انہوں نے مریم کو سینے سے لگا کر کہے تھے' اس کی یادداشت میں بازگشت کی صورت لہرائے تھے' درد کی ایک ٹیس سی اسے اپنے دل میں اٹھتی محسوس ہوئی' وہ سن ہوتے حواسوں کے ساتھ وہیں فرش پر بیٹھتی چلی گئی!

"تو دادی سچ میں نہیں رہ سکیں سمیع کے بغیر!" دھندلائی آنکھوں سے اس نے سمیع کو دیکھا جو موبائل ابھی بھی کان سے لگائے دھاڑیں مار کر رو رہا تھا' کیا تھا جو وہ اتنی خود غرض نا بنتی' دادی کے دن تو اتنے ہی تھے' کیا تھا جو وہ یہ خلش اپنے ضمیر کے نام نا کرتی کہ اس نے دادی کو اکیلا چھوڑ دیا' جس گھر سے وہ ساری زندگی دور نہیں ہوئی تھیں' اس سے دور ہو کر زندگی سے دور ہو گئیں!

اس نے شدت سے اپنا سینہ مسلا جہاں یک دم پچھتاووں کی آگ بھڑک اٹھی تھی' اور وہ جانتی تھی کہ آئندہ زندگی میں سمیع اس آگ کو کبھی بجھنے نہیں دے گا!

خود غرضی ایسا چابک ہے' جو رشتوں کی پیٹھ پر پڑتے تو تعلق کے ریشے ادھڑتے چلے جاتے ہیں' انہیں پہلے جیسا ہونے میں وقت لگتا ہے' اور یہ وقت کبھی کبھار زندگی بھر ہاتھ نہیں آتا!

☆ ☆

ناولٹ
سحر ساجد
کیسے
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM

نمکین سی رنگت' چھوٹی سی ناک' گہری آنکھیں' باریک ہونٹ اور متناسب سا سراپا۔ گردن کے بالکل ساتھ لگی کالی ڈوری میں پرویا ہوا کوئی تعویذ نما لاکٹ' جو اتنا گردن میں کھبا ہوا تھا کہ ارد گرد کا گوشت ابھر آیا تھا۔ ایک کلائی میں موٹے موٹے کڑے اور دوسری میں کوئی رنگین سا دھاگا لپٹا ہوا تھا۔ کندھے سے لٹکتا سیچل بیگ' دوپٹے کے نام پہ کوئی مفلر نما چیز شانوں پہ پھیلا رکھی تھی۔ بالوں کا گول مول بنایا ہوا جوڑا' گھٹنوں تک آتی قمیص' گھیر دار شلوار' پاؤں میں کولہا پوری چپل' آنکھوں میں یہ بھر بھر کر ڈالا گیا کاجل اور ماتھے پہ چمکتا پسینہ.... وہ جپسی ٹائپ لڑکی عین اس کے سامنے سے آرہی تھی۔ وہ دونوں ہی فٹ پاتھ پہ آمنے سامنے چل رہے تھے۔ وہ اپنے دھیان میں چلتی تھی اور وہ اسے دیکھ کر۔ حالانکہ ایسی کوئی دیکھنے لائق شے تو نہ تھی' پر پھر بھی وہ اسے دیکھ دیکھ چلتا تھا کہ اچانک....

وہ ٹھٹکی' اک پل کو ساکت ہوئی اور پھر فٹ پاتھ کے کنارے بہتے نالے کے قریب پنجوں کے بل جا بیٹھی۔ وہ جو کہ اسے کراس کرکے گزر چکا تھا اس کے اس فعل پہ حیران ہوا' حیرت سے مڑ کر اسے دیکھا اور پھر وہ بھی ساکت ہو گیا۔ نہ صرف وہ بلکہ وہاں موجود اور بھی لوگ اسے نوٹس کر چکے تھے اور اسی کی طرح حیران نظر آتے تھے۔ آخر وہ سب کیوں حیران نظر آتے تھے.... وہ.... وہ لڑکی دونوں ہاتھ نالے میں ڈالے بیٹھی تھی۔ اور جب اس نے نالے سے ہاتھ نکالے تو اس کے ہاتھ میں ایک بالکل ہی نوزائیدہ پلا تھا۔ وہ یقیناً" اس پلے کی چیاؤں چیاؤں کی آواز سے متوجہ ہوئی تھی اور پھر اسے ریسکیو کرنے نالے کنارے جا بیٹھی تھی۔ وہ اب پلے کو دونوں ہاتھوں میں اٹھائے ارد گرد مدد طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ نظر اس ساکت وجود پہ جا پڑی تھی۔

"پلیز ہیلپ...." اس نے کہا اور وہ میکانکی سے انداز میں اس کی طرف بڑھا تھا۔

"میرے بیگ میں پانی کی بوتل رکھی ہے' وہ نکال دیں۔" اس نے کندھے سے لٹکتے بیگ کی طرف اشارہ کیا۔ عباس نے ایک نظر اسے دیکھا جو کہ فکر مندی سے پلے کو دیکھتی تھی اور پھر اس کے بیگ سے پانی کی بوتل نکالی تھی۔

"پلیز...." اس نے پلے کو آگے کرتے ہوئے کہا۔ مطلب... اس پہ پانی ڈالا جائے۔ عباس نے پانی ڈالا.... پلے کو دھویا گیا اور پھر اس نے بڑے پیار سے اسے نالے سے دور لے جا کر ایک طرف رکھ دیا۔

"خبردار اب جو تم نالے میں گرے...." اس نے بڑی اماؤں جیسے انداز میں اسے ڈانٹ پلائی تھی۔ پلے نے کمزور سی آواز میں چیاؤں کہا اور اپنا جسم چھٹکنے لگا۔

"اوہ...." وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی تھی اور ارد گرد پانی کی تلاش میں دیکھنے لگی کہ جہاں وہ اپنے ہاتھ دھو سکے۔ عباس ابھی تک ہاتھ میں پانی کی خالی بوتل لیے دم بخود اسے تکتا رہا تھا۔ اس کی تلاش پہ جیسے وہ نیند سے جاگا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ پھیلا رکھے تھے اور کندھے سے لٹکتے بیگ کو وہ جھٹک جھٹک کر سنبھالنے کی کوشش میں ہلکان نظر آتی تھی۔ عباس نے سر جھٹکا اور قدم اس کی طرف بڑھا دیے۔

"یہاں قریب میں ایک ہوٹل ہے' وہاں پہ پانی مل سکتا ہے۔"

"کہاں....؟"

"آجائیں میرے ساتھ...." اور وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ ہوٹل چند قدم کے فاصلے پہ تھا۔ وہاں پہنچ کر عباس اس کی خالی بوتل میں پانی بھر لایا تھا اور اس کے ہاتھ دھلوائے تھے۔ "شکریہ" وہ ہلکا سا مسکرائی۔ عباس نے پھر سے ایک نظر دیکھا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں' اس کے مقابلے میں جو آپ نے کیا۔" وہ متاثر نظر آیا۔

"ارے...." وہ ہنس دی۔ "اتنا متاثر ہونے کی ضرورت نہیں' میں نہ ہوتی تو کوئی اور بھیج دیتا اللہ اس ننھی سی جان کی مدد کو۔ کیونکہ اسے ابھی زندہ جو رہنا تھا' سو میں نہ سہی کوئی اور سہی...." اس نے لاپروا انداز میں جیسے بات اڑائی۔ عباس لاجواب ہوا اور پھر

اس نے الوداعی سی مسکراہٹ سے عباس کو نوازا' کندھے پہ دھرا اپنا بیگ ٹھیک کیا اور مزے سے اپنی راہ چل دی اور عباس اس کی پشت کو دور تلک دیکھتا رہا۔ اس تیز' چمکتی دھوپ میں کھڑا وہ اسے دور تلک جاتے دیکھتا رہا۔ معلوم نہیں کیوں' مگر وہ اسے دیکھتا رہا... دور تلک...

☆ ☆ ☆

اگلی بار وہ عباس کو پھر سے ایک فٹ پاتھ کنارے ملی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر رک گیا۔ بے اختیار ہی۔ اک بار پھر حیران ہوا اور وہ ہر بار اسے حیران ہی تو کرتی تھی۔ اب کی بار سین ذرا مختلف تھا۔ وہ فٹ پاتھ کے کنارے یوں ٹھسے سے بیٹھی تھی' جیسے کہ کسی سوئٹ کے آرام دہ کاؤچ پہ بیٹھی ہو۔ چوکڑی مار کر' ایک ہاتھ میں گول گپوں کی پلیٹ پکڑ رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ کو نچا نچا کر وہ اس گول گپے والے لڑکے سے باتیں کرتی نظر آرہی تھی۔ حلیہ اب بھی کم و بیش ویسا ہی۔ فرق یہ کہ آج کرتے کے ساتھ جینز پہن رکھی تھی۔

"یہ ہے کیا چیز؟" وہ شدید حیران ہوا۔ قریب تھا کہ وہ اسی حیرت میں غرق رہ کر اسے دیکھتا ہی رہتا کہ...

"ہاہاہا..." اس کے حلق سے ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا تھا اور وہ ہوش میں آیا تھا۔ اس نے قدم بڑھائے۔

"ہیلو..." اور عباس اس کے سر پہ جا پہنچا۔ اس نے سر اٹھایا' آنکھیں میچ کر اسے دیکھا۔ پہچانا اور پہچان کر بولی۔

"اوہ ہائے کیسے ہیں آپ؟" وہ منہ میں ایک بڑا سا گول گپا سالم گھسانے کی کوشش میں تھی۔

"ٹھیک ہوں میں اور آپ...؟"

"اف..." عباس کی بات منہ میں ہی رہ گئی تھی' کیونکہ وہ یک دم کراہی تھی۔ وہ سالم گول گپا' اک بار ہی میں نہ کھا سکی تھی۔ تنگ آکر کھڑی ہوئی' پیر پٹخ کر گول گپوں والی پلیٹ بھی ریڑھی پہ پٹخی' آستین سے منہ صاف کیا اور پھر کپڑے جھاڑتے ہوئے بولی۔

"لو راشد بیٹے آج بھی تم شرط جیت گئے۔ یہ رہے گول گپوں کے پیسے اور یہ رہے تمہاری شرط جیتنے کے پیسے۔" وہ الگ الگ نوٹ رکھتے ہوئے بولی۔

"ہی ہی ہی... باجی آپ کبھی بھی سالم گول گپا نہیں کھا سکتیں۔" راشد نے چڑایا۔

"بیٹے میں کھا کر دکھاؤں گی۔" وہ منہ پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی تھی۔

"ہی ہی ہی..." اور راشد کی ہنسی دیکھنے لائق تھی۔ اس نے گھور کر راشد کو دیکھا اور پھر ہنس دی۔

"ہنس لو' ہنس لو بچے تمہارا وقت ہے۔ گول گپے کھائیں گے آپ؟" اسے جیسے اچانک عباس کا خیال آیا تھا اور عباس... گندمی رنگت' اونچی ناک' گھنے سیاہ بال اور وہ ایک خوبرو نوجوان تھا۔

"شکریہ..." دھیرج سے کہا گیا تھا۔ وہ بڑی دلچسپی سے وہاں کھڑا اس کی گفتگو سنتا رہا تھا۔

"آپ کی مرضی..." وہ کندھے اچکا کر بولی۔ "بڑی نعمت سے محروم کر رہے ہیں آپ خود کو۔ گول گپا نہ کھایا تو پھر کھایا کیا؟" اور عباس زور سے ہنس دیا۔

"ہا... اس میں ہنسنے والی کون سی بات ہے۔" وہ منہ کھول کر حیران ہوئی۔

"آپ گول گپے کو بڑی نعمت کہتی ہیں؟" وہ ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

"ترجیحات کی بات ہے۔ میرے لیے ہے آپ کے لیے نہ ہوگی۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"صحیح کہتی ہیں ترجیحات کی بات ہے۔" وہ متفق ہوا۔

"آپ کو وہ پلا دوبارہ نظر آیا؟" ترنت سوال آیا اور جواب... حیرت...

"اب شہر میں اتنے سارے پلے ہیں۔ کیا پتا چلتا ہے۔" عباس نے مجبوری ظاہر کی۔

"ارے..." اس نے یوں ہاتھ پہ ہاتھ مارا کہ جیسے یہ مسئلہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔

"اس کی آنکھیں کرنچی اور رنگ بھورا تھا۔" اف... وہ وہی ہو سکتی تھی کہ جس کو پلوں کی آنکھوں

اور ان کا رنگ تک معلوم ہو سکتا تھا۔ عباس نے کراہ کر سوچا۔ میری آنکھیں بھی تو سیاہ۔ اوہ۔۔۔ اوہ یہ میں کیا سوچ رہا۔۔۔ فٹے منہ میرا۔۔۔ آہ! تو میں کیا پلٹے جتنی توجہ کے قابل۔۔۔ عباس باز آجا' بری بات اس نے خود کو ڈپٹا اور بولا۔

"نہیں۔۔۔ میں نے دھیان نہیں دیا۔"

"میں گئی تھی دوبارہ اس جگہ نا۔۔۔ پر وہ نظر نہیں آیا۔ وہ پھر سے نالے میں تو نہیں جا گرا ہو گا؟" وہ بے فکر مندی سے پوچھ رہی تھی۔ عباس ایک بار پھر اسے دیکھنے پہ بے اختیار ہوا۔ یا خدایا! اس شہر میں کوئی دوجا ہو گا اس جیسا' جو ایسے معصومیت بھرے سوال پوچھے۔

"نہیں گرا ہو گا۔" اس نے ہلکے سے مسکرا کر کہا۔

"شیور؟" اس نے اتنی امید بھری اور معصومیت والی نظروں سے سوال کیا کہ خود بخود عباس کے منہ سے نکلا۔

"شیور۔۔۔" اور اس نے اطمینان بھری سانس لی۔

چند لمحے وہ ساتھ ساتھ چلتے رہے' خاموشی سے اس لمبی' دونوں اطراف سے شیشم کے پیڑوں سے ڈھکی سڑک پہ۔ یک دم وہ جھٹکا کھا کر رکی' منہ کھلا۔

"ویٹ آمنٹ۔۔۔ ہم ساتھ ساتھ کیوں چل رہے ہیں؟" اور پھر بڑی ہی حیرانی سے سوال آیا اور عباس نے کھسیا کر سر کھجایا۔

"مجھے تو اس طرف جانا تھا۔ میں تو اس لیے چل رہا تھا۔"

"کس طرف جانا تھا؟" وہ مشکوک ہوئی۔

"سر ظہیر کے گھر۔۔۔" اور جب عباس نے کہا سر ظہیر کے گھر تو وہ بے ساختہ اوہ کے سے انداز میں اسے تکتی رہ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"جب آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ پانچ بجے اکیڈمی بند ہو جاتی ہے تو آپ سب لوگ چلے کیوں نہیں جاتے؟" ٹھیک' پورے پانچ بج کر پانچ منٹ پہ دروازے پہ دستک ہوئی اور وہ سنی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔ دستک ہوتے ہی اندر خاموشی چھاتی چلی گئی' یوں جیسے وہ سب اسی آواز کے ہی تو منتظر تھے اور اس کے بعد۔۔۔ ہلکی سی۔۔۔ منہ بغلوں میں دے کر ہنسی جانے والی ہنسی کی آواز۔۔۔

"کیسر۔" سر کی تنبیہی آواز ابھری اور اب دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

اس کا آج پہلا دن تھا سو اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ ہوا کیا تھا؟ تو جب اسے سمجھ میں نہیں آیا اور وہ "یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟" کی تفسیر بنا بیٹھا تھا تو وہ آواز پھر سے آئی۔

"اب آپ لوگ جائیں پلیز۔" اور اس کے بعد سب اک اک کر کے جگہ چھوڑنے لگے' چیزیں سمیٹنے لگے اور باہر نکلنے لگے۔ وہاں یک دم چھٹی کے وقت سا شور پھیل گیا تھا۔ عباس بھی چیزیں سمیٹنے لگا تھا۔

"تم حیران ہو رہے ہو نا؟" سر ظہیر اپنی عینک کا شیشہ صاف کرتے ہوئے بولے تھے۔ اور وہ ان کے پوچھنے پہ رک گیا' ٹھہر گیا اور ٹھہر کر ان کو دیکھنے لگا۔

"نئے ہو نا ابھی' آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گے۔" عینک لگا کر وہ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے بولے تھے۔

"بیٹی ہے میری۔ شام کی چائے میرے بنا نہیں پیتی۔ ذرا سی دیر ہو جائے تو یوں ہی سب کو چلتا کر ڈالتی ہے۔" اور وہ بے اختیار مسکرایا۔

"اچھا بھئی کل ملاقات ہو گی' دروازہ بند کرتے جانا۔" وہ گھر کے اندر کھلتے دروازے کی طرف پلٹے تھے۔

"اللہ حافظ سر!"

"اللہ حافظ۔۔۔ اللہ حافظ۔" وہ مڑے بنا ہاتھ ہلا کر بولے تھے اور دروازہ کھلا' اندر کا منظر ذرا سا واضح ہوا۔۔۔ اور پھر بند۔۔۔ عباس اک پل کو ٹھہرا اور پھر چیزیں سمیٹ کر وہ بھی باہر کو نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

اب کی بار جب وہ اسے نظر آئی تو پھر سے اس کو رکنا

پڑا۔ اب کی بار وہ ایک چڑی فروش سے چڑیاں خرید رہی تھی۔ پھر وہ ہی حلیہ وہ ہی سیچل بیگ وہ ہی گردن کے ساتھ پھنسا کالی ڈوری والا تعویذ نما لاکٹ' کاجل سے بھری آنکھیں۔ سیاہ قمیص شلوار اور چنری کالال دوپٹا۔ عباس کو اس پہ وہ لال دوپٹا بے حد بھلا معلوم ہوا' اتنا کہ وہ بنا سوچے سمجھے اس کو دیکھے گیا۔ وہ ہاتھ میں چڑیاں لیے کچھ دور آئی اور پھر پھر رکی' آواز آئی۔۔۔ اس نے سب چڑیاں اڑادیں تھیں اور اب وہ اس مسرت سے ان چڑیوں کو اڑتے دیکھ رہی تھی کہ اردگرد سے بے گانہ نظر آتی تھی۔ اسے تو یہ تک معلوم نہ تھا کہ کئی لوگ خصوصاً" مرد اس کو یوں منہ اٹھا کر آسمان کی طرف تکتا دیکھ کر اسے منہ اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ عباس کو اب کے بے حد برا محسوس ہوا۔ اس کا جی چاہا وہ اسے وہاں سے غائب کردے۔ اسے اتنا برا محسوس ہوا کہ وہ بے اختیار اس کی جانب بڑھا۔ لیکن۔۔۔ اسی لمحے اس نے منہ نیچے کیا' ایک مسرت بھری سانس لی اور چل دی تھی اور عباس وہیں سے اکیڈمی جانے کے لیے مڑ گیا۔ وہ وقت سے پہلے جارہا تھا' لیکن اس نے سوچا وہیں بیٹھ کر کچھ پڑھ لے گا۔ گھر جاکر آتا تو دیر ہو جاتی۔ اور وہ جب اسٹاپ پہ اتر کر سر ظہیر کے گھر جانے والے رستے پہ آیا تو اک دم جھٹکا کھا کر رک گیا۔ عباس نے اس کو پھر سے اپنے سامنے پایا تھا۔ وہ بھی اسی رستے پہ تھی۔

"تو کیا وہ یہاں رہتی ہے؟" وہ حیران ہوا اور اس وقت وہ شاکڈ رہ گیا جب اس نے اسے سر ظہیر کے گھر داخل ہوتے دیکھا تھا۔

"کیسے۔۔۔" اس کے لبوں نے بے اختیار' استعجاب بھری جنبش کی تھی۔

عباس' سر ظہیر سے اردو پڑھنے جایا کرتا تھا۔ وہ بی ایس اردو کا طالب علم تھا اور سر ظہیر اردو کے بے حد مانے ہوئے استاد تھے۔ سارا شہران کو جانتا تھا۔ وہ ایک اخبار میں اداریہ بھی لکھا کرتے تھے۔ شہر بھر کے بچے ان سے اردو پڑھنا چاہتے تھے' سوان کی بیٹھک کھچا کھچ بھری ہوا کرتی تھی۔ وہ طالب علموں کو تب ہی نا بولتے تھے جب بیٹھک میں گنجائش ختم ہوا کرتی تھی۔ میٹرک' پری میڈیکل' پری انجینئرنگ' بی ایس' ایم اے غرض ہر جماعت کے طالب علم آیا کرتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سے انہوں نے یہ اکیڈمی کھولی تھی اور اس دن۔۔۔ بے اختیار عباس کو اس دن کا منظر یاد آیا تھا۔

"تو جانئے نا سر ظہیر کے گھر۔۔۔ میرے ساتھ کیوں چہل قدمی کا شغل فرمارہے ہیں؟" وہ ذرا تنک کر بولی' گھور کر اسے دیکھا اور پھر مڑ گئی۔

"کھا کر دکھاؤں سالم گول گپا ایک ہی بار میں؟" وہ اب راشد سے مخاطب تھی۔ عباس نے ایک نظر اسے دیکھا' ذرا سا مسکرایا اور۔۔۔ اپنی راہ چل دیا۔۔۔ اور آج۔۔۔ وہ اسے سر ظہیر کے گھر داخل ہوتا دیکھ کر شاکڈ نہ ہوتا تو اور کرتا کیا؟ مجھے ڈاج کیا؟ لیکن کیوں؟ وہ الجھا۔

☼ ☼ ☼

اسے نہیں معلوم یہ کیا تھا؟ اتفاق' قسمت یا کہ کچھ اور۔۔۔ وہ اسے یوں سر راہ ہی کیوں دکھتی تھی' سر راہ ہی کیوں ملتی تھی۔ کبھی پلا بچاتے ہوئے' کبھی کسی گول گپوں کی ریڑھی پہ شرطیں لگاتے ہوئے' تو کبھی چڑیاں اڑاتے ہوئے۔ اف۔۔۔ کیا کبھی نارمل انداز سے نہیں مل سکتی تھی وہ۔ عباس نے ایک گہرا سانس بھرا اور بھائی کی بائیک کہ جس کا وہ پنکچر لگوانے آیا تھا' اسے مکینک کے پاس کھڑا کر کے وہ اس کی طرف بڑھا تھا۔ جی ہاں! وہ اب کی بار اسے موٹر سائیکل ورکشاپ پہ ملی تھی۔ وہ اس سے چند گز کے فاصلے پہ جا کھڑا ہوا۔ وہ ایک گندے سندے سے کنستر کو زمین پہ الٹا رکھ کر اس پہ بیٹھی تھی۔ دونوں کہنیاں گھٹنوں پہ' ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسائے' اور ان پہ ٹھوڑی ٹکائے وہ اس تیرہ چودہ سالہ بچے سے محو گفتگو تھی جو کہ اس کے سامنے موجود بائیک کو ٹھیک کر رہا تھا۔

"تم پڑھتے کیوں نہیں؟"

"میں پڑھنے چلا جاؤں تو گھر کون چلائے گا باجی؟"

اس کے ہاتھ تیزی سے چلتے تھے اور وہ مصروف سے انداز میں جواب دیتا تھا۔
"نام لکھنا جانتے ہو اپنا؟"
"لکھ ہی لیتا ہوں باجی۔"
"اور پڑھنا؟"
"تھوڑا بہت... وہ بھی اٹک اٹک کر..."
"تو تم فارغ وقت میں میرے پاس آجایا کرو... میں پڑھا دیا کروں گی اور وہ بھی مفت..." اس کا دے تالی ڈالا انداز اور وہ بچہ...
"کون سا فارغ وقت باجی؟"
"جب یہاں سے فارغ ہوتے ہو تب..."
"ہونہہ... یہاں سے فارغ ہوتے ہوتے آٹھ' نو بج جاتے ہیں' کبھی دس بھی ہو جاتے ہیں اور سارے دن کی مشقت کے بعد باجی! صرف روٹی یاد آتی ہے اور جب پیٹ بھر جائے تو کتے کی طرح پڑھ کر سو جاتے ہیں' کیونکہ صبح پھر سے گدھے کی طرح کام جو کرنا ہوتا ہے۔ ایسے میں کدھر کی پڑھائی اور کون سا سبق۔ بس پیٹ یاد رہتا ہے۔" اور وہ بے اختیار خاموش ہوئی تھی۔ چند لمحے وہ اسی خاموشی کی حالت میں بیٹھی رہی۔
"تم ٹھیک کہتے ہو... روٹی سب سے اہم' پیٹ کا سبق سب سے مشکل... اور محنت سے کمانا سب سے عظیم پڑھائی۔ تم ٹھیک کہتے ہو" ایک تکان بھری سانس لیتے ہوئے وہ بولی اور اپنا سیچل بیگ کندھے پہ ڈالتے ہوئے اٹھی تھی۔
"یہ رکھ لو" وہ کچھ نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ بچے نے ایک نظر اسے دیکھا' ایک نظر اندر استاد کی طرف اور پھر پیسے پکڑ کے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر اسے سلام کیا تھا۔ کیسر کو اس کے یوں سلام کرنے سے تکلیف ہوئی' لیکن یہ معاشرہ اور اس کے اصول۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ ماتھے سے ہٹایا اور کندھا تھپتھپا کر مڑی تھی... کہ وہیں پہ ٹھہر سی گئی۔ عباس دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے اسے تک رہا تھا۔ بے اختیار کیسر کے ماتھے پہ بل نمودار ہوئے' وہ اسی برہم موڈ کے ساتھ اس کی طرف بڑھی تھی۔

"آپ میرا پیچھا کرتے ہیں کیا؟"
"نہیں تو..."
"تو آپ پھر ہر اس جگہ کیوں موجود ہوتے ہیں کہ جہاں میں ہوتی ہوں؟"
"یہ ہی سوال میری طرف سے بھی آسکتا ہے۔"
اس نے کندھے اچکا کر کہا اور وہ لاجواب ہو کر' تلملا کر' حسب عادت پیر پٹخ کر اپنی راہ چل دی تھی۔ عباس نے عجلت میں سیٹی مار کر مکینک کو مخاطب کیا۔ اسے "میں آتا ہوں" کا اشارہ کیا اور خود کیسر کے پیچھے۔ وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا اس تک آیا کھنکار کر اسے متوجہ کیا' وہ لاشعوری طور پہ متوجہ ہوئی اور پھر چار سو چالیس وولٹ کا جھٹکا کھا کر رک گئی۔
"آپ... آپ..." ناک کے نتھنے پھولنے لگے۔
"دھیرج کیسر دھیرج..." وہ نرمی سے بولا اور کیسر... وہ سخت حیرت جمع بے یقینی سے اسے تکتی رہ گئی۔
"میرا نام؟" استعجاب... "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ میرا نام ہے؟" اور پھر بے اختیار اس کے منہ سے سوال ابلا تھا۔
"سر ظہیر کا طالب علم ہوں۔" عباس نے گویا اعلان کیا۔
"اوہ! تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں ہی کیسر ہوں' سر ظہیر کی بیٹی بھی میں ہی ہوں۔" لو جی... آپ اپنے دام میں صیاد آگیا... بتا بیٹے اب بتا... عباس بے اختیار کھانسا تھا۔
"تمہاری آواز پہچان لی تھی۔" اور کیسر کا منہ اوہ کے انداز میں کھلا رہ گیا تھا۔
"تم اتنے تیز ہو کیا؟" اور عباس اس معصوم سوال پہ ہلکے سے ہنس دیا۔
"نہیں... حسیات تیز ہیں... لیکن تم نے چھپایا کیوں؟" اور کیسر نے گہرا سانس بھرا۔
"جواب... تفسیر' طلب ہے اور سننا مشقت۔"
اس نے ابرو اچکایا۔
"میں منتظر ہوں۔" وہ بدقت مشتاق کہنے سے باز آیا۔

کیسر نے گلا کھنکارا' عادتاً" کندھے پہ دھرے بیگ کو صحیح کیا اور چلنے لگی۔

"امی بہت بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھیں۔ ابا نے جو تربیت کی ہے نا اس میں مردانہ رنگ غالب ہے۔ میں گڑیوں سے نہیں کھیلی' میں نے گھر نہیں بنایا' میں نے اسٹاپو بھی نہیں کھیلا۔ میں نے سارا بچپن ابا کو قلم میں سیاہی بھر بھر کر دیتے اور ان صفحات کو چاٹ کر پڑھنے میں گزارا ہے جو ابا لکھا کرتے تھے۔ انہی کی طرح قلم پکڑنا' انہی کی طرح لکھنا' ان کی واسکٹ پہن کر انہی کی طرح استاد بننا۔ مجھے "ابا" بننے کا بڑا شوق ہوا کرتا تھا اور تمہیں پتا ہے یہ شوق مجھے ابھی بھی ہے۔"

وہ بچوں سے اشتیاق بھرے لہجے سے بولی اور پھر ہنس دی۔

"خیر... میں اتنی سوشل ہوں کہ شہر کی تمام سڑکیں میرے پیروں سے پناہ مانگتی ہیں۔ یونی سے پیدل کوچنگ سینٹر' وہاں سے پیدل گھر۔ ابا بوڑھے ہو چکے ہیں' سو گھر کے سارے کام... سودا سلف سے لے کر بل جمع کروانے تک میں ہی کرتی ہوں۔ میرے ابا نے مجھے مردوں کی طرح جینا سکھا دیا' لیکن میں ہوں تو عورت نا... میں نہیں چاہتی لوگ انگلیاں اٹھا اٹھا کر کہیں وہ دیکھو سر ظہیر کی بیٹی جا رہی ہے' وہ دیکھو سر ظہیر کی بیٹی نالے سے کتنا نکالتی ہے' وہ دیکھو کیسے بیٹھی ہے فٹ پاتھ پہ سر ظہیر کی بیٹی... ابا تک بات پہنچے گی تو انہیں دکھ ہو گا۔ یہ نہیں کہ وہ اپنی بیٹی کو نہیں جانتے' دکھ یہ کہ دنیا ان کی بیٹی کو نہیں جانتی۔ سو گمنامی اچھی... سر ظہیر کی بیٹی ہونا آسان نہیں ہے... تو میں اس حوالے سے بچتی ہوں... نہیں چاہتی کہ بیٹی کی وجہ سے سفید بالوں والا سر جھکے... ڈیٹس آل..." نرم' دھیما' ٹھہرا سا انداز اور آخری بات کہتے ہوئے اس نے مسکرا کر عباس کو دیکھا تھا اور عباس... اس کا جی چاہا کہ وہ یوں ہی اسے دیکھتی رہے اور مسکراتی رہے۔

"امید ہے کہ تم اپنے سر کی..."

"یہ نہ کہو' یہ کہہ کر تم نے مجھے چھوٹا کر دیا۔" وہ بات کاٹ کر' مدعا سمجھ کر ترنت بولا اور کیسر... وہ چند لمحے اسے تکتی رہی اور پھر جان گئی کہ وہ اس حوالے کی حفاظت کرے گا۔

"تمہارا نام؟"

"عباس..."

"میرے ساتھ ہی گھر جاؤ گے اب کیا؟" وہ اسے فرصت سے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلتے دیکھ کر بولی تھی۔

"جیسے تم کہو۔" وہ شرارت سے بولا۔

"جی نہیں! اب آپ اپنی راہ ناپیے۔" اس نے صاف جھنڈی دکھائی۔ پھر وہ ایک قدم آگے بڑھی' رکی' مڑ کر اسے دیکھا اور بولی۔

"خبردار! اب جو میرے پیچھے آئے تم..." وہ ڈپٹ کر بولی تھی۔ عباس نے مسکراہٹ دبا کر سر کھجایا تھا۔

وہ چند لمحے ٹھہری اسے دیکھتی رہی اور پھر اپنی راہ چل دی تھی۔ کافی دور جا کر جب اس نے مڑ کر دیکھا' یہ چیک کرنے کے واسطے کہ وہ اس کے پیچھے آ رہا ہے یا نہیں تو وہ... وہ حیران رہ گئی تھی۔ وہ ابھی تک اسی ایک جگہ کھڑا تھا اور اسے تک رہا تھا۔ کیسر کو اس کا یوں کھڑا رہنا سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

✵ ✵ ✵

"لو بھئی بچوں... مال غنیمت' شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈال کر لایا ہوں۔" وہ بڑے دبے پاؤں بیٹھک میں داخل ہوئے اور پھر بڑے ہی چور انداز سے دروازہ بند کیا تھا اور اس کے بعد کاغذات کا ایک پلندہ وہ سامنے ٹیبل پہ گراتے ہوئے بولے تھے۔ بچے سارے کھی کھی کر کے ہنسنے لگے۔ ابھی وہ اس بات کو انجوائے بھی نہیں کر سکے تھے کہ...

"ابا..." بیٹھک کے دروازے پہ زوردار قسم کی دستک ہوئی تھی اور اک نہایت ہی تلملاتی ہوئی آواز آئی تھی۔ اور ابا یوں دم سادھ کے بیٹھ گئے کہ گویا وہاں موجود ہی نہ تھے۔

"ابا..." دستک دوبارہ ہوئی اور آواز میں اب کے غصہ چھلکتا تھا۔

"آہم۔۔۔ آہم" ابا بلاوجہ کھنکارے، یوں جیسے شیر سے بات کرنے کا حوصلہ پیدا کر رہے ہو۔ وہ جانتے تھے کہ کیسر اندر نہیں آئے گی۔

"میرے نوٹس واپس کریں۔" وہ دھاڑی تھی۔ بچوں کی کھی کھی بلند ہوئی، سر نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور پھر بولے۔

"کیا ہے کیسر۔۔۔ ویسے تو ساری گلی کے کتے بلیاں پال رکھے ہیں اور انہیں اپنے پلے سے خرید خرید کر چھیچھڑے کھلاتی ہو۔ ذرا سی خدمت خلق ان بھائیوں کے لیے بھی۔۔۔ کرنے دو نا ان کو نوٹس کا پی۔" (کیسر بھی تو بی ایس اردو کی طالبہ تھی نا۔)

"بھائی ہی ہی۔۔۔" عباس کے پیٹ میں سخت بل پڑا تھا۔ اور کتنوں کے پیٹ میں بھی پڑا ہوگا۔ اب کسے معلوم۔

"یہ بھائی اپنی عقل استعمال کریں اور خود کے نوٹس بنائیں۔ چھاپہ کیوں مارتے ہیں نکمے! محنت کریں نا۔۔۔ میری محنت پہ کیوں تکیہ کرتے ہیں۔۔۔ ان کو تو چاہیے مجھے نوٹس بنا بنا کر دیا کریں۔ الٹا آپ میرے نوٹس اڑا لے گئے۔ ان بھائیوں کے لیے۔"

"ہاہاہا۔۔۔" اس کی اس بات پہ جناتی قہقہے بلند ہوئے تھے۔

"عباس۔۔۔" ان ہی جناتی قہقہوں کے درمیان ابا کی ہلکی سی آواز آئی تھی۔۔۔ آ۔۔۔ ابا چوک گئے یہ آواز کیسر نے سن لی تھی اور اک سیکنڈ سے پہلے وہ سمجھ گئی تھی کہ آواز دی کیوں گئی تھی۔ اس نے بجلی کی سی رفتار سے حرکت کی تھی۔ عباس بیٹھک کے دروازے سے برآمد ہوا اس نے ابھی اپنے پیچھے دروازہ بند کیا ہی تھا کہ۔۔۔ وہ جو گھات لگائے بیٹھی تھی، وہ نوٹس جھپٹ کر یہ جا وہ جا۔۔۔ جیسے کوئی ہوا کا جھونکا۔۔۔ جیسے جیسے۔۔۔ کوئی خوشبو جیسے کہ۔۔۔ جیسے کہ۔۔۔ "کیسر۔۔۔"

عباس ہکا بکا رہ گیا۔ بیٹھک کا دروازہ چونکہ باہر گلی میں کھلتا تھا اور وہ گھر کے مین دروازے سے آئی تھی۔ اس نے نوٹس چھیننے اور مین دروازے سے اندر داخل [illegible] میں دوڑ [illegible] لگائی تھی۔ مگر داخل ہونے سے پہلے بڑی ہی فاتحانہ مسکراہٹ عباس کی طرف اچھالی تھی اور چھپاک سے اندر گھس گئی۔۔۔ اور عباس۔۔۔

اوہ میرے خدا۔۔۔ کوئی یوں کھڑے کھڑے مسکراہٹ سے ہی قتل بھی ہو جایا کرتا ہے کیا؟ کیا وجود یوں ہی کھڑے کھڑے فنا بھی ہو جایا کرتا ہے؟ دل یوں ہی اک پل میں ہی برباد ہو جایا کرتا ہے کیا؟ اوہ خداوند۔ اوہ یہ کیا ہوا تھا کیا؟ وہ بند ہوتے دل کے ساتھ وہاں کھڑا، سمجھنے کی اپنی بہترین کوشش میں تھا اور وہ۔۔۔ وہ کیسر۔۔۔ اس نے دروازہ بند کیا، پشت دروازے سے ٹکائی، آ کے انداز میں کھلے منہ پہ ہاتھ رکھا اور بڑے زور سے ہنس دی تھی۔ عباس کے علاوہ کوئی اور نام پکارا جاتا تو وہ بھلا جاتی۔ ایسے کرتی کوئی۔ وہ بس بیٹھک کے دروازے کے باہر کھڑی ہو کر دانت پیستی رہتی اور حسب عادت پیر پٹختی۔ چلو زیادہ سے زیادہ کیا ہوتا۔۔۔ ابا سے لڑ جھگڑ لیتی اور بس۔۔۔ پھر جب ہنسی تھمی تو نہایت پُر مغرور، مغلئی سے انداز میں وہ بیٹھک کے اندرونی دروازے پہ آئی، بڑے ناز سے دستک دی اور بولی۔

"ابا۔۔۔ نوٹس واپس چھین لیے گئے ہیں۔ اگلی بار گھڑ سوار بھیجئے گا، پیادہ نہیں۔۔۔ نوٹس فوٹو کاپی کروانے۔" اچھا بھلا لکھنوی لب و لہجہ آخر میں آ کر دانت پیسنے جیسا ہو گیا تھا۔

"اوہ۔۔۔ تیری خیر کیسر۔ شیرنی کی بچی۔ اوہ بلاؤ اس پیادے کو اندر۔ دروازے پہ ہی مارا گیا۔" سر ظہیر نے افسوس سے کہا تھا اور وہاں ہی اوہ۔۔۔ اوہ۔۔۔ کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔

"اوئے آجا اندر۔۔۔" کسی لڑکے نے آواز دی تھی۔۔۔ اور وہ عجب سے انداز میں اندر داخل ہوا تھا۔ سب بچہ پارٹی نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔ آہ۔۔۔ باجی کیسر کے نوٹس ہاتھ سے گئے تھے، کوئی چھوٹی بات تو نہ تھی جو کہ ہوئی تھی۔ آہ۔۔۔ جتنا کراہا جاتا کم تھا۔ ایسی لائق فائق بچی اور یوں عرق ریزی سے نوٹس بنائے کہ ایک دفعہ رٹا لگاؤ بس سیدھے "پاس شدگان" کی فہرست میں شامل ہو جاؤ گے۔

"چلو بھئی بس۔۔۔ بڑا ہوگیا تماشا۔۔۔ چلو اب سب لیکچر کی طرف توجہ دو۔۔۔ وہ نوٹس تم بچوں کی قسمت میں تھے ہی نہیں۔" سر ظہیر نے تالی مار کر سب کو متوجہ کیا' تاکہ سب پھر سے میر کی جان کو رو سکیں۔ تو اب وہ سب میر کو روتے تھے اور آنکھیں ٹیڑھی کر کر کے عباس کو گھورتے تھے' دانت پیستے تھے اور من ہی من میں کہتے تھے' کیسی لائق نائق بچی کے نوٹس گئے ہاتھ سے۔۔۔ پیاوہ کہیں کا۔۔۔ میں جاتا تو۔۔۔ تو۔۔۔ ہا۔۔۔ نکما عباس پھٹے منہ تمہارا عباس۔۔۔ اور عباس سب سے بے خبر یوں بیٹھا تھا۔

میرے اندر کا پانچواں موسم
کس نے دیکھا ہے' کس نے جانا ہے

☼ ☼ ☼

"اوئے اوئے عباس۔۔۔" کسی لڑکے نے آواز دی تھی پیچھے سے اور اس کے ساتھ ہی کسی نے اسے کندھے سے پکڑ کر روکا تھا۔ اس نے حیران نظروں سے مڑ کر' اس حرکت کرنے والے کو دیکھا اور پھر تپ کر اپنا کندھا چھڑوایا تھا۔ وہ دو تھے اور انہوں نے کافی دور جا کر مین سڑک کے پاس اسے روکا تھا۔

"اوئے کیسی تھی وہ؟" اشتیاق دیکھنے لائق تھا' پوچھنے والے کا۔

"کون؟" عباس نے اچنبھے سے' بے اختیار پوچھا۔

"کوودن۔۔۔" ان دونوں نے مسخرے پن سے "کون" کو کھینچا اور پھر وہ دونوں ہاتھ پہ ہاتھ مار کر ہنس پڑے تھے۔

"کیسر۔۔۔ تیری بھابھی اور کون۔۔۔" ان میں سے ایک نے عباس کو آنکھ مار کر کہا تھا اور۔۔۔ جواب میں اک زبردست سا گھونسا اس کے منہ کو توڑ کر رکھ گیا تھا۔

"اوئے تیری تو۔۔۔ سالے۔۔۔ تو اس کا باپ لگتا ہے کیا؟ جو یوں آگ لگی ہے تجھے۔" وہ دونوں اس پہ پل پڑے تھے۔ عباس اکیلا' اور وہ ایک اور ایک گیارہ۔۔۔ مار مار کر اس کا بھرکس نکال کر رکھ دیتے' اگر لوگ انہیں نہ چھڑواتے تو۔۔۔

"ماں صدقے' ماں واری۔ بیڑہ غرق ان کم بختوں کا۔۔۔ کیڑے پڑیں ان کتوں کی قبروں میں۔ میرے معصوم بچے کا کیا حال کر دیا۔ ستیاناس ان مردودوں کا۔ ہائے میرے اللہ! میرا بچہ۔۔۔" صغراں روئے جاتی تھیں اور بددعائیں دیے جا رہی تھیں۔ لوگ بیٹوں کے لیے بیٹیوں کا ڈھیر لگا لیتے ہیں' لیکن ان کے ہاں الٹ تھا۔ سات بیٹے تھے ماشاءاللہ سے صغراں خاتون کے۔ انہیں بیٹی کی چاہ تھی اور ساتویں بار بھی عباس۔۔۔ سب سے چھوٹا۔ باپ سر پہ تھا نہیں۔۔۔ بڑے بھائی اتنے بڑے کہ ان کی اولادیں عباس کی ہم عمر تھیں تقریباً" ابھی لے دے کے ماں بچتی تھی' جو کہ اس کا سب کچھ تھی۔ اور ماں۔۔۔ یا میرے خدا مرغی کیا پروں میں لے کر چوزہ پھرتی ہوگی' جیسے صغراں عباس کو سنبھال سنبھال رکھتی تھیں۔ اور ان کی نازوں پلی اولاد کا یہ حشر۔۔۔ بددعا وہ جو آج تک نہ دی گئی ہو۔۔۔ بھائی الگ بے زار

"ہو گیا نا آپ کا لاڈلا جوان۔۔۔ ہو گئیں نا ماریں شروع۔۔۔ اب ہم کہاں تک سنبھالیں۔۔۔" وہ ماں کو طعنے دیتے اور ماں پوچھ پوچھ کر تھک گئی "میرے بچے' میرے لال بتا تو سہی ہوا کیا تھا؟ جھگڑا ہوا۔۔۔ تو ہوا کیوں؟ کس سے ہوا؟" پر لال کی بھی ایک ہی چپ تھی اور جب سب سے بڑے بھائی نے کالرز سے پکڑ کر اک جھٹکا دے کر پوچھا۔

"بتا۔۔۔ بتاتا کیوں نہیں ہے کہ ہوا کیا ہے؟" تو تب۔۔۔ ہاں تب اس نے اتنا سا کہا۔

"کبڈی میں جھگڑا ہوا تھا کسی بات پہ۔۔۔" اور پھر سے گونگے کا گڑ کھا لیا۔

وہ جلتی آنکھیں موند کر سوتا بن گیا اور بھائی بولتا رہا۔۔۔ لیکن۔۔۔ اس کے کانوں میں ایک ہی آواز گونجتی رہی۔ "کیسر۔۔۔ تیری بھابھی اور کون۔۔۔"

☼ ☼ ☼

"آ آ۔۔۔ آپ سر۔۔۔" وہ سر کو اپنے گھر پہ دیکھ کر

...ہوا اور اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"لیٹے رہو... لیٹے رہو۔" ظہیر صاحب نے اسے ...سے پکڑ کر دوبارہ لٹا دیا تھا۔

"...ہوا یہ؟"

"...سر... بس ایسے ہی...۔" وہ کھسیانا سا ہنس دیا۔

"تمہاری امی بتا رہی تھیں اکیڈمی کے کوئی لڑکے ..."

"امی آپ کے پاس گئی تھیں نا... شکایات لے ...ہے نا سر؟" وہ پورے وثوق سے بولا تھا۔

"مجھ سے سوال نہ کرو' جو میں پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو...۔" وہ ڈپٹ کر بولے۔

"سر جی! بس ایسے ہی تو تو میں ہو گئی تھی۔" اس نے سر جھکایا۔

"تھے کون؟" اور عباس نے ہونٹ بھینچے' مارے ضبط کے۔

"سر جی رہنے دیں نا... ایسے میں بات بڑھے گی۔" وہ ہچکچایا۔

"عباس... میں نے پوچھا تھے کون؟ کیا اکیڈمی کے تھے؟" اور وہ سر جھکائے کھولتا رہا۔ ان کے چہرے یاد آتے ہی خون میں کچھ ابلتا تھا۔ جی چاہتا تھا کمینوں کے اتنے ٹکڑے کرے کہ گننے والے کو گنتی بھول جائے۔ سر ظہیر بغور اسے دیکھ رہے تھے' اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ' اس کا سرخ ہوتا منہ...

"کون سے لڑکے تھے اکیڈمی کے۔" انہوں نے دوبارہ پوچھا۔ ان کو اکیڈمی میں نہیں ہونا چاہیے۔ وہ کیسر سے بدتمیزی بھی کر سکتے تھے۔ انہیں وہاں سے نکلوا دینا چاہیے۔ اور اسی سوچ کے ساتھ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"شاہد اور اکمل۔" اور نام سن کر ظہیر چونک گئے۔ یہ دونوں ہی سفارشی ٹٹو تھے۔ ان کی شہرت اچھی نہ تھی۔ ظہیر صاحب کو مجبوراً انہیں رکھنا پڑا تھا۔

"کس بات پہ جھگڑا ہوا؟" ان کے دماغ میں گھنٹی سی بجنے لگی۔ کیسر عباس سے ہی تو نوٹس چھین کر لے گئی تھی اور یہ جھگڑا بھی اسی دن...

"سر میں نہیں بتا سکتا۔"

"بولو۔" انہوں نے رعب سے کہا۔ وہ چند لمحے ہونٹ کچلتا رہا اور پھر بولا۔

"ان خبیثوں نے آپ کے گھر کے بارے میں نازیبا کلمات کہے تھے۔ میں برداشت نہیں کر سکا۔" وہ سر جھکائے بولا۔ ظہیر صاحب چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئے۔

"کیسر کے بارے میں کچھ کہا تھا؟" اور اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ وہ "ہاں" نہیں کہہ سکا تھا۔

"انہوں نے منہ سے سوال کیا' تم نے ہاتھ سے جواب دے ڈالا بچے۔"

"تو کیا چپ چاپ ان کی بات سنتا رہتا؟" دبا دبا سا لہجہ' تپا تپا سا انداز۔

"جاہلوں کی باتوں کا جواب خاموشی ہوتا ہے۔ کیا میں تمہیں بتانا بھول گیا؟" اور وہ جبڑے بھینچ کر خاموش ہو گیا' مگر غصہ چہرے سے چھلکتا تھا۔ ظہیر صاحب نے بے ساختہ اک گہرا سانس بھرا' کرسی پہ آگے کو ہو کر بیٹھے' اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولے۔

"سنو... سنو عباس جعفری! میں نے اپنی بیٹی کو سکھایا ہے کہ اس معاشرے' اس دنیا میں کیسے جینا ہے۔ میں نے اسے سکھایا ہے کہ کیچڑ میں پاؤں نہیں مارے جاتے۔ نہ میرے بچے اپنے اجلے کپڑے گندے کرنے کا فائدہ؟ جاہلوں کو منہ نہیں لگاتے۔ یہ تمہارا معیار نہیں ہے۔ گندی سوچ والوں کا کچھ نہیں کیا جا سکتا' وہ تو ایسے ہی سوچیں گے' چاہے ان کے سامنے ایک رنگین کپڑے کا چھیتڑا ہی کیوں نہ ہو' وہ اسے بھی عورت کی چادر گمان کریں گے۔ چار مکے مار کر' چار مکے کھا کر ان کی سوچ بدل ڈالی کیا تم نے؟ وہ اب جب بھی تم کو دیکھیں گے' تم کو ایسے ہی تنگ کریں گے' تو تم کہاں تک مارو گے اور مار کھاؤ گے؟ اگر کیسر کے بارے میں کچھ پوچھا تھا تو تم کہتے' جاؤ سر سے پوچھو... اللہ اللہ خیر صلا... مجھ سے پوچھنے آتے وہ؟

بات ختم' قصہ تمام شد' لیکن تم نے بات بڑھادی۔"
اور عباس... وہ حیران... سر کو معلوم کیسے ہوا کہ انہوں نے کیسر کا پوچھا تھا۔ سر کے بال ایسے ہی تو سفید نہیں ہو جایا کرتے' تجربہ بھی تو کسی چیز کا نام ہے اور ظہیر صاحب کی تو ساری عمر ہی لڑکے بالوں کو پڑھاتے گزری تھی' کیسے نہ سمجھتے اور پھر انہوں نے اس کے ہاتھ تھپتھپا کر چھوڑ دیے' وہاں خاموشی سی پھیل گئی تھی۔
"دم پنا خیال رکھنا۔" انہوں نے شفقت سے اس کا سر تھپتھپایا اور اٹھ کر چلے گئے اور جب صغراں انہیں دروازے پہ ملیں تو انہوں نے کہا۔ "بہن جی! بچے کو اب اکیڈمی نہ بھیجئے گا۔" شاہد اور اکمل پیچ رکھتے تھے اور ان کو اکیڈمی سے بے دخل کرنے کے لیے انہیں عباس کے ساتھ بھی ایسا کرنا پڑا تھا۔ اب وہ کہہ سکتے تھے کہ جھگڑا کرنے والے تینوں طالب علموں کو نکال دیا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور کیسر اس سارے معاملے سے انجان' بے خبر اپنی ہی دنیا میں مگن کتے' بلیوں کے ساتھ مصروف' راشد سے شرطیں لگاتی ہوئی' چڑیاں' طوطے آزاد کرواتی ہوئی۔ بالکل ہی بے خبر تھی... کہ کیا ہو گیا تھا۔ ہاں! ایک دن کسی بچے کی والدہ تو آئی تھیں شام کے وقت' وہ انہیں بیٹھک میں بٹھا آئی اور جب چائے لے کر گئی تو وہ جا چکی تھیں۔ ابا نے بھی کچھ کہا نہ بتایا... چلو زندگی گزرنے لگی اور ابھی چار دن کی ہی گزری تھی کہ اسے عجیب عجیب محسوس ہونے لگا۔ کچھ کچھ خالی خالی... جیسے کہ کچھ کم تھا یا شاید کھو گیا تھا یا پھر شاید... اللہ جانے کیا تھا۔ وہ تنگ آ کر' زچ ہو کر سوچنا چھوڑ دیتی پر یہ احساس' یہ کیسا احساس تھا ایسے جیسے کھانا کھا لینے کے باوجود پیٹ نہ بھرا ہو۔ ایسے جیسے سانس لینے کے باوجود زندگی محسوس نہ ہوتی ہو۔ ہائے اللہ یہ کیا تھا؟ وہ اچھی پھنسی... اچانک بیٹھے بیٹھے ایک دن خیال گزرا وہ... وہ کہاں تھا۔ اب کہیں دکھتا تھا نہ سر راہ ملتا تھا... ہا... وہ کہاں گیا۔ پہلے تو پیچھا بھی کرتا تھا تو اب کدھر گیا۔ جی چاہا ابا سے پوچھے پر پوچھے تو کیسے پوچھے؟ کیا کہہ کر پوچھے۔ تھی تو آخر عورت نا' لاکھ مردوں کی طرح تربیت کروا اور پھر یوں ہوا کہ وہ سڑک پہ چلتے چلتے ایک دم پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی۔ ہر بار لگتا وہ پیچھے ہی تھا اور جب پیچھے مڑ کر دیکھتی تو... دور تلک جاتی خالی سڑک... کوئی دم گزرتا' پھر سے اسے ایسا ہی محسوس ہوتا' وہ پھر سے مڑ کر دیکھتی تو... "اف... میں پاگل ہو جاؤں گی۔" وہ سر پہ ہاتھ مار کر کہتی' لیکن یہ مڑ مڑ کر دیکھنے کی عادت زور پکڑنے لگی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ وہ ایک دم سے سامنے آجائے اور یہاں پہ آکر کیسر ساکت ہو گئی' رک سی گئی' پلٹ... دل... دل... اس کا دل... تو یہ کچھ چاہتا بھی تھا کیا۔
"نہیں..." اور حیرت وہ جو آج تک نہ ہوئی۔ اور ابھی وہ تازہ تازہ اس حیرت کا شکار ہوئی ہی تھی کہ...

☼ ☼ ☼

"عباس... عباس کہاں جا رہے ہو؟" ہونٹ پھٹا ہوا' دائیں چیک بون پہ نیل' ماتھے کے زخم پہ کھرنڈ بن رہا تھا اور ایسے میں اگر وہ تیار شیار ہو کر۔ بے شکن لباس پہن کر' ہاتھوں میں کتابیں لیے کمرے سے نکلتا ہے تو پھر صغراں کا اسے ٹوکنا بنتا تھا۔
"اکیڈمی جا رہا ہوں امی..." اس نے رک کر جواب دیا اور پھر سے قدم بڑھائے۔
"رک جاؤ عباس۔" اور وہ رک تو گیا تھا' پر یوں روکے جانے پہ حیران تھا۔ امی اس کے پاس آئیں' ایک نظر اسے دیکھا اور اس کے ہاتھ سے کتابیں لے لیں۔
"تمہیں ابھی آرام کی ضرورت ہے۔"
"میں ٹھیک ہوں امی' آخری سال ہے میرا۔ پڑھائی کا حرج ہوتا ہے۔" جھنجلایا۔ صغراں کو محسوس ہوا کہ اب تو وہ نہ رکے گا۔
"تمہارے استاد منع کر گئے تھے۔"
"جی جی؟" وہ سمجھا نہیں۔
"تمہارے استاد مجھے کہہ گئے تھے تمہیں اب

اکیڈمی نہ بھیجوں۔" اور اس کے وجود کی ساری کی ساری چولیں ہل کر رہ گئی تھیں۔

"کیوں؟" اور اس سوال کا جواب صغراں کے پاس نہ تھا۔ وہ بے تاثر چہرہ لیے کھڑی رہیں۔

اس نے کتابیں ماں کو پکڑائیں اور خود اس بے قرار انداز میں باہر کو نکلا تھا کہ صغراں اسے دیکھتی رہ گئیں۔

جب وہ وہاں پہنچا تو سر لیکچر دے رہے تھے۔ وہ خاموشی سے ایک طرف سر جھکا کر بیٹھ گیا تھا۔ سب ہی اسے حیرت سے تکتے تھے۔ نہ ہاتھ میں کتاب، نہ قلم۔ مجروح حالت اور وہ یہاں کرنے کیا آیا تھا؟ اسے دیکھ کر ایک بار تو ظہیر صاحب بھی ٹھٹکے تھے اور پھر سبق پڑھانے لگے۔ پانچ ہوئے، پھر پانچ بج کر پانچ منٹ اور۔۔۔ دروازے پہ وہ مانوس سی دستک۔۔۔ وہ ہی مانوس سا، تھوڑا ستا ہوا لہجہ۔۔۔ اور اس کے روم روم میں کوئی سکون سا اترا تھا۔ پھر وہاں سے بچے اک اک کر کے جانے لگے اور جب بیٹھک خالی ہوئی تو۔۔۔

"میں نے کیا، کیا ہے سر جو آپ نے مجھے جماعت سے بے دخل کیا۔" وہ روہانسا ہو کر بولا۔ سر نے اک گہرا سانس بھرا، اٹھ کر اس کے پاس آئے، پیار سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور بولے۔

"گیہوں کے ساتھ گھن پسنے کی مثال تو سن رکھی ہے نا؟" عباس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"تو بس بیٹا۔۔۔ تم گھن ہو۔ مجھ پہ ان دو کو اکیڈمی میں رکھنے کا دباؤ تھا، میں نے یہ عذر تراشا کہ میں نے ان تینوں کو نکال باہر کیا کہ جنہوں نے جھگڑا کیا تھا۔ سو اب میں تمہیں نہیں رکھ سکتا۔ تم اچھے لائق بچے ہو اور اب تو بس امتحان ہوا ہی چاہتے ہیں، تم ان شاء اللہ کامیاب ہو جاؤ گے۔ جاؤ شاباش۔۔۔ جاؤ میرے بچے محنت کرو۔ خدا تمہاری مدد کرے۔" انہوں نے اک بار پھر اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"ابا۔۔۔" دستک پھر ہوئی، آواز پھر سے آئی اور اب کے وہ آواز عباس جعفری کو چیر کر رکھ گئی تھی۔ اس نے سخت تکلیف سے آنکھیں بند کی تھیں۔

"آرہا ہوں کیسر۔۔۔ آرہا ہوں۔" اس کے بعد ان دونوں نے اپنی اپنی نشست چھوڑی تھی۔ ظہیر صاحب اندر کو بڑھے اور وہ باہر کو۔

"دروازہ بند کرتے جانا۔" ظہیر صاحب نے کہا تو وہ ٹھہر سا گیا۔ چند لمحے دروازے کے پٹ کو پکڑے کھڑا رہا اور پھر دھیرج سے بند کر دیا تھا اور۔۔۔ یہ ایسا ہی تھا کہ جیسے زندگی کا دروازہ خود پہ بند کرنا۔

☆ ☆ ☆

اور ابھی وہ تازہ تازہ اس حیرت کا شکار ہوئی ہی تھی کہ۔۔۔ اسے حیرت کے اک نئے مفہوم سے آشنا ہونا پڑ گیا تھا۔ ایک خاتون آئی تھیں، اپنی بہو کے ساتھ اس کا رشتہ لینے۔ نہ حیرت یہ تو نہ تھی جس کا اسے ادراک ہوا تھا۔ وہ تو کچھ اور تھی۔ ابھی ابا نے کہا چائے بنالو اور ساتھ میں محلے کے کسی بچے کو کہہ کر کچھ منگوالو۔ چائے لے کر خود آنا۔ دستک نہ دینا۔ ابا تو کہہ کر چلے گئے اور وہ حیران۔۔۔ یا الٰہی ان کے گھر ایسا کون آگیا جس کی یوں خاطر مدارت کی جائے۔ رشتے دار تو سال بعد چکر لگاتے تھے اور ابھی پچھلے چکر کو سال تو نہیں ہوا تھا۔ اور اگر کوئی رشتہ دار ہوتا تو یوں بیٹھک میں تو نہ بٹھایا جاتا، تو آخر کون تھا۔ وہ متجسس ہوئی۔ چائے بنائی، ٹرے سیٹ کی اور جب وہ ٹرے اندر لے کر گئی تو۔۔۔ عام سی کھدر کی قمیص، دوپٹا شانوں پہ، پیروں میں نائیلون کی چپل۔۔۔ اوہ ہاں! آنکھوں میں کاجل تو تھا۔ گردن کے ساتھ وہ تعویذ سا لاکٹ بھی۔۔۔ اک کلائی پہ بندھا رنگین سادھاگا بھی تو تھا۔ وہ ٹرے میز پہ رکھنے کو جھکی۔

"یہ میری بیٹی ہے۔ کیسر" ابا نے تعارف کروایا۔ وہ سیدھی ہوئی نظریں ان خاتون سے ملیں۔ اوہ! یہ تو وہی تھیں جو اس دن بھی آئی تھیں۔ وہ از راہ مروت مسکرا دی۔ خاتون نے عجیب ناگواری سے منہ پھیرا تھا۔ کیسر کو عجیب محسوس ہوا۔

"بیٹھ جاؤ کیسر۔۔۔" ابا نے کہا تو وہ بیٹھ گئی اور لگی کلائی سے بندھے دھاگے سے کھیلنے۔ وہ کیا جانے کہ وہ خواتین کیوں آئی تھیں۔ ابا ان سے باتیں کر رہے تھے کہ۔۔۔

"کیسر باجی۔۔۔ کیسر باجی پوسی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔" ایک بچہ ہانپتا۔ کانپتا آیا' اطلاع پہنچائی اور غائب۔۔۔

"ہائے اللہ!" کیسر اس کے پیچھے بھاگی۔ "علی۔۔۔ علی رک تو سہی۔۔۔" بانگ دہل آوازیں دیتی ہوئی وہ بجلی کی سی رفتار سے اس کے پیچھے بھاگی تھی اور پھر دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز آئی تھی۔ وہ دونوں خواتین سخت حیران اور ابا ہنس دیے۔

"اسے نہیں معلوم کہ آپ خواتین کس مقصد کے تحت آئی ہیں۔ کیسر نے بلیاں پال رکھی ہیں اور اس کی جان ہے ان بلیوں میں۔۔۔" ابا بڑے پیار بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ کوئی اس وقت ان کے چہرے کو دیکھتا تو جان لیتا کہ باپ کی شفقت کیا ہوتی ہے۔ اور صغراں خاتون۔۔۔ لو جی پل بھر میں فیصلہ ہو گیا تھا اور جب وہ کیسر کے گھر سے نکلیں چند گز کا ہی فاصلہ طے کیا تو سامنے سے کیسر آتی دکھائی دی۔ بلے کو یوں اٹھا رکھا تھا کہ جیسے بچہ گود لیا ہو۔ ایک ہاتھ سے اسے پچکارتی' اس سے باتیں کرتی۔ وہ اس کی مرہم پٹی کروا کے لائی تھی۔ محلے کے ڈسپنسر سے۔ صغراں خاتون کو تو اسے دیکھتے ہی آگ لگ گئی تھی۔ کیسر حسب عادت اپنے دھیان میں مگن چلی رہی تھی۔ نہیں جانتی تھی کہ اک خاتون اس کا خون پی جانے کے ارادے سے اس کی طرف بڑھی تھیں۔

"بات سنو میری۔۔۔" اس کو بازو سے پکڑ کر روکا' نہ صرف روکا' بلکہ ایک جھٹکا دے کر روکا۔ لیں جی! ہونے لگی وارد وہ حیرت کہ جس کا ادراک کیسر کو آج سے پہلے نہیں ہوتا تھا۔

"میرے عباس کو تو تم نے پھنسا لیا' لیکن یاد رکھو کہ اس کی ماں ابھی زندہ ہے۔ تم باپ بیٹی تعلیم کے نام پہ کون سا ادھ کھ لے بیٹھے ہو؟ یہ لو۔۔۔ یہ لو پکڑو پیسے اور میرے معصوم بچے کی جان چھوڑ دو۔" صغراں یوں بل کھا رہی تھیں کہ بس چلتا تو اس کا گلا دبا دیتیں اور کیسر۔۔۔ یک ٹک انہیں دیکھے گئی۔ صغراں نے کاندھے تلے دبے پرس سے پیسے نکالے' اس کا ہاتھ کھینچا۔ ہتھیلی پہ پیسے پٹخے اور نفرت سے سیاہ پڑتے بولیں۔

"آوارہ کہیں کی۔" اور پھر بہو کا بازو کھینچ کر چل دیں۔

"تو کیسر کو آج معلوم ہوا' اب پتا چلا کہ حیرت دراصل ہوتی کیا ہے۔"

"عباس۔۔۔" اس کے لبوں نے بے آواز حرکت کی تھی اور پیسے اس کے ہاتھ سے نیچے جا گرے۔ اور اس کے ہاتھوں میں اتنا بھی دم نہ رہا کہ وہ بچوں کی طرح اٹھائے ہوئے بلے کو سنبھال لیتی۔ وہ بھی اس کے ہاتھوں سے نیچے جا گرا۔ میاؤں میاؤں کر کے اسے بتانے لگا کہ وہ زخمی ہے۔ پر کیسر کہاں سنتی تھی۔ حیرت نے اس کے کانوں کو بند کر ڈالا اور آنکھ کی پتلیوں کو ساکت۔۔۔ وہ اس ساکت زدہ سی کیفیت میں ہی حرکت میں آئی تھی۔ اس نے قدم اٹھایا اور پیران رویوں پہ رکھ کر گزر گئی۔ بلا میاؤں میاؤں کرتا' لنگڑا کر چلتا' زخم خوردہ سا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

آہ! کہ وہ دونوں اک سی حالت میں چل رہے تھے۔

"تو ابا نے اسے مردوں کے معاشرے میں جینا تو سکھا دیا پر عورتوں کی دنیا میں رہنا نہ سکھا سکے۔"

☆ ☆ ☆

عباس نے ماں سے کہا تھا کہ امی جی اس میں صورت نہ ہوگی' سیرت نہ ہوگی پر اس کا دل۔۔۔ امی جی اس کا دل وہ ہے جو شاید ہی کسی کے پاس ہو۔ میری یہ خواہش پوری کر دیں تو پھر ساری ہی خواہشوں کو انجام مل جائے۔۔۔ اور لو جی ماں جی ایسے اظہار پہ ہی کھٹک گئیں۔ ان کے بڑھاپے کا سہارا' ان کی آخری امید ہر لی کسی نے اپنے دام میں۔۔۔ باقی بیٹے ان کے بیٹے تو نہ تھے۔ وہ تو اپنی بیویوں کے شوہر تھے۔ اور اب کیا عباس بھی؟ نہیں نہیں وہ ایسا نہیں ہونے دیں گی۔ وہ محض عباس کو ٹالنے کے لیے ظہیر صاحب کے گھر گئی تھیں۔ جانتی تھیں کہ ظہیر صاحب جہاندیدہ آدمی ہیں۔ سمجھ دار بھی ہیں تو خود ہی ان کا رویہ دیکھ کر پیچھے

ہٹ جائیں گے۔ پر وہ تو آوارہ نکلی۔ ظہیر صاحب کیا وہ تو ان کے بیٹی کو بھی اچھی طرح سے سمجھا آئی تھیں۔ چلو جی خس کم جہاں پاک۔۔۔ عباس کے لیے لڑکیوں کی کمی تھی کیا۔ اک ڈھونڈنے نکلو' ہزار ملیں گی۔ اس کے لیے وہ ہی بچی تھی کیا؟ عباس کا کیا ہے۔۔۔ بہلالیں گی۔۔۔ چار دن معاملہ لٹکائیں گی' آخر میں قصہ تمام شد۔۔۔ بہو کو بھی منع کر دیا کہ بھنک نہ پڑے اس بات کی کسی کو بھی کہ وہ کیسر کے ساتھ کیا معاملہ کر کے آئی تھیں اور یہاں پہ آکر بہو نے بھی گونگے کا گڑ کھالیا کہ عباس اپنی چھوٹی بہن کے لیے بڑا پسند تھا اسے۔ اوپر سے ساس صاحبہ نے بھی آس دلا رکھی تھی۔ ماں کو وہ برآمدے میں ہی ٹہلتا ملا تھا۔ صغراں نے بہو کو اندر جانے کا اشارہ کیا اور پھر برآمدے میں رکھی کرسی پہ جا بیٹھی تھی۔ عباس خاموشی سے ان کے پاس جا بیٹھا۔

"عباس تمہاری نوکری تو ہے نہیں بھلا بتاؤ تم بیوی کا خرچا کیسے اٹھاؤ گے؟" وہ یہ بات سن کر بدمزا ہوا۔ اس ایک بات کی توقع نہیں کر رہا تھا وہ۔

"جب تک نوکری نہیں ملتی دکانوں کے کرائے سے گزارا کرلیں گے امی جی۔۔۔ اور وہ اتنی سادہ مزاج ہے کہ اس کے لیے گول گپے ہی دنیا کی بڑی نعمت ہیں۔" یہ کہہ کر وہ شگفتگی سے ہنس دیا۔

"ملتی رہی ہے تم سے؟" عجیب ناگوار سا انداز۔

"نہیں تو۔۔۔ میں ملتا رہا ہوں اس سے۔" وہ خواہ مخواہ میں مسکرایا۔

"ایک ہی بات ہے۔" وہ طنزیہ مسکرائیں۔ اب ان کو کون سمجھاتا کہ ایک ہی بات نہیں تھی۔

"مجھے پتا تھا' وہ آپ کو پسند نہیں آئی۔ پر ماں جی لکھوالیں مجھ سے' وہ آپ کی سب بہوؤں سے زیادہ اچھی بہو ثابت ہوگی۔" رازدانہ انداز میں کا ماں کا گھٹنا دبا کر کہتے ہوئے وہ کھل کر ہنس دیا تھا۔ ہنس کر احساس ہوا کہ ماں کچھ سنجیدہ سنجیدہ تھیں۔

"کیا ہوا امی جی' کوئی بات ہوئی ہے؟" وہ پریشان ہوا۔

"نہیں۔۔۔"

"تو پھر اتنی سنجیدہ کیوں ہیں۔ سر نے کیا جواب دیا؟" اسے فکر لاحق ہوئی۔

"بیٹیوں والے سوچنے کو وقت تو مانگتے ہی نا یوں منہ بھر کر' اک دم سے ہاں تو نہیں کرتے نا۔۔۔ میں تھک گئی ہوں' آرام کروں گی۔" وہ یہ کہہ کر گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر اٹھیں اور اندر چلی گئیں اور عباس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے اپنا سر کرسی کی پشت پہ گرایا تھا۔

"کیسر۔۔۔" اس کے لب بنا آواز کے ہلے اور یوں محسوس ہوا تھا کہ وہ نام' نام نہیں تھا۔ گھنٹیاں تھیں۔۔۔ گھنٹیاں۔۔۔ مدھری۔۔۔ پر' سرور جو اس کے ارد گرد بجنے لگی تھیں۔ وہ بڑے سکون سے مسکرایا تھا۔

✡ ✡ ✡

"کیسر۔۔۔" ابا اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔ ایسا حال۔۔۔ اوہ میرے خدایا۔۔۔ اسے کیا ہوا؟ "کیسر میرے بچے کیا ہوا؟" وہ عجلت میں اس کی طرف بڑھے۔ اس نے باپ کو دیکھا اور۔۔۔

"آہ! کہ اس کے باپ کا سفید بالوں والا سر۔۔۔ آہ! کہ اس کا بوڑھا باپ۔۔۔" اس کا دل پھٹ جانا چاہتا تھا۔ تو وہ بن گئی نا باعث بے عزتی کا اپنے بوڑھے باپ کی بے عزتی کا۔۔۔ نہیں' نہیں بے عزتی چھوٹا لفظ تھی۔

"ابا۔۔۔" اس کے ہونٹ بچوں کی طرح کانپے۔ آنسو لرز کر ٹوٹ کر پلکوں سے گرے۔

"اف۔۔۔" باپ کے دل پہ آرا چلا۔ انہوں نے بڑھ کر بے ساختہ اسے بانہوں میں لیا۔

"کیسر۔۔۔ میری جان' میرا بچہ کچھ بولو تو سہی ہوا کیا؟ پوپی تو ٹھیک ہے۔ بس ذرا سا زخمی ہی تو ہے۔" وہ صحن میں میاؤں میاؤں کرتے بلے کو دیکھ کر بولے تھے' پر وہ کہاں سنتی تھی۔ دونوں مٹھیوں میں باپ کی قمیض جکڑے وہ ایسے روئی کہ جیسے کوئی مر گیا تھا۔

"وہ کیوں آئی تھیں ابا! کیوں؟ کسی نے بلایا تھا کیا۔۔۔ کیوں۔۔۔ ابا۔۔۔ کیوں۔۔۔" خدا قسم اس کے رونے سے دل پھٹتا تھا۔ ظہیر صاحب نے ایک دم

اسے خود سے الگ کیا۔

"تم سے کچھ کہا انہوں نے؟ بولو کیسر بتاؤ۔" اور وہ کیسے کہتی۔ کیسے بتاتی۔

"کیسر بتاؤ۔" بوڑھے ہاتھ کانپے، آواز لرزی۔

"ابا بہت بری بات کی، بہت گندی بات۔۔۔ ابا پورا محلہ، پورا محلہ چھوٹے سے لے کر بوڑھے تک۔۔۔ کیسر باجی، کیسر باجی کہتا ہے مجھے، مائیں اس گھر میں اپنی بچیاں بے خوف بھیجتی ہیں کہ یہاں کیسر ہے۔ محلے کے لڑکے آپ کی اتنی عزت کرتے ہیں کہ مجھے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔۔۔ اور وہ۔۔۔ وہ۔۔۔" اور پھر سے کیسر چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر پھپک رو دی تھی۔ ظہیر صاحب اک پل کو ساکت ہوئے اور پھر اک سانس بھر کر اسے گلے سے لگایا تھا۔

"بس۔۔۔ بس میرا بچہ۔۔۔ بس۔" وہ اسے پچکارتے رہے اور وہ یوں روتی رہی کہ آج اپنے ساتھ انہیں بھی بہا ڈالے گی۔

"بچوں کی مرضی ہو تو والدین کیا کر سکتے ہیں بھائی جی۔" عباس کی والدہ کا ہنس کر کہا جانے والا جملہ انہیں بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔ سمجھ تو وہ گئے تھے۔ لہٰذا ہاں کس نے کرنی تھی۔ پر یہ کیا کر ڈالا انہوں نے۔۔۔ آہ۔۔۔ اک بار انہیں کہہ جاتیں۔۔۔ سمجھا تو گئی تھیں، منہ سے بھی کہہ جاتیں پر بچی کے ساتھ یوں تو نہ کرتیں۔۔۔ وہ رات بڑی بھاری تھی۔ آنکھوں میں کاٹنے سے بھی نہ کٹتی تھی۔ بومی میاؤں میاؤں کرتا رہا۔ اس کے کمرے کے گرد منڈلاتا رہا۔ اس رات۔۔۔ ہاں اس رات اس کی پالی ہوئی بلیاں ساری رات روتی رہی تھیں وہ رات بڑی بھاری تھی۔ قسم سے بڑی بھاری تھی۔

✻ ✻ ✻

"کیسر مہمان ہے۔ چائے دے جانا۔" بیٹھک کے بیرونی دروازے پہ ہونے والی دستک سن کر وہ اٹھتے ہوئے بولے تھے اور پھر جب دروازہ کھولا تو۔۔۔ وہ اسے سامنے دیکھ کر اتنے ساکت ہو گئے کہ اس کے سلام کا جواب بھی نہ دے سکے۔ اب وہ یہاں کیا کرنے آیا

تھا۔ وہ سخت حیران اور عباس انجان۔ ماں نے چار دن بات لٹکائی اور آخر میں کہہ دیا کہ "ظہیر صاحب نے انکار کر دیا۔" "یا میرے اللہ! یہ کیا ہوا؟ عباس کو تو سانس نہ آتی تھی، حلق سے نوالہ نیچے نہ اترتا تھا۔ "کیوں" کا سوال اس کے گرد دھمال ڈالتا تھا۔ اف۔۔۔ اس کا دماغ پھٹ جائے گا یا دل۔۔۔ اف نہیں۔۔۔ نہیں وہ کیسر کے بنا زندگی کیونکر گزار پائے گا۔ تو جب کیسر زندگی میں نہ ہو گی تو زندگی بھلا زندگی ہو گی کیا؟ نہیں، وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا اور "محبت" اس طرح سے حواس سلب کرتی ہے کہ کوئی عباس خود چل کر، ایک بیٹی کے باپ سے انکار کی وجہ پوچھنے آجاتا ہے۔ ماں کو کہا تھا پر وہ کہنے لگی۔

"میں تو نہیں جاتی ان کے گھر، جس نے میرے شہزادے بیٹے کو انکار کیا۔ جاتی ہے وہاں اب میری جوتی۔۔۔ ہونہہ۔۔۔" ماں نے تو تنفر سے کہہ دیا، پر اس کا سانس اٹکتا تھا، تکلیف کوڑے مارتی تھی۔ "یہ محبت جو ہے نا۔۔۔ یہ کانچ کی سی ہوتی ہے جو جب خون میں بہنے لگے تو پورے جسم کو۔ پورے بدن کو زخم زخم کر چھوڑتی ہے۔" اور وہ مجبور ہو گیا۔ اتنا لاچار کہ خود چل کر ایک باپ کے پاس جا پہنچا۔

"امتحان اچھے ہو گئے عباس؟" اور اک دستک دیتا ہاتھ تھام۔۔۔ عباس سن کر وہیں ہوا میں ہی ساکت ہو گیا تھا۔ ظہیر صاحب اندازہ کر سکتے تھے کہ وجہ کیا ہو سکتی ہے آنے کی، پر وہ اس موضوع پہ بات ہی نہیں کرنا چاہتے تھے اور عباس۔۔۔ اس کا سر اتنا جھکا تھا کہ وہ شخص سر کے پیر ہی دیکھ سکتا تھا۔ اس سوال پہ بھی وہ چہرہ اٹھا نہ سکا تھا۔

"جی۔۔۔" اس نے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

"آگے کا کیا سوچا ہے؟" اور وہ چپ۔۔۔ اتنا کہ یہ خاموشی ناگواریت میں بدلنے لگی تھی۔

"عباس۔۔۔" ظہیر صاحب کا استفہامیہ لہجہ۔

"سر جی! میرے ساتھ یوں نہ کریں۔ انکار نہ کریں۔ میں اسے بہت خوش۔۔۔" اور اس کا مجذوبانہ

انداز۔ وہ اگلی بات کہنے کی ہمت نہ کر سکا۔ ادھوری بات۔ پورا مطلب۔ ظہیر صاحب کو منٹ میں ساری کہانی سمجھ آگئی تھی۔ ماں راضی نہیں اور بیٹا بے خبر۔ اب اسے کیا کہیں؟ کیا ایک بیٹے کو ماں سے بدظن کر دیا جائے؟ تو کیا ایک ماں کے وقار کو۔ اس کی ممتا کو ایک بیٹے کے سامنے ذلیل کر کے رکھ دیا جائے۔ نہیں۔ ہاں۔ نہیں کہ جاہلوں کی بات کا جواب۔ ان ہی کے سے انداز میں نہیں دیا جاتا۔ یہ ان کا معیار نہیں تھا۔ یہ ان کا ظرف نہیں تھا۔ وہ استاد تھے اور سکھانے کے واسطے دنیا میں آئے تھے 'بگاڑنے کے واسطے نہیں۔

"بات یہ ہے عباس! کیسر کو ابھی پڑھنا ہے۔ اسے اردو میں ماسٹر کرنا ہے۔ اسے بہت شوق ہے میرے جیسا بننے کا۔" وہ ذرا سا ہنسے 'پھر سر جھٹکا۔

"بتاؤ اکلوتی اولاد کا شوق کیوں نہ پورا کروں۔ شادی بھی ہو جائے گی اپنے وقت پہ۔ ابھی تو اس کے بی ایس کا نتیجہ بھی نہیں آیا اور تم۔ تم بھی تو کسی قابل ہو جاؤ۔ پھر دیکھیں گے اور ایسے معاملات بچے طے نہیں کرتے۔"

"ہاں۔" اس نے اتنا خوش ہو کر سر یک دم اٹھایا تھا کہ ظہیر حیران رہ گئے تو کیا اسے زندگی کی نوید دے دی گئی تھی۔ کیا اس نے پہلی بار سانس لیا۔ ہاں کیا پہلی بار؟

"سر۔ سر میں۔" اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا کہے۔ کیسے اظہار کرے۔ وہ منہ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا اور خوشی اس کے پورے وجود سے کسی خوشبو کی طرح پھوٹتی تھی۔ ظہیر صاحب نے اک نظر اسے دیکھا اور پھر آہ جیسا سانس بھرا تھا۔

"جاؤ بچے۔ اپنے گھر جاؤ۔" وہ کہہ کر اٹھے اور پھر اندر چلے گئے۔ عباس چند لمحے وہاں کھڑا رہا اور پھر سرخوشی کے عالم میں وہاں سے نکلا تھا۔ بیٹھک کا بیرونی دروازہ بند کرنے سے پہلے وہ ذرا سا ٹھہرا' اک نظر اس کمرے کو دیکھا اور پھر آہستگی سے دروازہ بند کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ماں کو منانے اور سمجھانے میں بہت دن صرف ہو گئے تھے۔ اس نے یہ نہ بتایا کہ وہ سر کے پاس گیا تھا۔ وہ بس کہتا ہی رہا۔ "امی جی! آپ اک بار جائیں تو سہی۔ پوچھیں تو سہی۔ آخر مسئلہ کیا ہے۔ ہو سکتا وہ ابھی' اتنی جلدی شادی نہ کرنا چاہ رہے ہو۔ کیسر کو پڑھنے کا بہت شوق ہے نا۔ شاید یہ ہی وجہ ہو۔ اچھا یہ وجہ ہوئی نا تو سر سے کہنا۔ شادی نہیں کرنی تو نہ کریں۔ منگنی ہی کردیں' تاکہ میں بھی اطمینان سے انہیں کسی قابل بن کر دکھا سکوں اور آپ کو بھی فکر نہ رہے کہ بیوی کا خرچا کیسے اٹھاؤں گا۔"

اور ماں۔ ان کا دل چاہتا تھا کہ سو جوتیاں پہلے اپنے بیٹے کے سر میں ماریں کہ جس کی عقل پہ عشق کے پتھر پڑ چکے تھے اور پھر جا کر ان باپ' بیٹی کی خبر لیں۔ وہ بہانے سے ٹالتی رہیں پر بیٹے کو تو مرض محبت تھا کیونکر شفایاب ہوتا۔ ضد کے آگے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے ماں کو۔ تو وہ ایک دن جانے کے لیے تیار ہوئیں۔ عباس نے کہا' میں ساتھ چلتا ہوں۔ صغراں خاتون نے منع کر دیا۔ اس دن بیٹی کو تو سمجھا آئی تھیں اور سمجھایا تو باپ کو بھی تھا' پر لگتا تھا عقل نہیں آئی۔ تو وہ تو انہیں عقل سکھانے جا رہی تھیں' عباس کو ساتھ لے جا کر اب اپنے پیر پہ ہی کلہاڑی مارتیں کیا؟

وہ بڑے غصے میں تھیں اور باپ 'بیٹی کے چیتھڑے اڑا دینا چاہتی تھیں اور اس ایک کام کے لیے ان کے لفظوں کی بلٹس ہی کافی تھیں۔ تو جب وہ ان دونوں باپ 'بیٹی کو اپنی نائن ایم ایم (زبان) سے اڑانے آئیں تو یہ دیکھ کر مارے خوشی کے گنگ رہ گئیں۔ دروازہ پہ یہ اتنا بڑا تالا پڑا تھا اور کئی بلیاں اس مکان کے باہر' منڈیر پہ ماری ماری پھر رہی تھیں۔

"سنو یہ کہاں گئے؟" گلی سے گزرتے ایک بچے سے پوچھا تھا۔

"کیسر باجی لوگ مکان چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔" لو جی! ایک بار پھر خس کم۔ جہاں پاک۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے ہاتھ جھاڑے تھے۔ تو صغراں خاتون کو انہیں مارنے کے لیے اپنی نائن ایم ایم کا استعمال نہیں کرنا پڑا تھا۔

ماں کے منہ سے یہ سن کر کہ ظہیر صاحب گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ عباس کو یقین نہیں آیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا تھا بھلا؟ نہیں، نہیں۔۔۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ ایسے کیسے وہ چھوڑ کر جا سکتے تھے۔ ابھی تو۔۔۔ ابھی تو۔۔۔ اف۔۔۔ میرے خدایا۔۔۔ یہ کیا ہو گیا۔۔۔ کیا؟" اس نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھاما تھا' یوں جیسے وہ پاگل ہو رہا ہو۔

"نہیں امی کو غلط فہمی ہوئی ہو گی۔ اکیڈمی آج کل بند ہے' تو وہ ایسے ہی کہیں ملنے ملانے گئے ہوں گے۔ امی کو غلط فہمی۔۔۔" اور وہ اتنا بے قرار ہوا۔ اس قدر مضطرب کہ اٹھ کر نکل پڑا تھا یہ دیکھنے کے واسطے کہ کیسر کے گھر پہ تالا تھا یا نہیں۔ صغراں نے بہتیری آوازیں دیں پر اب کوئی آواز وہ کیسے سنتا۔ کیسے؟ صغراں نے بیٹا تب نہ کھوتیں کہ جب وہ کیسر کو اس کی زندگی میں لے آتیں۔ انہوں نے بیٹا اب کھویا تھا۔

اس کا جی چاہا کہ وہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لے اور ساری عمر یوں ہی آنکھیں بند کر کے اسی ایک در پہ کھڑا رہے۔ نہیں۔۔۔ اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ سامنے گیٹ پہ پڑا وہ تالا' نہیں اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ آہ! کہ حقیقت جان لیوا تھی۔ آتی گرمیوں کے دن تھے۔ دھوپ کی شدت زور پکڑنے لگی تھی۔ عین دوپہر کا وقت اور وہ دروازے کے سامنے سب کچھ ہار کر کھڑا تھا۔ کیا کرے۔۔۔ کدھر جائے' کہاں سے تلاشے؟

"میرے ساتھ یوں تو نہ کرتے سر جی! بیٹی کا ہاتھ نہیں دینا تھا' تو نہ دیتے' پر یہ تو نہ کرتے جو کیا۔" اور وہ گھٹنوں کے بل کھڑے کھڑے زمین پہ گرا تھا اور اس طرح گرا تھا کہ کسی ہارے ہوئے جواری کا حال اس سے بہتر ہوتا ہو گا۔ نہیں معلوم کتنی ہی دیر وہ یوں ہی خاک پہ خاک ہو کر بیٹھا رہا اور شاید یوں ہی بیٹھا ہی رہتا' مگر اسے ایک بلی کی آواز نے چونکایا تھا۔ وہ عجب وحشت بھرے انداز میں میاؤں میاؤں کرتی تھی۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا اور پھر اٹھ کر چل پڑا۔ پیدل ہی۔۔۔

وہ اتنا خاموش تھا اور اس انداز میں چل رہا تھا کہ لوگ بے اختیار اسے مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے۔ اس نے چھچھڑے خریدے اور پھر الٹے قدموں واپس۔۔۔ وہیں پہ اسی ایک جگہ پہ آ کر اس نے چھچھڑے بلیوں کو ڈالے اور خود ایک طرف خاموش بیٹھ کر انہیں تکنے لگا۔ وہ زمین پہ' دیوار کے سائے میں ایک ہاتھ سر پہ رکھے اس انداز میں بیٹھا تھا کہ ہر آنے جانے والا اسے نوٹس کرتا تھا۔ پر اسے پروا کہاں۔۔۔ وہ تو بس خاموشی سے بلیوں کو چھچھڑے کھاتے تکتا تھا۔ آہ! کہ محبت۔۔۔

اور پھر۔۔۔ پھر یوں ہوا کہ وہ شہر بھر میں اسے ڈھونڈتا رہا اور یہ کھوج بھی عجب تھی۔۔۔ وہ چڑی فروش سے چڑیاں خرید خرید کر اڑاتا رہا۔ راشد سے شرط لگاتا کہ وہ دنیا کی یہ نعمت کھا کر دکھائے گا اور سالم کیا۔۔۔ وہ تو ایک گول گپا بھی نہ کھا پاتا تھا۔ راشد گول گپوں کی پلیٹ بناتا' اس کے آگے رکھتا اور وہ۔۔۔ خود میں اتنی ہمت نہ پاتا کہ دنیا کی اس بڑی نعمت کو ذرا سا چکھ ہی لے۔ اس کے حلق میں کچھ پھنسنے لگتا' وہ چند لمحے اس پلیٹ کو تکتا رہتا اور پھر راشد سے کہتا۔

"تو بھئی راشد بیٹے یہ رہے پلیٹ ضائع کرنے کے پیسے اور یہ رہے شرط ہارنے کے پیسے۔" وہ الگ الگ نوٹ رکھتا اور جب جب وہ ایسا کرتا تو رہ رہ کر اسے خیال آتا کتنے طریقے آتے تھے نا تمہیں کیسر! کسی کی مدد کے لیے' کیا سارے جہاں کا درد تمہارے ہی دل میں تھا؟ اس غریب کی طرف بھی کبھی جو مڑ کر دیکھو' دیکھو تو سہی کتنا لاچار ہوا چاہتا ہے۔ کیا اب مدد نہ کرو گی؟ کوئی چارہ کیسر۔۔۔ کوئی مدد؟

کبھی جو بائیک ٹھیک کروانے جاتا تو ایسے ہی اسی بچے سے باتیں بھگارتا رہتا' پھر بڑی رازداری سے پوچھتا "کوئی باجی آئی تھیں ایسی باجی جو تمہیں پڑھنے کا کہتی ہو؟" وہ نفی میں سر ہلاتا' عباس کا دل ڈوب جاتا۔ پھر جیب سے چند نوٹ نکال کر اسے پکڑاتا۔ وہ استاد کی جانب تکتا تو عباس اس کا کاندھا تھپتھپا کر پیسے اس کی جیب میں ڈال دیتا۔ وہ سلام کرنے لگتا تو اس کا ہاتھ تھام لیتا اور پھر گال تھپتھپا دیتا۔ تو کچھ اس طرح سے وہ

کیسر کو شہر بھر میں کھو جا کر تا تھا۔

اس نے پوسٹ گریجویٹ کی ڈگری لے لی' دو سال گزر گئے۔ وہ لیکچرر شپ کی تیاری کرنے لگا۔ نوکری بھی تو چاہیے تھی نا' دل میں ابھی تک اک موہوم سی امید سر اٹھائے رکھتی تھی کہ جب وہ کسی قابل ہو جائے تو شاید... شاید... ہاں... یہ محبت... ابھی تک وہ اسی گمان میں تھا کہ سرراہ' کسی دن' یوں ہی اچانک... وہ ملے گی اور اسے کہے گی۔ "خبردار جو میرا پیچھا کیا تو..." اور پھر مڑ مڑ کر اسے تکا کرے گی کہ کہیں وہ پیچھے تو نہیں آتا۔ تو زندگی کیا اسے موقع دے گی؟ صرف بس صرف ایک موقع... اس کے ساتھ کسی سڑک پہ... کسی لمبے سے رستے پہ چلنے کا' اسے سننے کا' وہ کاندھے پہ دھرے بیگ کی اسٹرپ کو ہاتھ سے تھامے' سامنے دیکھ کر بولتی ہوئی چلا کرے اور وہ اس کے ساتھ ساتھ' سر جھکائے' پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اسے سنا کرے۔ بس اک موقع... وہ اس کی زندگی میں خوشبو کی مانند بکھری تھی۔ کوئی یاد ہوتی' کوئی حادثہ ہوتا' کوئی واقعہ تو بھلا دیا جاتا' ذہن سے ہش ہش کر کے ہٹا دیا جاتا پر وہ تو کیسر تھی نا... حیات سے نہ رنگ جاتا تھا' نہ خوشبو۔ وہ تو پور پور کیسر رنگ میں رنگا گیا۔ اور رنگ ایسا چوکھا لاگا کہ جو کبھی اترے' نہ مدھم ہو۔ پکا رنگ' محبت رنگ...

ارے ہاں... اک بات تو بھول ہی چکی... جب سے کیسر اس شہر سے گئی تھی نا تو شہر کے سارے... سارے پلے' نالوں میں گرنے سے احتیاط کیا کرتے تھے... اوہ... اوہ کیسر... تم قطب تھیں یا ابدال؟ اوہ کیسر...

* * *

وہ جب کوچنگ سینٹر سے گھر آیا تو گھر مچھلی بازار بنا ہوا تھا۔ اوہ میرے خدا... وہ سخت بے زار ہوا... بہوؤں کے جھگڑے ساس کے ساتھ روز بروز بڑھنے لگے تھے۔ انہیں عباس چبھتا تھا جو ان کے شوہروں کی کمائی کھاتا تھا۔ نکما' آوارہ سارا سارا دن جانے کہاں کی خاک چھانتا رہتا تھا۔ اور آج کا معرکہ... اف کچھ ہو کر رہے گا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے آوازوں کے شور سے اندازہ لگایا تھا اور اسی شور میں بھتیجے کی زور' زور سے رونے کی آواز... وہ اندر کی طرف بڑھا تا کہ ماں کو کول ڈاؤن کر سکے اور بھابھی اپنا بچہ سنبھال سکیں... ہال کا دروازہ کھولا... آوازیں اب شور نہ تھیں۔ وہ اب الفاظ تھیں۔ جو سماعتوں میں پورے معنی کے ساتھ اترتے تھے۔

"آپ کسی کا اچھا سوچ ہی نہیں سکتیں۔ آپ نے تو اپنے عباس کو بھی نہیں بخشا۔ کیسر کے ساتھ جو کچھ آپ نے کیا۔ اسے بتا دوں تو وہ آپ کے منہ پہ تھوکے بھی نا۔" بھابھی سخت طیش میں تھیں۔ زہر خند سا لہجہ... عباس کے قدم جم گئے... ہیں؟ یہ بھابھی کیا کہتی تھیں۔

"جاؤ جا کر بتا دو کیا کیا ہے میں نے کیسر کے ساتھ... کسی سے نہیں ڈرتی میں اور تمہاری بہن کے ساتھ تو اس سے بھی برا کروں گی۔ جب کیسر کا قصہ ختم کر دیا۔ تو تمہاری بہن کیا چیز ہے۔" اور بوڑھے وجود اتنی نفرت کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ جواب میں بھابھی کے چہرے پہ بڑی ہی طنزیہ مسکراہٹ ابھری تھی۔ اس نے اپنے روتے بچے کو اٹھایا' اک نظر ساس کو دیکھا اور پھر بڑا ہی مزا لیتے ہوئے بولیں۔

"میں نے کیا بتانا امی جی! عباس کو... اس نے خود ہی سن لیا۔" انہوں نے یہ کہہ کر بم پھوڑا اور پھر بڑی شان سے چلتی ہوئی عباس تک آئی تھیں۔

"تمہیں برباد کرنے والی کوئی اور نہیں' تمہاری اپنی ماں ہے۔ کیسر کو پیسے پکڑا کر آئی تھیں' تاکہ وہ تمہارا پیچھا چھوڑ دے۔" وہ آئیں' انہوں نے سماعتوں کو زہر آلود کیا اور وہ چلی گئیں... "اور امی جی... کہا تھا نا کہ بوڑھے وجودوں پہ اتنی نفرت جچتی نہیں۔ اتنی نفرت کے متحمل وہ نہیں ہو سکتے۔" صغراں نے کرنٹ کھا کر پیچھے مڑ کر دیکھا اور... اور... عباس کی مارے حیرت کے پھٹی ہوئی وہ آنکھیں... جوان پہ چپک کر رہ گئی تھیں۔

"امی جی ۔۔۔" اس کے لب بنا آواز ملے۔ صغراں کا دل دھک کرکے رہ گیا تھا۔ ہائے ان کا لاڈلا بیٹا کیسے ان کو تکتا تھا۔۔۔ اف ۔۔۔ اس کی نگاہیں ۔۔۔ ان کا سر بڑی زور سے چکرایا تھا۔ ان کا وجود اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکا تھا اور جو دو ہاتھ انہیں تھامنے آئے تھے وہ عباس کے علاوہ کسی اور کے نہ تھے۔

☆ ☆ ☆

گھر بھر میں خاموشی نے منحوسیت پھیلا رکھی تھی۔ سب اپنے اپنے کمروں میں' گھر اندھیرے میں ڈوبا۔ اتنے فرد ہونے کے باوجود سائیں سائیں کرتا ہوا۔۔۔ اور وہ برآمدے میں سر جھکائے' ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسائے' ڈھلکے شانوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ کوئی دیر گزری تو اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر اک ایسی آہ بھری جو کہ ہرے پیڑوں پہ سوکھا ڈال دے۔ امی جی شوگر کی مریضہ تھیں اور ان کا شوگر لیول ایک دم بڑھا تھا۔ ابھی سو گئیں تو وہ اٹھ کر باہر آیا تھا۔ اندھیری رات تھی پر راتیں تو اندھیری ہی ہوا کرتی ہیں' لیکن یہ کہ کچھ راتوں کا اندھیرا نا۔۔۔ یہ بڑا سامنہ کھول کر' وجود کو ہڑپ کر جاتا ہے۔ کھا جاتا ہے' تو اسے بھی ایک اندھیری رات کا اندھیرا لے ڈوبا۔ یا خدا! وہ کسی بوڑھے فرد کی مانند اٹھا تھا۔

"جو میرے ساتھ ہو رہا تھا وہ کیا کم تھا؟" وہ وضو کرنے جا رہا تھا۔

"یہ انکشاف نہ بھی ہوتا تو زندگی گزر ہی جاتی تھی۔" اس نے پانی کا نل کھولا۔

"وہ اک روگ ناکافی تھا کیا جواب یہ بھی۔۔۔" وہ وضو کر رہا تھا۔

"امی جی! اتنی ناپسندیدہ تھی تو مجھے کہا ہوتا۔ مجھ تک آتیں تو سہی۔۔۔ اس تک کیوں گئیں کیوں؟" اس نے جاء نماز بچھایا۔

"اسے تو پتا تک نہ تھا کہ نفرت کیا ہوتی ہے اور یہ کہ یہ۔۔۔ انسانوں سے ہی کی جاتی ہے۔" وہ نماز شروع کر چکا تھا۔

"وہ تو کتے' بلیوں' چڑیوں تک کو۔۔۔ آہ!۔۔۔ امی جی۔۔۔ آہ۔۔۔" اس نے نیت باندھی۔

"وہ محبت کا جنم۔۔۔ وہ شفقت کی بدیع جمال۔" وہ نماز پڑھتا تھا' مگر ذہن تھا کہ حاضر ہو نہیں پاتا تھا۔

"میرے خدا! مجھے معاف کر کہ میرا وجود اس کے لیے اتنی تکلیف کا باعث بنا اور میری ماں کو بھی' یہ تکلیف ان ہی کے ہاتھوں پہنچی۔" اور کئی مدتوں سے ضبط کے نام پہ دھرا آنکھ کا وہ آنسو آج اس کی ہتھیلی پہ گرا تھا۔

"تم نے مجھ سے کچھ پوچھا نہیں؟ کوئی سوال نہیں اٹھایا۔" اس کے دوا پکڑتے ہاتھ اک پل کو ٹھہرے۔

"کیا پوچھوں امی جی۔۔۔" وہ نرمی سے مسکرایا اور دوا انہیں پکڑائی۔

"کوئی گلہ؟ کوئی شکوہ عباس؟" اور ماں کا دل ایسے صبر پہ پھٹتا تھا۔

"چھوڑیں نا امی جی' کیسی باتیں لے بیٹھی ہیں۔ صدی پہلے کی بات کیوں کرتی ہیں؟ آئیں واک پہ چلتے ہیں۔" اس نے زبردستی کندھوں سے پکڑ کر ان کو اٹھایا اور پھر ایک بازو ان کے شانے کے گرد پھیلا کر' انہیں سہارا دے کر باہر لے آیا تھا۔ اس نے انہیں پھر سے بات کرنے کا۔۔۔ یہ موضوع چھیڑنے کا موقع نہ دیا۔ وہ انہیں چٹکلے سناتا رہا اور خود ہی ہنستا رہا اور امی جی۔۔۔ ان کا دل روتا رہا ایسے ظرف پہ۔۔۔ اوہ۔۔۔ ابھی تو وہ ظہیر صاحب کے ظرف کی کہانی سے انجان تھیں۔ وہ معلوم ہو تو وہ کیا کریں گی۔ عباس کو یہ کس نے سکھایا' وہ حیران تھیں۔۔۔ اف۔۔۔ یہ اوکھے سبق۔۔۔ پڑھنے مشکل تو یاد کرنے میں جان لیوا۔۔۔ ایسے سبق کسی کسی کو پڑھائے جاتے ہیں اور پھر انہیں یاد بھی کوئی کوئی رکھتا ہے۔ سب بچے اس قابل کہاں۔۔۔

☆ ☆ ☆

"سر۔۔۔ سر عباس۔۔۔" ایک بچی کے آواز دینے پہ وہ ٹھہر سا گیا تھا۔

"جی بیٹے۔۔۔" نرم سا انداز اور اس کے منہ سے

لفظ بیٹے سن کر بیٹے کو بالکل بھی اچھا نہ لگا۔ سفید شرٹ، کالی جینز، گھنے سیاہ بالوں کا شہری انداز کا ہیئر کٹ، ہلکی سی داڑھی اور مونچھیں اور اک عجیب سی نرمی جو اس کے پورے وجود سے ٹپک ٹپک پڑتی تھی، اگر اس کی شخصیت کو ایک لفظ میں بیان کرو تو وہ لفظ "نرمی" تھا۔

"اس شعر کا مطلب سمجھا دیں۔" بچی نے بدمزا ہو کر کتاب آگے کی۔ وہ اسے مطلب سمجھانے لگا کہ یک دم لاشعوری طور پہ نظر سیڑھیاں چڑھتے وجود پہ پڑی تھی۔ وہ بھی کوئی طالبہ ہی تھی، لیکن معذور... عباس کو سارا دھیان یکبارگی اس طرف منتقل ہو گیا۔ وہ ایک جملہ کہتا اور ایک نظر اس بچی کو دیکھ لیتا، پھر پاس کھڑی لڑکی کو سمجھانے لگتا اور پھر سے دھیان ادھر اور...

"اوہ..." اس کے ہاتھ سے کتاب چھوٹ کر زمین پہ جا گری، وہ تیزی سے اس بچی کی جانب بڑھا تھا۔ بچی نے بیساکھی اگلی سیڑھی پہ رکھنی چاہی تھی، مگر وہ سنبھل نہ پائی اور پھسل گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ گرتی عباس نے اسے جا پکڑا... لیکن ٹھہریے۔

وہ صرف عباس ہی نہیں تھا جو اس کی جانب بڑھا تھا۔ اس پہ نظر صرف عباس کی ہی نہیں تھی۔ کوئی اور بھی تو تھا۔ اس بچی کے پیچھے پیچھے... دو سیڑھیوں کے فاصلے سے کوئی تھا جو کہ فائل کو سینے سے لگائے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ اس کی نظر بھی اسی پہ جمی تھی۔ اسے گرتا دیکھ کر اس کے ہاتھ سے بھی فائل نیچے جا گری تھی اور اس نے بھی اتنی تیزی کے ساتھ حرکت کی تھی کہ جتنی تیزی کے ساتھ عباس حرکت میں آیا تھا۔ دو سیڑھیاں ایک ہی ساتھ پھلانگیں اور ان دونوں نے بیک وقت اس بچی کو تھام کر گرنے سے بچایا تھا۔ عباس نے سامنے سے تو اس نے پیچھے سے اور پھر... ان دونوں کا سانس جیسے رک سا گیا۔ نظروں نے اک دوسرے کو فوکس کیا اور پھر ہٹنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ دونوں ہی ہل نہ سکے۔ ساکت، منجمد، ٹھہرے اس قدر کہ آج کے بعد جیسے حرکت نہ کر سکیں گے۔ یوں جیسے اعلان ہو گیا ہو۔

"جنبش نہ کرو..."

"کیا وہ کیسر تھی؟"

☆ ☆ ☆

ابا عباس کو بھیج کر آئے تو کیسر صحن میں زمین پہ پھسکڑا مارے بیٹھی تھی۔ چائے والی ٹرے پاس ہی دھری تھی۔ اس چائے کو اب مکھیاں نوش فرما رہی تھیں۔ ایک بلی پیروں کے پاس تو... تو ایک گود میں چڑھی بیٹھی تھی اور وہ بلی کا سر سہلا رہی تھی۔ ابا نے اسے دیکھ کر گہرا سانس لیا۔ پھر ڈھیلے قدموں کے ساتھ اس کی جانب بڑھے اور اس کے پاس جا بیٹھے۔ چند لمحے خاموشی نے چرائے۔ وہ بلی کے سر کو سہلا رہی تھی، بے خیالی ہی میں وہ یہ کام کرتی تھی۔ چہرے سے صاف دکھتا تھا کہ وہ گہری نہیں کہ اندھی سوچ میں غرق بیٹھی ہے۔

"ابا..." وہ کئی ثانیے بعد بولی۔

"ہوں..."

"گاؤں چلیں؟" اور ابا سمجھ گئے۔

"اکیڈمی کا کیا ہوگا؟"

"وہاں بھی تو خدا کے بندے بستے ہیں باپ، بیٹی مل کر وہاں بھی کھول لیں گے۔" بے تاثر چہرہ، سفاک انداز۔ ابا چپ سے ہو گئے۔ کیا آسان تھا اس شہر سے جانا... نا... بالکل بھی تو نہیں۔ کیسر یہیں تو پیدا ہوئی تھی۔ سرکار نے نوکر بھرتی کیا تو وہ آبائی گاؤں سے اٹھ کر یہاں آئے تھے۔ اس جگہ اتنا سارا اچھا سا وقت گزرا اور ابھی بڑھاپا بھی تو عزت کی شان سے گزر رہا تھا۔ اک سلسلہ تھا تو جو یہاں آباد تھا اور وہ کہتی تھی کہ گاؤں چلیں... اور اس کا مستقبل؟ گاؤں جا کر کیا ہوگا؟

"کیسر تم..."

"گاؤں چلیں ابا..." ہٹ دھرم سے انداز میں بات جو کاٹی تو ابا اک گہری سانس بھر کر رہ گئے تھے۔ ابھی کیسر کہتی تھی جانا ہے تو بس پھر ٹھیک ہے چلتے ہیں۔ گھر کرائے کا سامان دو بندوں کا کیا ہونا تھا۔ چار دن لگے

پورا بستر سمیٹنے میں اور کیسر عباس کی زندگی سے نکل گئی۔ محلے داروں کو بھی سچ نہ بتایا کہا کہ دوسرے مکان میں شفٹ ہو رہے ہیں اور وہ پہنچ گئے گاؤں آبائی گھر لیکن جانے سے پہلے وہ ڈھیر سارے چھیچھڑے خرید لائی اور بلیوں کو ڈال دیے۔ وہاں انسان ہوں گے تو بلیاں نہ ہوں گی کیا؟ پر یہ والی تو نہ ہوں گی نا۔ اس کا دل بھر آیا اور ہو بھی کیا سکتا تھا اس کے سوا۔ چلو یہ تکلیف بھی یہاں سے اٹھائے لیے چلتے ہیں۔

اس نے کہا تھا نا کہ ظہیر صاحب کی بیٹی ہونا آسان نہیں اور یہ کہ گمنامی اس حوالے سے اچھی۔ تو وہ ہو گئی گمنام۔ یہاں رہتی تو کہانی زبان زد عام ہوتی اور اب نہ کوئی اس کے باپ کے دروازے پہ آئے گا اور نہ ہی وہ سفید بالوں والا سر جھکے گا۔ لو جی قصہ ختم۔ کہانی تمام شد۔ لیکن نہیں۔ جب لگتا ہے کہ کہانی تمام شد تو کہانی ایک بھرپور انگڑائی لے کر نئے سرے سے بے دار ہو جاتی ہے اور اپنے پڑھنے والے کو بتاتی ہے۔ ابھی تو وہ شروع ہوئی ہے وہیں سے کہ جہاں اس کا اختتام سمجھا گیا۔

☆ ☆ ☆

"اور وہ کیسر ہی تھی۔ کیسر کے علاوہ اور بھلا کون ہو سکتا تھا۔" عباس اس قدر دم بخود کہ اپنا مقام بھول گیا' جگہ بھول گیا' یہ بھول گیا کہ وہ کس لیے کیوں وہاں کھڑا تھا۔ وہ تو نظر ہٹا تا نہ تھا کیسر کو ہی یہ کام کرنا پڑا۔

"چوٹ تو نہیں لگی نا؟" ان دونوں کے درمیان پھنسی اس بچی سے کیسر نے پوچھا۔

"نہیں۔" کیسر ایک ہاتھ سے لڑکی کو سنبھالے ہوئے تھی اور دوسرے ہاتھ سے اس نے جھک کر اس کی بیساکھی اٹھانی چاہی تھی اور عباس کو ہوش آ ہی گیا۔ اس نے بیساکھی اٹھا کر بچی کو پکڑائی تھی۔ وہ کتنی بدل گئی تھی نا۔ شلوار' قمیص میں ملبوس دوپٹا اچھی طرح سے لپیٹے ہوئے۔ کاجل سے عاری آنکھیں۔ کوئی رنگین دھاگا نہ کڑا اور وہ تعویذ سا لاکٹ۔ معلوم نہیں اب اس کی گردن میں پھنسا ہو گا یا نہیں۔ اوہ ہاں اس کے کندھے پہ بیگ دھرا تھا۔ پرانی کیسر کی ذرا سی جھلک۔

"تھینک یو سر!" ممنون لہجہ اور اس نے چونک کر دھیرے سے سر کو خم دیا۔

"آپ کو یوں اکیلے نہیں سیڑھیاں چڑھنا چاہیے تھی۔ خدانا خواستہ ابھی جو کچھ ہو جاتا تو۔" وہ اب اسے سہارا دے کر سیڑھیاں چڑھنے میں مدد دے رہی تھی۔

"میں چڑھ لیتی ہوں سیڑھیاں۔ ایسی کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ ابھی معلوم نہیں کیسے پھسل گئی۔" وہ بولی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہی برآمدہ تھا اور اس سے آگے کمرے بنے ہوئے تھے۔ کچھ جماعت کے کمرے اور ایک طرف ایڈمن بلاک تھا۔ اس نے برآمدے میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پہ اس بچی کو بٹھایا تھا۔

"پانی پیو گی؟" کیسر نے اپنے مشہور زمانہ بیگ سے پانی کی بوتل نکال کر پوچھا۔

"شکریہ۔" اس نے بوتل پکڑتے ہوئے کہا اور کیسر کو یک دم اپنی فائل کا خیال آیا تھا۔ اس نے مڑ کر سیڑھیوں کی جانب جب دیکھا تو ذرا سے فاصلے پہ وہ فائل ہاتھوں میں لیے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ کیسر ٹھٹکی اور پھر چہرہ موڑ لیا۔

"ابھی کہاں جانا ہے آپ کو؟" اور اس بچی سے پوچھا۔

"میں چلی جاؤں گی۔ یہ ساتھ ہی ہے کلاس روم۔" وہ کیسر کی بات کا مطلب سمجھ کر بولی۔

"پکی بات؟"

"جی۔" وہ جواب دیتے ہوئے مسکرائی۔

"بہت اچھا لگا آپ سے مل کر۔" کیسر نے ہاتھ بڑھایا' بچی نے حیران ہو کر ہاتھ تھاما۔ یہ کون تھا جسے اس سے مل کر اچھا لگا تھا۔

"وہ کیسے؟" سوال آیا۔ وہ مسکرائی۔ پنجوں کے بل بیٹھی اس کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھا اور پھر بولی۔

"وہ ایسے کہ تم بلند حوصلے کا مینار ہو۔ مینار پاکستان

سے بھی اونچا مینار۔۔۔" اس نے آخری جملہ آنکھ مار کر' شرارت سے کہا۔ وہ لڑکی ہنس دی۔

"ایسے ہی رہنا۔۔۔ ہمیشہ۔۔۔" اس کا ہاتھ تھپتھپا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی' پھر مڑی۔ چہرے پہ سنجیدگی چھا سی گئی۔ وہ عباس تک گئی اور ہاتھ بڑھا کر بولی۔

"فائل۔۔۔" عباس نے چپ چاپ فائل اسے تھما دی اور وہ ایڈمن بلاک کی طرح مڑ گئی تھی۔ فائل سینے سے لگائے' ٹھوڑی فائل پہ ٹکائے' چلتے ہوئے وہ اپنی پشت پہ دو نظروں کا بڑا ہی جان دار سا لمس محسوس کرتی تھی اور اس لمس کو محسوس کرتے ہوئے اسے یاد آیا۔ اپنا دل کہ جو بھی نیا نیا سا کچھ چاہنے لگا تھا اور یہ یاد آتے ہی اس کے ماتھے پہ بل پڑے' چہرے پہ غصہ سا امڈ آیا اور اس نے یوں اس خیال کو مسلا جیسے کسی کلی کو دو پوروں میں لے کر بری طرح سے مسل دیا جاتا ہے۔ پر یوں مسل دیے جانے کے باوجود۔۔۔ خوشبو۔۔۔ اس خوشبو کا کیا کیا جائے جو اپنے یوں مسل دیے جانے پہ اور زور سے مہکتی ہے۔

☼ ☼ ☼

کیسر ایڈمن آفس سے باہر نکلی تو اسے سامنے' وہیں اسی جگہ پہ کھڑا دیکھ کر اک پل کو ساکت ہوئی۔ ہاتھ سینے پہ باندھے' ستون سے ٹیک لگائے' سر جھکائے وہ جوتے کی نوک سے فرش کو اکھاڑنے کی کوشش میں تھا اور سنجیدہ نظر آتا تھا۔ کیسر حرکت میں آئی اور اس کے پاس سے یوں گزری جیسے جانتی نہ ہو اور وہ۔ چند لمحے اسے خود سے دور جاتے دیکھتا رہا اور پھر ہاتھ جیبوں میں ڈالے' اس سے ذرا سا فاصلہ رکھ کر وہ اس کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا' پر اسے روکنے کی ہمت کہاں سے لاتا۔ اگست کے دن' گرمی شدید' اس نے آستینیں چڑھا لیں۔ پسینہ گردن سے ہو کر کمر پہ بہنے لگا اور اس کی سفید شرٹ پہ دکھنے لگا' لیکن وہاں پروا کسے تھی۔

کیسر بے خبر نہ تھی۔ جب پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی تھی تو وہ نہیں ہوتا تھا اور آج جب تھا تو۔۔۔ بے اختیار آنکھ نم ہوئی۔ اس کے قدموں کی رفتار سست پڑنے لگی' لیکن وہ بھاگنا چاہتی تھی' خدا کی قسم وہ بھاگ جانا چاہتی تھی اور اسی لیے وہ رک گئی۔ بیگ کی اسٹرپ کو سختی سے تھامے' وہ ضبط کی بدترین حالت میں تھی۔ عباس اسے رکتے دیکھ کر ٹھٹکا اور پھر اس کے شانے کے برابر جا رکا۔ اور اس نے گمان کیا۔۔۔ سیدھی سڑک۔۔۔ لمبا رستہ۔۔۔ وہ بولے گی اور وہ سنے گا۔۔۔ ہا۔۔۔ میرے خدا! تو خواہش یوں پوری ہوتی ہے کیا؟

"یہ شہر نہیں صاحب۔۔۔ گاؤں ہے گاؤں اور میں اپنے باپ کے جھکے کندھوں کو بڑی مشکل سے سنبھال کر بیٹھی ہوں۔ ہاتھ جوڑتی ہوں۔" اور اس نے واقعتاً ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگائے اور آنسو پھسل کر گالوں پہ بہنے لگے' مگر لہجہ سخت زہر آلود۔

"ہاتھ جوڑتی ہوں۔۔۔ کہ ہم باپ' بیٹی اس جگہ کو چھوڑ کر اور کہیں نہیں جاسکتے۔" اور اس انداز پہ عباس کی چولیں ہل کر رہ گئی تھیں۔ اس کا منہ کھل گیا' یوں جیسے کسی نے تھپڑ۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ خنجر۔۔۔ اوہ نہیں۔۔۔ نہیں یہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سخت تھا بہت شدید۔۔۔ اتنا آساں نہیں ہوتا خواہش کا یوں لہو ہو جانا اور خواہش بھی وہ کہ جس کا نام محبت۔۔۔ محبت کبھی سر راہ بھی ملا کرتی ہے کیا۔۔۔ کیسر نے سر جھکا کر آستین سے آنسو رگڑ کر سختی سے صاف کیے اور پھر اس پہ نگاہ ڈالے بنا چلی گئی۔ اس کے آنسو۔۔۔ وہ روئی؟ روئی کیا؟ اس کا دل جکڑا گیا۔ وہ کیسر تو نہ تھی۔ وہ۔۔۔ وہ شفقت کی بدیع جمال۔۔۔ اسے کیا ہوا جو وہ یوں۔۔۔ کمال کرتے ہیں صاحب۔۔۔ کمال۔۔۔ کسی کو جام بھر زہر پلاؤ اور پھر یہ بھی کہو کہ زہر اثر بھی نہ دکھائے۔۔۔ دل و جاں کو متاثر بھی نہ کرے۔

"کمال کرتے ہو صاحب!"

سیدھی سڑک بھی تھی' رستہ بھی لمبا سا' وہ دونوں بھی موجود' باتیں بھی ہوئیں پر خواہش۔۔۔ وہ ادھوری رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات حبس زدہ تھی۔ اندھیرا اپنے پر پھڑپھڑاتا تھا۔

کہیں دور جھینگر اپنا راگ الاپتے تھے۔ پتے ساکت، پیڑ ساکت، ہر شے ساکت، حتیٰ کہ وہ بھی ساکت۔ چت لیٹا گھرر گھرر چلتے پنکھے کو گھور تا تھا، پر وہ اسے تو نہ گھورتا تھا۔۔۔ وہ تو کہیں اور تھا۔ ذہن میں کیا کچھ تھا جو گھوم رہا تھا۔

"یہ شہر نہیں ہے صاحب۔۔۔"

"سنو۔۔۔ سنو عباس۔۔۔"

"اس اڈے کو چھوڑ۔۔۔"

"عباس یہ کرلینا۔۔۔"

نیم غنودگی کی سی کیفیت۔ پسینے میں تر بتر جسم۔۔۔ سانس مدھم سا چلتا ہوا۔۔۔ وہ کھلتی بند آنکھوں سے۔۔۔ گھرر گھرر گھومتے پنکھے کو دیکھتا تھا۔ پلکوں پہ پسینے کے قطرے آن ٹھہرے اور بدن اتنا شل کہ وہ ہاتھ اٹھا کر وہ پسینہ صاف نہ کر سکتا تھا۔ اور دور کہیں جھینگر اپنا راگ الاپتا تھا۔ وقت ٹپ ٹپ بہتا تھا۔

وہ رات بڑی حبس زدہ تھی۔

☆ ☆ ☆

"کیسر۔۔۔؟"

"ہوں۔۔۔" وہ چونکی۔

"اوہ۔۔۔" بے اختیار منہ سے نکلا تھا۔ وہ بے خیالی میں روٹی کے نوالے توڑ توڑ کر رکھتی جارہی تھی، مگر کھاتی نہ تھی۔

"کیا بات ہے؟"

"بس ایسے ہی۔۔۔"

"کیا اصغر ملا تھا، پھر اور۔۔۔؟" اور اس نے ہلکے سے نفی میں سر ہلایا۔ اب یہ اصغر کون؟ تو قصہ کچھ یوں کہ گاؤں میں اکیڈمی کھولنا آسان۔۔۔ چلو اتنے اور اس طرح کے بچے نہ سہی کہ جتنے اور جیسے شہر میں پر بچے تو تھے نا۔۔۔ بلیاں پالنی بھی آسان کہ دو دن اسٹریٹ کیٹس کو دودھ ڈالو، تیسرے دن بلیاں کیسر کی اور کیسر بلیوں کی۔۔۔ اللہ اللہ خیر صلا۔۔۔ اک ادھ چھچھڑا گلی کے کتے کو ڈال دو تو لگا وہ بھی دم ہلانے۔ پس سارا مسئلہ تو تب شروع ہوا کہ جب کیسر کا سوشل ورک پکوڑے تلنے والا "بچہ" اور ہو بچہ نہیں "مرد" گاؤں والوں کی زبان میں وہ مرد تھا اور کیسر کے نزدیک بچہ۔۔۔

اب ساری برادری ظہیر صاحب کی گاؤں میں۔۔۔ لگی توبہ استغفار کرنے۔ ایسی شتر بے مہار لڑکی کہ ہاتھ کانوں تک خود بخود جاتے تھے۔ آئے روز برادری کا کوئی نہ کوئی فروان کے گھر پہنچا ہوتا تھا۔ کیسر شہر چھوڑ سکتی تھی۔ باپ کے لیے تو کیا اپنی سرگرمیاں نہیں۔ اسے خود کو محدود کرنا پڑا۔ اس کی اسکول میں استانی کی نوکری بھی سب کو چبھتی تھی کہ استانیاں بڑی خرانٹ ہوا کرتی ہیں۔ چند بڑوں نے مل کر ظہیر صاحب کو کیسر کی شادی کا مشورہ دیا اور اور جی ہاں۔۔۔ رشتہ ڈالا۔ "اصغر" کا اور جب سے رشتہ ڈالا تھا۔ اصغر صاحب کی غیرت پھڑکتی رہتی تھی۔ حالانکہ ابھی تک رشتہ قبول بھی نہ کیا گیا تھا۔ سر راہ جو کیسر مل جائے تو بس۔۔۔ بدمزگی ہو کر رہتی تھی۔ اس دن بھی وہ اس ادارے میں کسی بچی کے ایڈمیشن کے سلسلے میں گئی تھی۔۔۔ ہاں۔۔۔ کیسر کو نہیں روکا جاسکتا۔ وہ اسکول سے سیدھا گھر نہیں آسکتی تھی چار لوگوں کے کام نپٹا کر آتی تھی۔

"کیسر کوئی تو بات ہوئی ہے نا بچے۔۔۔" ابا اس کے سر ہلانے سے مطمئن نہ ہوئے تھے۔ کیسر خاموش تھی اور پھر کافی دیر بعد بولی۔

"ابا! اصغر کا رشتہ قبول کرلیں۔" وہ نہیں چاہتی تھی کہ ایک بار پھر عباس کی ماں۔۔۔ اور اس کا باپ اب بہت ضعیف ہو چکا تھا۔

آہ! یہ بیٹیاں خدا جانے ان کو ایسے سبق کون پڑھا جاتا ہے۔ کم از کم ظہیر صاحب نے تو نہیں پڑھایا تھا اور اسی وجہ سے اس بات پہ ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ یہ ایک نہایت ہی بے جوڑ رشتہ تھا۔

☆ ☆ ☆

"سنو ظہیر صاحب کا گھر کون سا ہے؟" وہ پوچھ پوچھ تھک چلا، مگر کوئی انہیں نہ جانتا تھا۔ عباس اب سخت مایوس ہو رہا تھا۔ اب اسے کیا معلوم کہ وہ ظہیر نہیں، یہاں گاؤں میں ماسٹر صاحب کے نام سے جانے جاتے

تھے۔ پھر اک موہوم سی امید کے تحت اس نے سوال بدلا۔

"سنو! یہاں کسی کے گھر بہت سی بلیاں ہیں؟" اور لو جی جھٹ سے مل گیا پتا۔ یہ کیسے ممکن ہو کہ جہاں کیسر ہو وہاں بلیاں نہ ہوں۔ وہ ملکے سے' سر جھٹک کر مسکرا دیا۔ اوہ کیسر! کیا تم جیسا کوئی دوسرا ہو گا؟ بڑے دن بڑے ہی اضطراب میں گزرے تھے۔ کیسر کے بندھے ہاتھ روکتے تھے تو کسی سے کیا گیا عہد۔ چین نہیں لینے دیتا تھا۔ وہ نہ ملتی اور بات تھی اب جبکہ سامنا ہو چکا تو عہد کا پورا کیا جانا لازم ہو گیا تھا۔ اسے کیسر کے بندھے ہاتھوں کو نظر انداز کرنا پڑا تھا۔ گلی میں داخل ہو کر دائیں طرف تیسرا گھر۔ سرخ اینٹوں والا حویلی ٹائپ گھر کہ جس کی منڈیروں پہ بلیاں "پھدکتی" تھیں۔ عباس نے سر اٹھا کر ان بلیوں کی بے تکلفی کو ملاحظہ کیا اور جان لیا کہ کیسر یہیں بستی ہے۔ اس نے مین دروازہ پہ دستک دینی چاہی اور پھر رک سا گیا۔ ساتھ ہی تو بیٹھک تھی' وہ بھول کیوں گیا۔ اک سانس بھر کر اس نے بیٹھک پہ دستک دی۔

"آجاؤ۔" اندر سے آواز اور باخدا۔ باخدا یہ سامنا سخت تھا۔ اس نے اک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر کے خود کو اس لمحے سے ملنے کے لیے تیار کیا' بے جان ہاتھوں سے دروازے کو دھکیلا اور۔ سامنے وہ ہی منظر۔ چند طالب علم جنہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور دیکھا تو سر نے بھی تھا اور وہ لیکچر ڈیلیور کرتے کرتے ایک دم خاموش ہوئے تھے۔

"ابا! اصغر کا رشتہ قبول کر لیں۔" ایک دم کلک ہوا اور۔ اور انہیں پہلی بار عباس پہ غصہ آیا۔ تو کیا وہ ابھی تک نہ سمجھا تھا۔ عباس ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا اور وہ پھر سے لیکچر دینے لگے۔ پانچ بجے پھر پانچ بج کر پانچ منٹ اور عباس نے بے ساختہ وال کلاک کی طرف دیکھا تھا اور پھر دستک "جب آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ پانچ بجے اکیڈمی کا وقت ختم ہو جاتا ہے آپ لوگ چلے کیوں نہیں جاتے۔" اور وہ ستی ہوئی آواز۔ عباس کے ہونٹوں پہ اک زخم خوردہ سی مسکراہٹ پھیلی تھی۔

سب بچے اٹھ کر جانے لگے۔ کمرہ رفتہ رفتہ خالی ہو آگیا' یہاں تک کہ کمرے میں محض عباس اور ظہیر صاحب ہی بچے تھے اور وہ دونوں خاموش۔

"کیسے ہو عباس؟"

"اچھا ہوں سر جی۔" نگاہ جھکی' سر جھکا' ہاتھ اک دوجے میں پھنسائے' کرسی کے کنارے یوں بیٹھا تھا کہ جیسے ابھی اٹھ کر بھاگ جائے گا۔

"کیا کرتے ہو؟"

"لیکچرار ہوں۔ ادھر بوائز کالج میں تعینات ہوں آج کل۔"

"کیسے آنا ہوا؟" اور اب وہ خاموش۔ ظہیر صاحب نے چشمہ اتارا' اسے صاف کیا اور پھر سے چشمہ لگا کر اسے دیکھا۔

"بال بچے کیسے ہیں تمہارے؟" بڑا مناسب سا سوال کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی سلامت رہے۔

"شادی نہیں کی سر جی۔" اور لو اب سر خاموش۔

"کیا کسی پرانے معاملے کے سلسلے میں آئے ہو؟" وہ تو بولتا نہ تھا انہیں ہی کلیئر ہونا پڑا۔

"جی! سر جی۔" اور اب کی بار اس نے سر اٹھا کر جواب دیا۔

"اپنی ماں جی کو بتا کر آئے ہو؟" ان کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی کڑوا ہو گیا تھا۔ اور اس سوال پہ عباس کا رنگ فق ہوا۔ اس کے حلق سے کچھ نیچے اترتا دکھائی دیا۔

"ماں جی نہیں رہیں۔" اس نے لرزتی آواز میں کہا اور اک دستک کے واسطے اٹھا ہاتھ اک بار پھر سے وہیں فضا میں ہی ساکت ہو گیا تھا۔

✡ ✡ ✡

اس ایک جھٹکے کے بعد ماں جی پھر سنبھل نہ سکی تھیں۔ وہ دن بہ دن کمزور ہوتی چلی گئیں۔ شوگر نے گردوں پہ اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ ان کا بھانڈا عباس کے سامنے پھوٹ بھی جاتا تو تب بھی انہیں احساس نہ

ہوتا۔ احساس دلوانے والی شے' عباس کا رویہ تھا۔ اوہ میرے خدا وہ بچہ تو اف تک نہ کرتا تھا۔ اس نے ایک لفظ تک نہ کہا۔ کوئی شکوہ' کوئی گلہ نہ کیا۔ وہ پی گیا' میرے اللہ! وہ تو گھول کر ہی پی گیا تھا۔ صبر کر گیا اور یہ ہی صبر ماں جی کو مار گیا۔ وہ روز اسے یاد کرواتیں۔

"عباس کیسر کو میری زندگی میں ڈھونڈ لاؤ۔ میں معافی مانگوں گی اس سے۔"

کبھی کہتیں "عباس! کیسر اگر میری زندگی میں نہ ملی تو اسے ڈھونڈنا' اسے زمین کی پاتال میں سے بھی ڈھونڈ لانا اور اس سے معافی مانگنا میری طرف سے سنو عباس یہ یاد رکھنا' بھولنا مت۔" اور جب ان کا آخری وقت تو آیا تو انہوں نے عباس سے عہد لیا کہ وہ کیسر سے ان کے لیے معافی مانگے گا اور پھر جب کیسر مل گئی تو اس کے جڑے ہاتھوں پہ اک عہد بھاری ٹھہرا تھا۔

☼ ☼ ☼

"نہ... نہ میرے بچے۔" سر نے تڑپ کر اس کے بندھے ہاتھ کھولے تھے۔ جب انہوں نے ایسا کیا تو ایک آنسو ان کے بوڑھے ہاتھوں پہ گرا تھا اور وہ آنسو عباس کا تھا۔

"میری ماں کا فعل غلط تھا' لیکن انہیں معاف کردیں۔ پلیز۔ اور کیسر سے بھی کہیے گا انہیں معاف کردیں۔ مجھے علم ہوتا تو میں کبھی... کبھی بھی انہیں ایسا نہ کرنے دیتا۔" وہ سر جھکائے گیلی سی آواز میں بولا اور باہر کھڑی کیسر کی آنکھ سے آنسو ٹپکا۔

"آپ کو ناحق..."

"بس عباس... بس کرو۔ جو ہوا سو ہو گیا۔ میں نے اپنا دل صاف کیا اور میں کیسر سے بھی کہوں گا۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولے اور پھر اس کا کندھا تھپتھپایا تھا اور پھر ان دونوں کے درمیان کی نشست خاموشی نے سنبھالی تھی۔

"چلتا ہوں سر جی..." عباس اٹھا۔ مصافحہ کیا' پھر مڑ کر دروازہ کھولا' ایک قدم باہر رکھا۔

"کیسر سے شادی کرو گے عباس؟" اور اس کا دوسرا

اٹھتا قدم وہیں پہ ساکت ہو گیا تھا اور ساکت تو کیسر بھی ہوئی تھی۔ اس کی پوروں پہ کچھ مسلنے کی جلن تازہ ہوئی۔ اور عباس نے سخت اچنبھے سے سر کو دیکھا تھا اور سر... اصغر سے تو وہ کبھی نہ کرتے کیسر کی شادی چاہے اک بار پھر سے دربدر کیوں نہ ہونا پڑتا۔

٭ ٭ ٭

ایک سرکاری رہائش گاہ کا منظر تھا۔ بڑا سا لان... جو گیٹ کے ستون پہ نصب روشنیوں کی وجہ سے روشن تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چلتی ہوئی۔ رات اپنے بھید کے ساتھ اتر رہی تھی۔ وہ لان میں اترتی سیڑھیوں پہ گھٹنوں پہ ٹھوڑی رکھے بیٹھی تھی۔ خاموش... چپ... اور اس سے ذرا سے فاصلے پہ کوئی اور آکر بیٹھا تھا۔ کیسر کا جی چاہا اسے دیکھے... لیکن نہیں دیکھ پائی۔

"تم نے کاجل نہیں لگایا۔" اوہ... کیسر کا دل دھڑکا۔ وہ اس سوال کی توقع نہیں رکھتی تھی۔ اس کا سر جھکا۔

"ہاتھوں میں بھی کچھ نہیں پہنتیں اب کیا؟" اف... تو کیا وہ اسے اتنی غور سے دیکھا کرتا تھا اور پھر خاموش...

"میرے ساتھ چلو گی؟"

"کہاں؟" سوال بے اختیار تھا۔ وہ اٹھا، ہاتھ بڑھایا... کیسر نے اس بڑھے ہاتھ کو دیکھا اور پھر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ ہاں... وہاں گھر کے باہر اک راستہ تھا... لمبا سا راستہ کہ جس کے دونوں اطراف پیڑ جھکے چلے آتے تھے۔ وہ اس رستے پہ چلنے لگے ساتھ ساتھ...

"کیا کوئی اس طرح سے بھی گم ہو جاتا ہے کیسر؟"

"تم نے ڈھونڈا مجھے؟"

"تو کیا اس چڑی فروش کی چڑیوں نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟ کیا انہوں نے تمہارے تک اک پیغام بھی نہیں پہنچایا۔" اور کیسر رک سی گئی اور گردن اٹھا کر اسے تکتی رہی۔ تو کیا وہ اسے اس طرح ڈھونڈتا رہا تھا۔

"میری بلیاں کیسی تھیں؟" اس نے نم آواز میں پوچھا۔

"اداس..."

"اور دنیا کی عظیم نعمت چکھی تم نے؟"

"نہیں... راشد سے شرطیں ہارتا ہوں اسی ایک بات پہ..." وہ مسکرایا۔

"وہ پلا... پھر تو نہیں گرا؟"

"نہیں کیسر... تمہارے جانے کے بعد سب پلوں نے نالے میں گرنے سے احتیاط کی۔" اور اب کی بار اس نے اپنا اٹھا منہ جھکایا اور آستین سے اپنا چہرہ صاف کیا۔

"کیا کوئی اس طرح سے بھی محبت کرتا ہے عباس؟" آواز نم تھی۔

"ہاں! تم کیسر ہو نا... تمہاری خوشبو کوئی کیسے مٹائے، تمہارا رنگ کوئی کیسے اتارے۔ تم کیسر جو ہوئی نا۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

شنید ہے کہ کیسر (زعفران) کے کھیتوں کے پاس سے بھی گزر جاؤ تو اس کا رنگ چڑھ جاتا ہے۔ خوشبو تو دور سے ہی گرفت میں کرتی ہے اور تاحیات سانسوں میں مہکتی ہے، پھر جب کسی کیسر سے محبت کر بیٹھو تو... اس کی خوشبو کوئی کیسے مٹائے، اس کا رنگ کوئی کیسے اتارے۔

عباس نے اس کے شانے کے گرد بازو پھیلایا۔ اس نے شانے سے سر ٹکایا اور وہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ لمبا رستہ، وہ وجود، وہ بولتی تھی، وہ سنتا تھا۔ تو خواہش یوں پوری ہوتی ہے اتنی تپسیا کے بعد...

٭ ٭

سرورق کی شخصیت	
ماڈل	نیناں بتول اور نمراء جبیں
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی	موسیٰ رضا

حمیرا نوشین
گنگناتی آئی عید
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM

میرا تو موڈ صبح سے آف تھا ناشتا بناتے ہوئے کتنی مرتبہ خواہ مخواہ برتن پٹخے۔ دوپہر کو ٹیبل پر سالن کا باؤل اتنے زور سے پٹخنے کے انداز میں رکھا کہ اس کے اوپر کا آئل چھلک کر سفید کور کو داغدار کر گیا۔ چھوٹے ولید کے منہ میں زبردستی ایک کے بعد ایک نوالہ ٹھونستی چلی گئی۔ وہ بے چارہ اس افتاد پر گھبرا گیا ذرا نوالہ نگلنے میں دیر کرتا میں ساتھ ہی اس کے ایک دھمو کا جڑ دیتی۔ دونوں بڑوں کو بھی اب تک کئی مرتبہ اپنے ہاتھوں کی نرمی و گرمی سے آشنا کر چکی تھی۔

فواد صبح سے میرے مزاج کی اس تبدیلی کو نگاہوں میں رکھے ہوئے تھے مگر پاکستانی عوام کی طرح خاموش تماشائی بنے چپ چاپ دیکھے جا رہے تھے۔ میرے ناروا رویے پر ایک مرتبہ بھی لب کشائی نہ کی مگر جب میں نے کھانے سے فراغت کے بعد برتن اٹھا کر سنک میں پھینکے تو کانچ کے گلاس نے چھناکے سے ٹوٹ کر فواد کی خاموشی کا گلا گھونٹ دیا۔

"تمہیں آخر مسئلہ کیا ہے چھٹی کا دن سکون کا ہوتا ہے۔ مگر تم صبح سے میرا اور بچوں کا ضبط آزمانے پر تلی ہو۔" وہ دہاڑے' میں نے ذرا سی نظریں اٹھا کر دیکھا ان کی خونخوار نگاہوں سے سہم کر میں نے فوراً" پلکوں کی چلمن گرائی مگر کمال ڈھیٹ پن کا مظاہرہ کرتی ہوئے ترخ کر بولی۔

"مسئلہ بھی میں ہی آپ کو بتاؤں جیسے آپ اتنے ہی تو بھولے ہیں کہ پتا ہی نہیں مسئلے کس کے آنے سے بنتے ہیں۔" دھڑاک سے کچن کا دروازہ بند کر کے میں لاؤنج میں صوفے پر آگری۔

بچے میرے اس روپ پر حیران و پریشان کمروں میں جا دبکے جبکہ فواد کو میرا یہ روپ لگتا تھا کچھ زیادہ ہی بھا گیا تھا جب ہی تو میرے سامنے صوفے پر براجمان ہو گئے۔

"اپنے دل میں وسعت پیدا کرو۔ راحت آپا کتنے دنوں کے بعد ہمارے گھر آ رہی ہیں بھائی بہنوں کا مان ہوتے ہیں بہنوں کا میکا بھائیوں کے دم سے آباد ہوتا ہے۔ تم ہر بار ان کی آمد پر ناک بھوں چڑھاتی ہو مگر وہ پھر بھی خوش دلی سے دن گزار کر ہمارے بچوں سے ہنس بول کر چلی جاتی ہیں۔"

بچوں سے ہنس بول کر چلی جاتی ہیں مگر بھابھی سے ہمیشہ تیکھا مرچیں چبا کر ہی ہمکلام ہوتی ہیں۔ نام راحت ہے' درد سر بن کر نازل ہوتی ہیں۔

"یہ کچن کی کیبنٹس کی طرف بھی دھیان دے لیا کرو۔ مسالوں کی برنیوں کو زیادہ نہیں مہینے میں ایک بار تو دھوپ لگا لیا کرو۔ شیٹ جھاڑ کر نیچے اسپرے کرو تاکہ کاکروچ وغیرہ نہ آسکیں۔ سالن میں اتنی مرچیں نہ ڈالا کرو بچوں کے معدے ابھی سے خراب ہو جائیں گے ان کو روز پراٹھا کیوں کھلاتی ہوں بیمار کرو گی کیا؟ تمہارے کپڑے سارے ہی تیز رنگوں کے ہیں' کبھی ہلکے رنگ بھی پہن لیا کرو۔ ہر وقت نصیحتیں ہر کام میں مین میکھ کہاں تک برداشت کروں۔ گیارہ برس ہو گئے ان کی یہ پند و نصیحت سنتے سنتے۔ اب تو کان بھی دہائی دینے لگے ہیں۔" میں ہنوز منہ پھلائے ہوئے تھی۔

"شرم کرو تم بھی کسی کی نند ہو ایسی سوچ نہیں رکھتے۔" فواد مجھے تنبیہہ کرتے ہوئے ریموٹ ڈھونڈنے لگے۔

"میں اپنی بھابھیوں کی نند ہوں گند نہیں' اپنی باتوں سے پھلجھڑیاں چھوڑتی ہوں ہوں چنگاریاں نہیں۔ روز بھی جاؤں تو دروازے تک چھوڑنے آتی ہیں۔"

"تو تم بھی ان سے کچھ سبق سیکھو' راحت آپا کی آمد پر منہ نہ بنایا کرو ہم بھی ان کو دروازے تک چھوڑنے جایا کریں۔" صوفے کی سائڈ میں دھنسا ریموٹ نکال کر انہوں نے ٹی وی آن کیا۔

"دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ دروازے تک چھوڑنے جاؤں اور ہمیشہ کے لیے یہ دروازہ ان پر بند کر دوں۔" میں نے دانت کچکچائے۔

اس کی بات سن کر فواد کا پارہ ہائی ہو گیا وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور چٹاخ اس کے گال پر ایک تھپڑ رسید کیا وہ گال پر ہاتھ رکھے بھونچکا رہ گئی جس شخص نے کبھی لفظوں کی مار نہیں ماری تھی آج اس کے ہاتھوں کی

سختی اس کے چہرے کو تپا گئی۔

"اگر آئندہ راحت آپا کے بارے میں تم نے زہر اگلا تو مجھے اپنے ساتھ زہریلا رویہ رکھنے سے ہرگز روک نہیں پاؤ گی۔" تنے چہرے کے ساتھ انہوں نے اسے گھورا اور اٹھ کر بچوں کے پاس چل دیے۔ وہ اپنا سرخ چہرہ اور آنکھوں میں نمی لیے اپنے کمرے میں مقید ہو گئی کچھ دیر ماؤف ذہن کے ساتھ بیٹھی رہی پھر اٹھی دو چار سوٹ بیگ میں ٹھونسے اور گیٹ کی طرف قدم بڑھا دیے۔ بچے اس کے پیچھے لپکے ولید ٹانگوں سے لپٹ گیا مگر وہ انہیں دھکیل کر آوازوں کو نظرانداز کرتی گیٹ عبور کر گئی۔

✲ ✲

بھابیوں نے چاروں اطراف سے اسے گھیر رکھا تھا امی دلاسے دے رہی تھیں بڑی بھابی اس کے آنسو خشک کرتی تو چھوٹی اسکواش کا گلاس اس کے لبوں سے لگا دیتی۔ شام کو تینوں بھائی بھی اس کی درد بھری کتھا سن کر آپے سے باہر ہو گئے آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"اس کوے کی ہمت کیسے ہوئی میری نازک کبوتری بہن پر اپنا ہاتھی جیسا ہاتھ اٹھانے کی۔ بڑے بھیا کو جانوروں سے بڑا لگاؤ تھا ان کی گفتگو میں اکثر پرندوں اور جانوروں کے ناموں کی بھرمار ہوتی۔ فواد کے سانولے پن کو کوے اور فربہی جسامت والے ہاتھ کو انہوں نے ہاتھی سے مشابہت دی تو اس کے کلیجے میں ایسی ٹھنڈ پڑی جو سخت گرمیوں میں گولا گنڈا کھانے پر لگتی ہے۔

"ہاتھی نہیں بھائی' سانڈ جیسا ہاتھ میرے مرمریں گال پر دے مارا۔ دیکھیں تو ابھی تک اس کی کریلے جیسی موٹی انگلیوں کے نشان ثبت ہیں۔" چھکوں پھکوں روتے ہوئے گال ان کے سامنے کیا تو انہوں نے بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں کو پیا' باقی دونوں کی حالت بھی دیدنی تھی۔ بہن کے دکھ پر مارے افسردگی کے رات کا کھانا کسی کے حلق سے بھی نیچے نہ اترا۔

تلملاتے ہوئے تینوں کی رات گزری اور وہ اپنے دکھ اپنوں میں منتقل کر کے ساری رات سکون سے سوئی اب دیکھنا اس تھپڑ کا انجام۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں بھائی بھی ایسے جو جان بھی مانگوں تو دینے میں پل نہ لگائیں وہ اپنے بھائیوں پر نازاں ہوتی رہی۔

✲ ✲ ✲

وہ صبح دیر تک سوتی رہی نیند میں اس نے ولید کو اپنے ساتھ کرنا چاہا تو اس کے برابر کی جگہ خالی تھی اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں "ہائیں ولید کہاں چلا گیا؟" سارے کمرے میں نظریں دوڑائیں مگر ولید کہیں نظر نہ آیا اس کا دل دھک سے رہ گیا اسی دم بھابھی کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ ہوش میں آگئی کہ یہ کمرا اس کا نہیں۔ وہ امی کے گھر میں ہے اور ولید کو وہ خود چھوڑ کر آئی تھی۔

"مائرہ ناشتا بنا دوں تمہارے لیے کیا لوگی؟

"دل بھی میرا دل نہیں چاہ رہا۔" ولید کو یاد کر کے اس کا دل اداس ہو گیا۔ اسے واش روم لے کر جانا' نوالے بنا بنا کر بمشکل ناشتا کروانا اب کون یہ سب کرے گا۔ فواد تو صبح آفس جا چکے ہوں گے بڑے بچوں نے تو چلو اپنے کام خود سے کر لیے ہوں گے ان کو اسکول سے واپسی پر کھانا کون دے گا۔ گھر پر اکیلے کیسے رہیں گے ولید کا کون دھیان رکھے گا۔" اس کی سوچ بچوں میں اٹک گئی۔

"تم نے بتایا نہیں مائرہ کیا بناؤں تمہارے لیے۔" بھابھی اس کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔

"جب کرنا ہو گا تو بتا دوں گی آپ کو۔" وہ کروٹ بدل کر لیٹ گئی تو وہ اثبات میں سرہلاتی کمرے سے نکل گئیں۔ اسے یک دم ہی اداسی نے آگھیرا بچوں کی شدت سے یاد آنے لگی وہ ان کو یاد کر کے دکھی ہوتی رہی۔

✲ ✲ ✲

بھائیوں کے گھر آئے اسے ایک ہفتہ ہونے کے قریب تھا نہ فواد نے اس سے رابطہ کیا اور نہ بچوں نے فون پر بات کی۔ وہ تو بچوں کے بغیر ایک پل نہیں گزارتی تھی کجا یہ کہ ان کی جدائی سہتے سہتے ہفتہ ہو چلا تھا۔ فواد نے ایسی بے رخی کا مظاہرہ کبھی نہیں کیا تھا۔ دونوں کے درمیان اکثر کسی نہ کسی بات پر تکرار ہو جایا کرتی

تھی مگر اتنے دنوں ایک دوسرے سے بھی ناراض ہی نہ ہوئے تھے "آخر ایسا میں نے کیا کر دیا جو یوں مجھ سے انتقام لے رہا ہے۔ بچوں تک کو مجھ سے بات کرنے سے روک دیا ہے۔ بچوں اور ماں کے درمیان دیوار بن کر کھڑا ہو گیا ہے' دیکھتی ہوں کب تک تم بچوں کو مجھ سے دور رکھو گے اور کب تک ان کو سنبھالو گے۔ وہ تلخی سے سوچتی رہی۔

امی صبح سے گھر سے نکلتیں تو شام کو داخل ہوتیں۔ بھابیاں اپنے کاموں میں لگی رہتیں بچے اسکول چلے جاتے۔ بھائی اپنے اپنے ٹھکانوں پر وہ سارا دن بولائی بولائی پھرتی کوئی بھابھی کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیتی وہ سخت بوریت و الجھن کا شکار ہو رہی تھی۔

شام کو جب امی گھر میں داخل ہوئیں تو وہ ان سے الجھ پڑی۔

"کہاں چلی جاتی ہیں آپ۔ سارا دن میں گھر میں بور ہوتی ہوں بیٹی گھر میں آئی ہوئی ہے اور خود گھر سے نکل جاتی ہیں۔" وہ جھنجلائی تو سنجیدہ خاتون اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

"کیا کروں بڑھاپا ہے میرا بھی دل چاہتا ہے دو گھڑی کوئی میرے پاس بیٹھے میری بھی سنے بہوؤں کو کاموں سے فرصت نہیں ایسے میں میں کیا کروں اس لیے محلے میں دو چار گھروں میں چلی جاتی ہوں تو دن گزر جاتا ہے ویسے تو وقت کاٹے نہیں کٹتا۔" وہ لیٹ گئیں۔

"یہ آپ کو محلے میں جانے کا شوق کب سے ہو گیا ہے۔ پہلے تو آپ کو عبادت سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی اور پھر میں آئی ہوں میرے پاس بیٹھیں مجھ سے باتیں کریں تاکہ میرا بھی وقت کٹے" وہ بھی ان کے برابر میں لیٹ گئی تو وہ اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے سرد آہ بھر کر بولیں۔

"سچ پوچھو تو گھر سے نکلنے کا سبب بھی تم ہو مجھے کب گھر سے نکلنا پسند تھا مگر اب مجبوری میں نکلنا پڑتا ہے۔" دھیرے دھیرے وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

"میری وجہ سے آپ گھر سے نکلتی ہیں مگر کیوں۔۔؟" ان کی بات سن کر وہ حیران ہو کر اٹھ بیٹھی۔

"جب جب تمہیں دیکھتی ہوں دل دکھ سے بھر جاتا ہے میری نازوں پلی بیٹی کے ساتھ فواد نے اچھا نہیں کیا۔ تمہیں اتنا ستایا کہ تم بچوں کو چھوڑ کر ماں کے پاس چلی آئیں ورنہ کس ماں کا اپنے بچوں کے بغیر دل لگتا ہے۔ میں تمہارا کرب جانتی ہوں کیسے پل پل تم بچوں کی جدائی میں بے قرار رہتی ہو تمہارا دکھ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔" ان کی آنکھوں میں نمی پھیلنے لگی مائرہ نے چپ سادھ لی۔ ان کے گلے لگ کر انہیں حوصلہ دیتی رہی۔

"آہ! یہ ماؤں کی محبتیں میری ماں میری وجہ سے کس قدر دکھی ہے فواد میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی تم نے میری ماں کا دل دکھایا ہے۔" اس کی فواد سے ناراضی و شکووں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ "یہ بھائی بھی پتا نہیں کیوں چپ کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں فواد کو جا کر ٹھیک کیوں نہیں کرتے اس سے مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی بابت استفسار کیوں نہیں کرتے۔ اس طرح تو وہ اور بھی شیر ہو جائے گا۔ آج اگر اس کے بڑھتے ہاتھ کو نہیں کھینچا گیا تو کل کو اس کا ہاتھ پھر سے حرکت میں آجائے گا اور میں اس طرح اپنی تذلیل ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔ فواد کی اس جرات پر اسے سبق ضرور دینا ہو گا۔" اس نے بڑے بھیا سے بات کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا رات کو کھانے کی ٹیبل پر جب اس نے فواد سے پرسش کے بارے میں بات کی تو تینوں بھائی اس کا نام سن کر بھڑک اٹھے۔

"اس جابر انسان کا نام میرے سامنے مت لو میرا خون کھول جاتا ہے اب تمہارے منہ سے اس شخص کا ذکر قطعاً نہ سنوں میں ایسے شخص سے بات کرنا اپنی توہین سمجھتا ہوں جس کو عورت کی عزت ہی نہیں کرنی آتی۔" افضال بھیا کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا وہ ان کے اتنے شدید رویے پر ششدر رہ گئی۔

"مگر بھائی۔۔۔ میرے بچے وہ میرے بغیر کیسے رہیں گے کتنے دن ہو گئے مجھے ان کو دیکھے ہوئے۔"

"بچوں کی فکر چھوڑ دو جس کے بچے ہیں وہی

سنبھالنے ذرا اسے بھی تو پتا چلنا چاہیے کہ بیوی کے بغیر بچوں کو سنبھالنا کس قدر آسان ہوتا ہے! تم چپ چاپ یہاں بیٹھی رہو چند مہینوں میں ہی عقل ٹھکانے آجائے گی۔ خود ہی گھٹنوں کے بل چل کر آئے گا پھر حساب لوں گا اس سے تمہارے اوپر کیے ایک ایک ظلم کا۔ تم ہم پر بھاری نہیں ہو جس چیز کی ضرورت ہے اپنے بھائیوں سے کہو ہم ابھی زندہ ہیں۔ تمہیں اس جہنم میں ہرگز جانے نہیں دیں گے۔" چھوٹا بھائی افتخار، بڑے بھیا سے بھی زیادہ بپھرا ہوا تھا۔

ان کی باتیں سن کر اس کے ہوش اڑ گئے یہ ان کو ہو کیا گیا ہے۔ اس نے مدد طلب نظروں سے امی کی طرف دیکھا وہ چپ چاپ کھانا کھانے میں مصروف تھیں۔ تنہائی میں ان سے بات کی تو انہوں نے یہ کہہ کر جان چھڑالی۔

"تمہارے بھائی سمجھ دار ہیں تمہارے حق میں کوئی بہتر ہی فیصلہ کریں گے۔ تم پریشان نہ ہو اللہ بہتر کرے گا۔"

"یہ میں نے کیا کر دیا میں ایسا تو نہیں چاہتی تھی کہ اپنے گھر سے دور ہو جاؤں میں تو بس فواد کو اپنی غلطی کا احساس دلانا چاہتی تھی مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ ہو گیا تھا۔ فواد نے تو بھولے سے بھی اس کو یاد نہ کیا تھا۔ نہیں میں ہرگز اپنے بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ بھائیوں کو کچھ لچک دکھانی ہو گی۔" وہ سوچ کر رہ گئی مگر ان کے کڑے تیور دیکھ کر اس کی بات کرنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ رمضان شروع ہوا تو اس کی پریشانی سوا ہو گئی گھر میں عید کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔

ایک سے ایک مہنگا سوٹ اور چیزیں خریدی جا رہی تھیں بچے خوشی خوشی اپنی شاپنگ دکھاتے اور وہ زبردستی اپنے ہونٹ پھیلا کر "اچھے ہیں" کہہ کر اپنے بچوں کی سوچ میں پڑ جاتی۔ کتنے شوق سے وہ اور فواد مل کر بچوں کی عید کی شاپنگ کیا کرتے تھے بچے ان کے ساتھ کھلکھلاتے چہروں کے ساتھ اپنی پسند کی چیزیں خریدتے رہتے وہ انہیں یاد کر کے اداس ہو گئی۔ کیا میرے بچوں کو میری یاد نہیں ستاتی ہو گی اگر وہ ضد کرتے اور فواد سے مجھے لانے کو کہتے تو وہ ضرور مجھے لانے کے بارے میں سوچتا تو کیا میرے بچوں نے میرے بغیر رہنا سیکھ لیا ہے!" اس خیال نے ہی اس کا دل جکڑ لیا تھا۔ اشک تواتر سے بہنے لگے وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

امی بڑے ماموں کی طرف رمضان گزارنے گئی تھیں۔ کتنے مان سے ماموں ان کو لے کر گئے تھے وہ انکار نہ کر سکیں۔ سب اپنی اپنی زندگیوں میں مگن تھے۔ تنہا تھی تو فقط اس کی ذات تھی وہ اپنے اکیلے پن پر مستقل اشک فشانی کرتی رہی۔ اس دن وہ اپنا دل بہلانے کے لیے افطاری بنانے کھڑی ہو گئی بھابھیوں نے لاکھ روکنا چاہا مگر وہ اس کے اصرار پر خاموش ہو گئیں افطار کے دوران اس نے رولز بھیا کی طرف بڑھائے۔

"لیں بھائی آج آپ اپنی بہن کے ہاتھ کے بنے ہوئے رولز کھائیں مزا آجائے گا۔"

"کیا...؟ تم کچن میں گئیں۔" ان کے ماتھے پر تیوریاں چڑھ گئیں۔

درخشاں تم نے مائرہ کو کچن میں بھیجا۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری بہن سے کام کروانے کی۔ کیا یہ اس گھر میں کام کرنے کے لیے آئی ہے ساری زندگی بھی یہ اس گھر میں رہے تو تم اس کے حکم کی تابع ہو کجا یہ کہ تم اس سے کام لو۔" وہ بیٹھے سے اکھڑ گئے۔

بھابھی ضبط کی تصویر بنی بیٹھی رہیں وہ اپنے دفاع میں چند جملے بھی نہ بول سکیں۔

"بھائی میں اپنی خوشی سے کچن میں......"

"تم چپ رہو مائرہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کتنی خوشی سے کچن میں گئی ہو گی۔ ان تینوں کے رویوں نے تمہیں کچن میں جانے پر مجبور کیا ہو گا۔ کان کھول کر سن لو سب۔ مائرہ ہماری اکلوتی بہن ہے ہم نے اسے باپ کی کمی تک محسوس ہونے نہیں دی اس کے سکون اور خوشی کے لیے ہم کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ مگر اپنی بہن کو کسی قسم کی پریشانی میں نہیں دیکھ سکتے۔"

اپنی بیگم کے ساتھ انہوں نے افتخار اور قاسم بھائی

کی بیویوں کو بھی سنا ڈالیں۔ وہ بے چاری سہمی بیٹھی رہیں افتخار اور قاسم نے بڑے بھائی کی تائید میں سرہلائے تو مائرہ بھائیوں کی محبت پر بجائے خوش ہونے کے شرمندہ ہو گئی۔ وہ بار بار کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتی مگر بڑے بھیا مسلسل برس رہے تھے۔

"میں بے غیرت نہیں ہوں نہ ہی گھٹیا شخص جو اپنی بہن کو مان اور خوشی نہ دے سکوں یہ اس کا میکا ہے یہاں پر یہ رانی بن کر رہے گی ہم بھائیوں کی خوشیوں کا محور ہے۔ اس کے آنے سے گھر کیسا روشن و اجلا ہو جاتا ہے کوئی ہمارے دلوں سے پوچھے اسے ہم نے بڑے ناز اور محبت سے پالا ہے مائرہ کو اگر درخشاں کوئی شکایت ہوئی تو تمہیں اس گھر سے بے دخل کرنے میں لحہ نہیں لگاؤں گا اور ہاں اس بھول میں نہ رہنا کہ تمہارے امریکن بھائیوں اور کروڑوں کے بزنس مین باپ سے ڈر جاؤں گا مجھے اپنی بہن سے زیادہ کچھ عزیز نہیں۔"

کھانا چھوڑ کر وہ اٹھ گئے باقی بھائیوں نے بھی ان کی پیروی کی اور وہ اپنی جگہ شرمندہ سی بیٹھی رہ گئی۔ درخشاں بھابھی سے نظریں ملانے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔ ان کے بہتے اشک اسے ندامت میں مبتلا کرتے رہے اس کے دل پر منوں بوجھ آن پڑا تھا۔

فواد نے تو کبھی میری اس طرح سے انسلٹ نہیں کی۔ راحت آپا تو اکثر ہی کچن میں پائی جاتی تھیں' وہ ڈشز جو وہ سستی کی وجہ سے مہینوں نہیں بناتی تھی' وہ چند دنوں میں رہ کر بڑی خوش دلی سے بنا کر کھلاتی رہیں۔

بچوں کے ادھڑے کپڑے مرمت کر دیتیں انہیں سلائی اچھی آتی تھی جدید تراش خراش سے اس کے کپڑے تک سی جاتیں۔ فواد نے اسے کبھی ہلکی سی سرزنش بھی نہیں کی تھی کہ آپا سے کام نہ لیا کرو بلکہ وہ ان کی محنت کو سراہتا تو وہ مسکرا دیتیں۔

"یا خدا یہ کیا ہو رہا ہے۔" وہ بوجھل قدموں سے اپنے اور امی کے مشترکہ کمرے میں چلی آئی۔ دل پر ندامت و شرمندگی کا بوجھ آن پڑا۔

اگر میرے آنے سے میرے بھائیوں کے گھر کی رونق بڑھ جاتی ہے تو فواد کے بھی تو یہی جذبات ہوتے ہوں گے۔ میں کتنی پست ذہنیت کی ہوں جو بہن بھائی کے رشتوں کو ملنے کی خوشی سے محروم کر دینا چاہتی تھی۔ نہیں میں یہ سب ٹھیک نہیں کر رہی غلطی میری ہے فواد کا قصور نہیں۔

آج بھائی نے میرے کچن میں جانے کی وجہ سے بھابھی کی اتنی توہین کی ہے تو میں نے تو راحت آپا پر ان کے بھائی کے دروازے ہی بند کرنا چاہے تھے آخر فواد بھی تو بھائی ہے اس کے بھی جذبات مجروح ہوئے تھے تو اس نے طیش میں مجھے تھپڑ دے مارا۔" اس کا دل اپنی ہی لگائی ہوئی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ ساری رات جاگ کر وہ ایک مضبوط فیصلہ کر چکی تھی۔ صبح افضال بھائی کے آفس جانے سے پہلے اس نے ان سے بات کرنی کی ٹھان لی۔ وہ ان کے کمرے میں چلی آئی۔ "آؤ میری پیاری گڑیا۔" انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگالیا۔ "تمہیں کسی سے ڈرنے اور دبنے کی ضرورت نہیں ہے یہ تمہارا گھر ہے۔ تم یہاں پر پورے استحقاق سے رہو کوئی تمہیں کچھ نہیں سکتا۔" وہ پھر سے شروع ہو گئے اور یہ لو آج جا کر اپنے لیے اچھی سی شاپنگ کرنا۔" انہوں نے ہزار کے نوٹ اس کی مٹھی میں دبانا چاہے۔

"نہیں بھائی یہ گھر میرا نہیں میرا گھر وہ ہے جہاں میرے بچے اور میرا شوہر ہے اور مجھے اس گھر میں رہنا ہے۔" وہ اٹل لہجے میں بولی تو انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔ تم اس گھر میں جانا چاہتی ہو جہاں شوہر کو تمہاری قدر ہی نہیں جو بیوی سے زیادہ بہن کو اہمیت دیتا ہے اور ہاتھ اٹھانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔"

"آپ کو بھی تو اپنی بیوی سی زیادہ اپنی بہن عزیز ہے۔ میں نے جان لیا ہے بھائی کہ رشتوں سے جڑے رہنا ہی اصل خوب صورتی ہے۔ بہنوں کا مان میکا ضرور ہوتا ہے مگر گھر ہرگز نہیں۔ میں راحت آپا کو ان کے

ماں سے بھی محروم کرنا چاہتی تھی۔ فواد نے میری غلطی کی بنا پر مجھ پر ہاتھ اٹھایا اور میں اپنی غلطی پر شرمندہ ہونے کے بجائے اپنا گھر ہی چھوڑ کر چلی آئی۔ یہ بھی نہ سوچا کہ میرے بچے میرے بغیر کیسے رہیں گے۔ میں اپنے گھر واپس جانا چاہتی ہوں۔" کہہ کر وہ کمرے سے نکلنے لگی۔

"سوچ لو کل کو پھر کسی بات پر فواد نے تم سے ناروا سلوک کیا تو برداشت کرلو گی۔"

"ہاں... میں کرلوں گی صبر اور برداشت کا عورت کی گھٹی میں ہونا اس کے گھر کی بنیادوں کو مضبوط کرتا ہے۔ فواد ایک متحمل شخص ہے وہ مجھ سے ناروا سلوک ہرگز نہیں کرے گا بلکہ مجھے اپنے آپ میں بہت سی تبدیلیوں کی ضرورت ہے جو اس گھر میں رہتے ہوئے میں نے جانی ہیں۔ اتنے دن رکھنے اور پیار دینے کا شکریہ بھائی۔ میں اپنے میکے میں پوری عزت اور احترام سے آنا چاہتی ہوں۔" اس نے ان کا ہاتھ اپنے آنکھوں سے لگایا۔

"اور ہاں امی کو ماموں کے گھر سے لے آئیں میری وجہ سے وہ پریشان ہیں انہیں بتادیں کہ ان کی رانی اپنے راجا کے گھر جاچکی ہے وہ اب پرسکون ہو کر اپنے گھر رہیں۔" وہ بولتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

"ٹھہو مائرہ میں تمہیں چھوڑ کر آتا ہوں۔"

"نہیں بھائی جس طرح آئی تھی اسی طرح چلی بھی جاؤں گی میرے لیے پریشان نہ ہوں۔" اونچی آواز میں کہتی وہ گیٹ پار کرگئی تو افضال نے انگوٹھے کا نشان بنا کر "یس" کہا اور موبائل پر نمبر ملانے لگے۔

"امی جلدی سے وہاں سے نکلیں مائرہ گھر واپس آرہی ہے۔"

"واقعی بیٹا...؟" خوشی سے ان کی آواز کانپ گئی۔

"جی امی آپ کی پلاننگ بالکل کامیاب رہی اسے احساس ہوگیا ہے کہ غلطی فواد کی نہیں اس کی تھی۔"

"شکر ہے میری مالک اس لڑکی کو بھی عقل آئی کہ بھائیوں کے گھر بہنیں خوشی کے چند لمحے گزارنے آتی ہیں، بے وقوف فواد کی بہن کو اس خوشی سے محروم کرنا چاہتی تھی۔ وہ تو شکر ہے فواد سمجھ دار ہے ورنہ اب تک معاملات پتا نہیں کتنے بگڑ چکے ہوتے۔"

"بس اب آپ وہاں سے نکل کر پیچھے والی روڈ پر آجائیں میں آپ کو لینے آرہا ہوں۔" انہوں نے موبائل آف کیا۔

"مظلومیت کی زندہ تصویر ذرا سائیڈ ٹیبل پر سے کار کی چابی تو پکڑاؤ۔" درخشاں نے ان کے ہاتھ میں چابی پکڑائی۔

"مان گئے نا اپنی بیگم کی کامیاب اداکاری کو۔" باقی دونوں بھابیاں بھی وکٹری کا نشان بناتیں مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں تو افضال نے اثبات میں سرہلادیا۔

"مائرہ کو اپنی غلطی کا احساس دلا کر اپنے گھر بھیجنے کا سہرا تم تینوں کو ہی جاتا ہے۔" افضال نے متشکر ہو کر ان کی تعریف کی اور جلدی سے گیراج کی طرف بڑھے۔

وہ کتنے ہی لمحے اپنے گھر کے گیٹ کے باہر کھڑی رہی۔ گیٹ تھوڑا سا کھلا تھا وہ اندر داخل ہوگئی۔ حد ہے لاپروائی کی بھی گھر کو کیسے کھلا چھوڑ رکھا ہے کوئی چور اچکا گھر میں گھس جائے تو۔" وہ سوچتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ بچے لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہے تھے اس کی جز وقتی ملازمہ صفائیوں میں مصروف تھی۔

"سلام بی بی جی۔" اس نے مائرہ کو دیکھ کر سلام جھاڑا تو بچے بے اختیار چیختے ہوئے اس سے لپٹ گئے۔ "مما آپ ہمیں چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھیں کیا آپ کو ہماری یاد نہیں آئی۔" سلیقہ نے شکوہ کیا تو اس نے اس کا ماتھا چوم لیا' ولید تو اس کی گود میں چڑھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"روز مجھے اپنے بچوں کی یاد آتی تھی مگر یہ بتاؤ تم لوگوں کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ مما سے ملنے آجاؤ یا فون پر ہی بات کرلو۔"

"بہت دل کرتا تھا مگر نانو نے سختی سے منع کر رکھا تھا بابا نے تو کئی بار آپ کو لے کر آنے کا ارادہ کیا مگر نانو ہر بار منع کردیتیں۔" منان نے حقیقت اگلی۔

"کیا...؟ یہ نانو یہاں پر کیسے آگئیں۔"

"جب سے آپ گئی تھیں نانو تو ہر روز ہمارے پاس آتی تھیں اور اب تو کافی دنوں سے وہ ہمارے پاس ہی رہ رہی تھیں۔ ابھی ماموں نے فون پر نانو سے کچھ کہا تو وہ چلی گئیں۔"

منان کے اس انکشاف پر وہ پل میں سمجھ گئی کہ اس کی سمجھ دار ماں اور بھائیوں نے اسے احساس دلانے کے لیے یہ سب ڈرامہ کیا تھا اسے ماں پر ڈھیروں پیار آگیا۔

"مما جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو سلیقہ کو اپنے گھر میں بالکل بھی نہیں گھسنے دوں گا۔ یہ میری مسز کو تنگ کیا کرے گی۔ اس کے آنے پر ہمارے گھر میں جھگڑے ہوں گے جب اس کی شادی ہو گی تو اس کے ہزبینڈ کو کہہ دوں گا کہ اسے اپنے ہی گھر میں رکھے ہمارے گھر کا سکون برباد کرنے کے لیے اسے یہاں نہ بھیجا کرے۔ پھپھو کی وجہ سے آپ اتنی پریشان ہو گئیں کہ اپنا گھر چھوڑ کر جانا پڑا میں سلیقہ کی وجہ سے ہرگز اپنی مسز کو جانے نہیں دوں گا۔"

دس سالہ منان کی بات سن کر وہ بھونچکا رہ گئی دل پہ گھونسا پڑا تھا لگا تیزابی سے اس کا کلیجہ چھلنی کر دیا گیا ہو اس کا دل مٹھی میں لے کر جیسے کسی نے بے دردی سے مسل ڈالا ہو۔ میرے دل کی ٹھنڈک میری نور نظر سلیقہ پر بھائی اپنے گھر کے دروزے بند کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کے آنے سے اس کے گھر کا سکون نہ تباہ ہو جائے۔ وہ تڑپ اٹھی اپنے کا دکھ ایسے ہی تڑپاتا ہے۔ منان راحت آپا کے لیے بولنے والے لفظوں اور لہجے سے بہت کچھ سمجھ گیا تھا وہ شرمسار ہو گئی۔

"نہیں منان بیٹا بہنوں کے بارے میں ایسے تھوڑی بولتے ہیں بھائی تو بہنوں کا مان ہوتے ہیں ان کے آنے سے تو گھر میں بہار آجاتی ہے دل کھل اٹھتے ہیں۔"

"پھر آپ پھپھو کے آنے پر کیوں خفا ہوتی ہیں۔"

"بس یوں سمجھ لو کہ تمہاری مما تھوڑی تھوڑی پاگل بے وقوف سی تھیں اب آپ کی مما کو آپ کے ماموؤں نے کافی مقدار میں عقل خرید کر دی ہے۔" وہ خجالت سے ہنستے ہوئے بولی تو بچے بھی ہنس دیے۔

"اچھا واقعی۔۔۔؟ کتنے میں خریدی کہیں مقروض تو نہیں کر دیا مجھے سالوں کا۔" فواد بشاشت سے مسکراتے ہوئے کمرے سے نکلے تو وہ خفیف سے ہو گئی۔

"آپ آج آفس نہیں گئے۔"

"بھئی آج میں نے سوچا کہ آفس کا منہ دیکھنے کے بجائے اپنی بیگم کے رخ روشن کا دیدار کر لیا جائے۔" فواد نے چاہت سے اسے دیکھا اور اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئے۔ ایک دوسرے کی سنگت میں سرشار وہ سب باتیں کیے جا رہے تھے۔

"اچھا اب اٹھو یہاں سے باتوں میں ہی لگائے رکھو گے۔ کچھ گھر کے خبر لوں کہ میرے بعد کیا حشر کیا ہے۔" وہ اٹھی۔

"گھر کی بھی خبر لو اور گھر والے کی بھی کہ تمہارے بعد اس معصوم کا کیا حشر ہوا ہے۔" فواد اس کے ساتھ چلتے ہوئے شرارت سے مسکرائے تو وہ ـــــ مصنوعی پن سے آنکھیں نکالنے لگی۔

"عید میں چند ہی دن رہ گئے ہیں آج رات شاپنگ کے لیے چلیں گے اور ہاں راحت آپا کو بھی تو فون کرنا ہے کہ اس بار عید وہ ہمارے ساتھ کریں۔" وہ اپنے کمرے میں داخل ہو گئی کچھ دیر بعد ہی وہ راحت آپا سے کہہ رہی تھی۔

"آپ کو ہماری طرف آئے ہوئے کتنے دن ہو گئے ہیں بس اب کوئی بہانہ نہیں چلے گا اس دفعہ عید آپ ہمارے ساتھ ہی کر رہی ہیں آپ اپنے میکے تشریف لے آئیں ہم سب آپ کے منتظر ہیں۔" اس نے چہک کر کہا تو راحت آپا کا مان بڑھ گیا کہ ماں باپ کے رخصت ہونے کے بعد اب بھی میکے میں ان کو یاد کرنے والے موجود ہیں اور مائرہ سوچ رہی تھی کہ اصل عید تو اس کی اس مرتبہ کی ہے جب وہ کثیف دل سے پاک راحت آپا کو بخوشی گلے لگائے گی وہ مطمئن دل کے ساتھ عید کی تیاریوں میں مشغول ہو گئی۔

☆ ☆

مصباح علی

ازمیر اور مریم آسٹریلیا کے شہر وکٹوریہ میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی روائیبہ شادی کے گیارہ سال بعد پیدا ہوئی۔ وہ ایک خوب صورت اور معصوم لڑکی ہونے کے ساتھ والدین کی بے حد لاڈلی ہے۔ وہ اس کی سرپرائز سالگرہ آسٹریلیا کے مشہور نیشنل گرین فورسٹ میں شاندار طریقے سے مناتے ہیں۔ سارا پروگرام جندب ترتیب دیتا ہے۔ جندب کا ہاسٹل ازمیر کے فلیٹ کے بالکل قریب ہے۔ اکثر اوقات وہ ان کے ہاں آتا رہتا ہے۔ ان چاروں کے درمیان دوستی اور خلوص کا رشتہ ہے۔ میرزکا فیصل آباد کے نواحی گاؤں میں مانے ہوئے زمیندار ہیں۔ ان کی والدہ فالج کی مریضہ ہیں۔

میرزکا کے دو بیٹے خیام زکا، حنبل زکا ہیں۔ خیام کی شادی آئمہ سے ہو چکی ہے۔ حویلی میں آئمہ کی حکمرانی ہے۔ آئمہ کے دو بچے ہیں۔ ازلان، اعشال۔ ازلان لاابالی اور شرارتی ہے جب کہ اعشال رکھ رکھاؤ والی زمیندار لڑکی ہے۔

زینب حویلی میں جدی پشتی خدمت گزار کی حیثیت سے ہے، لیکن دل حنبل زکا کی وجاہت میں بری طرح جکڑا ہوا ہے اور اسی بنا پر وہ اپنے لیے آنے والے رشتے ٹھکرا دیتی ہے۔ ایک دن ان ہی کے طبقے سے تعلق رکھنے والے اصغر نے اسے چھیڑا۔ حنبل نے نہ صرف دیکھا بلکہ بے تحاشا پیٹا۔ اس واقعے نے زینب کو مکمل طور پر حنبل زکا کا اسیر کر دیا ہے۔

شہروز کمال سبرینہ کا شوہر ہے۔ دولت مند ہونے کے ساتھ ساتھ رنگین مزاج بھی ہے۔ سبرینہ سے اس کی پسند کی شادی ہے، لیکن اوپر تلے چار بیٹیوں کی پیدائش نے اسے سبرینہ سے متنفر کردیا ہے۔ اسے بیٹے کی شدید خواہش ہے۔ اکثر سبرینہ اس کے طنز و طعنے کے حصار میں رہتی ہے۔ بیٹیاں باپ کے سخت رویے سے خوف زدہ ہیں۔ باپ کے قریب جانے سے بھی ڈرتی ہیں یہ جرم بھی شہروز سبرینہ کے کھاتے میں ڈالتا ہے۔۔۔

اب آگے پڑھیں۔

تیسری قسط

مکمل ناول

موبائل کی بپ پر اس کا دل بے طرح سے دھڑکا تھا یل کے دسویں حصے میں اسے ایسے لگا ازمیر کا فون ہو گا اور وہ یقیناً "معذرت کر لے گا کیوں کہ اسے خود پر کنٹرول ہے۔ ویسے بھی میرہجل اس کے اپنے لیے احساسات کو محسوس کرنے لگی تھی۔ فطرتاً "میرہجل کی ایگو (انا) بہت مضبوط تھی۔ وہ کسی سے جھک کر ملنا پسند نہیں کرتی تھی لیکن دل نے اسے زمین تک جھکا دیا تھا۔ ضدی بھی بلا کی تھی۔ جو سوچ لیا تو بھلے جان بھی جائے اور ازمیر کے لیے اس کا دل اس حد تک جھک گیا تھا' بھلے اب جان بھی جائے۔ اس نے فون نکالا۔ اندازے کے مطابق ازمیر ہی کی کال تھی۔ اس نے ہر طرح کی بات سننے اور جواب دینے کے لیے خود کو تیار کیا اور موبائل کان سے لگا لیا۔

"ہیلو...!"

"ہاں میرہجل... مجھے سمجھ نہیں آرہا کون سا گیٹ تمہارا ہے' تین چار گھروں کے گیٹ سفید ہیں۔" پیانو کے ساز میں شادیانے کا ردھم کانوں میں رس گھول گیا تھا۔ شمعوں کی پھڑپھڑاتی لو یک لخت اتنی روشن محسوس ہوئی جیسے سیاہ آسمان پر پورا چاند اور ہر روشنی چاند کی روشنی میں چھپ گئی ہو۔ اس کے رخساروں پر میکسی کا رنگ چڑھ گیا تھا۔

"واقعی وہ کمٹمنٹ پوری کرنے کے لیے ہی کرتا ہے۔" ایک سانس میں اس کے دل نے کہا اور فوراً" سے دھڑکن سنبھالتے ہوئے بولی۔

"جس گیٹ پر گلوب روشن ہیں اور میری ٹری یقیناً" باہر سے نظر آرہا ہو گا۔ تم آؤ میں گیٹ پر آرہی ہوں۔" وہ بات کرتے ہوئے گیٹ کی جانب بڑھ رہی تھی۔ فلوریہ کی نگاہیں اس کے تیز لپ اسٹک زدہ مسکراتے ہونٹوں پر تھیں۔

"کیا کوئی میری اتنی خوب صورت بہن کے قابل ہو سکتا ہے۔ ہونہہ۔" رخسار استہزائیہ پھیلا "چلو دیکھتے ہیں۔"

میرہجل کا چہرہ بتا رہا تھا اس کے ساتھ آنے والا یقیناً" ازمیر ہی ہو گا اک عام سا حلیہ۔ راؤنڈ ٹی شرٹ سیاہ پینٹ' سیاہ کوٹ' اور کوٹ کی آستین کہنیوں تک سمٹی ہوئیں۔ "لباس سے تو نہیں لگتا تھا کہ وہ کسی خاص ڈنر میں وی آئی پی کی حیثیت سے آیا ہے۔ ہاں' اٹھان ضرور ایسی تھی جس پر میرہجل مر رہی ہے' رنگ' روپ' نقش۔"

فلوریہ نے بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا وہ قدرے قریب آیا تھا۔ لیڈی ہیلما اور فلوریہ کو "ہائے" کرنے پر اٹھان کے علاوہ جو چیز فلوریہ نے محسوس کی وہ اس کے کلون کی مہک تھی۔

"چلو لباس کی تمیز نہ سہی' خوشبوؤں کا پتا ہے۔" اس نے اسے زبان سے ہائے کا جواب نہیں دیا تھا سرد مہر سا مسکرا کر سر کو بس جنبش دی۔ جو ازمیر کو واضح محسوس ہوئی تھی۔ وہ کم انا پرست نہیں تھے۔ قدرے فاصلے والی چیئر کا انتخاب کر کے جم کر بیٹھے۔ میرہجل کے منہ سے "ازمیر یہ ازمیر وہ کے ابلتے کلمے کو لیڈی ہیلما نے یہ کہہ کر روکا۔

"میں خود پوچھ سکتی ہوں' یہ کیا ہے' اور کیوں ہے۔"

اسے کسی بات سے فرق نہیں پڑتا بس وہ خوش تھی۔ بے تحاشا خوش لیڈی ہیلما بہت سی باتیں کرتی رہیں۔ ان کی دلچسپیاں' اس کی تعلیم' ان کی فیملی۔ وہ مختصر الفاظ میں جواب دیتے رہے بالکل ایسے جیسے غیر اہم موضوع ہو۔ اس کی باتوں اور انداز سے لیڈی ہیلما کو یقین تھا وہ مسلمان ہے۔ پوچھنے پر انہوں نے "الحمدللہ" کہہ کر بتایا تھا۔

فلوریہ کو انتہائی دکھ ہوا تھا اس کی بہن کی پسند اس حد تک جا سکتی ہے' یعنی کہ اسے فرق ہی دکھائی نہیں دے رہا۔ وہ بہت دیر ماں اور اس کی گفتگو سنتی رہی۔ پھر بڑی ادا سے ازمیر سے سوال کیا تھا۔

"تم اپنے مذہب کو مختصر ترین الفاظ میں سمیٹ سکتے ہو' یعنی پلیں پوائنٹ۔" ازمیر کو اچنبھا ہوا بھنوؤں کے کنارے قدرے سمیٹے۔ انہوں نے بنا گردن ہلائے ایک پر شکوہ نگاہ میرہجل پر ڈالی جو بہن کے اس سوال پر بے چین ہوتی خفا نگاہ سے ماں کو دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ

فلوریہ کے سوال سے متفق تھیں۔ اطمینان دیدنی تھا۔ ازمیر نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی اور پشت کرسی کی بیک سے جما کر بڑے تحمل سے بولے تھے۔

"کیا آپ کرسچنٹی کو سمیٹ سکتیں ہیں چند الفاظ میں۔"

"بالکل۔" فلوریہ نے شانے اچکائے۔

ازمیر نے سر کو ایسے جنبش دی جیسے کہا ہو "شیور" فلوریہ جم کر بولی۔

"کرسچنٹی (عیسائیت) کی سب سے بڑی خوبی ہے 'یہ ساری مخلوق کو برابر سمجھتی ہے' مساوی ایک لیول پر"

اس نے اپنے قریب سے گزرتے بڑے سے پالتو کتے کی پشت پر زور سے تھپکی دی اس نے مڑ کر اس کی اسکرٹ سے جھانکتی ننگی پنڈلی پر منہ پھیرا اور چلا گیا۔ ازمیر کو کراہیت آئی تھی مگر محسوس ہونے نہیں دی بلکہ پھیکا سا مسکرائے۔

"بالکل ٹھیک 'لیکن ہمارے ہاں ایسی برابری کا کوئی تصور نہیں ہے' ہمارے ہاں جانچ کی بنیاد تقویٰ ہے۔"

فلوریہ کی آنکھیں ناسمجھی سے سکڑی تھیں ماتھے پر واضح بل تھا۔ ازمیر نے وضاحت کردی۔

"یعنی پرہیزگاری 'حرام' حلال میں تمیز....." ازمیر نے ٹانگ سے ٹانگ اتاری 'اٹھ کھڑے ہوئے۔ میربجل بھی ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ بہن ماں سے خفا خفا سی اور لجلجائی نگاہ سے اسے دیکھتی۔

"اب میں چلتا ہوں' میربجل مجھے ایک اور جگہ بھی جانا ہے۔"

"لیکن ڈنر..... تم نے کمٹمنٹ کی تھی۔"

"بالکل..... میں نے ڈنر پر آنے کی کی تھی۔ کھانے کی نہیں۔" وہ ہاتھ سے بائے کرتے تیز قدموں سے باہر کی جانب بڑھے تھے۔ میربجل کے چہرے پر چڑھا میکسی کا رنگ جلتی شمع کی لو میں بدل گیا تھا۔ اس نے تند نگاہ سے ماں اور بہن کو گھورا۔ ٹیبل کی سطح پر دونوں ہاتھ جمائے قدرے جھکی گہرے سانس لیتے انہیں گھورتی رہی۔

"میں نے کہا تھا نا..... میں ازمیر سے محبت کرتی ہوں' اور اس محبت کو پانے کے لیے میں کسی بھی حد تک جانے سے' خود کو روک نہیں پاؤں گی۔" اس نے سیدھے ہوتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر انگشت دونوں کی جانب گھمائی۔

"تم نے یہ ٹھیک نہیں کیا... میں معاف نہیں کروں گی۔"

لیڈی ہیلہ اور فلوریہ اس کی جذباتی عقل پر تاسف بھرا ہنکارا بھرتی رہیں۔

ڈنر اپنے عروج پر تھا سب لوگ شوخ مسکراتے ہوئے کچھ کھانا کھا رہے تھے' کچھ گپیں لگا رہے تھے۔ کسی کو فرق نہیں پڑتا تھا گھر کے افراد ایک ٹیبل پر لاتعلق اپنی ہی دنیا میں مگن ہیں۔ فلوریہ کا بوائے فرینڈ اسے بلانے بھی آیا۔ اس نے مسکرا کر ابھی آنے کا کہہ کر اسے ٹالا تھا۔ وہ کسی اور کے ساتھ رقص میں محو ہو گیا۔ سب لوگ بھرپور انجوائے کر رہے تھے سوائے اصل تین میزبانوں کے وہ اندر تک کلس رہے تھے۔

وہ جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔ مڑی اپنی لمبی میکسی کی پروا کیے بغیر بھاگتے ہوئے گیٹ کی جانب بڑھی تھی۔ پھر گلی میں آگئی۔ گلی خالی تھی اس نے آخری سرے تک اسے ڈھونڈا تھا۔ وہ نہیں تھا وہ جا چکا تھا۔ گلی تاریخ 'ویران تھی بالکل اس کے دل کی طرح گھر پر سب خوش تھے' کھا رہے تھے گا رہے تھے اور وہ اکیلی بہت دیر اسے راستے میں ڈھونڈتی رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ کئی دن سے اس کے ڈپارٹمنٹ کے چکر کاٹ رہی تھی۔ لیکن ازمیر مل کے نہیں دے رہے تھے۔ حالانکہ وہ یونی لگاتار آرہے تھے۔ لیکن اسے نہیں مل رہے تھا۔ پتا نہیں ایسا اتفاقیہ ہو رہا تھا۔ یا ازمیر جان بوجھ کر اس سے فاصلہ کر رہے تھے۔ چند دن کے بعد وہ ان کے فلیٹ پر آگئی۔ دروازہ رضاحیات نے کھولا تھا اور اسے اندر بٹھالیا تھا۔ ازمیر اس وقت واش روم میں تھے۔ جیسے ہی رضا نے دستک دے کر بتایا۔ ان کا بالکل موڈ نہیں تھا کہ باہر آئیں اور اس لڑکی کا سامنا کریں۔

انہیں اس سے عجیب سا خوف آنے لگا تھا۔
اس رات اس کی ماں، بہن کی پوچھ تفتیش سے بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ کتنا ان کا ذکر گھر میں کرتی رہی ہے۔ اس ذکر کے پیچھے کیا خواہش کار فرما ہوگی۔ کم از کم وہ ایسی کوئی خواہش نہیں رکھتے تھے۔ لیکن اس لڑکی کا بڑھتا اصرار اور انداز یقیناً" انہیں ڈگمگا دے گا۔ اسی لیے وہ سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

وہ کچھ دیر کمرے میں انتظار کرتی ادھر ادھر ان کی چیزیں چھیڑتی رہی۔ پھر کمرے سے ملحقہ ٹیرس پر نکل گئی۔ اس کا جانے کا قطعاً" ارادہ نہیں تھا۔ اس کا ارادہ دیکھ کر ہی رضا نے تیسری بار واش روم کا دروازہ بجایا۔ اور ڈپٹ کر انہیں باہر نکلنے کا کہا تھا۔ جواباً" انہوں نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر، رضا حیات کو گھورا تھا۔
"تو کہہ نہیں سکتا تھا میں گھر پر نہیں ہوں، باہر کسی کام سے گیا ہوں۔"
"کیوں میں کیوں جھوٹ بولتا۔"
"آگے تو، تو جیسے بڑا مومن ہے۔" وہ چبا کر بولے تھے۔
"اچھا..." رضا نے خوب طنزاً" کہا تھا" پہلے تو اسے اپنے پیچھے لگا لیا، اب کیوں بھاگ رہا ہے، بھگت۔"
وہ رضا کو کھا جانے کی حد تک گھور رہے تھے۔
"نکل باہر۔ اور فارغ کر اسے... میں نے سونا بھی ہے... وہ محترمہ ٹیرس پر تجھے کوک (انتظار) رہی ہے۔" رضا بڑبڑاتے ہوئے رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ ازمیر نے اپنا حلیہ درست کیا۔ گیلا ٹاول رضا پر پھینک کر کنگھی کر کے ٹیرس پر آ گئے۔
وہ سینے پر ہاتھ باندھے ٹیرس سے نظر آتے بحرالکاہل کے چھوٹے سے ٹکڑے پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔ ازمیر قدرے فاصلے پر کھڑے ہوتے ہلکا سا کھنکارے۔ اس نے گردن پھیر کر دیکھا تھا اور پھر ویسے ہی ان کی شخصیت کے سحر میں زنجیروں سے بندھ گئی۔ جو سوچ کر جملے آئی تھی اور جو ابھی کچھ دیر پہلے بن رہی تھی سب ہوا کے ساتھ اڑتے سمندر میں ڈوب گئے تھے۔ کچھ دیر بعد اس کے منہ سے نکلا تھا۔
"آئی ایم سوری... ازمیر... جو کچھ اس رات ہوا۔"
"کیا... ؟" ان کے اس قدر استعجابیہ کہنے پر وہ ششدر ہوئی پھر سنبھل کر بولی۔
"میرا مطلب ہے... جو کچھ فلوریہ نے اس دن کہا... دراصل وہ ایسی ہی ہے 'اکھڑ' بدتمیز' کسی کے دل کا بالکل احساس نہیں ہے۔ اس کی طرف سے میں معافی مانگتی ہوں... پلیز۔"
"لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔"
"پھر اٹھ کر کیوں آ گئے تھے؟"
"مجھے واقعی کام تھا۔"
"جھوٹ... تم جھوٹ بول رہے ہو۔"
"تم کیسے کہہ سکتی ہو میں جھوٹ بول رہا ہوں۔"
"جھوٹے جھوٹ کو پکڑ لیتے ہیں، مجھے بھی جھوٹ بولنے کی بہت پریکٹس ہے۔" اس کے جواب پر وہ اچھا خاصا چونکے تھے۔ وہ گہرے سانس لے کر بولی تھی۔
"لیکن اب میں جھوٹ نہیں بول رہی، میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں ازمیر... پلیز۔" انہیں فی الحال اس کے واضح اقرار کی امید نہیں تھی۔ چونکے ضرور تھے مگر ظاہر ہونے نہیں دیا۔
"اندر آؤ... چائے پیتے ہیں۔"
"میں چائے پینے نہیں آئی... میں تم سے بات کر رہی ہوں... ازمیر، میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"
"میں کل ہی نئی چائے لایا تھا۔ آؤ اس کا ٹیسٹ چیک کرتے ہیں۔" کہہ کر ازمیر کے مڑنے پر اس نے انہیں کہنی سے پکڑ کر روک لیا۔
"تم بات کیوں بدل رہے ہو۔"
"بے مقصد باتوں کو بدل دینا چاہیے۔"
"کیا مطلب بے مقصد، میں تم سے محبت کرتی ہوں، شادی کرنا چاہتی ہوں، یہ بے مقصد نہیں۔"
"لیکن میں نہیں چاہتا، میرے لیے بے مقصد ہے۔" ان کے دو ٹوک انداز پر میرجل کو اپنا دل

اونچائی سے گرتا ہوا محسوس ہوا۔ بمشکل مردہ سی سانس کھینچ کر استفسار کیا تھا۔

"کیوں۔۔۔؟"

"کیوں کہ میں الحمد للہ مسلمان ہوں ۔۔۔ ایک کرسچن سے۔۔۔ امپاسبل (ناممکن)۔" اس کا نازک ہاتھ کہنی سے پھسلتا ان کی کلائی کے جوڑ پر لمحہ بھر کا ٹھہر کھل کر پہلو میں آگرا۔

"کیا اسلام منع کرتا ہے۔ بہت سخت دین ہے تمہارا؟" اس کی آواز ایسے تھی جیسے کوئی گڑھے میں منہ دیے بول رہا ہو۔

"نہیں۔" انہوں نے رخ ٹیرس پر لگی ریلنگ کی جانب موڑا اور مضبوطی سے آہنی راڈ پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ "اسلام سخت دین نہیں ہے' لیکن میں نے بتایا تھا۔۔۔ نا اس کی بنیاد میں حرام حلال کی تمیز بھی ہے۔"

"تم مجھے اپنانے کو حرام سمجھتے ہو؟" وہ ست روی سے چند قدم اٹھا کر اس کے برابر کھڑی ہو گئی۔ انہوں نے رخ میربجل کی جانب کر لیا تھا۔ اور ریلنگ سے پشت ٹکالی۔ کچھ دیر اس کے مایوس کن چہرے کو دیکھتے رہے۔ پھر دھیرے دھیرے قائل کرنے کے انداز میں کہہ رہے تھے۔

"دیکھو میری۔" ازمیر کے منہ سے لفظ "میری" اسے بے پناہ اچھا لگا تھا۔ جب اس کی ماں' بہن اس سے لاڈ کرتی تھیں تو میری ہی کہہ کر پکارتی تھیں۔ اک اطمینان بھری سانس چہرے پر پھیل گئی مگر وہ کچھ اور کہنے لگا تھا۔

"دیکھو میری' ہر ادارے' سوسائٹی کے کچھ اصول و ضوابط ہوتے ہیں' اسی طرح مذاہب کے بھی۔۔۔ اسلام میں جگہ جگہ موقع کی مناسبت سے گنجائش ضرور نکلتی ہے مگر میں مسلم خواتین کے ہوتے ہوئے' ایک کرسچن لڑکی کو کیوں اپناؤں' اور تمہاری فیملی بھی یقیناً" ایسا نہیں چاہتی سو۔۔۔ ایم سوری۔"

اس کا آخری لفظ سوری سن کر میربجل کو ایسے لگا جیسے بحرالکاہل کی وہیل نے اسے نگل لیا ہو اور وہ اس کے دانتوں میں کچلی جا رہی ہو۔ وہ بہت سہولت سے کہہ کر اندر کمرے میں چلے گئے تھے۔ وہ کتنی دیر وہاں کھڑی ہوا اور پانی کی آوازوں میں خود کو وہیل کا لقمہ بنتے محسوس کرتی رہی۔

رضا کسی کام سے باہر جا چکے تھے۔ ازمیر کچن کاؤنٹر پر کھڑے کپوں میں کچھ گھول رہے تھے۔ اس نے ایک سرد نگاہ ان کی پشت پر ڈالی۔ بنا کچھ بولے خاموشی سے باہر نکل گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

کتنے دن گزر گئے تھے میربجل نہیں آئی تھی۔ نہ فون کیا' نہ ڈپارٹمنٹ میں دکھائی دی۔ بظاہر ازمیر خوش تھے۔ کہ اس سے جان چھٹ گئی۔ لیکن اندر کچھ محسوس ضرور ہو رہا تھا جو وہ سمجھنے سے قاصر تھے۔ یا سمجھ رہے تھے مگر خود کو بہلاتے رہے' انہوں نے کچھ غلط نہیں کیا لیکن خواہ مخواہ میں ایک انتظار سا تھا۔ کتنی بار اس کے ڈپارٹمنٹ کے پاس سے گزرے حالانکہ ادھر کوئی کام بھی نہیں تھا۔ لیکن وہ نظر نہیں آئی تھی۔ یونی میں چند چھٹیاں ہو گئی تھیں۔ خاطر خواہ کام بھی کوئی نہیں تھا۔ رضا حیات نے لڑکوں کے ساتھ مل کر بیچ کا پروگرام بنایا ازمیر نے انکار کر دیا موڈ نہیں ہے۔ پھر خود سرف سٹی کے ساحل پر چلے گئے۔ دل خواہ مخواہ اداس ہو رہا تھا۔ ملبورن سے کچھ ہی فاصلے پر بنا سرف سٹی کا ساحل بہت پرسکون اور گہری جگہ ہے۔ نیلے بحرالکاہل پر ٹھاٹھیں مارتی دودھیا سفید لہریں اس طرح مچلتی ہیں جیسے پانی میں بہت سرف ملا دیا ہو اور پھر اس پانی میں آسمان سے بادل نہانے کے لیے اتر آئے ہوں۔ وہ بہت دیر ساحل پر چلتے رہے' بادل جیسی لہریں ان کے پاؤں سے آ آ کر لپٹتی رہیں۔ تب ہی وہ چونکے تھے۔ ساحل کی سبز کنکریوں والی زمین پر وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی جمائے بیٹھی تھی۔ وہ اسے پیٹھ سے پہچان گئے تھے پہلے تو سوچا رخ موڑیں اور چلے جائیں۔ لیکن باغی دل نے پاؤں جکڑ لیے۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے قریب آئے۔

"ہائے میری کیسی ہو۔۔۔؟" عقب کی آواز پر وہ

ٹھٹکی۔ اس کی گرے آنکھیں بے حد اداس تھیں چہرے پر ویرانیاں اتر آئی تھیں۔

"ریجکٹ شدہ کیسے ہوتے ہیں؟"

"ایسے مت کہو۔" ازمیر کے دل کو دھکا لگا تھا۔

"پھر کیسے کہوں۔" وہ اپنی گیلی شرٹ جھاڑتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ بے چارگی سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

"تمہارا مذہب بہت اونچا ہے' اعلا۔۔۔ وہ مجھے حرام قرار دیتا ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے' میریجل۔"

"پھر کیا بات ہے ازمیر۔۔۔" اس کی آواز یک لخت تیز ہوئی تھی۔ "کرسچنٹی بھی عام مذہب نہیں ہے' اسلام سے پرانا ہے' آفاقی ہے' کیا انکار کرتے ہو؟"

"نہیں۔۔۔ میں انکار نہیں کرتا۔ حقیقتاً" پرانا اور آفاقی ہے۔"

"پھر۔۔۔ پھر اسلام اس کی تردید کیوں کرتا ہے' کیوں کرسچن سے شادی نہیں کرنے دیتا۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں تم سے شادی کرنے پر' ازمیر۔۔۔ لیکن تمہیں ہے۔"

وہ تاسف سے اس کی پھٹتی ڈوبتی آواز کو سنتے رہے پھر پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ اڑستے سفید جھاگ جیسی لہروں پر نگاہ جمادی۔ ازمیر کو اس کے اندر گرتے آنسو بخوبی محسوس ہو رہے تھے۔ سمجھ نہیں لگ رہی تھی وہ کس موڑ پر آچکے ہیں۔ اسے سمجھائیں یا اپنے دل کو۔ بہت مشکل لمحہ تھا مگر انہیں بتانا تو تھا ہی۔

"تمہیں کس نے کہا میریجل' اسلام کرسچنٹی کی تردید کرتا ہے' ہم مسلمانوں کا ایمان تو کامل ہی تب ہوتا ہے جب تمام آسمانی کتابوں' اور رسولوں پر ایمان لے آئیں اور اقرار کریں ان کے مذاہب کا۔۔۔" انہوں نے قدرے توقف لیا "اسلام کسی مذہب کی تردید نہیں بلکہ ان کی تکمیل کرتا ہے' ہر اس ادھورے قاعدے' قانون کی تکمیل جو ادھوری تھی' خاص قوم' خاص علاقے کے لیے تھی اس کی پوری دنیا کے لیے تکمیل۔۔۔ قیامت تک کے لیے تکمیل۔"

وہ چپ تھی اور سینے پر ہاتھ لپیٹے ان کے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ رک رک کر بول رہے تھے۔

"عیسائیت کے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام مبشر رسول ہیں' انہوں نے خود تورات میں آخری الزماں پیغمبر کا نام احمد بتایا تھا' اور یہ بھی کہ وہ آئیں گے اور قیامت تک کا دین لائیں گے۔۔۔ کیا تم تورات نہیں پڑھتیں۔"

سفید لہروں سے نگاہ اٹھا کر اب گرے لہروں میں جھانکا تھا گرے لہریں یک لخت سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔ جہاں تک اسے یاد پڑتا تھا وہ ایک عرصہ سے چرچ نہیں گئی تھی۔ اب صحیح سے یاد نہیں تھا کس کی شادی میں لیکن آخری بار وہ کسی کی شادی میں چرچ گئی تھی۔ پھر اپنی سرگرمیاں ایسی تھیں فرصت ملتی نہیں تھی اور اگر فرصت ملتی بھی اور جاتی بھی تو وہاں کے پوپ عام طور پر وہی چیپٹرز پڑھتے تھے جس میں معاشرتی رہن سہن کا ذکر تھا۔ اور ویسے بھی تورات تو اس نے کبھی پڑھی نہیں تھی۔ البتہ اناجیل کا ہر سال آنے والا نیا ایڈیشن لیڈی ہیلہ خرید لاتی تھیں۔ انجیل یوحنی میں اس نے کسی راہب سے سنا ضرور تھا کچھ ایسا ذکر ہے ضرور مگر کبھی توجہ نہیں دی۔ توجہ بچے دیتے بھی نہیں ہیں انہیں دلوائی جاتی ہے اور یہ کام والدین اور مذہبی رہنما کا ہوتا ہے۔ والدین میں لیڈی ہیلہ کے پاس خود زیادہ معلومات نہیں تھیں اور راہب سے وہ خود خوف کھاتی تھی۔ کیسے تارک الدنیا ہیں۔ اس کی گردن ازمیر کے سامنے خود بخود نفی میں ہلی۔ وہ پھیکا سا تاسف بھرا مسکرائے۔

"اگر کہیں سے پرانا تورات کا نسخہ ملے' تو اسے پڑھو۔۔۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم احمد کے آنے پر دین مکمل ہونا ہے۔۔۔ اور ہو گیا ہے۔ اور ان کی تعلیمات سے تمام دین مکمل ہو گئے ہیں' ایک مکمل چیز سخت کیسے ہو سکتی ہے۔" وہ لمحہ بھر چپ رہے۔ وہ سوچ رہے تھے اسے کیسے دلیل دیں کہ سمجھ جائے کہ وہ اسے ناپسند نہیں کر رہے بلکہ ان کے بیچ ایک بہت بڑا

فرق مذہب کا ہے۔" اور رہا کرسچن سے شادی کا سوال' اتنا تو ہر باشعور شخص جانتا ہے' ادھوری بات کی جگہ کامل تحقیق کو اپنایا جائے' اسے فروغ دیا جائے' تم اس سے انکار نہیں کر سکتیں۔" آخری جملہ انہوں نے تب بولا جب انہیں محسوس ہوا میرہچل کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھول رہی ہے۔

"پانچوں اناجیل اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ مسیح ابن مریم خود گواہی دے رہے ہیں' مگر افسوس تم نے اپنی کتابیں بھی پوری نہیں پڑھیں۔"

ان کے ادھورے انکار پر وہ ٹوٹ رہی تھی' دفعتاً ان کی دونوں بازو تھام لیے اور مضبوطی سے بولی تھی۔

"میں تمہاری خاطر کچھ بھی کر سکتی ہوں' کچھ بھی... اپنا مذہب۔" وہ لمحہ بھر رکی "اپنا مذہب بھی تبدیل کر سکتی ہوں۔" مذہب کی تبدیلی کا خوف اس کے وجود کو لرزا گیا تھا۔

"میری' مذہب کوئی لباس' یا کوئی زیور' دستار نہیں ہے جسے باآسانی' جب چاہو بدل لو' آج جذبات میں آ کر یہ سب کہہ رہی ہو' کل پھر سب پہلا اچھے لگے گا ... اور یہ تبدیل کیا' پھر وہ تبدیل کیا۔" "میں تو بار بار کہہ رہا ہوں تبدیلی نہ' تکمیل' اگر تم مذہب کی تکمیل کر لو تو مجھے بہت خوشی ہو گی..." انہوں نے آہستگی سے اس کے ہاتھ اپنے بازوؤں پر سے ہٹائے۔

"تم جو کہو گے' میں کر لوں گی... تبدیل' تکمیل کچھ بھی... تمہاری خاطر مسلم ہونے کو تیار ہوں۔"

"میری خاطر کیوں...؟ وہ تقریباً" ڈپٹتے ہوئے بولے تھے "اللہ کی خاطر' اپنی عاقبت کی خاطر' حضرت عیسیٰ کی گواہی کی خاطر مجھے گناہ گار مت کرو' میرہچل ... میں تمہیں سمجھا رہا ہوں' مذہب کوئی لباس یا آرائش نہیں آج یہ تو کل وہ... سوچو' سمجھو... رہنمائی لو' جیسے بائبل ریسرچ کرتی ہو' ویسے کرو' ڈاکومنٹری پر وقت لگاتی ہو' ویسے وقت لگاؤ' اللہ سے مدد مانگو' وہ بہتر راہ دکھانے والا ہے۔" وہ کہہ کر تیزی سے واپسی کی جانب بڑھے وہ انہی کی طرح تیز تیز پیچھے آ رہی تھی اس نے ہانک لگا کر پوچھا تھا۔

"پھر تم مجھ سے شادی کر لو گے۔" ازمیر نے کوئی جواب نہیں دیا اس وقت ان کے اپنے اندر شدید کشمکش جاری تھی۔ ایک مذہب ہی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ تو وہ لڑکی پورے دل سے بدلنے کو تیار بیٹھی تھی اور بھی کچھ تھا جو وہ چاہتے ہوئے بھی بتا نہیں پا رہے تھے۔ کیسے بتاتے وہ فیصلہ خود بڑوں نے ان پر ٹھونسا تھا اور اب انہیں بہرحال وہ نبھانا تو تھا۔ ایسے میں اس لڑکی کا کیا کرتے' جو ان کے اپنے دل پر بھی سوار ہوتی جا رہی تھی۔

پھر سے کئی دن گزر گئے تھے۔ میرہچل سے یونی میں ایک دو ملاقاتیں بھی ہوئیں بس سرسری سی۔ کوئی بات نہیں کی نہ اس نے نہ ہی ازمیر نے۔ ایک دن ازمیر نے دیکھا اس نے سر پر ایک اسکارف نما رومال لپیٹ رکھا ہے۔ کندھے پر لٹکتے بیگ کے علاوہ ہاتھوں میں چند کتابیں بھی تھیں۔ وہ کچھ دیر کے لیے ان کے پاس رکی ... باتوں باتوں میں بتایا وہ یہاں سے چرچ جائے گی اور پھر اسلامک سنٹر... اب وہ دین پر ریسرچ کر رہی ہے۔ ازمیر کو سن کر بہت خوشی ہوئی تھی مسکرا کر کہا تھا۔

"میں تمہاری کامیابی کے لیے دعاگو ہوں۔" وہ بھرپور مسکرائی اور اپنی کتابوں کو سینے سے لگاتے ہوئے گردن اٹھا کر بولی۔

"پھر اپنی دعاؤں میں ایک دعا اور شامل کر لو..."

"کیا..." ازمیر کے ابرو اٹھے تھے۔

"یہی... میں مذہب کی تکمیل کے قریب ہوں' بس پھر مجھے ایک مکمل شخص اپنا لے' شادی کر لے مجھ سے۔" ازمیر کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور اس کی آنکھوں میں اندر تک جھانکا تھا۔

"تم مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتی ہو' کتنا جانتی ہو میرے بارے میں۔"

"یہی کہ تم بہت اچھے انسان ہو' بہت اچھے..."

"اچھا..." ان کا جاندار قہقہہ یونی کی بلڈنگ میں گونجا تھا۔ "اور اگر یہ اچھا انسان پہلے سے شادی شدہ ہو... تو؟" لمحہ بھر کے لیے میرہچل کو لگا تھا ساری

بلڈنگ اس پر آ گری ہے۔ وہ ملبے میں دھنس چکی ہے اور اس کی آواز بھی باہر نہیں آ رہی۔ اس کے گہرے آنکھوں میں سیاہ پانی ہلکورے لینے لگا۔ اسے لگا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے، لیکن وہ جھوٹ کو پہچان لیتی تھی اور اس وقت ڈگمگا رہی تھی۔ سب اندازے گڈمڈ ہونے لگے۔ وہ مسلسل اس کا ردعمل دیکھ رہے تھے۔

میرہجل تھوک نگل کر بولی تھی۔

"مجھے آج آخری بار چرچ جانا ہے' یہ بکس رکھنے ـــ" اس نے ہاتھ میں پکڑی کتابوں کی جانب اشارہ کیا "پھر اسلامک سنٹر بھی... دیر نہ ہو جائے' اس لیے چلتی ہوں ـــ" پژمردگی سے کہتی وہ آگے کو بڑھ گئی۔ ازمیر بہت دیر تک اس کی پشت دیکھتے رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ کئی دن سے بہت چڑچڑے ہو رہے تھے۔ بات بات پر رضاحیات سے الجھ جاتے۔ سامنے بھی رضا تھے بچپن سے اسے جانتے تھے۔ آڑے ہاتھوں لے ہی لیا۔

"مسئلہ کیا ہے تیرے ساتھ' کیوں کتوں کی طرح کاٹ کھانے کو دوڑ رہا ہے۔"

"یار مجھے تنگ نہ کر' میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں' دماغ خراب ہو رہا ہے میرا۔"

"تو پھر اس کا علاج کروا ـــ"

رضا کمرے میں بکھری چیزیں ادھر ادھر رکھتے کچن کاؤنٹر کی جانب بڑھے اور دو کپ کافی بنانے لگے "بلکہ ایسا کر' اسے نکال اور باہر سڑک پر پھینک دے۔"

"کسے ـــ؟" ازمیر کو سمجھ نہیں آئی۔

"دماغ کو' جو خراب ہو چکا ہے ـــ نیا پتا کر لینا شاید مل جائے۔" کافی بنا کر ایک کپ انہیں تھمایا ـــ وہ مسلسل اسے تند نگاہ سے گھور رہے تھے۔

"اچھا چل بتا' مسئلہ کیا ہے۔" انہوں نے کرسی کھینچ کر سامنے رکھی اور کرسی کی پشت کی جانب الٹے رخ بیٹھے اپنی ٹھوڑی کرسی کی بیک پر ٹکالی۔

"وہ ـــ میرہجل مسلمان ہو رہی ہے۔" ازمیر نے آہستگی سے کہا۔

"یہ تو خوشی کی بات ہے' تو کیوں شیطان بنا ماتم کر رہا ہے۔" ان کے برجستہ جواب پر ازمیر نے ایسے نگاہ اچکائی جیسے حیرت ہوئی ہو کہ وہ سمجھا کیوں نہیں' جبکہ رضا مزے سے کافی کے سپ لیتے بے فکر دکھائی دے رہے تھے۔

"تو سمجھ کیوں نہیں رہا ـــ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہ رہی ہے۔" ہنسی روکنے کے چکر میں گرم کافی رضا کے حلق میں لگی اور شدید اچھو لگا۔ کچھ دیر بعد سنبھل کر کہنے لگے۔

"یہ جو تو اس کے پیچھے پیچھے پھیریاں کاٹ رہا تھا ناں' اس کا نتیجہ ہے' بھگت اب۔"

"یار ـــ میں کاٹ رہا تھا؟" ان کا لہجہ استفہامیہ تھا۔

"چل' وہ کاٹ رہی تھی' پھر مزے تو' تو لے رہا تھا ناں' روک دیتا اس کے قدم۔"

"بی سیریس یار ـــ"

"سیریس تو پھر یہی ہے ـــ تو اپنے اباجی کو خط ڈال کر بلا' وہ شفقت چیمہ بن کر آئیں اور میرہجل کے سامنے تیری وہ درگت بنائیں کہ وہ کانوں کو ہاتھ لگاتی خود ہی بھاگ جائے۔"

"میں اس قدر پریشان ہوں' تجھے مذاق سوجھ رہا ہے۔"

"تو میں کیا کروں۔" رضاحیات جھنجلا گئے "تو نے جو رنگ پھیلایا ہے نا' اس کا بھگت دیکھ۔"

اکتا کر ازمیر نے پاس رکھا کشن رضا کے منہ پر مارا تھا۔ شکر ہے رضا نے کافی رکھ دی تھی ورنہ کپڑوں پر گرتی۔

☼ ☼ ☼

صبح کے ابتدائی پہر تھے جب میرہجل کی انہیں کال آئی وہ ازمیر کو ابراہیم اسلامک سنٹر وکٹوریہ میں بلا رہی تھی۔ وہ ہلکے پھلکے تیار ہو کر چلے گئے۔ انہوں نے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا وہ سرخ قالینوں کے فرش پر

چوکڑی مارے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے روبرو مولانا صاحب بیٹھے تھے۔ میریجل نے چوڑا سا مفلر اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ ازمیر آہستہ آہستہ چلتے اس سے چند قدم پیچھے بیٹھ گئے۔ مولانا صاحب اس کو آہستہ آواز میں کچھ سمجھا رہے تھے۔ وہ اثبات میں سر ہلاتی رہی۔ پھر ازمیر کے کانوں نے اس کی انوکھی آواز سنی تھی۔ آج تک وہ ان سے انگریزی میں بات کرتی آئی تھی لیکن اس وقت عربی میں کلمہ شہادت پڑھتے بے حد مختلف لگ رہی تھی البتہ لہجے میں وہی انگریزی زبان کے جھٹکے ضرور تھے۔ کلمہ دہرانے کے بعد مولانا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور نام پوچھا تھا۔ پیچھے سے ازمیر بولے تھے۔

"مریم۔" اس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ اسے امید نہیں تھی ازمیر آئے گا اور اب انہیں وہاں دیکھ کر اندر تک سرشار ہو گئی تھی پورے دل سے مسکرائی اور مولانا سے کہا۔

"مریم... مریم آسکر نام ہے میرا۔" وہ بہت سی دعائیں دیتے وہاں سے اٹھ گئے وہ دونوں بھی اٹھ کر باہر کی جانب چلے گیٹ کے قریب مریم نے رک کر کہا تھا۔

"اگر کوئی اچھا انسان پہلے سے شادی شدہ ہو' تب بھی مجھے کوئی مسئلہ نہیں۔" وہ کہہ کر رکی نہیں۔ فیصلہ ازمیر پر چھوڑ گئی۔

☼ ☼ ☼

بڑے بڑے فیصلے کبھی آسان نہیں ہوتے۔ گھروں کے در و دیوار ہلا دیتے ہیں۔ رہنے والوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ لیڈی ہیلا کا گھر بھی ہل کر رہ گیا تھا۔ انہیں اتنا تو معلوم تھا ہی ان کی بیٹی میریجل لاڈ میں ضدی' جلد باز ہے لیکن اتنا اندازہ نہیں تھا کہ وہ ضد میں اتنا بڑا قدم اٹھا سکتی ہے۔ کہ اپنا مذہب ہی بدل لے' صرف اور صرف ایک لڑکے کی محبت میں۔ وہ کروفر سے بھری اس پر چیخ چلا رہی تھیں۔ فلوریہ اسے مارنے کو چڑھ دوڑ رہی تھی۔ جبکہ وہ اطمینان سے کرسی کی پشت پر سر ٹکائے آنکھیں مونڈے بیٹھی رہی۔

"ہم تم سے کہہ رہے ہیں میریجل' تم برباد ہو جاؤ گی' تم نے یسوع مسیح کو ناراض کیا ہے' ان کی تعلیمات کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو فوقیت دی' تمہارے لیے زمین تنگ ہو جائے گی۔

"تم سن رہی ہو میریجل..." فلوریہ کے جھنجوڑنے پر اس نے آرام سے آنکھیں کھول دیں اور مسکرائی۔

"میریجل نہیں' مریم۔" اس کے قطعیت بھرے انداز پر فلوریہ قدرے نرم پڑ گئی۔

"ٹھیک ہے مریم۔ اگر تم مریم نام رکھنا چاہتی ہو تو ضرور رکھو' بہت خوب صورت نام ہے مریم' یسوع کی ماں تھیں مریم... لیکن خدا کے لیے خود پر ظلم مت کرو' مذہب بدل کر خود کو پستی میں مت ڈالو۔"

"میں فیصلہ کر چکی ہوں اور میں نے بدلا نہیں' تکمیل دین کی ہے۔" وہ کہہ کر جھٹکے سے اٹھی "یہ میری زندگی کا معاملہ ہے' تم لوگوں کو کیا مسئلہ ہے۔" "مسئلہ ہے۔"

لیڈی ہیلا اس کے قریب آئی تھیں "کیوں کہ ہم تم سے محبت کرتے ہیں' تمہیں برباد ہوتا کیسے دیکھ سکتے ہیں۔" وہ بے وفا ہے' چھوڑ کر چلا جائے گا... میری' محجوبات کو۔"

"اگر یہ میری بربادی ہے' تو مجھے یہ بربادی دل سے قبول ہے۔"

"لیکن ہمیں قبول نہیں ہے۔" فلوریہ زور سے دھاڑی تھی "وہ کون ہوتا ہے تمہیں برباد کرنے والا' اگر تمہیں اس کے غم میں مرنا ہے تو ہم خود کیوں نہ تمہیں مار دیں' میں خود تمہیں مار دوں گی' مگر گھٹ گھٹ کے مرتا نہیں دیکھ سکتی۔" فلوریہ پاؤں پٹخ کر کمرے سے باہر نکل گئی جاتے جاتے دروازہ زور سے مار گئی تھی۔ لیڈی ہیلا سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

تقریباً" شام کا وقت تھا وہ اچھی بھلی کچھ دیر کو سو کر اٹھی تھی اور فلوریہ نے روٹین کی طرح کافی بنا کر دی۔ اس کا کپ خالی ہوتے ہی اسے غیر معمولی پن کا احساس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

ہوا تھا۔ اس کی طبیعت شدید متلا رہی تھی سر بھاری ' آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا۔ اس نے سانس کھینچ کھینچ کر لینی چاہی جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو ' بمشکل زور سے کھانسی آنے پر لیڈی ہیلہ جو آرام کرسی پر بیٹھی سوئیٹر بن رہی تھیں متوجہ ہوئیں۔ میربجل کا متغیر چہرہ ' ابلتی آنکھیں دیکھ کر جھٹکے سے کرسی سے اٹھیں۔ اون سلائیاں ' ہاں ہی پڑی رہ گئیں۔

"میری۔۔۔ کیا ہوا تمہیں؟" وہ اپنا گلا دونوں ہاتھوں سے تھامے زور لگا کر کھانسنے کی کوشش میں تھی کچھ فاصلے پر کاؤچ کے اوپر پاؤں کیے فلوریہ اکڑوں بیٹھی تھی اپنا سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا جیسے جیسے لیڈی ہیلہ ' میربجل کی آوازیں بدل رہی تھیں ویسے ویسے اس کا سر مزید گھٹنوں میں چھپتا ' اور بدن لرزنے لگتا۔ لیڈی ہیلہ نے اسے آواز دی کہ وہ آئے ' بہن کو دیکھے مگر فلوریہ کے لرزنے میں تیزی آگئی۔

"میری۔۔۔ میری۔" ایک دم میربجل کو زور سے کھانسی کے ساتھ قے آئی تھی۔ "فلوریہ دیکھو میری کو کیا ہو رہا ہے۔۔۔ ڈاکٹر کو کال کرو۔۔۔ بلاؤ کسی کو۔" فلوریہ نے کانوں پر ہتھیلیاں جمالیں آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ آخر لیڈی ہیلہ نے ہی لڑکھڑاتی میربجل کو کرسی پر بیٹھایا خود ایمبولنس کو کال کی۔ وہ قے پر قے کرتی نڈھال ہو رہی تھی تب فلوریہ کانپتے ہوئے ماں سے بولی۔

"مت بلاؤ کسی کو۔۔۔ کچھ دیر میں اس کی تکلیف ہٹ جائے گی۔ میں نے کافی میں زہر ملا دیا تھا۔۔۔ یہ مر جائے گی۔"

"کیا کہا۔۔۔" لیڈی ہیلہ کی آواز اور آنکھیں دونوں غصے سے پھٹ گئیں "کیا کہا تم نے۔۔۔ تم نے اپنی میری کو زہر دے دیا۔۔۔ ایسا تم کیسے کر سکتی ہو۔"

فلوریہ کے رونے میں تیزی آگئی تھی گھٹی گھٹی آواز میں ایک ہی بات کیے جا رہی تھی۔ "میں اسے برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتی ' میں نے اسے زہر دے دیا۔"

فلوریہ کی بہت سی دوست ایسی تھیں جنہوں نے ایشین لڑکوں سے شادی کی بعد میں وہ چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کی اپنی خالہ لیڈی ہیلہ کی بہن نے بھی ایک پاکستانی سے شادی کرنا چاہی تھی اور انکار پر وہ پہاڑ سے کود کر مر گئی تھی۔ فلوریہ کے ذہن میں یہ بات بیٹھ چکی تھی ازمیر یا تو میری کو دھوکا دے گا ' یا میری اس کی محبت میں پاگل ہو جائے گی کیوں نہ وہ خود ہی اپنی بہن کو مار دے۔ اور اس وقت وہ اس کی موت قریب دیکھ کر شدید اذیت سے گزر رہی تھی۔ ایمبولنس آچکی تھی۔ لیڈی ہیلہ ورکرز کے ساتھ مل کر میربجل کو اسپتال لے گئیں۔

بہت زیادہ قے آجانے سے وہ غنودگی میں جا رہی تھی لیکن ایک فائدہ ہوا تھا اندر کا بہت سا زہر نکل چکا تھا۔ معدہ واش ہونے پر وہ خطرے سے باہر تھی۔ ڈاکٹرز کو لیڈی ہیلہ نے یہی بتایا تھا۔ فارسٹ سے کوئی زہریلی جڑی بوٹی کھا لینے سے ایسا ہوا ہے ' کیوں کہ رپورٹس میں واضح زہر کی قسم آگئی تھی۔ انہوں نے فلوریہ کا نام پولیس سے تو بچا لیا تھا مگر ڈر تھا کہ میربجل نہ بتا دے لیکن وہ بھی چپ رہی اور پر شکوہ نگاہ سے ماں کو دیکھتی رہی۔ فلوریہ بھی اسپتال آچکی تھی اور اس پر جھکی رو رہی تھی۔ مریم نے اس کی جانب سے رخ پھیر لیا۔

ازمیر کو مریم نے فون کر کے سب بتایا تھا تب تک وہ گھر آچکی تھی۔ وہ فوراً ہی اس سے ملنے آئے تھے فلوریہ کا جی چاہا تھا ازمیر کے ٹکڑے کر دے جس نے اس کی ہنستی کھیلتی بہن کو پاگل بنا رکھا تھا۔ مگر وہ ایسا کچھ نہ کر سکی۔ کیوں کہ ان کے آجانے سے میری بہت حد تک کھل گئی تھی۔ ازمیر بہت دیر اس کے پاس بیٹھے رہے۔ آہستہ آہستہ اپنے بارے میں سب بتایا تھا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی آخر میں ان کے ہاتھ مضبوطی سے تھام لیے۔

"مجھے سب منظور ہے ' میں صرف جینا ہی نہیں ' مرنا بھی تمہارے ساتھ چاہتی ہوں۔"

✡ ✡ ✡

وہ آج بہت دل سے تیار ہو رہے تھے۔ آئینے کے

سامنے کھڑے بال بنائے' کف لنکس بند کرکے اپنے اوپر اسپرے چھڑکا تھا۔ رضاحیات پیچھے کھڑے انہیں تنقیدی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ ازمیر نے اپنا ارادہ سب سے پہلے رضا کو ہی بتایا تھا اور وہ بالکل بھی نہیں چونکے انہیں پہلے ہی یقین تھا ایسا ہوگا۔ بلکہ انہوں نے تو کئی بار ازمیر سے کہا بھی تھا۔

"تو جھوٹ بولتا ہے صرف وہ تجھ سے محبت کرتی ہے' وہ تو بے چاری اظہار کرتی ہے تو منافق ہے' جو چھپا لیتا ہے۔" جب انہوں نے منافقت چھوڑی تو رضا بہت دیر انہیں دیکھے گئے پھر پوچھا۔

"اور ہاجرہ... اس کا کیا کرے گا اور مریم کو پتا ہے اس کا؟"

"ہاں... میں بتا چکا ہوں... اسے اعتراض نہیں۔"

"ایک بار پھر سوچ لے... چچا میر علی کا غصہ..."

"میں سوچ چکا ہوں' جو سوچنا تھا۔"

وہ فیصلہ کرچکے تھے اور فیصلوں سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ اپنے گھر والوں کو پیشگی اطلاع دے کر تو اپنے گلے مصیبت ڈالنا تھی۔ جب مریم پسند ہے تو پھر پسند ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے جاب تلاش کی۔ رہائش کے لیے علیحدہ فلیٹ دیکھ چکے تھے۔ سب کام ہوجانے کے بعد اپنا سامان سمیٹ آج نکاح کے لیے جارہے تھے۔ رضاحیات کے علاوہ کمیونٹی کے دو تین اور لڑکے بھی ان کے نکاح میں شامل ہوئے۔ اسلامک سنٹر ملبورن میں مریم اپنی جانب سے اکیلی آئی تھی۔ لیڈی ہیلدا اور فلوریہ نے بہت سمجھایا۔ جب وہ کسی صورت نہ مانی تو انہوں نے صاف کہا تھا۔

"ٹھیک ہے جاؤ' اپنی مرضی کرو... مگر کبھی ہمیں یہ مت بتانے آنا وہ چھوڑ گیا ہے' یا تم پاگل ہوگئی ہو۔"

ازمیر اس کے لیے سرخ کامدار قمیص شلوار لائے تھے۔ سرخ دوپٹا لپیٹے وہ بے حد پیاری لگ رہی تھی خوشی اس کے رخساروں' آنکھوں سے بے طرح چھلکتی تھی۔ نکاح نامے پر دستخط کرتے اس کی آنکھیں ناقابل یقین مسرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ مشرقی لباس میں ضرور تھی مگر ادا مشرقی نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

ازمیر' مریم کی کلائی تھامے تیز تیز ڈیپارچر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ روائیبہ اپنے گلابی ہونٹ دانتوں میں بھینچے' سوچی سوچی آنکھوں سے انہیں دور جاتے دیکھتی رہی۔ جیسے ہی وہ دونوں ڈیپارچر کی لائن میں گم ہوئے۔

"ڈیڈی... ممی... پلیز۔" اس نے چلاتے ہوئے قدم ان کی جانب بڑھائے تھے جندب نے سرعت اس کی کلائی تھامنا چاہی اس نے غرا کر اسے ایسے دیکھا جیسے ممی ڈیڈی کو جندب نے ہی بھیجا ہو۔

"یو..." اس نے انگشت اٹھائی تھی جندب نے ہاتھ سے نیچے کردی۔

"بس کرو' کیا تماشا لگا رہی ہو' اب تم کوئی چھوٹی بچی نہیں ہو' جو ایسے پوز کرو۔"

اس کے غرانے کی پروا کیے بغیر اس نے اس کی کہنی مضبوطی سے تھامی اور خارجی حصے کی جانب تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اسے خواہ مخواہ ہی غصہ آگیا تھا۔ دراصل ٹک شاپ پر کھڑے دو کورینز روائیبہ کے ردعمل سے محظوظ ہوتے خوب مسکرا مسکرا کر اسے دیکھ رہے تھے۔ اس نے اس کی کہنی گاڑی کے پاس لاکر چھوڑی تھی۔ دروازہ کھول اسے پٹخنے کی صورت اندر کیا... پھر زن سے گاڑی دوڑا دی... اس کے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ دو تین بار جندب نے ناگواری سے اسے دیکھا پھر ٹشو کھینچ کر اسے پیش کیا۔ اس نے غصے میں اس کے ہاتھ سے ٹشو پکڑنے کے بجائے خود دوسرا کھینچا اور ہونہہ کے انداز میں رخ کھڑکی کی جانب موڑ لیا۔ اس نے اس کی گود میں ٹشو پھینک دیا تھا۔

"نہیں لیتی نہ لو... میں بھی اتنی آہستہ گاڑی چلاؤں گا' تاکہ تمہاری آنکھوں کا سارا پانی یہاں ہی بہہ جائے۔" اس کے رونے میں تیزی آگئی۔

"کیا مصیبت ہے یار۔" اس نے اسے کندھے سے پکڑ کر اپنی جانب گھمایا وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

"کیوں رو رہی ہو اس طرح' کوئی وہ پہلی بار تو یوں کہیں نہیں گئے۔ لاسٹ ایئر بھی تمہارے پیپرز تھے اور انکل کو وانا جانا پڑ گیا تھا' آنٹی ساتھ گئی تھیں اور تم دو دن ہوسٹل رہیں' تب تو یہ ڈرامے نہیں لگائے۔" وہ بالکل نہیں سن رہی تھی۔ "وہ تو تمہیں لے کر جا رہے تھے' تم خود نہیں گئیں۔۔۔ اب رونے کا مقصد۔" روائیبہ کی رندھی ہوئی آواز بمشکل نکلی تھی۔

"جندب۔۔۔ مجھے لگ رہا ہے' وہ مجھے بھول جائیں گے۔"

"انسان اپنے دکھوں کو کبھی نہیں بھولتا' بی بی۔۔۔"

اس کی استہزا میں لپٹی برجستگی پر روائیبہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ پلکوں سے قطرے ٹوٹ رہے تھے گلابی ہونٹوں پر مسکان' اس نے صرف اس کے رخسار دیکھے تھے۔ بھیگے مسکراہٹ میں پھیلے۔

"ایسے ہنسا کرو' خواہ مخواہ میں رو رو کر میرا دماغ خراب کر رہی ہو۔۔۔ پیزا کھانا ہے؟" اس کے پوچھنے پر روائیبہ نے صاف انکار کر دیا "نہیں۔"

"پھر میرا سر کھالو۔" وہ زچ ہو گیا تھا۔

اس نے گاڑی ایک آئس کریم پارلر کے سامنے روکی اتر کر دو کورنیٹو لے آیا تھا۔ ہلکی پھلکی باتیں کر کے جندب اس کا موڈ کافی حد تک بہتر کر چکا تھا۔ جب وہ گھر پہنچے لینا فیڈرک پہلے ہی ادھر موجود تھیں۔ جندب کو بھی اب کافی تسلی ہو گئی تھی۔ کیوں کہ بڑھاپے کے باوجود لینا کی عادت بہت اچھی تھی۔ ہر عمر کے بندے کے ساتھ گھل مل جاتی تھیں۔ روائیبہ کو بھی جانے کون کون سے قصے سناتی رہیں۔ جندب واپس ہاسٹل چلا گیا۔ جاتے جاتے کہہ گیا تھا۔ "کوئی بھی مسئلہ ہو کال کر لینا۔" بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو جاؤں گا۔"

☆ ☆ ☆

ان کے نکاح کو ہفتہ ہونے کو تھا۔ ازمیر نے اسی بلڈنگ میں لینا فیڈرک سے دوسرا فلیٹ لے لیا تھا اتنی تنخواہ تھی کہ وہ دو افراد کو سپورٹ کر سکیں پھر میر علی بھی اچھی خاصی اماؤنٹ ان کے اکاؤنٹ میں ڈلوا دیتے تھے۔ جاب تو ازمیر نے حفظ ماتقدم کے طور پر کی تھی۔ کسی بھی صورت میں اگر میر علی خرچ روک دیں تو کم از کم ان کی بیوی کو پریشانی نہ ہو۔

وہ ہنی مون کے لیے آسٹریلیا کی ریاست گولڈ کاسٹ آئے تھے۔ یہ ملبورن کے نواح میں سبز پہاڑوں سے گھری ریاست تھی چاروں جانب اونچے پہاڑی جنگلات اور درمیان سے بہتا بحرالکاہل کا پانی اتنی ہریالی میں بالکل سبز لگتا تھا۔ شام اترتے ہی تمام ہوٹلز کی بتیاں جل جاتیں ان کا عکس سبز پانی میں ننھے ٹمٹماتے دیوں کی طرح تیرتا تھا۔ انہوں نے اپنا کمرہ "رمادا" ہوٹل میں بک کروایا تھا۔ کمرے کی قد آدم گلاس وال سے بیڈ پر بیٹھے ہوئے بھی سبز پہاڑوں میں گھرا "سرفیس پیراڈائز" کا رومانٹک ساحل دکھائی دیتا تھا۔

ملبورن میں مقیم اکثر نئے شادی شدہ جوڑے گولڈ کاسٹ کے سرفیس پیراڈائز پر ہنی مون منانے آتے ہیں۔ سرفیس پیراڈائز کے سبز پانی پر رات کو تیرتی چھوٹی چھوٹی کشتیاں جن کی تزئین رومانوی انداز میں پھولوں سے کی جاتی ہے۔ تیرتی بے حد دلکش لگتی ہیں سیاہی کو چھوتے مست ہوا کے جھونکے' پھولوں کی مہک اور ساحل کے اطراف بنے ہوٹلز کی بتیاں' گونجتی ہلکی موسیقی۔ اچھے بھلے انسان کو جنت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ازمیر نے رمادا ہوٹل میں کمرے کی بکنگ مریم کے کہنے پر کروائی تھی۔ ساحل سے اٹھ کر کچھ دیر پہلے ہی وہ اپنے کمرے میں آئے تھے۔ مریم اوپر پاؤں کیے' بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے' کیم کورڈر پر کچھ دیر پہلے بنائی گئیں تصاویر دیکھ رہی تھی۔ ازمیر نے دو کپ کافی بنائی۔ ایک کپ اسے تھما کر۔ اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئے تھے۔ کشتی میں بیٹھتے ہوئے مریم کے خطرناک ارادے بھانپ کر' آج ازمیر نے اس سے وعدہ لیا تھا۔

"آج کے بعد تم کوئی ایسا ایڈونچر نہیں کرو گی جس سے جان کو خطرہ ہو۔" وہ گھر کا۔

"صحیح کہہ رہا ہوں' نا سائیکلنگ' نا چٹانوں پر

کرتب اور ناہی رش ڈرائیونگ۔۔۔ سمجھیں۔" مریم کا اونچا قہقہہ گارڈینا کے پھولوں نے سنتے ہی اپنی مہک بڑھانے کا سوچا ہو گا۔

"موت سے ڈرتے ہو۔۔۔؟"

"موت سے نہیں، تمہیں کھونے سے ڈرتا ہوں۔"

"اچھا۔۔۔! مریم کو اچنبھا ہوا "بے فکر رہو تمہیں تنہا چھوڑ کر میں کہیں نہیں جانے والی۔"

"تنہا جانے دوں گا، بھی نہیں۔" یہ جملہ اسے سرفیس پیراڈائز سے بھی زیادہ دلکش لگا تھا وہ تقریباً" اس کی گہری آنکھوں میں جھکتے ہوئے بولی تھی۔

"کیا، مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔۔۔" وہ اسی کے انداز میں جھکتے قطعیت سے کہہ رہے تھے۔

"اگر تم سے محبت نہ ہوتی، تو دنیا کی کوئی طاقت نہیں تھی، مجھے تم سے شادی پر مجبور کر دیتی!" یہ جملہ مریم کے لیے حیران کن تھا۔ اب تک وہ یہی سمجھتی آئی تھی شاید اس کی محبت، جنون کے آگے ازمیر نے ہار مان لی، لیکن انہوں نے تو ہار اپنے دل سے مانی تھی۔ وہ خوشی سے بھر گئی تھی نیا نیا کیا وعدہ بھول اپنا کیم کورڈ اٹھا کر تیزی سے اچھلتی کشتی کے تکون سرے پر چڑھی تھی۔ ازمیر اسے پکڑنے کو ہونق زدہ سے بڑھے تھے اور اس نے کیمرے میں محفوظ کر لیا تھا۔ اس وقت وہ وہی تصویر دیکھتے زور سے ہنس رہی تھی۔

"تم ڈر گئے تھے، کشتی ڈوبنے لگی ہے۔"

"میں ڈر گیا تھا، تم سمندر میں ڈوبنے لگی ہو۔۔۔"

انہوں نے اس کا کان ہلکا سا کھینچتے ہوئے تصحیح کی۔ وہ بے طرح سے لوٹ پوٹ ہوتی ازمیر کے کندھے سے جا لگی۔ دفعتاً" ان کا موبائل کمرے میں گونجا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اٹھایا، چمکتی اسکرین پر "اباجی کالنگ" گرج رہا تھا۔ وہ عام طور پر اس وقت کال کرتے تھے جب آسٹریلیا میں صبح ہو۔ اس وقت یوں اچانک انہوں نے سوچتے ہوئے کال اٹینڈ کی۔ سلام کیا تھا جواب میں میر علی کی آواز گرجی۔۔۔

"تم کہاں ہو اس وقت؟"

"جی۔۔۔!" وہ سٹپٹا گئے تھے۔

"اگر سمجھ میں نہیں آیا تو دہرا دیتا ہوں۔۔۔ تم وہاں پڑھنے گئے تھے یا رنگ رلیاں منانے۔۔۔ ازمیر مجھے دو ٹوک الفاظ میں جواب چاہیے، جو کچھ میں سن رہا ہوں، وہ صحیح ہے یا غلط۔"

لمحہ بھر کے لیے ازمیر کا دماغ سن سا ہو گیا تھا۔ انہیں پورا اعتماد تھا رضا حیات کم از کم ان دوستوں میں سے نہیں ہیں جو دوست کو نیچا دکھانے کے لیے شکایتوں کا سہارا لیں۔ پھر یہاں ایسا کون ہے جس نے فوراً" اطلاع دے دی۔ جھماکے کی صورت یاد آیا تھا چک جنوبی کے چوہدری کا بیٹا بھی انہی کی بلڈنگ میں رہتا تھا اور دو دن پہلے جب مریم اور وہ گولڈ کاسٹ کے لیے نکل رہے تھے تب وہ سیڑھیوں پر ملا تھا۔ حال احوال پوچھتے ہوئے اس نے اپنی رات کو پاکستان روانگی کا بتایا تھا اور مریم کے بارے میں پوچھا تھا۔ ازمیر نے چوری تو کی نہیں تھی، جو چھپائے نہ یہ گمان تھا۔ سرسری انداز میں بتائی گئی بات اسے اتنا بے کل کر دے گی کہ پاکستان جاتے ہی سب سے پہلے یہ بتانے جائے گا کہ آپ کے فرزند نے بیاہ رچا لیا۔ وہ تذبذب میں تھے کہ میر علی کی دوبارہ آواز گونجی۔ انہیں پورا یقین تھا ان کا یہ بیٹا ہرگز جھوٹ نہیں بولے گا۔ جو سچ ہو گا بتا دے گا یا خاموش رہے گا۔ اسی لیے زور سے دہرایا گیا۔

"کیا سوچنے لگے، کیا پوچھ رہا ہوں۔۔۔ وہ سچ ہے یا جھوٹ ہے۔"

"سچ ہے اباجی۔"

"لعنت ہے تم پر ازمیر۔ لعنت۔۔۔ تم نے عیسائی سے شادی کر لی۔"

"وہ عیسائی نہیں ہے، مسلم ہو گئی ہے۔" مسلم لفظ پر مریم کے کان کھڑے تو ہوئے تھے مگر اسے اردو واضح سمجھ نہیں آتی تھی۔ انڈین مسلم کمیونٹی میں اٹھنے بیٹھنے سے کچھ لفظ پتا تو تھے مگر جملے نہیں آتے تھے۔ ازمیر کا لہجہ، انداز اسے تشویش میں مبتلا کرنے لگا۔

"بہت اچھی طرح جانتا ہوں، اسے اور اس کے اسلام کو۔۔۔ جو دینا ہے، جلد از جلد دے دلا کر فارغ کرو

۔ اور فوراً "پاکستان آجاؤ' جتنا پڑھنا تھا پڑھ چکے ہو تم ۔۔۔" وہ گرج کر بولے تھے ازمیر کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

"کیا مطلب۔۔۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔ وہ بیوی ہے میری۔"

"اور جو یہاں تمہاری منتظر ہے۔۔۔ اسے بھول گئے ہو کیا؟"

ازمیر نے جب آسٹریلیا آنے کے لیے بے حد ضد کی۔ میر علی تو کسی صورت مان کر نہ دیتے تھے ان کے نزدیک پڑھا تب جاتا ہے جب نوکریاں کرنی ہوں' پھر اتنی مشکل پڑھائی کا تو مقصد ہی دیار غیر کی تاحیات خاک چھاننا ہے۔ وہ کسی صورت نہیں مان رہے تھے۔ انہیں پورا یقین تھا کہ ازمیر گوریوں کے چکر میں پڑ جائے گا۔ اتنا پڑھ لکھ جائے گا تو خاندان کی تو پسند آنے سے رہی' باہر رہے گا تو شادی بھی اپنے جیسی سے کرے گا ان سب کا حل میرزکا نے نکال لیا تھا۔ ان کی چھوٹی سالی کنواری تھی انہوں نے ہی میر علی کو مشورہ دیا۔

"اس کا نکاح کردو' پاؤں بندھے ہوں گے لازمی واپس آئے گا۔" ماں جان سنتے ہی چپ کر گئی تھیں۔ انہیں پتا تھا ازمیر کسی صورت نہیں مانے گا۔ ہاجرہ شکل و صورت میں تو بہتر تھی مگر اسکول کی شکل تک نہیں دیکھ رکھی تھی۔ ازمیر کی تو باتوں سے ہی لگتا تھا اسے پڑھی لکھی لڑکی چاہیے۔ ازمیر ماں کے اندازے کے مطابق بھڑک گئے۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔ مجھے یہ سب سمجھ میں نہیں آرہا۔۔۔"

"تمہیں آسٹریلیا جانا ہے یا نہیں۔" میرزکا دو بدو کھڑے ہوگئے تھے۔

"کیا یہ سودے بازی ہے۔"

"دیکھو ازمیر' ابا جی کسی صورت راضی نہیں تمہیں وہاں بھیجنے پر وہاں کا ماحول بہت خراب ہے' یہ تو میرا مشورہ ہے۔ جس پر وہ راضی ہوگئے ہیں۔"

"کیوں' نکاح تعویز ہے' جو وہاں کے ماحول سے بچالے گا۔" انہوں نے غصے سے گردن جھٹکی تھی۔ تیزی سے باہر نکل گئے تب ہی میر علی ہال کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ ان پر نظر پڑتے ہی۔ قطعیت سے کہا تھا۔

"کل شام تمہارا نکاح ہے' زاہد سے بات کرلی ہے میں نے۔" وہ کہہ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے تھے۔ ازمیر بہت دیر وہاں کھڑے جلتے کلستے رہے پھر پچھلے صحن کی جانب بڑھے جہاں ماں جان گھر کی جھاڑ پونچھ کروا رہی تھیں۔

"یہ سب کیا ہے۔۔۔ کیوں نہیں آپ کچھ بولتیں۔" ان کے پکارنے پر وہ چونکیں وہ مسلسل شکایتی انداز میں برس رہے تھے "جو اباجی اور زکا بھائی کے جی میں آ رہا ہے' میری زندگی کے ساتھ کر رہے ہیں' اور آپ چپ ہیں۔ کیوں' میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں۔۔۔ کیوں نہیں بولتیں میرے لیے۔"

"کیا بولوں ازمیر تو میری سن رہا ہے۔"

"کیا سنوں' سمجھائیں مجھے' خواہ مخواہ میں ایک لڑکی کو باندھ جاؤں اپنے ساتھ۔"

"لڑکیوں کے نصیب میں بندھنا ہی لکھا ہوتا ہے۔" ماں جان کے سرد انداز پر انہوں نے تنفر سے سر جھٹک کر "ہونہہ" کہہ کر رخ پھیر لیا۔ ماں جان ان کے سامنے آگئیں۔

"میری بات سن ازمیر۔۔۔ ہاجرہ بہت اچھی ہے' سلجھی' سگھڑ' ایک تعلیم نہیں ہے تم پڑھالینا۔"

"مجھے نہیں کرنا' ابھی' نکاح شادی۔۔۔ آپ کہیں انہیں۔"

"خدا کے واسطے میرے بچے۔" وہ بے چارگی سے اسے تک رہی تھیں "تیرا باپ پہلے ہی کہتا ہے' میں نے تجھے بگاڑ رکھا ہے' کیوں تجھے ذلیل کروانے پر تلا ہے' میر علی نے اگر کہہ دیا ہے' کل شام تیرا نکاح ہے' تو میں اسے نہیں روک سکتی تجھے اللہ کا واسطہ دے سکتی ہوں۔"

ماں کے جڑے ہاتھ دیکھ کر ان کا غصہ جھنجلاہٹ میں بدل گیا تھا۔ ان کے ہاتھ چومے سامنے سے ہٹ

گئے۔ وہ دن مکمل خفگی کا اظہار کرنے کے باوجود نکاح پر راضی ہو گئے تھے۔ اور جب آسٹریلیا آنے سے کچھ دن پہلے انہوں نے ماں جان سے کہا۔

"مجھے ہاجرہ سے ملنا ہے۔"

"کیا۔۔۔" ماں جان نے شاید صحیح سنا نہیں تھا یا حیرت میں تھیں۔ کچھ فاصلے پر بیٹھی سلمٰی (میرزکا کی بیوی) کی آنکھیں بھی حیرانگی سے ابلیں۔

"کیا کہہ رہا ہے تو۔" ماں جان حیرت سے بولیں۔

"یہی، مجھے ہاجرہ سے ملنا ہے، کیوں مل نہیں سکتا۔۔۔ نکاح ہوا ہے اس سے" ماں جان نے جواب طلب نگاہ سلمٰی پر اٹھائی۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا تھا۔ اور بہت آہستگی سے بولیں۔

"نکاح ہوا ہے، رخصتی نہیں ہوئی ازمیر، میرے بھائی بالکل نہیں مانیں گے، نہ ہاجرہ راضی ہو گی۔"

"کیوں میں کھا جاؤں گا اسے، نکاح پر تو وہ سب مان گئے تھے۔"

"خدا کے لیے ازمیر۔" ماں جان نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا "کیوں اتنا ضدی، اکھڑ بنا ہے، تیرے باپ کو پتا چل گیا تو وہ۔"

"میرے ٹکڑے کر دیں گے، تو کر دیں۔۔۔ ہونہہ۔" وہ درمیان سے بات اچک کر بولے۔

ہاجرہ بہت کم بہن کی طرف آیا کرتی تھی چادر میں ملفوف ڈری جھجکی لڑکی کو وہ ہاجرہ کے طور پر جانتے تو تھے لیکن کبھی بغور نہیں دیکھا تھا۔ اگر تب وہ اس سے مل لیتے شاید رشتے میں محبت کے جذبات پیدا ہو جاتے۔ مگر ہمارے شرم و حیا کے اکثر رواج شرع سے ٹکرا جاتے ہیں شرع میں دو نامحرموں کی ملاقات کی شرط نکاح ہے جبکہ معاشرے میں رخصتی۔ آسٹریلیا آنے کے بعد ان کے دل میں اس کاغذی رشتے کی محبت تو نہیں تھی البتہ احساس ضرور تھا کہ اس رشتے کو اب نبھانا ہے۔ جیسے بھی جس طرح بھی۔ نا اپنے نکاح کو مریم سے چھپایا تھا اور نہ خود کو کبھی بھولنے دیا تھا۔ لیکن میر علی کی گونجتی آواز پر وہ اچھے خاصے تذبذب کا شکار ہو گئے تھے۔

"میں کیوں بھولنے لگا ہاجرہ کو۔۔۔ میں ان دونوں میں توازن رکھ سکتا ہوں، مریم کو بھی پاکستان لے آؤں گا۔"

"بکواس بند کرو اپنی، اور جلد از جلد فارغ کرو اسے۔"

"میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ بیوی ہے وہ میری۔۔۔" انہوں نے ٹھوس انداز میں کہتے ہوئے ایک اچٹتی نگاہ قریب بیٹھی مریم پر ڈالی۔ جو خوف، الجھن کے ملے جلے تاثر سے ان کے بدلتے رنگ کو دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے اعتماد سے اس کے کندھوں پر ہاتھ پھیلایا اور قدرے قریب کر لیا تھا۔ مریم کی اٹکی سانس بحال ہوئی تھی غیر ارادا "اس کا سر کندھے پر رکھے ازمیر کے ہاتھ پر جھک گیا تھا۔

"کیا کہا تم نے۔۔۔ اسے نہیں چھوڑو گے۔۔۔ تو ٹھیک ہے، پھر ہاجرہ کو طلاق دو۔۔۔ ابھی، اسی وقت۔" باپ کے سفاک انداز پر وہ اچھے خاصے گھبرا گئے تھے۔

"آپ ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں۔۔۔ ابا جی آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"اب تم سمجھاؤ گے مجھے، ناخلف۔۔۔" ان کی دھاڑ سے حویلی کے درو دیوار کانپ گئے تھے۔ "میں کہہ رہا ہوں، ابھی اور اسی وقت ہاجرہ کو طلاق دو، نہیں ہے وہ تم جیسے نانجار کے قابل۔" انہوں نے نفسیاتی دباؤ ڈالا۔

"میں نے آپ کے کہنے پر اس سے نکاح کر لیا تھا، لیکن آپ کے کہنے پر طلاق نہیں دوں گا، میری ہاجرہ سے بات کروا دیں۔" وہ کسی دباؤ میں آنے والے نہیں تھے۔

"بات کرے گی وہ تم سے۔۔۔ ہونہہ، زاہد کی بیٹی تمہارے اوپر تھوکے گی بھی نہیں۔" ازمیر نے غصے سے فون بند کیا اور سامنے بیڈ پر پٹخ دیا۔ باپ کے شدید رد عمل کا اندازہ تو تھا لیکن یہ ہاجرہ کو چھوڑنے کی منطق ایسے ہی خواہ مخواہ۔ کچھ دیر اندر کے ابلتے خون کو قابو کرتے رہے پھر مریم سے پوچھا تھا۔

"تم میرے ساتھ پاکستان چلو گی۔"

"ہاں...."

"ہمیشہ کے لیے؟" لہجے میں خدشہ ساتھا کہیں وہ انکار نہ کردے 'لیکن محبتوں میں اقرار ہوتے ہیں انکار نہیں۔

"دنیا کا کوئی بھی کونا ہو' تمہارے ساتھ رہ لوں گی۔ کب چلنا ہے۔" وہ ٹھوس انداز سے بولی۔

"چند ضروری کام ہیں ذرا وہ بھگتا لوں.... پھر.... تم تیاری رکھنا' میں میٹس ویزے کا پتا کرتا ہوں۔" ان کا ایک ہفتے کا ہنی مون ٹرپ دو دن میں سمٹ گیا تھا۔ اگلے دن ہی گولڈ کوسٹ سے ملبورن واپس آ گئے۔ ساری بات رضا حیات سے بھی ڈسکس کی تھی۔ انہوں نے بھی یہی بہتر جانا۔

"تم جلد از جلد واپس چلے جاؤ' سامنے کی بات اور ہوتی ہے' پھر ہاجرہ بھابھی کو جلدی رخصت کروا لینا معاملہ رفع دفع ہو جائے گا۔"

"ہوں.... میں بھی یہی سوچ رہا ہوں' مریم بھی تیار ہے۔" وہاں جانے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ چند دن میر علی بھڑکتے رہے کچھ میرزا نے دہکا دیا تھا۔ میرزا کا بس نہیں چل رہا تھا ازمیر کو آسٹریلیا کے کسی سکوائر پر کھڑا کر کے اتنے جوتے لگاتے کہ وہاں جانے والے سب لڑکے یاد رکھتے۔ ان کی سالی کو اتنا غیر اہم جانا کہ کسی عیسائی لڑکی کو اس پر فوقیت دی۔ سوچ سوچ کر ان کا دماغ پھٹ رہا تھا۔ سلمیٰ الگ آنکھوں پر دوپٹا رکھے روتی دھوتی پائی جاتی۔ انہوں نے ہی باپ کو مشورہ دیا تھا۔

"وہ کہہ رہا ہے ناں' ہاجرہ سے بات کرواؤ' آپ ہاجرہ کے ذریعے ہی اس پر پریشر دو۔" جلتے کو مزید چنگاری دکھانے پر الاؤ تو بھڑکنا تھا' سلمیٰ کی بیماری کا کہہ کر ہاجرہ کو میرزا لائے تھے۔ وہ ازمیر کی شادی کا بہن سے سن تو چکی تھی لیکن بات ابھی گھر تک نہیں پھیلی تھی۔ میر علی نے انہیں فون کیا۔ اس دن ازمیر کا موڈ قدرے بہتر تھا۔ وہ بہت سے کام نبٹا چکے تھے اگلے ہفتے پاکستان کی فلائٹ تھی اور میر علی کی کال آ گئی۔ پہلے کی طرح انتہائی برہم گرجتی ہوئی۔

"السلام علیکم.... کیا حال ہے ابا جی۔"

"اپنے سلام تم اپنے پاس رکھو.... میں نے جو تمہیں کہا تھا' وہ کیا ہے یا نہیں۔" ان کے تلخ لہجے کا جواب ازمیر نے قدرے خود کو قابو کرتے ہوئے دیا تھا۔

"میں پاکستان آ رہا ہوں' وہاں بیٹھ کر بات کریں گے۔"

"ٹھیک ہے...." میر علی قدرے ڈھیلے پڑے "اسے فارغ کر کے آنا...."

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ' وہ میری بیوی ہے' میں ساتھ لا رہا ہوں اسے۔"

"ازمیر...." وہ دھاڑے تھے "اپنی حویلی میں اس کے ناپاک قدم دھرنے نہیں دوں گا۔ سمجھے.... فارغ کر کے آؤ اسے۔" اصل دبدبہ عود کر آیا تھا۔

"میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں' میں مریم کو کسی بھی صورت نہیں چھوڑوں گا' کسی بھی صورت۔" ان کے مستحکم لہجے نے میر علی کو سیخ پا کر دیا تھا۔

"تو پھر ٹھیک ہے' ہاجرہ کو فارغ کرو۔" ان کا حاکمانہ لہجہ ہنوز تھا۔ کمرے سے کسی کام کو نکلتی ہاجرہ کو انہوں نے اشارے سے بلایا اور فون تھما کر کہا تھا۔

"کہو اسے 'تم میں' یا اس میں سے کسی ایک کا فیصلہ کرے۔" ہونق زدہ ہاجرہ کا پورا بدن لرز گیا تھا' ریسیور اس کے ہاتھوں میں بے طرح کپکپانے لگا۔

"کون.... ہاجرہ بات کر رہی ہو۔" اس کے کانوں میں ازمیر کی آواز لہرائی تھی ہولے سے جھٹکے سے اس کا بھاری ہوتا سر ہلا.... ازمیر کو ہلتا سر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بار بار پوچھ رہے تھے۔

"پلیز بات کرو مجھ سے.... ہاجرہ ہو ناں تم۔" اس کی گہری گہری سانس ماؤتھ پیس سے ان کے کانوں تک گئیں۔

"کہو اس سے.... تمہیں یا اسے' ایک کو فارغ کرے۔" کچھ فاصلے سے آتی میر علی کی دھاڑ نے ثابت کر دیا فون ہاجرہ کے ہاتھ میں ہے۔

"ہاجرہ اگر تم سن رہی ہو' تو غور سے سنو میں شادی کر چکا ہوں' اور تمہیں بھی چھوڑنا نہیں چاہتا... میں جلد پاکستان آرہا ہوں' بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

"ہاجرہ کہو اسے... طلاق دے' فارغ کرے۔" میر علی کے حکم پر ہاجرہ صرف کانپ رہی تھی۔ منہ میں ایک لفظ بھی نہیں بن پا رہا تھا۔

"تمہیں کسی کے پریشر میں آنے کی ضرورت نہیں ہے' تم کیا چاہتی ہو' اپنی بات کرو۔"

"کہو اسے..." میر علی کی دھاڑ پر وہ بمشکل بول پائی۔

"ایک کو... مجھے یا اسے۔" اس کی کانپتی آواز پر ازمیر دنگ رہ گئے تھے۔ میر علی نے آگے بڑھ کر ہاجرہ سے ریسیور جھپٹا۔

"سن لیا تم نے۔" ان کا خیال تھا وہ نفسیاتی دباؤ میں آجائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

"یہ آپ زیادتی کر رہے ہیں... ابا جی...."

"میں کہہ رہا ہوں طلاق دو' ابھی' اسی وقت۔"

"یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے۔"

"میں کہہ رہا ہوں' طلاق دو۔" وہ آگ بگولا ہوئے مسلسل اپنی بات پر اڑے تھے انہیں پورا یقین تھا ازمیر ہاجرہ کو طلاق دے کر اتنے بڑے خاندان سے لڑائی مول نہیں لے سکتا البتہ اس عیسائی کو چھوڑ دے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ ان کے بے جا اصرار' چیخنے چلانے پر ازمیر انہی کے لہجے میں بولے تھے۔

"آپ ایک بار پھر سوچ لیں' ہاجرہ سے پوچھ لیں۔"

"میں کہہ رہا ہوں طلاق دو اسے...." ازمیر انہی کا خون تھا اسی طرح گرما گیا تھا۔ نا وہ نکاح ان کی پسند سے تھا' اور نا ہاجرہ سے دلی وابستگی' اک تعلق تھا جسے وہ قول کی خاطر نبھانا چاہتے تھے لیکن میر علی کے بے انتہا طیش دلانے پر ازمیر بھی غصے میں بولے تھے۔

"میں ہاجرہ کو طلاق دیتا ہوں... طلاق دیتا ہوں... طلاق دیتا ہوں۔"

ان جملوں نے حویلی کے درو دیوار ہلا دیے تھے۔

ماں جان دروازے میں کھڑی کھڑی لڑکھڑا گئیں۔ میر علی کو اس بات کی توقع نہیں تھی وہ پتھر کی طرح ساکت ہو گئے۔ اور چند دن بعد طلاق' کاغذات کی صورت میں ہاجرہ کے دروازے پر تھی۔ ان کے اس عمل نے پورے خاندان میں شدید جھگڑا کر دیا تھا۔ میر علی نے تاحیات ازمیر کی شکل نہ دیکھنے کی قسم کھائی تھی۔ میرزکا نے تنبیہہ کی تھی۔ آج کے بعد وہ حویلی کا رخ نہ کریں ورنہ ٹکڑے کر دیں گے۔ ماں جان کو شوہر اور بیٹے کی دھمکیوں نے اندر سے توڑنا شروع کر دیا' وہ چپ رہنے لگی تھیں۔ وقت گزرتا گیا۔ انہوں نے پاکستان تو کیا آنا تھا فون کرنے پر پابندی عائد تھی۔ ماں سے بات کرنے کو جب بھی فون کیا' ہمیشہ کوئی بہانہ سننے کو ملا تھا۔ ماں جان میں بہت خوف تھا میرزکا اور میر علی کا دونوں نے سختی سے منع کر رکھا تھا۔

"اگر فون اٹینڈ کیا تو اسی کے پاس بھجوا دوں گا۔"

شوہر کی دھمکی پر چاہتے ہوئے بھی فون کے قریب نہ جاتیں۔ جو کوئی ملازمہ اٹھاتی اشارے سے منع کر دیتیں "جو مرضی بہانہ بنا دو۔" یوں وہ مزید کٹ گئے۔ میر علی نے بیٹے کی نافرمانی دل سے لگا لی تھی۔ آج تک پورے خاندان برادری میں کسی کی جرأت نہیں تھی ان کے فیصلے کے خلاف چلے' بڑی بڑی پنچائیت میں ان کے فیصلے کو اہمیت دی جاتی تھی۔ بیٹے کی نافرمانی اندر سے کچوکے لگانے لگی دو سال کے اندر اندر میر علی کا وقت پورا ہو گیا تھا۔ ازمیر کو جیسے ہی پتا چلا تھا پہلی فلائٹ سے پاکستان پہنچے تھے مگر ان کا انتظار نہیں کیا گیا تھا۔ کفن دفن سب ہو چکا تھا۔ میرزکا نے بھائی سے ملنا تو درکنار سامنے سے ہٹ گئے تھے اور ماں جان کو سختی سے منع کیا تھا۔

"وہ آیا ہے' لیکن آپ اس سے نہیں ملیں گی... مجھے اپنے باپ کے لفظ یاد ہیں' جو انہوں نے کہے تھے۔"

ہال کمرے میں بیٹھے دونوں بھائیوں کے درمیان شدید بحث ہوئی تھی۔ ماں جان سفید چادر اوڑھے دروازے میں کھڑی آنسو بہاتی رہیں۔ لیکن ان میں

اتنی جرات نہیں تھی چھوٹے بیٹے کو گلے لگالیتیں بہت مشکل سے لہجے میں سختی پیدا کرتے بولی تھیں۔

"اب کیا لینے آیا ہے ازمیر۔ چلا جا یہاں سے۔۔۔ خدا کے واسطے چلا جا۔" ان سے اپنے قدموں پر کھڑے ہونا دشوار ہو گیا فوراً کمرے میں چلی گئیں۔

دفعتاً "چھوٹا سا بچہ تقریباً" تین چار سال کا ہو گا بھاگتا ہوا ایک جانب سے آیا "چچا" کہہ کر ازمیر کی ٹانگوں سے لپٹ گیا تھا۔ سلمیٰ جو اسے پکڑنے پیچھے پیچھے آئی تھیں دور ہی رک گئیں۔ کیوں کہ میرز کا قہر آلود نگاہ سے سلمیٰ کو دیکھ رہے تھے جیسے وہ ایک بچے کو قابو کرنے میں ناکام رہی ہوں۔ ازمیر نے اسے خود سے الگ کیا گود میں اٹھالیا۔ بے حد روشن چمکتی آنکھیں مسکراتا کھلا کھلا چہرہ بے ساختہ اس کے گال چوم لیے۔

"خون اپنا آپ منوالیتا ہے' ذکا بھائی۔۔۔" انہوں نے استہزائیہ میرز کا کو دیکھا جو رخ موڑ کر کھڑے ہو گئے تھے "آپ مجھ سے ملیں نہ ملیں' میرے بھتیجے کو آپ نہیں روک سکیں گے۔" انہوں نے زور سے حنبل ذکا کو بانہوں میں بھینچا خوب پیار کر کے اسے سلمیٰ بھابھی کی جانب چھوڑ دیا۔ ازمیر واپس آسٹریلیا چلے گئے تھے۔

وقت مزید آگے گزرا مگر ان کے تعلقات میں برہمی ہنوز تھی۔ بمشکل چند سال گزرے تھے میرز کا کی بیوی سلمیٰ اچانک انتقال کر گئیں۔ اس طرح کی خبریں انہیں رضا حیات کے گھر والوں کے ذریعے مل جاتی تھیں کیوں کہ رضا اسی گاؤں کے تھے اور رضا حیات نے ہی مشورہ دیا تھا۔

"یار یہ ایسا صدمہ ہے' اچھا بھلا انسان ہل جاتا ہے' تمہارے جانے سے انہیں حوصلہ ہو گا' یقیناً" دلوں کی کدورت بھی دھل جائے گی۔" پھر اسی امید کے تحت ایک بار پھر وہ پاکستان آئے تھے۔ میرز کا نے غم سے ہلنا تو کیا چٹان کی طرح سخت کھردرے ہو گئے تھے اور ازمیر کو دیکھتے ہی اندر پکتا لاوا ابل پڑا۔

"کیا کرنے آئے ہو یہاں' میرا میرے بچوں کا تماشا دیکھنے آئے۔۔۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ' یہ میرے خاندان کا دکھ ہے' میرا دکھ ہے۔۔۔ کیا مجھے اپنوں کے غم میں شامل نہیں ہونا چاہیے۔"

"اس خاندان میں دکھ تم نے بھرے ہیں ازمیر' تم نے۔۔۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔" ازمیر حیرت سے انہیں تک رہے تھے وہ مسلسل شعلہ بار نگاہوں سے انہیں دیکھتے کہتے رہے "تمہاری بخشی بے عزتی میرے باپ کی جان لے گئی' میری بیوی کو بہن کا غم نگل گیا۔"

"خدا کے لیے ذکا بھائی ایسا مت کہیں۔" وہ ان سے ملنے کو آگے بڑھے میرز کا نے جھڑک دیا تھا۔

"ہاتھ مت لگانا مجھے' بھائی سمجھتے تو بھائی کی لاج رکھتے' ذلیل کر کے رکھ دیا مجھے۔۔۔ جس طرح تم نے اپنے باپ کو دکھ دیا' تم باپ بننے کو ترسو گے۔"

ازمیر کی پوری آنکھیں پھٹ گئی تھیں ان کی شادی کو چھ سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا۔ وہ اس نعمت کو ترس رہے تھے۔ اس وقت بھائی کے منہ سے سفاکیت سن کر سارے بدن میں انگارے دہکنے لگے۔ وہ دانت جما کر بولے تھے۔

"اولاد کا ہونا نہ ہونا' میرے اللہ کی طرف سے ہے' اگر میرے نصیب میں لکھی ہے' تو میں ان شا اللہ ترسوں گا نہیں۔" انہیں دکھ ہو رہا تھا ان کی ماں کے سامنے ان کا بھائی انہیں بد دعائیں دے رہا ہے اور وہ ایک لفظ ان کی حمایت میں نہیں بول رہیں انہوں نے شکوہ کناں نگاہ ماں جان پر اٹھائی۔

"اللہ حافظ' آئندہ کبھی نہیں آؤں گا اور اگر آیا اللہ کی قسم واپسی نصیب نہ ہو۔" ماں جان کے دل پر ہاتھ پڑا تھا انہوں نے سینہ تھام لیا جب کہ میرز کا پورے کروفر کے ساتھ استہزائیہ "ہونہہ" کہتے مسکرائے اور تلخ لہجے میں گرجے تھے۔

"اگر تمہاری رگوں میں حلال خون ہے' تو قائم رہنا اپنے کہے پر۔۔۔ اور واپسی' کیا بات کر رہے ہو تمہارے جیسے بے شناخت کو یہاں وہاں کوئی زمین قبول نہیں کرتی۔"

"میری ماں کو گالی مت دیں ذکا بھائی۔" اس بار ازمیر ان سے بھی زیادہ گرجے تھے۔ چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور نتھنے پھٹنے کو۔ "اور زمین کا فیصلہ کرنے والے آپ کون ہوتے ہیں کیا خود کو خدا سمجھ لیا ہے؟"

"اللہ کے واسطے۔۔۔ تمہیں رب کا واسطہ۔۔۔" ماں جان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ دونوں بیٹوں کے سامنے ہاتھ جوڑے انہیں چپ کروانے کے درپے تھیں پھر ازمیر پر ہی ان کا بس چلا تقریباً" انہیں دھکے دیتیں کہہ رہی تھیں، آنسو ٹوٹ ٹوٹ منہ میں جا رہے تھے۔

"تو چلا کیوں نہیں جاتا۔۔۔ کیوں آجاتا ہے بار بار میرا کلیجہ نوچنے، جا۔۔۔ جہاں مرضی رہ، خوش رہ۔۔۔ مت آیا کر میرے دل کو نچوڑنے کے لیے۔"

ان کا بدن ہچکولوں میں لرز رہا تھا۔ ازمیر کا شدت سے جی چاہا ان سے لپٹنے کو لیکن انہوں نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ کبھی نہ آنے کے پکے ارادے سے نکل گئے تھے اور پھر وہ کبھی پاکستان آئے بھی نہیں۔

٭ ٭ ٭

بیٹوں میں جدائی، بیوگی اور جوان بہو کا غم ایک کمزور عورت کہاں تک سہ پاتی وہ آہستہ آہستہ اندر سے گھلنے لگیں۔ ازمیر کبھی کبھی انہیں فون کر لیتا۔ کبھی وہ بات کر لیتیں کبھی میرزکا کی ناراضی کے ڈر سے ٹال دیتیں خود کو انہوں نے میرزکا کے بچوں میں الجھا لیا تھا۔

حنبل ذکا اس وقت آٹھ نو برس کا تھا۔ جیسے جیسے وہ جوان ہوا مکمل ازمیر کی کاپی بنتا چلا گیا۔ چال ڈھال، رنگ روپ، سراپا یہاں تک کہ اپنی بات منوا کر دم لینا۔ پہلے پہل ماں جان اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر چونکتی تھیں پھر تو جیسے وہ پورا ازمیر بن کر سامنے چلنے پھرنے لگا۔ اس کے ہر ہر انداز پر بچھڑا بیٹا دل میں کسک کی طرح چبھنے لگا۔ چند سال پہلے بلڈ پریشر بے طرح بڑھ جانے سے فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ ان کا علاج شروع ہوا بجائے ٹھیک ہونے کے وہ مکمل بستر کو لگ گئیں۔ پھیپھڑے ناکارہ ہونے لگے۔ ہڈیاں گھل گئیں۔

پورا گھر ہی ان کا بہت خیال رکھتا تھا۔ ایک ضرورت، دوا، خوراک۔ لیکن ان سب میں حنبل ذکا بہت جذباتی تھا۔ ماں کے ہوتے ہوئے بھی دادی کے قریب تھا ماں کے بعد بالکل دادی کا بیٹا بن گیا۔ ان کے دل کی ایک ایک بات جان لیتا تھا۔ ازمیر چچا کے لیے ماں جان کی تڑپ نہ صرف محسوس کی بلکہ رابطے کی کوشش کی تھی۔ جو کامیاب ہوتی چلی گئی۔ جب ماں جان کہتیں وہ فوراً" ان کی بات کروا دیتے۔ کئی بار تو اس نے رائے بھی لی تھی۔

"آپ نے آسٹریلیا جانا ہے؟ میں لے جاتا ہوں۔"

"تو اسے کہہ وہ یہاں آجائے۔۔۔" ازمیر سے بحال ہوتے تعلقات میرزکا سے چھپے نہیں تھے۔ مصلحتاً" وہ نظر انداز کر دیتے تھے۔ ایک طرف جوان بیٹے سے الجھنا اپنے گھر میں تناؤ پیدا کرتا، دوسری جانب بوڑھی بیمار ماں کی حالت بھی سامنے تھی۔ وقت کی رسہ کشی میں میرزکا کا وہ جوانی والا سارا رعب و دبدبہ بڑھاپے کی عمارت میں بیٹھ گیا تھا۔ بہت حد تک اپنی اولاد سے بھی خوف زدہ تھے کہ کہیں کسی بات پر میرے بیٹوں میں دوری نہ آجائے، کیا وہ برداشت کر پائیں گے، کوئی ماں باپ کیسے برداشت کر سکتے ہیں وقت کے ساتھ انہیں اکثر وہ لمحے یاد آنے لگے جب میر علی ہسپتال میں ایک ہفتہ داخل رہے تھے اور زندگی کی ہر امید ختم ہو رہی تھی۔ انہوں نے بارہا ازمیر کو شدت سے پکارا تھا۔ ایک بار دیکھ لینے کی منتیں کی تھیں۔ ہر بار میرزکا نے کہہ دیا۔

"اس کا خون سفید ہو چکا ہے، وہ نہیں آئے گا۔"

"میری اس سے بات کرواؤ میں بلا لوں گا اسے۔"

میرزکا غلط نمبر ملا کر فون سامنے کر دیتے کہ "نمبر بند کر رکھا ہے اس نے، وہ ہم سے ملنا نہیں چاہتا۔" اس بات کا سوائے میرزکا کے کسی کو کانوں کان نہیں پتا تھا باپ گزر گیا مگر گلٹ اندر رہ گیا۔ "کیا تھا اگر باپ کی آخری خواہش پوری کروا دیتا، باپ اس ظالم کے غم میں گھل کر مر گیا۔" گلٹ پھر سے تنفر میں بدل جاتا۔

لیکن اس بے جا تنفر کو حنبل ذکا آہستہ آہستہ صاف کرتا رہا۔ اور نوبت یہاں تک آگئی اب برسوں بعد ازمیر پاکستان اپنی زمین پر آرہے تھے اپنی ساری قسمیں سارے عہد توڑ کر۔

☆ ☆ ☆

اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ٹیبل سے چابیاں اٹھا کر تیزی سے باہر کی جانب نکلا زینب ماں جان کی وہیل چیئر پکڑے انہیں ہال کمرے میں لا رہی تھی۔ اس نے رخ پھیر کر انہیں دیکھا تھا۔ نہائی دھوئی میں صاف اجلی، سرمہ پاؤڈر اور سبھی کار کھا سرخ سوٹ پہن رکھا تھا۔ سرخ تو کیا وہ گہرے رنگ نہیں پہنتی تھیں۔ لمحہ بھر کے لیے وہ چونکا تھا۔ ماں جان سے ہی سن رکھا تھا۔ ازمیر چچا کو سرخ رنگ بہت پسند تھا۔ حنبل کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ قدم قدم ان کے قریب آیا گھٹنوں کے بل سامنے بیٹھ گیا۔ زینب سائیڈ پہ ہو گئی۔

"بہت انتظار ہے' آپ کو چچا کا۔۔۔" جھریوں زدہ چہرہ اقرار میں ہلا۔۔۔ "میرے ساتھ جائیں گی لینے۔" جھریوں پر آنسو ٹکنے لگے۔ آنکھیں بند کرلیں۔

"ابھی تو بہت وقت ہے' تقریباً" دو' ڈھائی گھنٹے لگ جائیں گے۔ تھک جائیں گی آپ۔۔۔ اتنے آرام کر لیں۔" وہ نرمی سے کہتے زینب سے مخاطب ہوا "انہیں کمرے میں لے جاؤ' لیٹا دو' ابھی بہت ٹائم ہے۔"

"یہ تو آج صبح سے نہیں لیٹیں۔" اسے مخاطب کرتے زینب کی آواز خواہ مخواہ کانپ جاتی تھی۔

"کیوں۔۔۔؟ اس کا استفسار سخت تھا۔

"کہہ رہی تھیں' اگر آنکھ لگ گئی اور ازمیر آکر چلا گیا تو۔" اس نے تاسف سے ان کے چہرے کو دیکھا پھر لہجے کو مزاح میں بدلتے کہنے لگا تھا۔

"اچھا تو آپ تھک کر بیمار پڑنا چاہ رہی ہیں' تاکہ آپ کا لاڈلا بیٹا آکر ہماری کھنچائی کرے' ہیں ناں۔" وہ مسکرائیں سرنفی میں ہلا۔

"پھر جاکر آرام کریں لیٹ جائیں۔"

"وہ آئے گا ناں۔۔۔"

"ہاں ہاں۔۔۔ آپ کو یقین نہیں آرہا۔۔۔ میں انہیں ہی لینے جارہا ہوں۔ آئیں گے اور کئی دن آپ کے پاس رہیں گے۔ اگر آپ کو ان کے ساتھ جانا ہو گا چلی جایئے گا' کوئی نہیں روکے گا۔۔۔ لیکن پلیز روئیں مت۔" اس نے ان کے ہاتھ چومے۔۔۔ زینب کو گردن سے اشارہ کیا انہیں لے جائے اور خود میرزکا کے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا۔ وہ پشت پر ہاتھ باندھے کمرے میں چکر لگا رہے تھے۔ انہوں نے حنبل کو کہتے سنا تھا۔

"ایئرپورٹ چلیں گے آپ۔"

"تم کافی نہیں ہو' اس کی بے قراری کے لیے۔" ان کے کٹیلے جواب پر حنبل استہزائیہ مسکرا دیا۔

"حالانکہ ہونا آپ کو چاہیے تھا۔" میرزکا کے ابرو تن گئے تھے بیٹے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس کے قریب آئے۔

"تم کیا سمجھتے ہو حنبل۔۔۔ میں بہت بے حس ہوں؟ پتھر ہوں؟ چٹان ہوں؟ دل نہیں ہے میرے پاس بے جان لوتھڑا ہے۔" بولتے ہوئے اپنے ہاتھ حنبل ذکا کے کندھوں پر رکھ لیے "جتنی تم خیام سے محبت کرتے ہو' نا اس سے کہیں زیادہ میں ازمیر سے کرتا تھا' ہر طرح کا خیال رکھا' کبھی کسی کام کا بوجھ نہیں ڈالا تھا اس پر صرف اس کی زندگی کا ایک فیصلہ کیا تھا' صرف ایک فیصلہ' بھائی ہونے کے ناتے میری عزت نہیں رکھ سکتا تھا' اس کے ایک عمل نے مجھے کتنا اور کہاں' کہاں ذلیل کیا' کیا کیا سنوایا۔۔۔ سوچ نہیں سکتے تم۔"

"جن باتوں سے کچھ حاصل نہ ہو' انہیں چھوڑ دینا چاہیے بابا۔"

"کیسے چھوڑ دوں حنبل۔" انہوں نے جھٹکے سے ہاتھ اٹھائے گہری سانس لیتے رخ موڑ کر کھڑے ہو گئے "میرے باپ کی آج تک نگاہیں نہیں جھکی تھیں' اس کے ایک عمل نے پنچایت میں سر جھکا دیا' میری بیوی مجھے طعنے دیتی رہی' وہ کہیں اور سے نہیں گیا تھا' اسی

گاؤں سے گیا تھا اور خوب جانتا ہو گا گاؤں والوں کے ذہن اتنے کشادہ نہیں ہوتے اس طرح کی باتوں کو آسانی سے بھول جائیں' طعنے' تشنے ہر موقع پر نکلتے ہیں' مانا زبردستی نکاح کیا تھا' کیا ہوتا میری خاطر نبھالیتا۔۔۔ نہیں۔" انہوں نے ہاتھ ہوا میں لہرائے۔

"اسے تو اس کرسچن سے عشق ہو گیا تھا۔ اور وہ آیا کب ہے معافی مانگنے' میتوں پر۔۔۔ جب میں پہلے ہی پریشان تھا تب۔۔۔ خیام کی شادی پر بھی تو آسکتا تھا' اگر میں نے نہیں بلایا تو فوتگیوں پر میں نے کون سا دعوت نامہ بھیجا تھا۔ ضبل ذکا میں انسان ہوں' اور انسان کا دل خوشیوں میں ویسے ہی کشادہ ہوتا ہے' خواہ مخواہ بڑی بڑی باتیں معاف کر دیتا ہے۔۔۔ لیکن نہیں۔۔۔ اسے تو میت کا انتظار تھا' اب بھی میرا یا ماں جان کا مرنا دیکھ رہا ہو گا اگر میں نے کچھ سخت کہہ دیا تھا تو اسے قسم اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔ قسم اٹھا کر گیا تھا وہ۔" وہ ہاتھ باندھے خاموشی سے انہیں اس لیے سن رہا تھا جتنا غصہ ہے نکال لیں شاید دل صاف ہو جائے۔ وہ چپ ہوئے تو ضبل ذکا بہت مستحکم لہجے میں گویا ہوا۔

"بابا جان آپ کا شکوہ اپنی جگہ درست ہے' میں نے انہیں بھی سنا ہے' ان کا شکوہ اپنی جگہ درست ہے' جب ہم خود کو درست سمجھ کر جھکنے پر تیار نہ ہوں' تو پھر بہت کچھ غلط ہو جاتا ہے۔۔۔ اس سے پہلے کہ یہ چند رشتے بھی ختم ہو جائیں گنجائش نکال لینی چاہیے۔"

"نکال تو رہے ہو تم اب اور کیا چاہتے ہو۔"

"بابا جان۔۔۔" وہ ان کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا" جن بھی موقعوں پر سہی مگر چچا نے معافی تو مانگی تھی' اور وہ طلاق صرف دادا جان کی ضد کی وجہ سے ہوئی تھی' چچا قسم کھاتے ہیں' وہ رشتہ نبھانے کو تیار تھے' کیا ایک طلاق کو قبر بنا کر ہر رشتہ اسی میں اتارنا شروع کر دیں؟ ناراضی کی پہل آپ کی طرف سے ہوئی تھی' معافی کی بھی آپ کریں۔۔۔ میری جگہ اگر آپ چلے جائیں' تو آپ کی بوڑھی ماں کو زیادہ خوشی ہو گی' اتنی لمبی ناراضی کا کفارہ سمجھ کر اتار دیں۔" میرز کا نے گہری سانس لی۔

"کیا ٹائم ہے فلائٹ کا؟" بے یقین مسکراہٹ ضبل ذکا کے رخساروں کو چھو گئی۔

"ایک گھنٹے بعد۔ چلیں؟" اس کے پوچھنے پر میرز کا منہ سے کچھ نہیں بولے' آگے چل پڑے۔

☆ ☆ ☆

لینڈنگ کی اناؤنسمنٹ گونجتے ہی جہاز کے پہیے زمین پر رگڑ کھانے لگے پاکستان سے جب پہلی بار گئے تھے آنکھوں میں بہت خواب تھے' کچھ بن جانے کے' کچھ کر دکھانے کے لیکن ہر بار واپسی پر گھبراہٹ سوا ہوتی جاتی کیسے رویے ملیں گے۔ ان کے چہرے کے تاثرات بھانپ کر مریم نے تسلی آمیز ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھا حالانکہ اندر سے وہ خود بہت خوف زدہ تھیں' جانے حویلی میں کیا ہو گا۔ یہ سارے خوف ازمیر کی محبت نے ان میں بھر دیے تھے ورنہ وہ کسی چیز سے ڈرنے والی نہیں تھیں۔

ایئرپورٹ کی تمام فارمیلٹیز پوری کر کے وہ ایگزٹ کے ویٹنگ لاؤنج میں آگئے۔ بہت دور سے ہی میرز کا کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئے تھے۔ کچھ بھی تھا مگر اتنی امید نہیں تھی کہ ذکا بھائی خود لینے آجائیں گے۔ کیا واقعی ماضی میں اتنی گرد ہوتی ہے' بہت کچھ چھپا دیتی ہے۔ وہ سوچتے ہوئے قدم قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ دونوں کی نظریں ایک دوسرے پر جمی تھیں اور دونوں ویسے ہی تھے بس وقت کی گردش میں کنپٹیوں کے اوپر سفیدی کی ہلکی ہلکی لکیریں ابھر آئی تھیں۔ کچھ چہروں پر بڑھاپے کے اثرات تھے البتہ آنکھوں میں شناسائی چمک رہی تھی۔ میرز کا سے ذرا سے پیچھے دائیں جانب ضبل ذکا سینے پر ہاتھ باندھے استادہ تھا۔ ازمیر میرز کا کے سامنے آرکے بازو کھول لیے۔

"کیا آپ کے بازو میرے لیے کبھی نہیں کھلیں گے' کبھی معاف نہیں کریں گے۔"

"قسم کیوں کھا کر گیا تھا۔" ان کا لہجہ سرد تھا۔

"دماغ خراب ہو گیا تھا۔" میرز کا کے جبڑے بھاری ہونے لگے یک لخت ہی لپٹ گئے دونوں' بہت دیر لپٹے رہے تھے۔ اتنی دیر میں ضبل نے مریم سے سلام حال

احوال تک پوچھ لیا تھا۔
"بیٹی کو کہاں چھوڑ کر آیا ہے۔" میرزکا نے الگ ہوتے ڈپٹ کر پوچھا تھا۔
"اس کے پیرنٹس گھر ہی میں تھی۔"
"انگریزوں میں رہ کر انہی جیسا لاپروا بن گیا ہے جوان لڑکی کو تنہا چھوڑ آیا۔" انہیں ازمیر کی یہ حرکت بری لگی تھی۔
"آپ بے فکر رہیں وہ محفوظ ہے۔"
"لڑکیاں محفوظ اپنوں میں ہوتی ہیں سمندر پار تنہا نہیں۔" ازمیر کو اگر ذرا سا بھی ذکا بھائی کے رویے کا اندازہ ہو جاتا تو شاید وہ روائیہ کا سمسٹر چھڑوا کر ساتھ لے آتے اور ممکن تھا ہمیشہ کے لیے ہی آجاتے۔ وہ خود پردیس رہ رہ کر عاجز آچکے تھے۔ مریم کے سلام کے جواب میں میرزکا نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا اور آگے بڑھ گئے۔ حنبل کے لیے یہ سارا منظر کسی خوش نما خواب کی طرح تھا۔
حویلی میں خوشیوں کا ایسا سماں تھا جیسا انتیس کا چاند نکلنے پر عید لطف دے جاتی ہے۔ خوشیاں مسکراہٹیں دلوں کی کدورتیں آنکھوں کی نمی میں ڈھل رہی تھیں۔ جب انہوں نے حویلی میں قدم رکھا تھا ماں جان ہال کمرے کے داخلی دروازے پر وہیل چیئر پر بیٹھی تھیں کانپتی ہوئی دونوں بانہیں پھیلا لی تھیں انہیں یقین دلانا مشکل تھا برسوں بعد ان کا بیٹا ان کی بانہوں میں ہے۔ ان کے گھٹنوں پر سر رکھے وہ بہت دیر روتے رہے تھے۔ مریم اجنبیوں کی طرح سب سے مل کر ماں جان کے برابر کھڑی تھیں انہوں نے اسے بھی ساتھ لگا لیا اور وہی ایک ہی شکوہ۔ "بچی کو کیوں نہیں لائے۔"
"اگلی بار آؤں گا تو اسے ساتھ لے کر آؤں گا ہمیشہ کے لیے یہاں آپ کے پاس رہے گی اپنے گھر میں۔"

☼ ☼ ☼

رات کے کھانے پر سب لوگ اکٹھے تھے کھانے کا ٹھیک ٹھاک اہتمام کیا گیا تھا۔ ان کے آنے سے چند دن پہلے ہی حنبل ذکا باتوں میں کہہ دیتا تھا۔ مسالے ذرا ہلکے ہی رکھوانا بھرجائی ہو سکتا ہے چچا کا ٹیسٹ اب بدل چکا ہو پھر ان کی فیملی بھی ساتھ ہوگی۔ لیکن ازمیر کے گھر آجانے پر میرزکا نے خالہ گلزاری اور زینب کو خود اچھے کھانے کی ہدایات دی تھیں۔ ساتھ آئمہ بیگم کو کہا تھا۔ وہ چیک رکھیں۔ کھانا لگنے پر سب لوگ جمع تھے۔ برسوں بعد پاکستانی کھانوں کی خوشبو ازمیر کی بھوک چمک گئی تھی۔ بے شک انہوں نے بہت کم کھایا مگر بہت دل سے کھایا تھا۔
مریم کو آئمہ کچھ خاموش لگی تھیں اعشال نے بھی چند ایک باتیں کیں پھر خاموش مگر اذلان اس کی تو زبان کے آگے پوری خندق تھی۔ آئمہ بیگم گھرکتی رہیں اعشال نے ایک دوبار اسے چپ کروانے کے لیے اس کے پاؤں پر ٹیبل کے نیچے سے پاؤں بھی مارا ابھی نئے مہمان ہیں کیا سوچیں گے منہ پھاڑے ہنسے جا رہا ہے بولنے میں عورتوں کو مات دے رہا ہے۔ مگر وہ چپ رہنے والا کب تھا۔ بات سے بات اسے تو آسٹریلیا کی ایک ایک چیز میں دلچسپی تھی خاص کر ان کے کرکٹرز۔ اس نے شائقانہ انداز میں پوچھا تھا۔
"آپ نے تو واٹسن کو دیکھا ہوا ہوگا۔" ازمیر سے پہلے مریم بول پڑیں۔
"ہاں۔۔۔ میرے پاس ایک بال پر اس کا آٹوگراف بھی ہے سڈنی میں کئی بار ہم اس سے ملنے۔۔۔" بولتے ہوئے اس نے اپنے جملے کی نزاکت کا احساس ہو گیا تھا۔ کیوں کہ یک لخت سب کو اچنبھا سا ہوا تھا۔ ایک کرکٹر سے ملنے جانا گاؤں کے کلچر میں شاید عجیب ہو۔
ازمیر نے بھی نگاہوں میں انہیں چپ رہنے کی تنبیہہ کی اور بات خود سنبھال لی تھی۔
"ہاں یار ہم ملے ہیں اس سے بہت اچھا بندہ ہے ایکچوئلی روائیہ کو کرکٹ کا بہت جنون ہے۔۔۔ آسٹریلینز کی طرح کھیلتی ہے خیر تم آنا ادھر تمہیں بھی ملوائیں گے اس سے یار۔"
"تم نے لڑکی کو کیا بنا رکھا ہے ازمیر۔۔۔ کیا وہ وہاں

کرکٹ کھیلتی ہے؟ میرزکا کے پوچھنے پر آئمہ بیگم' اعشال کی نگاہوں کا ذو معنی تبادلہ ہوا تھا۔ ان کے لیے تو بے حد عجیب بات تھی۔

"نہیں زکا بھائی... صرف میرے ساتھ کھیلتی ہے' یا پھر ایک دو فرینڈز کے ساتھ' آپ اس سے ملیں گے خوش ہو جائیں گے' وہاں کی لڑکیوں سے وہ بہت مختلف ہے۔"

"ہونا بھی چاہیے۔" خیام نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا تھا "آخر اس خاندان کی بیٹی ہے۔"

"کیا کرتی ہیں وہ... میرا مطلب ہے ایکٹوٹیز وغیرہ۔"

حنبل زکا نے سرسری سا پوچھا تھا۔ اور ازمیر کا سارا چہرہ کھل گیا۔ روائیبہ کی ایکٹوٹیز پر وہ اندر تک کھل جاتے تھے۔

"یار ابھی تو بہت چھوٹی ہے' A لیول کا فرسٹ سمسٹر دے رہی ہے باقی کھیل کود' ڈیزائننگ' پینٹنگ' رائیڈنگ وغیرہ۔"

اسی وقت ان کا موبائل چمکا تھا اور ڈول کالنگ جگمگانے لگا ازمیر کی مسکراہٹ گہری ہوگی۔

"لو آگیا فون۔" فون کان سے لگاتے ہی جو شکوہ ازمیر نے سنا۔

"کہاں ہیں آپ... وہاں جا کر مجھے بھول ہی گئے... ایٹ لیسٹ (کم از کم) بندہ ایک کال ہی کر دیتا ہے... پر نہیں' جیسے مجھ سے تو کسی کا تعلق ہی نہیں ہے' میں تو کسی کی کچھ لگتی ہی نہیں' میں تو دنیا میں ہوں ہی نہیں۔"

"ارے' ارے رے..." ازمیر نے اس کے لمبے ہوتے شکوے کو فل اسٹاپ لگایا "یار میں نے پاکستان آتے ہی پہلے تمہیں کال ملائی تھی' تمہارا فون بند تھا' جندب سے بات ہوئی تھی۔ اس نے نہیں بتایا۔"

"بتا دیا تھا..." وہ منہ پھلائے کہہ رہی تھی۔ "ڈیڈی پلیز آپ جلدی آجائیں' مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے' یو نو... میرا دل بیٹھ رہا ہے۔" پھر اس کی آواز اس قدر بھاری ہوگئی لفظ سمجھ آنا مشکل ہوگئے... ایسے لگا جیسے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہوں۔ انہیں بھی اپنا دل بیٹھتا محسوس ہوا تھا۔

"کیا بات ہے بیٹا' سب خیریت ہے؟" اس کی خاموشی پر وہ قدرے بوکھلائے "تم رو رہی ہو...؟"

اس نے ناک کی سوں سوں روکنے کی کوشش کی تھی مگر ازمیر سمجھ چکے تھے۔ موبائل مریم کو دیا۔

"یہ... تم بات کرو۔" وہ موبائل لے کر وہاں سے اٹھ گئیں۔

"یہ جندب کون ہے۔" میرزکا کا انداز کچھ تفتیشی سا تھا۔ مگر انہوں نے سرسری انداز میں بتایا تھا۔

"رضا حیات کا بیٹا۔"

"رضا تو پاکستان آگیا تھا۔" میرزکا کو خاصی معلومات تھیں۔

"جی... لیکن اس کا بیٹا ادھر ہی پڑھ رہا ہے' بہت اچھا لڑکا ہے... ہمارے فلیٹ کے قریب ہی ہوسٹل ہے اس کا... آتا رہتا ہے' میں اسے کہہ کر آیا تھا ذرا دھیان رکھے۔"

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے' اکیلی لڑکی کا دھیان رکھنے کو غیر لڑکے کو کہہ آئے ہو... ایسا بھی کیا مسئلہ تھا' بچی کو لے کر آتے۔"

میرزکا کا کھانے سے دل اچاٹ گیا' جب کہ ازمیر مسکرا کر بولے۔

"آپ فکر نہیں کریں' روائیبہ اکیلی نہیں ہے' ہمارے فلیٹ کی لینڈلیڈی اس کے ساتھ ہے' بوڑھی سی خاتون ہیں بہت اچھی ہیں۔"

لفظ "فلیٹ کی لینڈلیڈی" میرزکا کو اندر تک چیر گیا تھا کہ ازمیر ایک فلیٹ میں رہ رہا ہے اور وہ خود اتنی شاندار حویلی میں۔ انہوں نے آنکھیں سکیڑتے تحیر سے پوچھا تھا۔

"تم وہاں کرائے کے فلیٹ میں رہ رہے ہو...!"

ازمیر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے لمحہ بھر کے لیے سن ہو گئے تھے۔ وہ کیا بتاتے خود کروڑوں کے وارث اور بیوی ایک بہت بڑی لینڈلیڈی کی بیٹی ہوتے کرائے کے گھر پر ہیں۔

لیڈی ہیلہ' فلوریہ اس کی شادی کے بعد بہت عرصہ تک ناراض رہیں ان کے فلیٹ پر تو کبھی بھی نہیں آئی تھیں۔ جب کبھی وہ دونوں جاتے تو وہ واضح ناراضی کا اظہار کرتی تھیں کچھ عرصے میں لیڈی ہیلہ کی وفات کے بعد فلوریہ نے کہا تھا۔

"تم چاہو تو اپنی پراپرٹی کے شیئرز لے لو' تمہارے میاں کے پاس تمہیں دینے کے لیے گھر تک نہیں ہے۔" مریم کو اس کا دوسرا جملہ بری طرح چبھا تھا اور اس نے اس کی پیشکش ٹھکرادی تھی۔

"میرے میاں کے پاس مجھے دینے کے لیے محبت ہے' اور گھر محبت سے قائم رہتے ہیں' پراپرٹی سے نہیں۔"

"وہ تمہیں فاقوں پر لے آئے گا۔۔۔ میرجعل۔"

"میں فاقے کاٹ لوں گی۔۔۔ اور میرجعلی نہیں' مریم ہوں میں' مریم ازمیر۔" اس کے قطعیت سے کہنے پر وہ استہزامیں مسکرائی۔

"چلو' مریم سہی' تو مریم آسکر' تمہیں ایک دن اس پراپرٹی کی ضرورت پڑے گی' اپنے لیے نہ سہی' اپنی اولاد کے لیے' جب چاہو لے جانا' میرے پاس محفوظ ہے۔" مریم کی جانے بلا اس نے کبھی ذکر تک نہیں کیا تھا۔ جو ازمیر نے فلیٹ لیا تھا اسی میں رہتے رہے۔ ازمیر کی تنخواہ بہت اچھی تھی ایک دو جگہ پارٹ ٹائم بھی کر لیتے تھے۔ کیوں کہ شادی کا پتا چلتے ہی میر علی نے اپنا ہاتھ مکمل روک دیا تھا اور جب ہر تعلق ختم کر لیا تھا۔ اتنی انا تو کم از کم ازمیر میں بھی تھی بھوکے رہ سکتے تھے اپنا حق بھی مانگنا گوارہ نہیں تھا اور اس وقت میرز کا کس منہ سے کہہ رہے تھے کہ کرائے کے گھر پر ہو' ازمیر کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی۔

"ایک تنخواہ دار بندہ' کرائے کا فلیٹ ہی افورڈ کرے گا۔" اس سے پہلے کہ میرز کا مزید شرمندہ ہوتے مریم نے موبائل لا کر ازمیر کو تھمایا اور مسکرا کر سب کو دیکھتے دوبارہ سے بیٹھ گئیں۔ وہ شکل و صورت چال ڈھال سے بالکل انگریز عورت کی طرح لگتی تھیں لیکن لباس کے ساتھ ان کی زبان نے سب کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ بھلے ٹوٹی پھوٹی گرائمر اور لہجے کے ساتھ مگر اچھی خاصی اردو بول اور سمجھ لیتی تھیں۔ یہ صرف ازمیر کی محبت تھی۔ شادی کے شروع دنوں میں ہی ازمیر نے انہیں اردو بول چال سکھائی تھی۔ اور باقاعدہ وہاں سے زبان سیکھنے کا کورس کیا کیوں کہ جب تک پاکستان آنے کا مکمل ارادہ تھا۔ مگر جیسے جیسے وقت گزرا ارادہ کمزور ہوتا گیا۔ لیکن اردو آپس میں بول چال اور پاکستانی' انڈین کمیونٹی سے میل ملاپ کے سبب خاصی بہتر ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

ماں جان کو لگا یہ ہفتہ پر لگا کر اڑ گیا۔ صرف آٹھ دن کا گزرتے پتا بھی نہیں چلا تھا ازمیر جہاں بیٹھے ہوتے وہ اپنی وہیل چیئر ادھر لے جانے کا کہتیں۔ انہیں دیکھتی رہتیں' بولتے سنتیں اس ایک ہفتہ میں وہ اپنی ہمت سے بہت زیادہ جاگی تھیں۔ مقبل ز کا کو ان کی صحت کی فکر تھی۔ کتنی بار کہا۔

"آپ آرام کریں' آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔"

وہ مسکرا کر پہلے سے زیادہ تازہ دم ہونے لگتیں۔ "ساری زندگی آرام ہی کرنا ہے' اب اسے تو دیکھ لوں۔" ازمیر سے ایک ہی شکوہ تھا۔ بیٹی کو نہیں لایا۔ اگر لے آتا تو کم از کم وہ مل لیتیں۔ پھر جانے کب زندگی میں ملاقات ہو۔

"بس آپ ٹھیک ہو جائیں' بہت جلد ملاقات ہو گی۔ میں یہاں' آپ کے پاس شفٹ ہو جاؤں گا۔" تقریباً" رات کا وقت تھا سب اپنے ٹھکانوں پر جا چکے تھے۔ ازمیر اور مریم کے دور دور بھی نیند کا گمان نہیں تھا۔ صبح ان کی اسلام آباد روانگی تھی۔ رضا حیات کی بیٹی کی منگنی تھی صرف ان کی آمد کی وجہ سے انہوں نے تاریخ آگے کی تھی تاکہ دوست شامل ہو سکے۔ کل شام ماہم کی منگنی اٹینڈ کر کے رات کو وہاں سے ہی آسٹریلیا واپس جانا تھا۔ ماں جان کے پاس ان کی آخری

رات تھی۔ ان سے باتیں کرتے کرتے۔ ان کی وھیل چیئر گھسیٹتے باہر لان میں لے آئے تھے۔ رات کی تاریکی میں چھپا سبزہ، پنجروں میں دبکے پرندے لمحوں میں سناٹا بکھیر رہے تھے۔ بھلے کتنا سناٹا ہو مگر کھلے آسمان پر بھرمار تاروں میں چاند اپنی پوری تابناکی پر تھا۔ مریم کے لیے یہ رات خاصی پراسرار سی تھی۔ اتنا بڑا آسمان جس پر لٹکتے تارے اور چاند کا ہالہ آج سے پہلے نہیں دیکھا تھا زندگی میں اتنے ایڈونچر کیے تھے لیکن کھلی راتوں کے آسمان سے ابھی تک ناواقف رہی تھی۔ آج اسے پہلی بار پتا چلا تھا۔

"رات بہت خوب صورت ہوتی ہے ازمیر۔" ماں جان کی چیئر کے سامنے وہ دونوں نیچے بیٹھ گئے تھے۔ رات کے بڑھتے سحر میں اک عجیب سی بے کلی کروٹیں لینے لگی تھی۔ باربار دھیان روائیبہ کی طرف پلٹتا۔ آسٹریلیا میں صبح ہونے والی ہو گی' جانے وہ کیا کر رہی ہو گی۔ شاید اٹھ چکی ہو' اسکول جانے کے لیے۔ پھر انہوں نے اس کی باتیں ماں جان سے شروع کر دیں۔ حنبل ذکا نے اپنے کمرے کے ٹیرس سے انہیں دیکھا تو خود بھی نیچے ان کے درمیان آگیا۔ اسے ازمیر چچا بہت پسند آئے تھے ان سے باتیں کرنا سننا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"ماں جان' میری بیٹی خود کو بہت بہادر' نڈر' دلیر سمجھتی ہے' لیکن ہم دونوں جانتے ہیں وہ ایسی بالکل بھی نہیں ہے' بہت بونگی ہے' فوراً" باتوں میں آجاتی ہے۔"

"تجھے یاد آ رہی ہے۔" ماں جان کو ان کے انداز سے محسوس ہوا تھا۔ انہوں نے اقرار میں سر ہلا لیا۔

"ہاں..... اتنے دن تو ہم اس سے کبھی بھی دور نہیں رہے' اس کی تنہائی سے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ البتہ اس کی ماں۔" انہوں نے کن انکھیوں سے مریم کو گھورا "اسے بالکل نہیں ہوتی۔"

"ہونی بھی نہیں چاہیے' وہ اس دنیا کا فرد ہے' دنیا کا مقابلہ آنا چاہیے..... وہ ازمیر کی وجہ سے ایسی ہے' اگر میں اکیلی تربیت کرتی تو وہ بہت دلیر ہوتی۔"

حنبل ذکا نے محسوس کیا تھا۔ چچا اس سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ ہر باپ اپنی بیٹی سے محبت کرتا ہے لیکن اس طرح ہر وقت ذکر نہیں جس طرح سے ان کی ہر بات اسی سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتی تھی۔ جس دن آئے تھے میزکا اور حنبل انہیں گاؤں دکھانے لے گئے تھے۔ پہلے سیاسی حلقے سے ملوایا پھر ڈیرے پر لے گئے تب بھی ازمیر نے یہی کہا تھا۔

" روائیبہ کو بے حد شوق ہے گاؤں دیکھنے کا۔ کھیت نہریں بہت اپیل کرتی ہیں اسے..... مجھ سے اکثر پوچھتی رہتی ہے ان سب کے بارے میں۔"

ڈیرے پر تو چاہتے ہوئے بھی ازمیر' مریم کو ساتھ نہیں لے کر گئے تھے۔ کیوں کہ میزکا کی عادت جانتے تھے خواہ مخواہ' غصہ کریں گے البتہ شہر جاتے ہوئے مریم کو ساتھ لے گئے تھے۔ کیوں کہ ساتھ حنبل اور اذلان گئے تھے۔ وہاں کے اندرون شہر سے انہوں نے صرف اپنی بیٹی کے لیے' بہت سی چیزیں خریدی تھیں۔ اس نے کئی بار انہیں روائیبہ کو کال ملاتے اور پھر باتیں کرتے سنا تھا۔ اب رات میں اس کا ذکر کرتے ان کی آواز خواہ مخواہ ہی نم ہو گئی تھی۔

"آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں' وہ بالکل ٹھیک ہو گی..... اور باہر کی بچیاں' بہت دلیر ہوتی ہیں' آپ کو اتنی فکر نہیں کرنی چاہیے۔" حنبل کے تسلی آمیز جملے پر وہ ہلکا سا مسکرائے۔

"بیٹیاں کہیں کی بھی ہوں' حنبل' باپ ان کے لیے پریشان رہتے ہیں۔" جواب تک ان کی زندگی میں ہوتا آیا تھا۔ اس پر کبھی کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ قسمت میں ایسے ہی لکھا تھا اور ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن یہاں آنے اور لوگوں سے مل لینے کے بعد بہت سے پچھتاووں نے انہیں گھیر لیا تھا۔ خاص کر جب سے ہاجرہ کے بارے میں پتا چلا تھا۔

اس کی شادی بہت جلد ہی برادری کے بہترین گھر میں ہو گئی تھی۔ لیکن پرانی طلاق اس کی قسمت کا بدترین داغ بن گئی تھی۔ اس کے شوہر نے اسے بیوی کے طور پر قبول تو کر لیا تھا لیکن بیوی سے پہلے وہ ایک

ٹھکرائی ہوئی عورت تھی اور ٹھکرائی ہوئی عورت ہمیشہ ٹھوکروں کی زد پر رہتی ہے۔ وہ شوہر کے گھر پچیس سال زندہ رہیں اور ان پچیس سالوں میں اس نے پچیس صدیوں برابر کے طعنے ایسے شخص کے حوالے سے سنے تھے جس نے اسے نگاہ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں تھا چھونا تو در کنار' ابھی چند سال پہلے ان کا انتقال ہوا تھا۔ اپنی قسمت کے طعنوں کو انہوں نے اپنا عضو سمجھ لیا تھا۔ جیسے ناک' کان' ہاتھ کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔ ایسے ہی اگر میاں طعنہ دینا بھول جاتے انہیں ادھورہ پن محسوس ہوتا تھا۔ لیکن جب اکلوتی بیٹی مبوبینہ کو صرف بیٹا نہ ہونے کے سبب طعنے ملنے لگے۔ "مرد کی خصلت ہے وہ خود کو برتر ثابت کرنے کے لیے اونچی آواز اور طعنوں کا سہارا لیتا ہے۔ اس کے لیے طلاق یا اولاد سبب ہونا ضروری نہیں اسے اپنی برتری ثابت اور قائم رکھنی ہے وجوہات خود ڈھونڈ لیتا ہے۔" ہاجرہ اپنے طعنے پچیس سال تک برداشت کرتی رہیں لیکن بیٹی کے بے سبب طعنے برداشت نہیں ہوئے دنیا سے رخ پھیر لیا۔ میرزکا کی فیملی مبوبینہ اور شہروز کمال کے آپس کے رویے سے بے خبر تھی مگر ہاجرہ کے حالات زندگی سب پتا تھے۔ اس کی شادی شہر میں ہوئی تھی لیکن میاں لڑ جھگڑ کر اکثر گاؤں چھوڑ جاتا۔ پنچائیت بیٹھتی صلح صفائی کرواتی اور میرزکا کا سر جھک جاتا کیوں کہ اکثر ہی قمرالدین کہتے تھے۔

"ازمیر سے نکاح کی وجہ سے میری بیٹی طعنے سن رہی ہے۔"

باتوں میں ہاجرہ کا ذکر سن کر ازمیر کو بے حد شرمساری ہوئی تھی۔ بے شک وہ ان کی محبت نہیں تھی لیکن منسوب تو تھی۔ ایک شرعی رشتہ قائم ہوا تھا۔ ایک طرف میر علی کا غصہ تھا تو دوسری جانب ازمیر کا احتجاج اور مریم سے محبت اور اس رسہ کشی میں ٹوٹی ہاجرہ تھی۔ اس ٹوٹ پھوٹ کا احساس آج برسوں بعد ازمیر کو ہو رہا تھا۔ دل شدت سے چاہا' کاش! ہاجرہ زندہ ہوتی' وہ خود جا کر اس سے معافی مانگ لیتے۔ مگر اب کچھ بھی ممکن نہیں تھا وقت بیت چکا تھا پیچھے اس کی پھیلائی اندوہناکیاں رہ گئی تھیں۔ قمرالدین کی بیٹی کی یاد آتے ہی' دل شدت سے روائیبہ کے لیے دھڑکا' کھسیاہٹ سے پیشانی رگڑی اور اس کا نمبر ملایا تھا۔ پہلی بیل پر ہی کال ریسو ہو گئی تھی۔ وہ بھی ادھر جاگ رہی تھی۔

"اٹھ گئیں۔۔۔"

"میں سوئی نہیں ڈیڈی۔۔۔ مجھے نیند نہیں آئی۔" اس کی زکام زدہ آواز سے اندازہ ہوتا تھا وہ بہت زیادہ روئی ہے' یا کسی بات پر پریشان ہے۔"

"کیوں نیند نہیں آئی' طبیعت ٹھیک ہے' گلا کیوں بیٹھ رہا ہے تمہارا۔" اس نے جواب نہیں دیا۔

"روائیبہ۔۔۔ کیا بات ہے بیٹا۔" ایسے لگا تھا جیسے وہ بہت رو رہی ہے۔ "آپ کب آئیں گے' ڈیڈی۔" مریم نے ازمیر کے ہاتھ سے موبائل لے لیا تھا۔ اسے ازمیر کی شکل سے اندازہ ہو چکا تھا وہ کیا کر رہی ہو گی' حنبل زکا خاصی کوفت کا شکار ہوا۔

"اگر اتنی ہی نازک بیٹی ہے تو ساتھ لے آتے۔ توبہ کتنا روتی ہے وہ۔" اس نے دل میں سوچا تھا اور مریم تو اچھا خاصا ڈپٹ رہی تھیں۔

"کیا بدتمیزی ہے' کیوں پریشان کر رہی ہو' ڈیڈی کو' نہ آنے کا فیصلہ تمہارا اپنا تھا' اب ہم کال نہیں کریں گے' بس آ کر ملیں گے۔۔۔ اللہ حافظ۔"

"اب افاقہ ہو گیا ہو گا۔۔۔ ایسے ٹھیک ہوتی ہیں رونے دھونے والیاں۔" حنبل زکا دل میں خاصا محظوظ ہوا تھا مگر ظاہر نہیں ہونے دیا۔

☆ ☆ ☆

کل دن میں ان کی اسلام آباد کے لیے فلائٹ تھی جہاں ماہم کی منگنی اٹینڈ کر کے اگلے دن اسلام آباد سے آسٹریلیا چلے جانا تھا۔ رات وہ چاروں لان میں بیٹھے باتیں کرتے رہے کسی کو نیند نہیں آئی تھی۔ فجر کی نماز ادا کر کے کچھ دیر کے لیے لیٹے ناشتے کے بعد ان کے جانے کا سلسلہ چل پڑا تھا۔ ماں جان جس طرح ان کے آنے پر خوش تھیں اب اتنی ہی اداسی چھائی ہوئی

تھی۔ ازمیر سے گلے ملتے بہت دیر ہو گئی تھی مسلسل لپٹائے روئے جا رہی تھیں۔

"میں بہت جلد آجاؤں گا' آپ کے پاس.... پلیز مت روئیں۔" انہوں نے ان کے آنسو صاف کرتے پیشانی چومی' ہاتھوں پر بوسہ لیا۔ "پرامس کریں اب روئیں گی نہیں.... میرا انتظار کریں گی۔" انہوں نے زبردستی مسکراتے ہال میں سرہلایا تھا۔

مریم نے دھاگے کے کام والی میرون چادر لپیٹ رکھی تھی۔ اسے سنبھالنے میں کچھ الجھن ہو رہی تھی مگر سنبھال رکھی تھی۔ جس دن پہلی بار وہ حویلی سے باہر جانے کے لیے نکلی تھیں۔ میر زکا نے آئمہ بیگم سے چادر منگوا کر ازمیر کو دیتے قدرے گھور کر کہا تھا۔

"اوڑھاؤ اسے....."

چادر دیکھتے ہی ازمیر کو حویلی کی بہت سی روایات یاد آ گئی تھیں۔ اسے چادر اوڑھائی گئی جو اس نے مسلسل ایک ہفتہ اوڑھے رکھی تھی۔ بالکل آئمہ بیگم کی طرح دونوں کندھوں پر لپیٹ کر۔ وہ چادر کا پلو سمیٹتے ہوئے ماں جان کے گلے ملنے لگیں۔ چادر سر سے سرکی ماں جان نے بمشکل مگر اس کے سر پر ٹھیک کی۔ "اسے لے کر رکھنا.... ہماری عورتیں.... لے کر رکھتی ہیں۔"

سب سے باری باری مل کر وہ گھر سے نکلے تھے۔ ایئرپورٹ پر حنبل زکا اور خیام زکا دونوں بھتیجے چھوڑنے گئے تھے۔ حنبل کو محسوس ہوا تھا ازمیر کا موبائل بار بار بج رہا ہے اور وہ اٹینڈ نہیں کر رہے۔ تب ہی اسے محسوس ہو گیا تھا یقیناً اس رونی صورت کی کال ہو گی۔ ایسی بھی کیا گود کی بچی ہے' جو ماں باپ کو یاد کرتی روئے جا رہی ہے۔ ایئرپورٹ کے لاؤنج میں انہوں نے اس کی کال بالآخر اٹینڈ کی تھی۔ جندب بول رہا تھا۔

"خدا کے واسطے انکل' ماہم کی منگنی چھوڑیں' آپ واپس آئیں.... ورنہ یہ میرا دماغ کھا جائے گی۔ بلاوجہ روئے جا رہی ہے.... اب مار کھائے گی مجھ سے۔"

"یار میرے اپنے جہاز نہیں چلتے.... جو اڑا کر آجاؤں' کل کی سیٹس بک ہیں' ہم کل....." وہ کچھ کہہ ہی رہے تھے جب روائیبہ نے فون کھینچ لیا تھا۔

"میں اسے کچھ نہیں کہہ رہی' جھوٹ بول رہا ہے یہ.... اور نہ ہی کسی کی یاد آرہی ہے' ماہم کی منگنی کیوں' شادی اٹینڈ کر کے آنا....."

"اچھا.... اگر تم اجازت دے رہی ہو تو' سوچا جا سکتا ہے۔"

وہ جان کر مسکرائے تھے وہ دھاڑ کر بولی۔ "ڈیڈی"

ایئرپورٹ پر اسلام آباد کی روانگی کے اعلانات جاری ہو چکے تھے۔ مسافروں کا رش لاؤنج سے سمٹ کر ڈپارچر کی جانب گروہوں کی صورت میں بڑھنے لگا۔ ازمیر اور مریم بھی ان دونوں سے باری باری ملے۔ بہت سی دعائیں خیال رکھنے کی نصیحتیں کرتے' ہاتھ ہلاتے باقی مسافروں کی طرح آگے بڑھتے گئے یہاں تک کہ رش کی لائن سے نکل کر خاصا آگے چلے گئے۔

☆ ☆ ☆

آسمان سے چاروں طرف سیاہی برس رہی تھی۔ آسٹریلیا کی ہر عمارت اس سیاہی میں چھپنے لگی۔ سارا دن گزر چکا تھا مگر اس کا موڈ بحال نہیں ہو رہا تھا۔ آج صبح اس نے بتایا تھا وہ اسکول نہیں جا رہی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پوچھنے پر کوئی خاص وجہ نہیں بتائی تھی۔ وہ کالج جانے سے پہلے اس کا پتا کرنے آیا تو لینا فیڈرک نے بتایا تھا۔ "وہ کل رات بھی نہیں سوئی' خواہ مخواہ ٹیرس پر پھرتی رہی۔"

"کیوں بدروح بن کر چکراتی پھر رہی ہو۔" اس کا مزاج اس وقت اسے کر کرانے لگا تھا۔

"میں بالکل موڈ میں نہیں ہوں۔"

"میں تو جیسے موڈی بنا فلور پر ڈانس کر رہا ہوں۔"

"پلیز جندب جاؤ۔"

"بات کیا ہے.... وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا" جس دن سے انکل' آنٹی گئے ہیں' تمہارا موڈ آف ہے' کہیں تمہاری کوئی چیز چرا کر تو نہیں لے گئے۔"

"جندب...." اس نے قریب رکھا کشن اس کے سر

پر مارنا چاہا اس نے پکڑ لیا تھا۔
"اچھی بات ہے 'غصہ ماں باپ کا ہتھیار مجھ پر چل رہے ہیں۔۔۔ چلو اٹھو تیار ہو اور اسکول جاؤ۔" آسٹریلیا میں عمومی اسکولنگ اے لیول تک ہے اور وہ اے لیول کے فرسٹ پارٹ میں تھی۔
"مجھے کہیں نہیں جانا' تم جاؤ یہاں سے۔" کہتے ساتھ ہی وہ منہ پر ہاتھ رکھے پھپک کر رونے لگی تھی۔
وہ یک لخت گھبرا گیا تھا۔
"روائیہ۔۔۔" اس نے اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹانے چاہے مگر اس نے سختی سے جمار کھے تھے "پرابلم کیا ہے' بتاتی کیوں نہیں ہو' یار۔۔۔ پلیز۔"
"میرا دل بہت گھبرا رہا ہے جندب۔۔۔ مجھے سمجھ نہیں لگ رہی آخر ہو کیا رہا ہے۔۔۔ بس مجھے اکیلے نہیں رہنا۔ مجھے اکیلے پن سے خوف آتا ہے۔" بیٹھی آواز کے ساتھ وہ آہستہ آہستہ کہتی رہی۔
"تم کیوں اکیلی رہنے لگیں۔ انکل آنٹی کل آجائیں گے۔۔۔ اور پلیز ایسے مت رو۔۔۔ پلیز روائیہ۔"

اس نے بیٹھے بیٹھے اسمتھ اور میرڈین کو کال کی۔ کالج سے چھٹی اور تفریحی پروگرام ترتیب دے دیا تھا۔ وہ اس وقت کہیں بھی جانا نہیں چاہتی تھی۔ مگر وہ اسے زبردستی لے گیا تھا۔ لینا بھی یہی چاہتی تھیں۔ وہ کچھ دیر کے لیے کہیں باہر ہو آئے تاکہ موڈ بہتر ہو۔ لینا فیڈرک بوڑھی مگر متحرک خاتون تھیں۔ تھوڑے سے ٹائم میں انہوں نے پکنک کی مکمل تیاری کی۔ اسے تیار ہونے کا کہا اور کرکٹ کٹ رکھنا بالکل بھی نہیں بھولی تھیں انہیں پتا تھا کرکٹ اس کا جنون ہے' کرکٹ کھیل کر اس کا موڈ اچھا خاصا بحال ہو جاتا ہے۔ اور اسی لیے جندب نے ملبورن اسٹیڈیم جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ آدھے راستے میں اس نے واپسی کی رٹ لگا دی تھی۔
"یوٹرن لو اور چلو۔۔۔ میرے سر میں درد ہے۔"
"یار آج نیشنل ٹیم کا انڈر ناٹنٹین کے ساتھ میچ ہے۔۔۔ ہم انجوائے کریں گے۔۔۔ واٹسن آیا ہوا ہے۔۔۔

وہ تو تمہارا فیورٹ ہے ناں۔۔۔"
"میرے فیورٹ میرے ماں باپ ہیں اور بس۔۔۔ وہ کل آجائیں گے۔۔۔ مجھے گھر پر کچھ سرپرائز کام کرنے ہیں ان کے لیے۔۔۔ تم گاڑی ٹرن کرو۔"
"ہوتے رہیں گے کام۔۔۔" جندب نے اسے گھرک کر گاڑی کی رفتار آہستہ کرتے اپنی جیب سے موبائل نکالا تھا۔ اسکرین اور اسمتھ کا ٹیکسٹ تھا۔
"اسٹیڈیم نہیں میوزیم میں آجاؤ' ہم دونوں ادھر ہیں۔" نیشنل میوزیم ملبورن اسٹیڈیم کے بالکل قریب ہے۔ پیدل بھی چند منٹ میں پہنچا جاسکتا ہے اس نے گاڑی میوزیم کے بجائے اسٹیڈیم کی پارکنگ میں کھڑی کی تھی۔ اسمتھ گیٹ ٹو پر ہی مل گیا تھا اور تفصیل بتاتا آرہا تھا۔
"میچ کی ٹکٹس ساری فروخت ہو چکی تھیں اسی لیے ہم میوزیم میں آگئے۔"
کھیلوں کے اعتبار سے صحت مند قوم آسٹریلین اپنی عوام کو ترغیب دینے اور مزید دلچسپی پیدا کرنے کے لیے نہ صرف مواقع پیدا کرتی ہے بلکہ ایسے تفریحی مقامات بنا رکھے ہیں جہاں کی سیر کرنے کے بعد شوق نہ ہو تب بھی کھیلنے کی تحریک خود بخود ابھرتی ہے ایسا ہی خوب صورت نیشنل اسپورٹس میوزیم ہے۔ تمام کھیلوں کی مکمل معلومات' استعمال ہونے والا سامان دلکش بناوٹ کے ساتھ شیشے کے ریکس میں سجا دیکھنے والوں کو متوجہ کرتا ہے۔ کرسٹل سے بنے کسی کیبن سے فٹ بال کی مکمل معلومات دی جارہی تھیں' کسی کیبن میں مختلف ربوٹ اتھلیٹس کے مظاہرے کررہے تھے۔ یہاں آکر وہ سب من پسند کیبنز میں بٹ گئے تھے۔ وہ دروازے کے دائیں جانب بنے کرکٹ کیبن میں آگئی۔
سفید ماربل پیچ پر کرسٹل کے بنے چھوٹے چھوٹے ربوٹ کرکٹ کھیل رہے تھے۔ بیک گراؤنڈ میں کمنٹری' تالیاں' ہجوم کا شور لیزر لائٹ کے ذریعے ان پر افیکٹ (اثر) ڈال رہا تھا بڑے سے کیس میں بند یہ ٹھری ڈی مصنوعی اسٹیڈیم دیکھنے والوں کی نگاہوں کا

مرکز تھا۔ وہ سینے پر ہاتھ لپیٹے بہت دیر بونوں کی کرکٹ دیکھتی رہی چہرہ بے تاثر تھا۔ بونے ربوٹ آسٹریلین ٹیم کے مشابہ بنائے گئے تھے۔

"یار بریٹلی کو ربوٹ صحیح کاپی نہیں کر رہا۔" جندب پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کے برابر آکھڑا ہوا تھا "واٹسن ایک دم فٹ ہے' لفٹ شارٹ اسی کی طرح اٹھایا ہے.... ہیں ناں...." اس نے تائیدی نگاہ اس کی جانب اٹھائی وہ بالکل خاموش تھی۔ نچلا ہونٹ اندر کی جانب سے کاٹتی۔ آنکھیں سکیڑے وہ پھر مخل ہوا تھا۔

"میں تم سے بات کر رہا ہوں.... کہاں ہو تم؟" اس کی نگاہیں اسی طرح ہنوز جمی تھیں۔ وہ قدرے زور سے بولا۔

"روائیبہ....!"

"ہاں.... آں۔" وہ چونک گئی لمبی پلکیں اٹھا کر ایسے دیکھا تھا جیسے اس نے کچھ بھی نہ سنا ہو۔

"کہاں کھو گئی تھیں۔"

"کہیں نہیں۔" اس کے بے نیازی سے شانے اچکانے پر وہ اس کے دو بدو آکھڑا ہوا۔ آنکھیں آنکھوں میں جما دیں۔

"تم جب جب پریشان یا الجھی ہوئی ہوتی ہو' مجھے الہام کی صورت پتا چل جاتا ہے' لیکن کیوں' کس وجہ سے یہ کوشش سے بھی نہیں بوجھ سکتا' پلیز بتاؤ کیوں پریشان ہو۔"

"تمہیں کس نے کہا ہے' مجھ پر ریسرچ کرنے کو۔"

"میرے دل نے۔" جندب کے قطعی انداز پر اس نے اپنی نگاہوں کا رخ بدلتے قدرے پہلو بدل لیا تھا اور وہ دھیرے دھیرے کہے جا رہا تھا۔

"انسان جس سے محبت کرتا ہے' لاشعوری طور پر اس کی فکر کرنے لگتا ہے' اور میں تمہارے لیے فکر مند ہوں' تم خواہ مخواہ میں اداس ہو' یا اس کی کوئی خاص وجہ۔"

وہ اس کے پہلے جملوں پر ہی الجھ کر رہ گئی تھی۔ یوں اتنے آرام سے وہ بہت کچھ کہہ دے گا' یہ سب اس کی سوچ سے باہر تھا۔ "ہو سکتا ہے وہ کچھ اور کہنا چاہ رہا ہو اور منہ سے یہ سب نکل گیا یقیناً" ایسا ہی ہوگا "میری خاموشی پر وہ پریشان ہے' بس اتنی سی بات ہوگی۔" اس نے فوراً" ذہن کو جھٹکا اور پھیکا سا مسکرائی۔

"میری فکر کرنے کے لیے میرے والدین ہیں' تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ گہرا سانس لے کر بہت سکون بھرے انداز میں بولی تھی۔

"رہی میری خاموشی کی وجہ تو ممی ڈیڈی کے جانے سے میں ڈسٹرب ہوں' کسی چیز میں دل نہیں لگ رہا' یہاں تک کہ پڑھائی میں بھی.... میرے سارے ٹیسٹ بھی خراب ہو رہے ہیں' بہت سا کام مزید پینڈنگ (التوا) میں ہے.... اگر وہ مزید لیٹ ہو گئے' میں فیل ہو جاؤں گی جندب.... میں اس لیے پریشان ہوں ٹیچرز نے مجھے پیپرز کے لیے وارن کیا ہے۔"

"تمہارا استیاناس.... یو فول۔" جندب کو یک لخت اس پر ڈھیر سا غصہ آیا تھا۔ وہ کتنے دن سے سوچ سوچ کر ہلکان تھا ایسا کیا ہو گیا جو وہ کسی کو کچھ نہیں بتا رہی بات بے بات رونے لگ جاتی ہے۔ اب پتا چلا محترمہ کے نا صرف ٹیسٹ خراب ہو رہے ہیں بلکہ ٹیچرز نے والدین کو کال کیا ہے۔ اس کا جی چاہا روائیبہ کا سر بونوں کے کرکٹ کیس میں دے مارے۔ وہ مار بھی دیتا اگر عین اسی وقت لینا فیڈرک نہ آجاتیں۔ انہوں نے پکنک بیگ میں چاکلیٹی مِف اور جوسز رکھے تھے۔ وہ انہی کی دعوت دینے آئی تھیں۔ کیوں کہ میوزیم میں کچھ بھی کھانا پینا سختی سے منع ہوتا ہے۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے کیبن سے باہر نکلے تھے۔ وہ چلتے ہوئے اسے ڈپٹ رہا تھا۔

"پہلے نہیں بتا سکتی تھیں' ٹیسٹ خراب ہو رہے ہیں۔ انٹول سے پہلے یہ تمام کلیئر کرنا پڑیں گے۔ میں روزانہ آتا ہوں' جو کنفیوژن تھی سمجھ لیتیں۔"

لینا فیڈرک اسمتھ اور میرڈین کو کئی کیبنز میں دیکھ چکی تھیں۔ وہ ادھر کہیں نہیں تھے۔ تب ہی انہوں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے' وہ دونوں باہر ہوں۔" جندب نے لاپروائی سے شانے اچکائے کوریڈور سے باہر کی جانب بڑھے وہ دونوں اسٹیپس پر بیٹھے پیسٹریز کھا رہے تھے۔ جندب کو پہلے ہی غصہ چڑھا تھا کچھ انہیں ہنستے کھاتے دیکھ کر مزید چڑھ گیا۔ تیز تیز ان کی جانب بڑھا سامنے جا کھڑا ہوا۔

"میرا خیال ہے' ہم اکٹھے پکنک پر آئی ہیں۔"

"تو..." اسمتھ نے تجاہل عارفانہ سے کہا۔

"تو یہ' اکیلے کھاتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔"

"نہیں آنی چاہیے..." اسمتھ نے مسکرا کر ایک نظر میرڈین کو دیکھا پھر اسے "میں صرف اپنی گرل فرینڈ کو افورڈ کر سکتا ہوں' پوری فرینڈز لسٹ کا ٹھیکا نہیں اٹھایا۔"

جندب تو کچھ نہیں بولا البتہ میرڈین کی نیلی آنکھیں پوری پھیل گئی تھیں منہ غصے سے پھٹا۔

"واٹ... گرل فرینڈ...!"

اس نے ہاتھ میں پکڑی پیسٹری اس کے منہ پر مل دی "آئندہ سوچ کر بولنا۔" وہ کہتے ہوئے اسے دو مکے مار وہاں سے اٹھی۔ اسمتھ کے سیاہ چہرے پر کریم کا سفید لیپ اسے مضحکہ خیز بنا رہا تھا۔ اس نے کریم سے بوجھل پلکیں جھپک جھپک کر باری باری سب کو دیکھا۔ سب اس کی حالت پر ہنس رہے تھے۔ ان سب کی ہنسی میں جندب کی ہنسی اسے سب سے بری لگی اپنے منہ سے بہت سی کریم اتار کر اس کے چہرے پر پھیر دی اور تب روائیبہ بہت زور سے ہنسی تھی۔ منہ پر ہاتھ رکھے زور سے ہنسنے سے چہرہ سرخ پڑ گیا تھا اور آنکھیں نم۔

"اگر آنکھیں گیلی نہ کرو' تب بھی تم ہنستے ہوئے بہت اچھی لگتی ہو۔" جندب نے کہتے ہوئے کچھ کریم اس کے رخسار پر بھی لگا دی تھی۔ لینا فیڈرک بچوں کی شرارتوں کو انجوائے کر رہی تھیں۔ چاکلیٹی مف نکال کر ان سب کو دیے۔ اچھا وقت گزرنے سے بوریت خاصی دور ہو گئی تھی۔ جیسے جیسے اندھیرا آسٹریلین عمارتوں پر اترنا شروع ہوا روائیبہ کا دل پھر سے ڈوب رہا تھا۔ ممی ڈیڈی شدت سے یاد آنے لگے۔

اسمتھ' میرڈین اکٹھے آئے تھے۔ واپسی پر بھی ساتھ چلے گئے لینا فیڈرک کو ایک کام کے سلسلے میں کہیں جانا تھا۔ وہ کچھ دیر میں گھر پہنچنے کا کہہ کر نکل گئی تھیں اور وہ دونوں اکٹھے آ رہے تھے تب ہی جندب نے ازمیر کو کال ملائی اور یہ کنفرم ہو گیا تھا۔ ان کی کل کی سیٹیں بک ہیں۔ جب تک لینا فیڈرک گھر نہیں پہنچیں۔ جندب اس کے ساتھ رہا تھا۔ فزکس کے نیومیریکلز سمجھائے اور اس کے پینڈنگ (ملتوی) کاموں کی ترتیب لگا کر شیڈول بنا کر دیا کہ کیسے کیسے یہ سب پورا ہو جائے گا۔ درمیان میں اس نے ایک دو بار پاکستان کال کی لیکن رضاحیات کا نمبر بزی ملا تھا۔ ماہم سے بات کرنے کو جی چاہا وہ ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ پھر یہ سوچ کر وہ سب فنکشن میں مصروف ہوں گے اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور لینا فیڈرک کے آنے پر وہ ہاسٹل چلا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ہاجرہ کی برسی پر وہ لمبے عرصے کے بعد میکے آئی تھی۔ حویلی سے میرزا نے شرکت کی تھی۔ انہوں نے ہی ازمیر کی آمد اور روانگی کا باتوں میں تذکرہ کیا تھا۔ سبرینہ کو ازمیر کے تذکرے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ماں سے ان کی آسٹریلین داستان سن رکھی تھی۔ وہ اس وقت کسی اور وجہ سے الجھی ہوئی تھی۔ سب مہمانوں کے چلے جانے کے بعد اس کا دل چاہا کہ وہ بھائیوں سے پوچھے آخر وہ اتنے چپ چپ کیوں ہیں۔ کیوں کہ آج سے پہلے وہ جب بھی آئی تھی اسے خاص پروٹوکول دیا جاتا تھا۔ ایک تو وہ اکلوتی بہن تھی دوسرا شہروز کمال ان سے کئی درجے امیر اور اونچی ناک والا لگتا تھا۔ اس کی آمد پر سب ہائی الرٹ ہو جاتے۔ کوئی بات اسے ناگوار نہ گزرے' خاطر مدارت میں کوئی کمی بیشی نہ رہ جائے۔ حالانکہ وہ سسرال میں اپنے مزاج کا دسواں حصہ بھی ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔ بس خاموش چپ چاپ بیٹھ' ایک دو بات کر' اٹھ کر چلا جاتا تھا۔ پھر

بھی اس کی بہت عزت تھی۔ لیکن آج کچھ الگ تھا۔ جیسے وہ چپ بیٹھا رہا۔ وہ بھی چپ رہے پہلے کی طرح بچھ بچھ نہیں گئے وہ دعا کے بعد چلا گیا تھا۔ سبرینہ اور بچیاں ابھی وہاں ہی تھیں اور بھائیوں کا رویہ ہنوز سرد' آخر سبرینہ نے بڑے بھائی عقیل سے پوچھ ہی لیا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے' ناں....."

"ہاں اللہ کا شکر ہے۔" بڑی بھابھی نے چائے لا کر میز پر رکھی۔ وہ اپنا کپ اٹھا لاتعلق سے بنے گھونٹ گھونٹ پینے لگے۔ سبرینہ کو چائے تھما کر بھابھی ساتھ بیٹھ گئی تھیں۔

"پھر آپ اتنے چپ چپ کیوں ہیں.... شکیل بھی الگ الگ پھر رہا ہے۔" اس سے پہلے عقیل جواب دیتے بھابھی بول پڑیں۔

"شہروز نے اچھا نہیں کیا....."

"کیا....؟" کیا کہتے ہوئے سبرینہ اچھی خاصی چونک گئی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا شہروز کمال کی حرکتیں اس کے گھر والوں پر عیاں ہو جائیں گی۔ ابھی چند ہفتے پرانی بات تھی جب شام کے وقت ایک اجنبی نمبر سے اسے کال آئی تھی۔ لڑکی نے روتے ہوئے اپنا نام عینی بتایا تھا۔ اور پھر وہ تمام تفصیل جو کچھ شہروز کمال اور اس کے درمیان ہوا کس طرح وہ اس پر ملتفت ہونے کے بعد بلیک میل کرنے لگا اور اب باپ کی وفات کے بعد وہ دھمکیوں پر اتر آیا ہے کہ وہ اس پر تیزاب پھینکوا دے گا' محلے میں بدنام کر دے گا۔ اس کے زارو قطار رونے پر سبرینہ بھی تلخ ہو گئی تھی۔

"یہ سب کچھ تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھا' کوئی مرد خواہ مخواہ پیش رفت نہیں کرتا' عورت اپنی کمزوری اس کے ہاتھ تھماتی ہے۔"

"مانتی ہوں مجھ سے غلطی ہو گئی' مسائل سے گھبرا گئی تھی.... لیکن پلیز میری اس سے جان چھڑا دیں۔"

"شہروز کمال کوئی معمولی چیز نہیں ہے' جس کے شکنجے سے تم با آسانی بچ جاؤ' پیسے کے معاملے میں وہ ایسا ہی ہے' اگر تم پر اس نے پیسہ لگایا ہے' وہ وصول بھی کرے گا۔" سبرینہ کے چبا چبا کر بولنے پر اس کی ہچکیاں جھٹکے سے رکیں۔

"ہاں اس نے جو چند ہزار مجھے دیے ہیں' میں اس کے منہ پر ماردوں گی' میں یہ شہر چھوڑ کر اپنے دور پار کے رشتہ داروں کے ہاں جا رہی ہوں۔ آپ کو فون اس لیے کیا تھا۔ آپ کا میاں سائیکو ہے' اس کا علاج کروائیں' اسے خوب صورت بیوی' بیٹا اور ہر چیز اپنی مٹھی میں چاہیے' اس کی خواہشات آپ کو پوری کرنی چاہئیں نہ کے کسی دوسرے کو۔" اس نے فون کھٹ سے بند کر دیا۔ بیٹے تک تو اسے سمجھ میں آتی تھی کہ وہ اس کی دسترس سے باہر ہے لیکن خوب صورت بیوی؟ وہ خوب صورت تھی' شہروز کمال نے خوب صورت رہنے نہیں دیا تھا اس کی دن بدن بڑھتی تلخیوں نے اسے ہر چیز سے اچاٹ کر دیا وہ اپنا منہ تک دھونا بھول جاتی تھی۔

عینی کے بارے میں اس نے شہروز سے سرسری باز پرس کی اس نے خونخوار انداز میں گھور کر دیکھا تھا۔ وہ اندر تک دہل گئی۔

"میں نے کہا تھا ناں' دوسری شادی کے لیے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں۔"

"کیوں ضرورت نہیں.... بیوی ہوں تمہاری.... تمہارے بچوں کی ماں۔"

"بچوں کی نہیں' بچیوں کی۔" اس نے انگشت اٹھا کر تصحیح کی پھر زور سے بولا تھا "اور جاؤ شور ڈالو اپنے خاندان کو بتاؤ' بھائیوں کو بتاؤ' مجھے روکیں' ماریں پیٹیں۔"

وہ بہت اچھی طرح جان گیا تھا سبرینہ کسی کو کچھ نہیں بتائے گی۔ اگر بتا بھی دے وہ کون سا کسی سے ڈرتا تھا اور ایسا ہی تھا۔ سبرینہ کو اپنی عزت اپنا وقار میکے میں بہت عزیز تھا ماں کے سامنے کبھی اپنا دل کھول کر رکھ دیتی تھی لیکن بھائی بھابھیوں کو بھنک تک نہیں پڑنے دی۔ اب یوں بھابھی کے منہ سے سن کر "شہروز نے اچھا نہیں کیا" اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔

"کیا اس لڑکی نے یہاں بھی فون کیا ہے' یا انہوں نے خود کچھ دیکھ لیا ہے۔" اس کے منہ سے کھوکھلا سا "کیا" نکلا تھا۔ اور اس "کیا" ادا کرنے میں اس نے کتنی دعا کی تھی اس کا بھرم میکے میں رہ جائے اور واقعی مجبور دل کی دعا قبول ہو جاتی ہے اور قبول ہو گئی تھی وہ کچھ اور بتا رہی تھیں۔

"تمہارے بھائی نے اسے تجربہ کار سمجھ کر ایک مشورہ مانگا اور دیکھو انہیں فیکٹری کے نقص بتا دیے' خود اندرون خانہ وہ خرید رہا ہے۔ ایسے ہوتے ہیں بہنوئی۔"

"چھوڑو اس بات کو۔" عقیل نے بیوی کو سرسری سا منع کیا۔

"کون سی فیکٹری... کون سا مشورہ۔" سبرینہ نے دونوں کو باری باری دیکھا تھا۔ بھابھی نے پوری تفصیل سنا دی۔ وہ اندر تک شرمندہ ہوئے جا رہی تھی۔ عقیل اپنا خالی کپ ٹیبل پر رکھتے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا۔

"دکھ اس بات کا ہے' اپنوں کے سامنے شرمندہ کروا دیا' کیا سوچتے ہوں گے حنبل اور خیام۔" انہیں رہ رہ کر وہ دن یاد آ رہا تھا جب حنبل ذکا کا فون سن کر پہلی فرصت میں اس سے ملے اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر صاف شہوز کمال کی پیشکش کا بتا کر کہا تھا۔

"بڑا دوغلا بندہ ہے وہ۔"

"نہیں نہیں یار۔" عقیل نے بہنوئی کی عزت رکھنے کے لیے جھوٹ بولا "دراصل ہمارا اپنا ارادہ بدل گیا تھا' اس نے ہم سے پہلے پوچھا تھا' پھر ہم سے بات کی۔" اس کی صفائی پر حنبل ذکا کی استہزائیہ مسکراتی آنکھیں انہیں اندر تک شرمندہ کر گئی تھیں۔ اس وقت بھی وہ شرمندگی غصہ دلا رہی تھی۔ انہوں نے اپنا غصہ قابو کرتے بہن کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"بہرحال تم اس سے ذکر مت کرنا' تمہارا نازک رشتہ ہے اس سے' خواہ مخواہ رنجش آئے گی۔"

سبرینہ اپنی رنجش اور رشتے کا کیا بتاتی دن میں کتنی بار کس کس طرح سے اس کے سامنے ذلیل ہوتی ہے۔ ہلکا سا اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

حنبل اور خیام انہیں رخصت کرنے کے بعد فیکٹری چلے گئے تھے وہاں کئی کام بھگتا کر گاؤں کے لیے نکلے تھے۔ راستے میں ہی حنبل ذکا نے خیام کو شہوز کمال کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی بدمزا ہو گئے۔ "مجھے تو پہلے دن سے ہی خالہ ہاجرہ کا داماد پسند نہیں' عجیب اکھڑ' بددماغ آدمی ہے۔"

"بددماغ تو نہ کہیں' بڑی تیز چیز ہے۔" اس نے استہزائیہ ابرو اٹھا کر خیام کو دیکھا۔ انہوں نے تنفر سے گردن جھٹک دی۔

"خیر عقیل نے کیا کہا' سن کر۔"

"کیا کہنا تھا' کھسیاتے ہوئے بات بنا رہے تھے' کہ وہ انٹرسٹڈ ہی نہیں خریدنے میں۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے' ہمیں اپنی چیز فروخت کرنا ہے' جو مرضی خرید لے' تم اپنی مرضی کا ریٹ لگاؤ شہوز کو۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں' وہ تیز ہے تو ہم بھی بے وقوف نہیں ہیں۔"

حنبل ذکا نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی تھی۔ سورج ابھی پوری طرح سے ڈوبا نہیں تھا البتہ اس کی شعاعوں میں نارنجی سی نرمی بکھر رہی تھی۔ جیسے جیسے گاؤں کی فضا شروع ہوئی ہوا میں سبزے کی تازگی اور مخصوص مہک کا تناسب بڑھ چکا تھا۔ حویلی کو جاتی چوڑی سڑک کے دونوں اطراف سنبل کے درختوں پر بہار اپنے جوبن پر تھی۔ سردی نے ان کے سارے پتے زرد کر کے جھاڑ دیے تھے۔ مارچ کے شروع ہوتے ہی ٹنڈ منڈ شاخوں پر ٹھہرے سرخ پانچ پتوں کے بڑے بڑے پھول موسموں کے بدلنے کی آمد کا پتا دیتے یہ بھی بتا رہے تھے۔ بہار کے موسم میں ٹھہراؤ نہیں ہے بالکل تیز گام ایسے مسافر کی طرح جو بہت انتظار کے بعد آئے بنا ٹھہرے گزر جائے اور اس کے پیچھے رہ جانے والی بہت گرم جھلسا دینے والی ہوائیں ہوتی ہیں۔ ہلکی ہلکی ہوا سے ٹنڈ منڈ شاخوں سے سنبل کے پھول بارش کی طرح برس رہے تھے۔ سرخ بارش کو دیکھ کر حنبل ذکا کے بھرے ہونٹوں پر مسکان ٹھہر گئی۔ اسے اس

وقت ازمیر چچا کی بات یاد آرہی تھی۔ وہ دن پہلے وہ اسی سڑک سے گزر رہے تھے تب ازمیر نے ان درختوں کو دیکھ کر کہا تھا۔

"یار مجھے مارچ کا مہینہ صرف ان درختوں کی وجہ سے پسند تھا' ڈوبتے سورج کے وقت انہیں دور سے دیکھو' تو ایسے لگتا تھا جیسے کھیتوں کی شادی ہو رہی ہو۔" ان کے دلچسپ قیاس پر حنبل ذکا اچھا خاصا مسکرایا تھا۔

"سچ کہہ رہا ہوں یار' جب میں پانچ چھ سال کا تھا تب ابا جی یہی کہا کرتے تھے مارچ کھیتوں کی شادی کا موسم ہے' فروری میں سرسوں پیلا جوڑا پہناتی ہے مارچ میں سنبل کے درخت سرخی سے لد جاتے ہیں ... اور ہمارا رزلٹ بھی مارچ کی آخری تاریخ میں نکلتا تھا' میں اپنی جیبوں میں یہ پھول بھر کر لے جاتا تھا ماسٹر صاحب کے لیے اور ماں جان کے بالوں میں بھی لگا دیتا تھا۔" بچپن کو یاد کرتے ازمیر کے چہرے پر بے پناہ خوب صورتی تھی۔

"اس کا مطلب ہے تمہارا فیورٹ ریڈ رنگ کی وجہ یہ سنبل کے پھول ہیں۔" پچھلی نشست سے مریم کے کہنے پر انہوں نے مسکراتے ہوئے اپنا سر سیٹ بیک پر ٹکالیا۔

"انفیکٹ" (یقیناً) یار زندگی مارچ میں ہے' یہیں ٹھہر جانی چاہیے ... تم ایسا کرنا۔" وہ سیٹ سے قدرے آگے ہوتے ہوئے حنبل ذکا کو دیکھ کر بولے تھے۔

"اپنی شادی مارچ میں پلان کرنا' بیک گراؤنڈ میں یہ درخت زبردست فوٹو شوٹ آئے گا۔"

اپنی شادی کے ذکر پر حنبل کی پوری آنکھیں تحیر سے مسکراتے ہوئے پھیلیں۔

"یعنی آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں' مجھے شادی کے لیے مزید ایک سال انتظار کرنا ہو گا۔" کچھ توقف سے اس نے استفسار کیا تھا "ویسے تب آپ آئیں گے ناں"

"تم بلاؤ گے تو ضرور آؤں گا۔"

"ہر بار ہمیں بلانا پڑے گا آپ خود سے نہیں آئیں گے۔" ازمیر یک لخت پھیکا سا مسکرائے۔

"میرا یہاں سے جانے کو دل نہیں کر رہا اگر روائیبہ وہاں نہ ہوتی یقیناً "میں اپنا پروگرام بدل دیتا۔"

"نہیں ازمیر' ہمیں حنبل کو وقت دینا چاہیے شادی کی تیاری کے لیے' اتنے ہم بھی اچھی سی تیاری کر آئیں گے۔"

مریم نے ذو معنی مزاح اختیار کرتے ازمیر کی افسردگی دور کی تھی۔ شادی کے ذکر پر پہلی بار حنبل ذکا کے چہرے پر سرخی پھیلی تھی جو اس وقت خیام کے ساتھ بیٹھے یاد آتے ہی پھر سے پھیل گئی۔ خیام نے فوراً پوچھا تھا۔

"کیا بات ہے' کیوں مسکرائے جا رہے ہو؟"

"چچا سنبل کو دیکھ کر کہہ رہے تھے کھیتوں کی شادی کا موسم آگیا ہے۔"

"کھیتوں کی شادی کا تو کہہ دیا' تمہاری شادی کی کوئی بات نہیں کی انہوں نے۔" خیام ذکا کے سوال پر وہ ذرا بھی نہیں چونکا البتہ مسکرایا ضرور تھا۔

"میری شادی کا وہ کیوں کہیں گے' آپ بات کریں بابا سے۔"

"واقعی ...!" حنبل کے منہ سے پہلی بار شادی کا تذکرہ سنا تھا وہ بھی مسکراتے اثبات کے ساتھ' خیام کہیں اندر تک خوشی و طمانیت سے بھر گئے تھے۔ کیوں کہ اب آمنہ بیگم اکثر ہی زور ڈالتیں۔

"سلویٰ اور حنبل کی یہی عمر ہے شادی کی اور کتنا لیٹ کریں گے' میرے بھائی بھی اس فرض سے فارغ ہونا چاہتے ہیں۔"

اس وقت خیام ذکا نے پکا ارادہ کیا تھا آج گھر جاتے ہی بابا سے یہ بات کرنی ہے' جتنی جلدی ہو یہ کام ہو جانا چاہیے۔

☆ ☆ ☆

گہری سبز لینڈ کروزر حویلی میں داخل ہونے کے کچھ دیر بعد ہی میر ذکا کی کار اندر داخل ہوئی تھی۔ تب تک حنبل اور خیام لاؤنج میں پہنچ چکے تھے' آمنہ بیگم فون کان کو لگائے بیٹھی تھیں شاید سبرینہ سے اپنے نہ آنے کی معذرت کر رہی تھیں۔ اذلان ایل سی ڈی پر

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

اسپورٹس چینل دیکھنے میں محو تھا۔ ماں جان وہیل چیئر پر لاؤنج اور سٹنگ روم کے درمیانی دروازے میں رکی تھیں۔ ان دونوں کو دیکھ کر کھلا سا مسکرائیں۔

چھوڑ آئے اُسے۔۔۔

عقب سے ان کی آواز پر وہ مڑا پھر قدم قدم ان کے قریب آگیا۔

اٹھ گئیں آپ۔۔۔؟

"یہ تو جی سوئیں ہی نہیں۔۔۔ جب سے آپ گئے تھے ایسے ہی بیٹھیں ہیں' آپ کو دیکھ کر کہا مجھے باہر لے جاؤ' میں لے آئی۔" اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر وقت دیکھا قدرے سختی سے بولا تھا۔

"کیا مطلب ہے' چار گھنٹے ہو گئے ہیں' تب سے بیٹھی ہیں حد ہو گئی زینب۔"

"وہ پہنچ گیا اطلاع دی اس نے۔"

"انہیں پہنچے ہوئے بھی کئی گھنٹے ہو چکے ہیں۔ یہ تو اسلام آباد ہے۔" ماں جان کو کہہ کر وہ آمنہ بیگم کو کچھ کہنے کے لیے مڑا تھا تب ہی میرز کا تیز تیز اندر داخل ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ انہوں نے ایک نظر میں سب کو دیکھا تھا نگاہ بوڑھی ماں کے چہرے پر ٹھہر گئی۔ اشارے سے زینب کو کہا تھا۔

"انہیں اندر لے کر جاؤ۔"

ان کے چہرے سے حنبل کو کسی انہونی کا اندازہ ہو چکا تھا ماں جان کے وہاں سے ہٹتے ہی وہ ان کے قریب آیا۔ "کیا بات ہے' سب خیریت تو ہے نا؟؟"

"اس کی فلائٹ نمبر کیا تھا؟" حنبل کو اچنبھا سا لگا تھا۔ وہ رک کر بولا۔

"شاید 202۔۔۔ کیوں خیریت۔" وہ منہ سے کچھ نہیں بولے صرف نفی میں ایسے سر ہلا رہے تھے جیسے انہیں یقین نہ آرہا ہو۔ پھر ایل سی ڈی کی جانب مڑے تھے۔ وہاں کرکٹ میچ دیکھ کر وہ تند لہجے میں بولے تھے۔

"ہر وقت یہ بکواس دیکھتے رہتے ہو' لگاؤ خبروں پر۔۔۔" ان کی غصے سے پھٹتی آواز پر ازلان سمیت سارے ہی لرز گئے تھے۔ اس گھر کے مردوں کی ایسی ترش آواز عام حالات میں نہیں نکلتی تھی۔ "یقیناً" کچھ بہت زیادہ ہو چکا تھا۔ ازلان نے ادھر ادھر ریموٹ کی تلاش میں نظر دوڑائی۔ اعشال نے آگے بڑھ کر کارپٹ سے ریموٹ اٹھا کر چینل تبدیل کیا تھا۔ پوری اسکرین سیاہ تھی جس کے درمیان میں بڑے حروف میں لکھی پٹی چل رہی تھی۔

"فیصل آباد سے اسلام آباد روانہ ہونے والی ایئربس A-202 مارگلہ ہلز سے ٹکرا کر تباہ' جہاز میں 157 مسافر سوار تھے' بہت سی اموات کا خدشہ' بڑے پیمانے پر ریسکیو آپریشن جاری۔"

سیاہ اسکرین کے کونے سے علامتی جہاز ابھرتا مصنوعی پہاڑوں سے ٹکرا کر سرخ دھوئیں میں بدل رہا تھا۔ چینل کا نمائندہ پیشہ ورانہ انداز میں سنسنی پھیلا کر قیامت صغریٰ دکھا رہا تھا۔ جہاز کے مختلف حصے شدید آگ کی لپیٹ میں تھے۔ ریسکیو ٹیمیں' پولیس اور بہت سے لوگ ادھر ادھر کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔ ایمبولینسز کے سائرن' نمائندے کے جملوں کی بازگشت' دل دہلا دینے والا ساز' روتے پیٹتے لواحقین ایسی قیامت کا پتا دے رہے تھے جو ابھی کس کس پر کس کس طرح سے ٹوٹنی تھی۔ اس خبر کو نشر ہوتے گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ میرز کا نے اپنی گاڑی کے ایف ایم پر بریکنگ نیوز سنی تھیں۔ انہیں پورا یقین تھا کہ یہ کوئی دوسری فلائٹ ہوگی لیکن جب حنبل نے فلائٹ نمبر بتایا اور وہی نمبر اسکرین پر بار بار چل رہا تھا ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا تھا دماغ میں جھکڑ چلنے لگے۔

"آئندہ کبھی نہیں آؤں گا' اور اگر آیا' اللہ کی قسم واپسی نصیب نہ ہو۔" میرز کا نے آنکھیں سختی سے بھینچ کر زور سے سر جھٹکا تھا۔

"واپسی کی کیا بات کرتے ہو' تمہارے جیسے بے شناخت کو یہاں وہاں کوئی زمین قبول نہیں کرتی۔"

میرز کا کی سانسیں اٹکنے لگیں۔ اس وقت اسکرین پر مسافروں کی فہرست چل رہی تھی۔

(باقی آئندہ)

☼ ☼

Downloaded From Paksociety.com
ناولٹ
صدف آصف
دم قدم
WWW.PAKSOCIETY.COM

میرا کچھ سامان تمہارے پاس پڑا ہے
ساون کے کچھ بھیگے بھیگے دن رکھے ہیں
اور میری اک خط میں لپٹی رات پڑی ہے
وہ رات بجھادو
میرا وہ سامان لوٹادو
پت جھڑ ہے کچھ... ہے نا؟
پت جھڑ میں کچھ پتوں کے گرنے کی آہٹ
کانوں میں اک بار پہن کے لوٹ آئی تھی
پت جھڑ کی وہ شاخ ابھی تک کانپ رہی ہے
وہ شاخ گرادو' میرا وہ سامان لوٹادو
ایک سو سولہ چاند کی راتیں
ایک تمہارے کاندھے کا تل
گیلی مہندی کی خوشبو
جھوٹ موٹ کے وعدے کچھ
جھوٹ موٹ کے شکوے بھی سب
یاد کرادو
سب بھجوادو
میرا وہ سامان لوٹادو
ایک اجازت دے دو بس
جب اس کو دفناؤں گی
میں بھی وہیں سو جاؤں گی

گلزار کی شاعری کانوں میں کیا پڑی وہ ڈسٹنگ چھوڑ کر سر دھنتے ہوئے ٹی وی کے آگے سج کر خوشگوار موڈ میں خود بھی گنگنا اٹھی۔ بہت دنوں بعد وہ فریش محسوس کر رہی تھی۔ اچانک کمرے کے دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔ سائڈ ٹیبل سے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کی آواز ہلکی کی اور جا کر دروازہ کھولا۔ راشدہ بیگم' شازب کا بازو تھامے کچھ جھجکتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ احسانہ نے سوالیہ نگاہوں سے شوہر کو دیکھا' مگر اس نے نگاہیں چراتے ہوئے' متذبذب ساماں کی حرکات کو دیکھنے لگا۔ راشدہ کمرے کا گھوم پھر کر معائنہ کرنے کے بعد بہو کے سامنے کھڑی ہوئیں اور ایک نیا حکم نامہ جاری کیا۔

''جی۔ میں سمجھی نہیں؟'' احسانہ ہکا بکا سی ساس کا منہ دیکھتی ہوئی بڑبڑائی۔ ایک لمحے تو یوں لگا' جیسے اسے سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔

''بڑی بہو۔ یہ کمرہ شارق کی دلہن کے لیے تیار کرانا ہے' اس لیے آپ کل سے ملازمین کو ساتھ لگوا کر اپنا سامان اوپر والے فلور پر شفٹ کرلیجیے گا۔'' راشدہ بیگم نے اس کا بے تاثر چہرہ دیکھا تو رک رک کر اپنی بات دہرائی۔

''شازب...؟'' احسانہ نے شوہر کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پکارا۔

''اوں...'' حوصلہ دیتی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے امی جان۔ میں کردوں گی۔'' احسانہ نے یہ بات کس دل سے کہی' وہ ہی جانتی تھی یا شازب ظفر جو صرف جیون ساتھی ہی نہیں اس کے دکھ سکھ کا ساتھی بھی تھا۔

''بڑی بہو...'' راشدہ بیگم جاتے جاتے ایک دم سے پلٹیں اور اس کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے نرمی سے بولیں۔

''جی... امی جان۔'' احسانہ نے اپنے احساسات پر قابو پاتے ہوئے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔

''ہمیں پتا ہے بیٹا کہ آپ کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے' مگر کیا کریں اس گھر میں آنے سے پہلے ہی وانیہ کا دل خراب ہو جائے یہ بھی ہمیں منظور نہیں۔'' وہ الجھے الجھے انداز میں بولیں۔

''میں سمجھ سکتی ہوں...'' احسانہ نے سمجھ داری سے سر ہلاتے ہوئے رضا مندی دی تو انہوں نے پرسکون ہو کر قدم بڑھا دیے۔

راشدہ ظفر چھوٹے بیٹے شارق کی شادی کا سلسلہ شروع ہوتے ہی کافی محتاط ہو گئیں' وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اس بار کوئی ایسی بات ہو کہ شوہر کا موڈ آف ہو جائے۔ شارق نے الگ واویلا مچا رکھا تھا' وہ اپنی منگیتر وانیہ کے منہ سے نکلی بات پوری کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے پر تلا رہتا۔ پندرہ دن کے نوٹس پر کی جانے والی اس شادی کے چکر میں احسانہ شازب کی

تلی گردن پھنس کر رہ گئی۔ گھر کی بڑی بہو ہونے کی حیثیت سے جہاں اس کی ذمہ داریوں میں بے انتہا اضافہ ہو گیا' وہیں لڑکی والوں کی طرف سے کی جانے والی نت نئی فرمائشیں بھی خون جلا دیتی۔

راشدہ جو احسانہ کے رشتے کی خالہ تھیں' ان کا ساس بننے کے بعد بھی رویہ تبدیل نہ ہوا۔ اس کے لیے وہ ایک سمجھ دار' صاف گو اور منصف مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ محبت کرنے والی خاتون ثابت ہوئیں۔ شادی کے دس سال چٹکی بجاتے گزر گئے' احسانہ کو ان سے کبھی کوئی خاص شکایت نہ ہو سکی' مگر اب' ہر دوسرے دن کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی جس سے اس کے حساس دل کو چوٹ پہنچتی یا آنکھیں بھیگ جاتیں اور وہ بھی خود کو مجرم تصور کرنے لگتی۔

☼ ☼ ☼

کم عمر' حسن کی دولت سے مالا مال وانیہ سبحان کے خون میں بھی ضدی پن شامل تھا۔ وہ راشدہ بیگم کی نند شمائلہ سبحان کی بیٹی ہونے کے ساتھ شارق کی اولین چاہت بھی تھی۔ نند بھی وہ جن کے ساتھ دس سال تک میل ملاپ نہیں رہا۔ تاہم شارق بزنس کے سلسلے میں دبئی گیا تو پھوپھی کی طرف بھی چلا گیا اور پھر اس پر وانیہ کے حسن کا ایسا جادو چلا کہ پاکستان لوٹتے ہی اس نے پھوپھی زاد سے شادی کی ضد باندھ لی۔ یہ سنتے ہی راشدہ دل تھام کر رہ گئیں۔ انہیں اپنے گھر کا سکون ختم ہوتا دکھائی دیا۔

ظفر بیگ نے بیٹے کی پسند پر خوشی کا اظہار کیا کیوں کہ اس طرح سے انہیں بہن کی ناراضی دور کرنے موقع مل رہا تھا۔ اپنی جلد باز طبیعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیوی کے ساتھ پہلی فلائٹ پکڑ کر دبئی پہنچ گئے اور بھانجی کا ہاتھ مانگ لیا۔ بڑے بھائی خود چل کر آ گئے تو شمائلہ کے دل میں پڑی گرہ بھی کھل گئی اور وہ ناراضی بھلا کر ان کے گلے لگ گئیں۔ سبحان علی نے بھی پرانی باتوں کو بھلا کر مسکرا دیے۔ بڑے ارمانوں سے یہ رشتہ طے کیا گیا' مگر تمام وقت شمائلہ نے اپنی ہی چلائی جس پر راشدہ جز بز ہوتی رہیں۔ بیوی کے کہنے پر ظفر بیگ نے بہن سے عید کے بعد کی شادی کی تاریخ مانگ لی' مگر یہاں بھی وہ اڑ گئیں۔

"بھائی صاحب۔۔۔ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔" شمائلہ نے طنز کرتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی اور پندرہ دن بعد کی نکاح کی تاریخ پر زور دیا۔

"اتنا کم وقت۔۔۔ سب کچھ کیسے ہو گا؟" یہ سنتے ہی راشدہ کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ منمنا کر کہنا چاہا' مگر ظفر بیگ نے بیوی کے اشارے نظر انداز کر دیے۔

"چلیں۔۔۔ بھئی جیسے آپ کی خوشی۔" ظفر بیگ نے قہقہہ لگایا اور بہن بہنوئی کا منہ میٹھا کرا دیا۔ راشدہ ٹھنڈی آہ بھرتی رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"میرے تمام نئے سوٹ احتیاط سے اوپر والے کمرے میں بھجوانا۔" شازب کی ایک اہم میٹنگ تھی اس نے عجلت میں بیوی کو تاکید کی اور جوتے موزے پہننے لگا۔

"اور ہاں۔۔۔ ساری کتابیں بھی اوپر والے شیلف پر سیٹ کروا دینا۔" سر جھکا کر تسمے باندھتے ہوئے شازب نے دوسری ہدایت دی تو احساس ہوا کہ کمرے میں صرف اس کی آواز ہی گونج رہی ہے۔

"کیا ہوا بیگم صاحبہ۔۔۔؟" سر اٹھا کر دیکھا تو احسانہ کو ایک ہی زاویہ میں بیٹھے خیالوں میں کھویا ہوا پایا۔

"اتنی چپ چپ کیوں ہو؟" بیوی کے برابر میں بیٹھنے کے بعد اس کا ہاتھ تھام کر پیار سے پوچھا تو احسانہ نے خالی خالی نظروں سے شوہر کو دیکھا۔

"پلیز۔ تم اپنے دل میں پلتے اندیشوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکو۔۔۔" وہ اس کے دل میں چھپے ڈر کو بھانپ گیا۔

"اگر۔۔۔ ان لوگوں نے آپ کو مجھ سے چھیننے کی کوشش کی تو؟" اس کے لب کپکپائے۔

"ایسا نہیں ہو سکتا' میں ہمیشہ تمہارے دم قدم

رہوں گا۔" شازب نے نازک ہاتھوں پر دباؤ ڈالا۔
"کیوں... جب وہ مجھے اس کمرے سے بے دخل کراسکتے ہیں تو...؟" وہ معصومیت سے بولتے ہوئے ایک دم چپ رہ گئی۔
"تمہیں کوئی... بھی میری زندگی سے بے دخل نہیں کرسکتا... آئی سمجھ۔" شازب نے ہنستے ہوئے اس کی چھوٹی سی ناک دبائی۔
"آپ سچ کہہ رہے ہیں نا...؟" ہونٹ لٹکا کر یقین دہانی چاہتے ہوئے وہ ان کے دل پر ستم ڈھا گئی۔
"ادھر دیکھو... جان... تمہارا سائبان یہ کمرہ نہیں شازب ظفر کی ذات ہے۔" اس کا چہرہ اپنی جانب موڑتے ہوئے آنکھوں میں پیار سے جھانکا۔ "اور... میں ابھی اتنا کمزور نہیں ہوا ہوں کہ کوئی مجھ سے میری زندگی کو الگ کرسکے۔" اس کی نگاہوں سے ٹپکتی محبت' وہ نگاہیں چرا گئیں۔
"اچھا... اگر... اب اجازت ہو تو بندہ ناچیز آفس جانے کا قصد کرے' ایک اہم میٹنگ ہے۔" وہ جانے کے لیے کھڑے ہوتے ہوئے بولا تو احسانہ نے اس کے بازوؤں پر ہاتھ رکھا تو وہ ہنس دیا۔
ان دونوں نے شادی کے دس سال اسی آرام دہ روشن اور وسیع کمرے میں گزارے تھے' اسی وجہ سے احسانہ کو یہاں کے چپے چپے سے ایک خاص انسیت ہوگئی تھی۔ یہاں کی دیواروں کو ان کی محبت بھری سرگوشیوں' دکھ سکھ' لڑائی جھگڑے اور روٹھنے منانے کے قصے سننے کی عادت تھی' منی کی پیدائش سے لے کر اس کے پالنے پوسنے اور پھر اسکول تک کی جانے والی مشقت کی گواہ یہ چار دیواریاں تھیں' مگر اب اچانک دیور کی شادی پر اسے' کمرہ چھوڑنے کا حکم نامہ مل گیا' وہ بھی ہونے والی دیورانی کی فرمائش پر یہ بات اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ گئی۔ کمرے سے بے دخل کرانے والی کہیں اسے شوہر کی زندگی سے نہ نکال دے' کیوں کہ جانے انجانے میں وہ ان کے دکھ کی وجہ بنی تھی۔

"مما... آپ سب کو پتا ہے نا کہ میں ریڈ کلر سے کتنی الرجک ہوں... پھر بھی..." وانیہ نے پاؤں اوپر کرکے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اعلان کیا۔ احسانہ جو سرخ رنگ کا بھاری کام والا عروسی لباس دکھاتے ہوئے سب کی تعریفیں سمیٹ رہی تھی' اس کے نرم ہاتھ کپکپا گئے۔
"او... لیں... ڈارلنگ... میں تو بھابھی کو یہ بات بتانا ہی بھول گئی تھی۔" شمائلہ نے راشدہ کو دیکھتے ہوئے بیٹی کو بھولے پن سے جواب دیا۔
"ہاں... بیٹی کا پچیسواں ڈرامہ" راشدہ نے دل ہی دل میں گنتی مکمل کرتے ہوئے جل کر سوچا' ماتھے پر ناگواری سے لکیریں پڑ گئیں۔
"کچھ بھی ہے... میں شادی والے دن یہ رنگ نہیں پہنوں گی۔" وانیہ نے منہ پھلا کر کہا۔
"شمائلہ... ایک بار دیکھو تو احسانہ نے بڑی محنت سے یہ ڈریس ڈیزائن کروایا ہے۔" راشدہ سے بڑی بہو کی اتری صورت دیکھی نہیں گئی تو حمایت میں بولیں۔
"ہاں... وہ تو سب ٹھیک ہے... مگر کیا فائدہ جب وانی کو پسند نہیں۔" شمائلہ نے صاف گوئی سے انکار کیا۔
"کیوں بیٹی کیوں نہیں پسند' اتنا شاندار تو ہے۔" شمائلہ کی ایک سسرالی رشتے دار خاتون نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
"ہاں... واقعی... بہت ہی منفرد ڈیزائننگ کی گئی ہے۔" ایک اور سسرالی کو بھی سچ بولنے کا حوصلہ ملا' مگر شمائلہ کے نقوش بگڑتے گئے۔
"آج کل تو ڈیزائنر کے یہاں ایک سے ایک برائیڈل ڈریس آسانی سے بنے بنائے مل جاتے ہیں تو پھر احسانہ کو اتنی محنت کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔" شمائلہ نے اب اسے دیکھ کر نخوت زدہ لہجے میں پوچھا۔
"ہاں... مگر... ایک تو وہ بے انتہا مہنگے ہوتے ہیں دوسرے ان میں ایسی کاریگری اور نفاست کہاں پائی جاتی ہے۔" راشدہ بھی اپنے موقف پر اڑ گئیں۔

"پھوپھو۔ کیا فائدہ ایسی کفایت شعاری کا جب پہننے والی کو ہی پسند نہ ہو۔" وانیہ نے بھی ماں کا ساتھ دیا۔ احسانہ لب سیے، سر جھکائے ایسے بیٹھی تھی جیسے اس کا نہیں پڑوسیوں کا ذکر ہو رہا ہو۔

"بیٹا۔ ایک بار پہن کر تو دیکھو۔" راشدہ نے وانیہ سے لجاجت بھرا اصرار کیا۔

"ایک منٹ۔ راشدہ۔" ظفر بیگ کی کڑکتی ہوئی آواز پر سب کو سانپ سونگھ گیا، وہ کسی کام سے اندر آئے تھے۔

"بلاوجہ کی بحث کا کیا فائدہ۔ اگر وانی کو نہیں پہننا تو کوئی اس پر زور نہیں ڈالے گا۔" ان کے حتمی انداز پر مزید کچھ کہنا بے کار تھا۔ احسانہ کا سر مزید جھک گیا۔

"اوہ۔ ماموں۔۔۔ آئی لو یو۔" وانی نے فاتحانہ نظروں سے احسانہ کو دیکھتے ہوئے لاڈ سے کہا۔

"یہ ہی تو میں اتنی دیر سے بھابھی کو سمجھا رہی ہوں۔" بھائی کی شے پر شمائلہ آسمانوں پر اڑنے لگ گئیں۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ شمائلہ۔ تم وانیہ کو ساتھ جا کر اس کی پسند سے شادی اور ولیمے کے لباس خرید لو۔" وہ تیز تیز بولتے ہوئے باہر نکل گئے۔ وہ مرے مرے ہاتھوں سے برائیڈل لباس کو تہ کر کے ڈبے میں رکھ رہی تھی۔

"ہے تو۔۔۔ لش۔۔۔" ایک لمحے کو وانیہ کا دل للچایا، مگر وہ ہی لمبی ناک۔ ہونہہ کر کے وہاں سے اٹھ گئی۔

ایک طویل مدت کے بعد بہن بہنوئی کی پاکستان آمد پر ظفر بیگ صاحب خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے، اسی لیے ان کی ہر بات، آنکھ بند کر کے مانی جا رہی تھی اور انہوں نے اپنی منوائی بھی خوب۔ ان لوگوں کی کئی بار کی بے جا تنقید پر راشدہ سمجھ چکی تھیں کہ اتنے سال گزر جانے کے باوجود شمائلہ کے دل میں احسانہ کے لیے جو کدورت تھی، وہ نکلی نہیں ہے، مگر فی الحال انہیں مصلحت سے کام لینا تھا۔

شمائلہ جب بھی احسانہ کو پورے گھر میں ہنستے مسکراتے اور راج کرتا دیکھتی تو تلملا کر رہ جاتیں اور جانے انجانے اسے نیچا دکھانے کی کوشش کرتیں۔ شازب اور احسانہ کی وجہ سے ہی تو رانیہ کے شوہر فراز نے اپنی بیوی کو چھوٹی سالی کی شادی میں شرکت کرنے سے روک دیا تھا۔ ہواؤں سے باتیں کرنے والی شمائلہ اس وقت پیچ و تاب کھا کر رہ گئیں، مگر خاموشی اختیار کرنی پڑی کیوں کہ سامنے فراز جیسا بددماغ داماد تھا۔

☆ ☆ ☆

احسانہ، راشدہ کی رشتے کی بہن عظیمہ کی بیٹی تھی۔ بڑی بیٹی حسینہ کی شادی دو سال قبل ہو چکی تھی۔ اکثر خاندان کی کسی بھی تقریب میں ان لوگوں کا آمنا سامنا ہو جاتا تو عظیمہ خالہ ان سے بڑی محبت سے ملتیں۔ علی خالو بھی انکساری کے ساتھ حال احوال دریافت کر لیتے، مگر ان کی سب سے چھوٹی بیٹی احسانہ علی بہت لیے دیے سے رہتی۔ اس کی یہ ہی ادا شازب کو چونکانے کی وجہ بنی۔ لمبا چوڑا کھوئی کھوئی آنکھوں والا شازب ظفر خوش شکل ہونے کے ساتھ ساتھ خوش اخلاق بھی تھا۔ اس کی مردانہ وجاہت، بات چیت کا انداز اور رکھ رکھاؤ، ایسا نہ تھا کہ نظرانداز کیا جائے، مگر اس بالشت بھر کی لڑکی کو جانے کس بات کا زعم تھا جو نگاہ بھر کر بھی اس کی طرف نہ دیکھتی۔ مکمل طور پر نظرانداز کیے رہتی تھی یہ ہی بات اس کے اندر کیل بن کر گڑ گئی تھی۔

شازب کو اس بات کی بھی خبر تھی کہ زندگی میں ہلکے پھلکے رومانس کی بھی گنجائش نہیں تھی، مگر پھر بھی احسانہ جانے کیوں اس کے دماغ پر بھوت بن کر چمٹ گئی تھی، یوں وہ غلط پٹری پر چل پڑا کیوں کہ شازب کی بات چیت بچپن میں ہی دبئی میں مقیم اس کی کزن رانیہ سجان سے بات طے کر دی گئی تھی۔ جوان ہونے پر جب راشدہ نے بیٹے کے کان میں یہ بات ڈالی تو اسے کوئی اعتراض نہ ہوا۔ ہوتا بھی کیوں! پڑھی لکھی پریوں جیسا حسن رکھنے والی رانیہ ایسی تھی کہ گویا ہاتھ لگانے سے میلی ہو جائے۔ بس ایک قباحت تھی وہ کافی ریزرو طبیعت کی مالک تھی۔ نہ کوئی فون پر رابطہ، نہ

کوئی عشق و محبت کا سلسلہ' اس کے باوجود شازب نے فرماں بردار اولاد ہونے کا فرض نبھایا اور اپنے والدین کی خوشی پر راضی بہ رضا ہو گیا تھا پھر بھی شادی سے ایک ماہ قبل اس کی دل کی دنیا بدل کر رہ گئی تھی۔

ڈھلتی شام کے سائے میں سیاہ ملتانی کڑھائی والی چادر میں لپٹا' جانا پہچانے وجود کو فٹ پاتھ پر چلتے دیکھ کر اس کے پیروں نے بے اختیار بریک پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔

"احسانہ... کیا ہوا... خیریت تو ہے۔ تم اس وقت یہاں کیوں کھڑی ہو؟" شاندار گاڑی اس کے قریب لے جا کر روکتے ہوئے بے شمار سوال پوچھے۔

"میں... امی کی دوائی لینے جا رہی ہوں۔" اس نے عجلت میں جواب دیا اور قدم بڑھا دیے۔

"تم کو اس وقت گھر سے نکلنے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ نیچے اتر کر قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے برہم ہوا۔

"ابو جی دفتر کے کام سے حیدر آباد گئے ہوئے ہیں اور امی کا بخار تیز ہونے لگا تھا اس لیے مجبوراً مجھے ہی گھر سے نکلنا پڑا۔" اس نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

"اوہ... خالہ کی طبیعت ٹھیک نہیں... چلو... میں دوائی دلوا تا ہوں۔" شازب نے اپنائیت کا مظاہرہ کیا اور گاڑی کی جانب اشارہ کیا۔

"نہیں شکریہ... میں چلی جاؤں گی۔" وہ ایک دم خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹی۔

"تم نے سنا نہیں میں نے کیا کہا... جلدی سے بیٹھو۔" وہ اتنے رعب سے بولا کہ احسانہ کے پاس بیٹھنے کے سوا کوئی دوسرا چارہ نہ رہا۔

"ایک بات بتاؤں... میں انسانوں کو بالکل نہیں کھاتا۔" گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس کی اتری صورت دیکھ کر وہ شرارتی ہوا۔

"آں... ہاں۔ اگر کھاتے بھی تو مجھے ہضم کرنا آسان نہیں..." اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے اعتماد سے جواب دیا۔

شازب اس کا خوف دور ہونے پر خوش ہوا اور ہلکی پھلکی باتیں شروع کر دیں۔ وہ بھی کچھ ریلیکس ہوئی اور دلچسپی سے اس کی باتوں کو سننے میں محو ہو گئی۔ یہ مختصر سا سفر ایک دم پر لطف بن گیا۔ شازب کو کچھ دیر میں ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے احسانہ کے بارے میں کافی غلط فہمی تھی وہ تو بہت سلجھی ہوئی دھیمے مزاج کی لڑکی ہے۔

دوائی لینے کے بعد شازب نے اسے گھر تک چھوڑنے کی آفردی۔ اس بار وہ بلا جھجک چادر اچھی طرح سے سر پر لیتے ہوئے دوبارہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی جو کچھ بھی تھا وہ کوئی اجنبی نہیں اس کا کزن تھا۔

"ویسے تم مجھ سے اتنا ڈرتی کیوں ہو؟" اس نے اسٹیئرنگ گھماتے ہوئے شرارتی انداز میں پوچھا۔

"میں... آپ سے نہیں... بلکہ اس طبقاتی فرق سے ڈرتی ہوں... جو آپ کے اور ہمارے درمیان موجود ہے۔" احسانہ نے بڑی صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

"اوہو... مجھے نہیں پتا تھا کہ احسانہ جیسی سمجھ دار لڑکی اس انداز میں بھی سوچ سکتی ہے۔" اس کا پر مزاح انداز قائم رہا۔

"میری سمجھ داری ہی ہے... جو مجھے محتاط رہنے کے اشارے دیتی ہے۔" احسانہ بھی مرر میں اس کا عکس دیکھتے ہوئے سمجھ داری سے بولی۔

"ایک بار پھر بتا دوں کہ میں آدم خور نہیں ہوں۔" وہ زور سے ہنسا تو احسانہ کے لب بھی کھل اٹھے۔

شازب لمحے بھر کو مبہوت رہ گیا' یوں لگا جیسے زمانے بھر کی نرماہٹ' ان حسین ہونٹوں میں سما گئی ہو' ایک دم سے اس کا دل ایک نئی لے پر دھڑکنے لگا۔ وہ اپنی کیفیت پر حیراں اسے دروازے پر ہی چھوڑ کر زن سے گاڑی بھگا لے گیا۔ شازب سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اسے ہوا کیا ہے۔ دوران تعلیم اس کی بہت ساری لڑکیوں سے بات چیت رہی' لیکن وہ تعلقات صرف دوستی تک محدود رہے۔ اپنی منگیتر رانیہ سے بھی اس کی سلام دعا سے آگے نہیں بڑھی اور یہ احسانہ' اس کی زندگی میں آنے والی وہ پہلی لڑکی بن گئی جس کے سادہ اور معصوم حسن نے اسے احساس دلایا کہ اس کے سینے میں دھڑکنے والا دل بھی احساسات کا مجموعہ ہے۔

جب شازب کو پتا چلا کہ وہ ایم بی اے کے فائنل میں ہے تو اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا وہ تو اسے کالج گرل سمجھتا آیا تھا۔ ایک دن دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر شازب احسانہ سے ملنے کے لیے اس کی یونیورسٹی پہنچ گیا۔ پہلے تو احسانہ جھجکی، مگر پھر شازب کے دیے ہوئے اعتماد نے اس خوف کو دور کردیا چھوٹی چھوٹی ملاقاتوں کے دوران وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب آگئے کہ بچھڑنے کا تصور ہی ان کے لیے سوہان روح بن گیا۔

احسانہ اب تک اس بات سے بے خبر تھی کہ شازب کی بات بچپن سے اس پھوپھو کی کے گھر طے ہے۔ وہ شازب کے شاندار فیملی بیک گراؤنڈ سے واقف تھی اس کے والد علی مرتضیٰ انتہائی محنتی اور ایمان دار انسان تھے۔ وہ ایک سرکاری دفتر میں معمولی عہدے پر فائز تھے۔ اس لیے اپنی حیثیت کو پہچانتے ہوئے امیر رشتے داروں سے ایک حد میں رہ کر ملتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ احسانہ شروع سے شازب کی فیملی کے ساتھ لیے دیے رہتی تھی تاکہ کسی وجہ سے اس کے والدین کو خجالت کا سامنا نہ کرنا پڑے، مگر اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہم جس چیز سے جتنا بھاگتے ہیں وہ ہی ہمارے دم قدم ہوجاتی ہے۔ شازب کے پرپوز کرنے پر اس کے من میں کئی طرح کے خدشات نے سر اٹھایا۔ اس نے اپنے من میں اٹھتے جوار بھاٹا کا ذکر شازب سے کیا تو اس نے احسانہ کے مومی ہاتھ پہ اپنا مضبوط ہاتھ رکھتے ہوئے ہمیشہ ساتھ رہنے کا پختہ یقین دلایا۔

☼ ☼ ☼

"لٹ گئے ہم۔۔۔ تو راہوں۔ میں۔۔۔" بارات والے دن وہ کانوں میں جھمکے پہنتی زینہ اترنے لگی تو سامنے کھڑے شازب نے دل پر ہاتھ رکھ کر بے ہوش ہونے کی ایکٹنگ کی۔

"ایک بات کہوں۔۔۔ سرکار۔" اس نے قریب پہنچ کر بڑی ادا سے شوہر کے کان میں سرگوشی کی۔

"حکم۔۔۔ بیگم صاحبہ۔" وہ تجسس سے اس کی جانب جھکا۔

"پکے۔۔۔ ڈرامے باز۔۔۔ ہیں۔ آپ۔" وہ شوخی سے بولتی ہوئی دور ہوئی تو ہاتھوں میں پہنی چوڑیاں کھنک اٹھیں۔

"جیسے بھی ہیں۔ اب تو۔ آپ کے ہیں جناب۔" شازب نے اس کی بانہوں میں کھنکتی چوڑیوں کو چھوا۔

"ارے جائیں۔" اس نے انگوٹھیوں سے مرصع انگلیوں کو لاپروائی سے لہرایا۔

"ہائے۔ اب کہاں جائیں۔۔۔؟" وہ ہونٹ دبا کر شرارتی لہجے میں پوچھنے لگا۔ سبز شیفون کی بھاری کامدار ساڑھی میں ملبوس احسانہ کا نرم گلابی پڑتا چہرہ اسے فرشتوں کا سا حسن بخش رہا تھا۔

"لگتا ہے جیسے یہ رنگ آپ کے لیے ہی بنا ہے۔" شازب نے سراہتے ہوئے سر تا پیر بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"صاحب۔۔۔ بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔۔۔" وہ اٹھلائی۔

"کیا۔۔۔ بنانا؟" شازب نے معصومیت کی انتہاؤں پر جاکر پوچھا۔

"بے وقوف۔۔۔" وہ رک رک کر بولی اور ایک دم سے مسکرائی تو گلابی لبوں کی نرمیاں، اسے مبہوت کر گئیں۔

"بڑی بہو۔۔۔" ان کی بولتی آنکھیں ایک دوسرے کو اپنی چاہتوں کا مان دینے میں مصروف تھیں کہ دور سے آتی راشدہ بیگم کی آواز نے چونکا دیا۔

"شازب۔ میں چلی۔۔۔" احسانہ نے اسے دور دھکیلا اور باہر کی طرف بھاگی۔ بیوی کے یوں شرمانے پر شازب بھی زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے باہر کی جانب چل دیا۔

☼ ☼ ☼

خدا خدا کرکے شادی کی تقریبات اختتام پذیر ہوئی تو احسانہ نے سکھ کا سانس لیا۔ اس کی محنت بہرحال رنگ لے آئی۔ سب کچھ بڑی خوش اسلوبی سے

ہو گیا۔ اس کی ساس نے جو ذمہ داریاں سونپی تھیں وہ بغیر کسی غلطی کے انجام پا گئیں۔ اسے لگا جیسے سرخرو ہو گئی ہو۔ دیکھنے والے کو لگتا تھا کہ بظاہر ساری چیزیں بڑے آرام سے ہو گئیں 'مگر شازب جانتا تھا کہ اس کی بھائی کی شادی میں احسانہ نے اپنی راتوں کی نیندیں اور دن کا آرام تج دیا تھا۔ شارق کی بری اور شادی کے دیگر امور نمٹانے کے ساتھ بیٹے کی پڑھائی کا دھیان رکھنا ضروری تھا کیوں کہ سنی کے ایگزامز چل رہے تھے۔

شائلہ پھوپھو کی فیملی 'اس کے والد کی ضد پر ان کے گھر ٹھہر گئی تھی۔ شادی کا موقع تھا۔ سبحان پھپھا کے رشتے داروں کا بھی ہر وقت کا آنا جانا لگا رہتا تھا 'اس وجہ سے مہمان داری بھی بہت زیادہ ہو رہی تھی۔ احسانہ کا ایک پیر بازار میں تو دوسرا کچن میں ہوتا۔ ملازموں کی بھرمار کے باوجود ایک جز وقتی ملازمہ کا انتظام بھی کیا گیا تاکہ وہ اوپر کے کاموں میں احسانہ کی مدد کر سکے۔ ان سب باتوں کے باوجود بہرحال گھر کی بہو تو احسانہ ہی تھی۔

شازب کی خوب ساری تعریفیں سمیٹنے کے باوجود احسانہ کا دل جانے کیوں اندر سے اداس ہی رہا۔ وہ ولیمہ میں بھی چپ چپ رہی اور جب ساس کے کہنے پر۔ وہ سب فیملی فوٹو بنانے اسٹیج پر چڑھ گئے۔ راشدہ نے بغل میں دابے بیگ میں سے ہاتھ ڈال کر ایک مخملیں باکس نکالا اور مسکرا کر قدم بڑھائے تو وانیہ نے خوش ہو کر ساس کو دیکھا 'مگر یہ کیا وہ تو احسانہ کی طرف مڑ گئیں۔

"بڑی بہو... آپ نے ہمیں خاندان والوں کے سامنے سرخرو کر دیا ہے۔" راشدہ نے احسانہ کا ماتھا چوم کر زور سے کہا۔

"ہاں بیٹا... آپ نے بڑی سمجھ داری دکھائی۔" ان کے ساتھ کھڑے ظفر بیگ کی نگاہوں میں بھی پہلی بار اپنے لیے اپنائیت بھرے رنگ دیکھ کر اس کا دل دھڑکنے لگا 'اداسی اڑن چھو ہو گئی۔ مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھل اٹھی۔

"ہمارے اور آپ کے خالو کی طرف سے۔ ایک چھوٹا سا تحفہ۔" راشدہ نے اس کی کلائی تھام لی۔

احسانہ حیران رہ گئی اور دلہن بنی وانیہ کا دل سڑ کر رہ گیا۔ سب سے نگاہ بچا کر شازب نے بیوی کو وکٹری کا نشان دکھایا۔ وہ اس بات سے پہلے سے ہی باخبر تھا 'درحقیقت ماں کی توجہ اس جانب اس نے ہی کرائی تھی۔ راشدہ نے بہو کو اپنے ساتھ لگا کر تصاویر بنوائیں تو شارق کو بھی بھائی بھابھی کا خیال آیا اور اسے اور سنی کو ساتھ بٹھا کر بھائی کو بھی اوپر آنے کا اشارہ کیا۔ شازب نے اپنے کزن کو کیمرہ پکڑایا اور خود بھی اسٹیج پر پہنچ گیا۔ ہنستا مسکراتا گروپ فوٹو یادگار ہو گیا۔ اتنی خوشیوں کے بیچ کسی نے دھیان نہیں دیا کہ وانیہ کا منہ بری طرح سے بنا ہوا ہے۔ اس کے دل میں یہ قلق جاگ اٹھا کہ ولیمہ کی دلہن تو وہ تھی 'مگر سب کی توجہ کا مرکز اس وقت بھی جٹھانی صاحبہ بنی ہوئی تھیں۔

"کیا میری قربانیاں رنگ لے آئی ہیں۔" اس نے کھوئے کھوئے انداز میں برابر میں بیٹھے شوہر سے سوال کیا تو شازب نے بیوی کو حوصلہ دیتی نگاہوں سے دیکھا۔ وہ لمحہ تاریخی ہو گیا 'جب راشدہ بیگم نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر خاندان والوں کے سامنے اپنی بڑی بہو کی سلیقہ مندی اور انتظام کاری کا اعتراف کیا اور بڑے پیار سے اس کی نازک کلائی میں سونے کا موٹا سا کڑا ڈال دیا اور تو اور پہلی بار سسر نے بھی پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ یہ بات اس چیز کی گواہی تھی کہ انہوں نے اسے اپنی بڑی بہو تسلیم کر لیا ہے۔ اس نے بھیگی پلکیں اٹھا کر محبوب شوہر کو دیکھا جو پیار بھرے لمحے کو اپنے کیمرے میں مقید کرنے کے بعد بڑا مسرور دکھائی دے رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

ادھر اس کی اور رانیہ کی شادی کی تاریخ طے ہوئی اور شازب کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ آر یا پار والا جانگسل لمحہ آخر زندگی میں آ ہی گیا۔ وہ بڑی ہمت سے ماں کے سامنے پہنچا اور احسانہ اور اپنی چاہت کا اعتراف کر ڈالا۔ راشدہ بیگم تو خوف سے زرد پڑ گئیں اور پاس پڑی کرسی پر ڈھے گئیں۔ انہوں نے فوراً ہی

بیٹے کو اس آگ سے دور رہنے کا مشورہ دیا۔
"شادی ہوگی تو صرف۔ احسانہ سے۔۔۔ ورنہ کسی سے نہیں۔۔۔" اس نے بھی ماں کو اپنا فیصلہ سنا دیا کہ وہ شادی کرے گا تو صرف احسانہ علی سے ورنہ کسی سے نہیں۔ راشدہ نے بیٹے کو سمجھانے کی بڑی کوشش کی کیوں کہ وہ جانتی تھیں کہ یہ سنتے ہی ان کے گھر میں بھونچال آجائے گا' مگر وہ کوئی جواب دیے بغیر اٹھ گیا۔
راشدہ نے اس بات کی گھر میں کسی کو ہوا لگنے نہ دی۔ بس چپکے چپکے بیٹے کو سمجھانے لگ گئیں۔ اسے رانیہ کے دکھوں کا احساس دلا کر منانا چاہا۔ ایک یہ ہی وہ نقطہ تھا جہاں آکر وہ خود کو بے بس محسوس کرنے لگتا۔ اسے بہت افسوس ہوتا' مگر وہ بھی کیا کرتا جب پورے دل پر احسانہ قابض ہوچکی تھی رانیہ کے لیے رتی برابر بھی گنجائش نہ چھوڑی۔ اب ایک ان چاہے رشتے کو قائم کرکے وہ رانیہ کی زندگی برباد نہیں کرسکتا تھا' اچھا تھا کہ جڑنے سے پہلے ہی یہ رشتہ ٹوٹ جائے۔ راشدہ بیگم کو اس رشتے پر ہرگز اعتراض نہ ہوتا اگر ان لوگوں نے نند کو زبان نہ دے رکھی ہوتی۔ وہ ایک عجیب مشکل میں گرفتار ہوگئیں۔ شوہر کی ضدی طبیعت سے واقف تھیں۔ اس لیے بیٹے کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتیں۔

جب ماں نے اس کی بات ماننے سے انکار کردیا تو شازب نے کھانا پینا بہت کم کردیا تھا' رات رات بھر سوتا نہیں' منہ لٹکائے پھرتا رہتا۔ آفس میں حاضری بھی کم ہوگئی۔ ظفر بیگ کو بیٹے کی حالت نے چونکا دیا۔ انہوں نے ایک دن بیٹے کو اپنی لائبریری میں بلوایا اور بیٹھ کر پریشانی کی وجہ معلوم کرنا چاہی۔ وہ حالات سے اتنا بے زار ہوچکا تھا کہ اس نے باپ کے سامنے سچ اگل دیا۔ بڑی لجاجت سے احسانہ کے گھر جاکر رشتہ مانگنے کی استدعا کی۔ جواب میں ان کی طویل خاموشی اور سرد مہری نے اسے بری طرح پریشان کردیا' لیکن کہیں نہ کہیں اس کے دل کو یقین تھا کہ وہ اپنے بڑے بیٹے کی خواہش نہیں ٹالیں گے۔ اس لیے جب ظفر بیگ نے اسے کہا کہ وہ اس بارے میں چند دن بعد سوچ کر جواب دیں گے تو شازب ان کے کمرے سے مطمئن ہوکر باہر نکل گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا۔۔۔ آپ کے یہاں صرف بڑی بہو کو ہی تحفوں سے نوازا جاتا ہے؟" وانیہ نے کمرے میں آتے ہی شوہر سے شکوہ کیا۔
"کیا مطلب۔۔۔ میں کچھ سمجھا نہیں؟" کوٹ کے بٹن کھولتے شارق کے ہاتھ تھم گئے۔
"بھابھی نے ایسا کون سا تیر مارلیا۔۔۔ جو ہر ایک ان کی تعریفوں کے پل باندھنے پر تل گیا۔۔۔؟" وہ سینڈل سے سفید پیروں کو آزاد کرتے ہوئے کلس کر بولی۔
"ارے بابا۔۔۔ ایسا کیا ہوگیا۔۔۔ جو تم ایسی لال پیلی ہورہی ہو؟" شارق نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"دیکھا نہیں۔ آپ نے۔ کیسے ممانی جان نے بڑی بھابھی کو سونے کا موٹا سا کنگن تھمایا۔" اس کے لہجے میں حسد جاگا۔
"ہاں۔۔۔ تو کیا ہوا' امی جان نے تمہیں بھی تو منہ دکھائی میں ڈائمنڈ کا سیٹ دیا تھا۔" شارق نے اس کا ہاتھ تھام کر لاپروائی سے جواب دیا۔
"اُف۔۔۔ میرا مطلب یہ تھا کہ ممانی جان۔۔۔" اس نے جل کر مزید کچھ کہنا چاہا۔
"چھوڑو نا۔۔۔ تم بھی کیا۔ شادی کے دوسرے دن ساس بہو کے ڈراموں والی ہیروئن کی طرح شوہر کو بھڑکانے لگی ہو۔" شارق نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ناگواری سے کہا تو وانیہ نے منہ پھلا لیا۔
"اچھا۔۔۔ ایک بات سنو۔" دونوں کے بیچ کچھ لمحوں کی خاموشی در آئی تھی۔ تھک ہار کر شارق کو ہی پیش قدمی کرنی پڑی۔
"ہاں بولیں۔۔۔؟" اس نے نروٹھے پن سے جواب دیا۔
"میں امی جان سے کہوں گا کہ سارے قیمتی تحائف پر بس میری بیوی کا حق ہے اوکے۔" شارق نے بیوی کے بالوں کو پیار سے چھو کر جھوٹا بہلاوا دیا۔

"آپ۔۔۔ سچ کہہ رہے ہیں نا۔" وانیہ نے ہنستے ہوئے یقین دہانی چاہی۔

"میری زندگی' سو فیصد۔۔۔ سچ۔" شارق نے پیار سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ شوہر کا موڈ دیکھ کر وانیہ کو اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا' مگر ذہن میں کچھ دیر پہلے کے منظر لہرانے لگے تو وجود میں کڑواہٹ پھیل گئی۔

دوسرا صبح سجی سنوری وانیہ شارق کا ہاتھ تھامے ناشتے کی ٹیبل پر آئی تو سب نے اس کا استقبال بڑی گرمجوشی سے کیا۔ ظفر بیگ نے ان دونوں کو خصوصی طور پر اپنے برابر میں بٹھایا تو اس کا چہرہ کھل اٹھا' انا کو تسکین پہنچی مارے اتراہٹ کے جلدی سے جٹھانی کی طرف دیکھا جو چہرے پر سادہ سی مسکراہٹ سجائے ان دونوں کے آگے پلیٹ لگا رہی تھیں۔

"وانیہ پوری کھیر نکالوں۔۔۔؟" احسانہ نے بڑے جوش سے پوچھا۔

"نو۔۔۔ تھینکس۔" وانیہ نے قدرے بے رخی اختیار کی اور شارق کو دیکھنے لگی۔

"اچھا۔۔۔ پھر کیا کھاؤ گی۔" اس نے قدرے ڈھیلے پڑتے ہوئے میزبانی نبھائی۔

"میں کوئی مہمان تھوڑی ہوں اور یہ میرا سسرال ہی نہیں ماموں کا گھر بھی ہے۔۔۔ اس لیے آپ ٹینشن نہ لیں۔" اس نے ٹھنڈے لہجے میں جانے کیا جتانا چاہا۔

"یہ بات تو تم نے ٹھیک کہی میری بچی۔" ظفر بیگ نے چائے کا سپ لیتے ہوئے بلاسوچے سمجھے قہقہہ لگایا تو احسانہ کا دل بجھ کر رہ گیا۔

"بھابھی۔۔۔ مجھے تو پوری کھیر کھانی ہے۔" شارق اس وقت انسانیت کے جامے میں تھا' جلدی سے بولا تو احسانہ نے خاموشی سے اس کی پلیٹ میں ناشتا نکالا۔

"چھوٹی دلہن۔۔۔ چکھ کر تو دیکھو۔۔۔ بڑی نے خاص طور تم دونوں کے لیے یہ اہتمام کیا ہے۔" راشدہ کو اس کا رویہ نامناسب لگا تو ٹوکنا ضروری سمجھا۔

"نہیں۔۔۔ میں بریڈ لوں گی۔" منہ میں پانی بھر آیا' مگر پھر بھی انکار کر دیا۔ راشدہ کچھ کہتے کہتے مصلحتاً چپ رہ گئیں۔ احسانہ کو دیورانی کے مزاج کی سمجھ نہیں آئی تھی' وہ جو بات بولتی ہمیشہ اس کا الٹ ہی کرتی تھی۔۔۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"حسنی۔۔۔ چلو یہاں آکر بیٹھو اور میرے ساتھ ناشتا کرو۔۔۔" ہمیشہ کی طرح شازب ہی بیوی کا مددگار رہتا۔

"جی۔۔۔ اچھا۔" وہ چپ چاپ میاں کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی اور سر جھکا کر ناشتا کرنے لگی۔

"بھئی۔ بڑی دلہن۔۔۔ مزا آگیا۔" ظفر بیگ نے فیرنی کا پیالہ ختم کیا اور کھڑے ہو کر پیار سے کہا۔

"خالو جان اور دوں۔۔۔؟" اس نے ایک دم خوش ہو کر ان سے پوچھا۔ ان دونوں کے بیچ قائم خلیج بھر چکی تھی' احسانہ کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔

"نہیں۔۔۔ بیٹا۔ بہت کھالیا۔" وہ شفقت آمیز لہجے میں بولے۔

"بھابھی۔۔۔ یار مزا آگیا۔ قسم سے۔ جادو ہے۔۔۔ جادو۔۔۔" شارق نے مسکرا کر تعریف کی تو وانیہ نے گھور کر شوہر کو دیکھا۔

"کون سا۔۔۔ جادو؟" شازب نے بھائی سے پوچھا۔

"اس کھیر میں۔۔۔ بھابھی کے ہاتھوں کا جادو ہے۔" اس نے باؤل کی جانب اشارہ کیا تو سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"میرے سر میں درد ہے۔ میں ذرا کمرے میں جا رہی ہوں۔" وانیہ ایک دم تپ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ایسے۔۔۔ ناشتا چھوڑ کر نہیں جاتے۔۔۔ جوس دوں۔۔۔؟" خیال رکھنے کی عادت سے مجبور احسانہ کے منہ سے پھسلا۔

"بھابھی۔۔۔ سر میں درد ہو تو میرے حلق سے کچھ نہیں اترتا۔" اس نے نروٹھے پن سے جواب دیا۔

"گولی دوں۔۔۔؟" شارق نے بیٹھے بیٹھے پوچھا مگر کھڑا نہیں ہوا تو وہ بری طرح سے سڑ گئی۔

"نہیں شکریہ۔۔۔ آپ ایک اور پوری کھالیں۔۔۔" اس نے تہذیب کے دائرے میں طنز فرمایا اور سب کو

حیران چھوڑ کر خواب گاہ کی جانب چل دی۔

٭ ٭ ٭

اس دن بسوں کی ہڑتال چل رہی تھی۔ علی صاحب کافی دور سے پیدل چل کر اپنے دفتر پہنچے تو ہانپ گئے۔ بیل بجا کر چپراسی سے پانی کا گلاس منگوایا' ابھی کرسی پر بیٹھ کر گلاس منہ سے لگایا ہی تھا کہ ظفر بیگ بڑے کروفر کے ساتھ ان کے کیبن میں داخل ہوئے۔ غیر متوقع طور پر انہیں وہاں دیکھ کر علی مرتضیٰ کا ہاتھ فضا میں معلق رہ گیا اور حلق مزید خشک ہوا۔ رعب دار شخصیت کے مالک ظفر بیگ نے ملاقات میں انہیں بہت کچھ اچھی طرح سے باور کروا دیا کہ ان دونوں گھرانوں کے بیچ میں امارت اور غربت کی طویل لکیر کھنچی ہوئی ہے۔ علی صاحب ان کے عجیب سے برتاؤ پر پریشان نظر آنے لگے' مگر جب وہ اصل مدعا کی طرف آئے اور ان کی آمد کا مقصد جان کر اور منہ سے اپنی بیٹی کا نام سن کر علی صاحب کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ ان کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ ان کی لاڈلی' ان کی احسانہ کی وجہ سے اپنے ایک امیر رشتے دار کے سامنے ایسے نگاہیں جھکا کر شرمسار ہونا پڑے گا۔ ظفر بیگ بہت کچھ بول کر چلے گئے تو صدمے سے علی مرتضیٰ کا برا حال ہو گیا۔ وجود کی نقاہت بڑھ گئی۔ جب وہ گھر پہنچے تو ان کا غیظ و غضب سے برا حال تھا' بیٹی کی شکل دیکھنا نہیں چاہتے تھے منہ پھیر کر بس چلاتے رہے۔ احسانہ ذہنی طور پر اس صورت حال کے لیے قطعی طور پر تیار نہ تھی۔ اس کی تو وہ حالت ہوئی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہ ہو۔ اپنی عمر کے بائیس سال گزارنے کے باوجود اس نے کبھی باپ کو ایسے اشتعال میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک دم لرزتی ہوئی خوف سے پیلی پڑ گئی تھی۔

"عظیمہ اس بدبخت سے کہہ دو کہ میری نگاہوں سے دور ہو جائے۔" وہ اس وقت ایک لمحے کے لیے بھی اسے اپنے سامنے برداشت نہیں کر پا رہے تھے۔ منہ پھیر کر چلائے۔

"جاؤ... ابھی تم اپنے کمرے میں جاؤ۔" ماں کی تاکید پر احسانہ روتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ احسانہ کی وجہ سے ظفر بھائی میری اتنی تضحیک کریں گے۔" انہوں نے بھیگے ہوئے لہجے میں بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں... مگر کچھ غلطی تو ان کی بیٹے شازب کی بھی ہوگی۔" شوہر کی حالت دیکھ وہ بھی آبدیدہ ہو گئیں' مگر بیٹی کی حمایت میں ایک جملہ منہ سے پھسلا۔

٭ ٭ ٭

سحری کا آٹا گوندھنے کے بعد احسانہ نے کچن کے بکھیڑے نمٹائے اور واپس کمرے میں آ گئی۔ کمرے میں آ کر اس نے ٹائم دیکھا تو رات کے نو بج چکے تھے۔ وضو کے بعد عشاء کی نماز ادا کی۔ نماز کی ادائیگی کے دوران ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ جائے نماز تہ کرتے ہوئے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو سنی دادی کے ساتھ لڈو کھیل رہا تھا۔ وہ مطمئن ہو کر آرام کے لیے کچھ دیر بستر پر دراز ہو گئی تو آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔

"بھئی... حسنی اتنی جلدی سو گئیں؟" شازب تراویح کی ادائیگی کے بعد گھر لوٹا تو بستر پر دراز بیوی کے کان میں دھیرے سے سرگوشی کی۔ اس کے وجود میں جنبش تک نہ ہوئی۔ ایسے ہی اپنے ہاتھ پر سر رکھے مزے سے سوتی رہی۔ شازب کو اس کا یہ انداز بہت بھایا۔ بیڈ کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ کر وہ بیوی کو تکنے لگا اور بے اختیار اس کے نرم بالوں میں انگلیاں پھیرنا شروع کر دیں۔ گول بے ریا سا چہرہ' بڑی بڑی سیاہ آنکھوں پر گھنی پلکوں کا سایہ' ستواں ناک اور سرخی مائل گلابی بھرے بھرے ہونٹ۔ اس نے اعتراف کیا کہ... اس کا حسن ایک دم سے دیوانہ بنانے والا نہیں تھا۔ بس دھیرے دھیرے سامنے والے کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا تھا اس لیے تو وہ ساری دنیا کو ٹھکرا کر اسے اپنا بنا بیٹھا۔

"جو عورت اپنے حسن کی طاقت سے انجان ہو۔۔۔ اس سے محبت نہیں عشق کیا جاتا ہے۔" شازب نے سرگوشی کی' اس کی حسیں بے دار ہوئیں۔ وہ اس کے بالوں میں یوں ہی انگلیاں پھیرتے رہے۔ شوہر کے محبت بھرے لمس میں جادو تھا۔ جاگ جانے کے باوجود احسانہ ایسے ہی آنکھیں موندیں لیٹی رہی۔ دن بھر کی تکان پر لگا کر اڑن چھو ہو گئی۔

وہ لیٹے لیٹے پرانے زمانے کو یاد کرکے دل ہی میں ہنستی رہی۔ یہ وہ ہی شارب تھے جن سے ان کی ایک پل بھی نہیں بنتی تھی' احسانہ ہمیشہ انہیں دیکھ کر ایسے منہ بناتی جیسے کونین کی گولی منہ میں چبالی ہو۔ شازب بھی اسے بددماغ' نک چڑھی اور مغرور کے القابات سے نوازتے ہوئے حتی الامکان نظرانداز کرنے کی کوشش کرتا' مگر پھر دونوں ایک دوسرے کی چاہت میں ایسے گرفتار ہوئے کہ ایک دوجے کے بنا سانس لینا بھی مشکل ہو گیا تھا جس طرح شازب کو اس بات کا اچھے طریقے سے اندازہ تھا کہ احسانہ اُسے بے انتہا قدر ٹوٹ کر چاہتی ہے ویسے ہی وہ بھی جانتی تھی کہ اس کے بغیر شازب کی ذات کی تکمیل ہونا ممکن نہیں۔

"من چاہی ہستی کی قربت میں گزرنے والا ہر لمحہ کتنا قیمتی ہو جاتا ہے۔" احسانہ کے کسمسانے پر شازب کے لبوں پر ہنسی رینگ گئی دھیرے سے بولا۔ وہ شوہر کی شرارت سمجھ گئی' بولنے پر اکسا رہے تھے' مگر وہ بھی مکر کیے آنکھیں بند کرکے لیٹی رہی۔

"چلو۔۔۔ تو پھر تم سوتی رہو۔۔۔" اس نے جان کر زور سے بولا۔

"میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔" معصوم چہرے کے بدلتے تاثرات سے اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے شازب کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ "بابا جان دودھ کے انتظار میں ٹیرس پر ٹہل رہے تھے' ان کو بتا دیتا ہوں کہ بہو بیگم نیند میں دھت ہیں۔" وہ اپنی جگہ پر کھڑا ڈھب ڈھب کرنے لگا۔

"سنیں۔۔۔ تو۔" احسانہ نے گھبرا کر پٹ سے آنکھیں کھولیں' مگر باہر جانے کی ایکٹنگ کرتے دیکھ کر باوجود ضبط کے قہقہہ نکل گیا۔ وہ بیوی کی شکل دیکھ کر بے اختیار ہنستا چلا گیا۔

"میں۔۔۔ ابھی آتی ہوں۔" بستر سے اترتے ہوئے اسے شازب کی محبوبہ سے ذمہ دار ہو بننے میں منٹ نہ لگا۔

"یہ۔۔۔ پکڑیں۔" سسر کو دودھ دینے جانے سے قبل شوہر کے ہاتھ میں نائٹ سوٹ تھمانا نہ بھولی۔ وہ ایسے ہی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھنے والی تھی۔ "خدا نے احسانہ کی صورت میں مجھے بیوی نہیں بلکہ ایک نعمت دی ہے۔" اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔

☆ ☆ ☆

"آپی۔۔۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ یہاں کے گھٹے گھٹے ماحول میں رہنا بہت مشکل ہے۔" رانیہ سے فون پر بات کرتے ہوئے وانیہ نے دل کی بھڑاس نکالی۔

"اسی دن کے لیے تمہیں سمجھایا تھا کہ شارق سے شادی نہ کرو۔" رانیہ نے بہن کو فون کی دوسری طرف سے لتاڑا۔

"اس معاملے میں شارق کہاں سے آ گئے۔" وہ ایک دم گڑبڑائی۔

"کیوں۔۔۔ کیا۔۔۔ وہ ماموں کے گھرانے کا فرد نہیں؟" اس نے الٹا سوال پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ مگر ہمارے بیچ کے معاملات تو بالکل ٹھیک جا رہے ہیں۔" وہ صفائی دینے جیسے ہو گئی۔ "میں شازب بھائی اور احسانہ بھابھی کی بات کر رہی ہوں۔ میں نہیں بھول سکتی کہ احسانہ بھابھی کی وجہ سے شازب بھائی نے شادی سے ایک ماہ قبل انکار کہلوا دیا' بلکہ دس سالوں تک ہم لوگوں کا ماموں سے ملنا ملانا بھی بند رہا۔" وانیہ نے چبا چبا کر کہا۔

"یہ ماضی کی بات ہے' مگر اب میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ اچھی زندگی گزار رہی ہوں اور شازب بھی اپنی بیوی کے ساتھ خوش ہے۔" رانیہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "اور پھر دیکھو وانی۔۔۔ ہماری قسمت میں یہ ہی لکھا تھا۔"

''آپی.... کبھی ہم انسانوں کی غلطیوں کو قسمت پر ڈال کر صبر کرنے کا درس دیتے ہیں.... مگر....'' وہ مزید بولتے بولتے رک گئی۔

''اچھا.... سنو.... میری ایک درخواست ہے۔ ہماری وجہ سے تم اپنی شادی شدہ زندگی کو مشکل میں نہ ڈالنا۔'' رانیہ نے بہن کو سمجھانا چاہا۔

''آپی.... میں یہ ساری باتیں بھولنا چاہتی ہوں' مگر جب بھی ان دونوں کو ساتھ دیکھتی ہوں' میرے دماغ میں پچھلے سال گھوم جاتے ہیں' جب مما ہر عید' تہوار میں اپنے بھائی کے لیے روتی پھرتی تھیں اور میرا دماغ گھوم جاتا ہے۔'' وانیہ کی غم میں ڈوبی آواز بہن تک پہنچی۔

''وانی.... بھلائی اسی میں ہے کہ خود کو بدل ڈالو۔ ایسا نہ ہو کہ وقت بدل جائے۔'' رانیہ نے اسے سنجیدگی سے سمجھایا۔

''وہ.... آپی.... شارق بھی ٹھیک ہیں۔ ابھی آفس سے آئے ہیں۔'' وانیہ نے شارق کو کمرے میں آتے دیکھا تو بات گھمانا چاہی۔

''چلو.... ٹھیک ہے۔ میں تم سے پھر بات کروں گی۔ مگر میری باتوں پر غور کرنا۔ اوکے۔'' رانیہ نے سمجھاتے ہوئے اجازت طلب کی۔

''اوکے.... کوشش کروں گی۔'' اس نے مختصر بات کر کے لائن کاٹ دی اور شوہر کا زوردار مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کیا۔

☆ ☆ ☆

احسانہ کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ظفر خالو اس کے باپ کے دفتر پہنچ کر ان کے ساتھ ایسا سلوک بھی کر سکتے ہیں۔ وہ جب سوچتی دماغ کی رگیں پھٹنے لگ جاتیں۔ ماں' باپ کے سامنے اپنے جذبوں کے ارزاں ہونے سے زیادہ اس بات کا قلق ہوا تھا کہ اس کی ذات اور ماں' باپ کی عزت نفس پر بڑی بھاری چوٹ پڑی ہے۔ سب سے بڑھ کر رانیہ اور شازب کی منگنی والی بات پر وہ خود کو معاف ہی نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کی پاکیزہ محبت ہی اس کا جرم بن گئی تھی۔ نوعمری کی چاہت اور سنبھال کے رکھے گئے جذبوں کی ایسے برے انداز میں تشہیر' احسانہ کے وجود کو لہولہان کر گئی تھی۔

وہ ان سب باتوں کا ذمہ دار شازب کو ٹھہرا رہی تھی' اس لیے اس سے بات کرنا' ملنا ملانا چھوڑ دیا۔

وہ احسانہ کے جان بوجھ کر گمشدہ ہو جانے پر بری طرح سے پریشان ہو گیا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اچانک ایسا کیا ہو گیا ہے۔ جو وہ غائب ہو گئی تھی۔ دو ایک بار اس کی یونی میں پتا کیا' مگر وہ وہاں سے بھی غیر حاضر تھی۔ گھر جانے کی ہمت نہ ہو سکی' فون بھی مسلسل بند جا رہا تھا۔

اس دن احسانہ بہت دنوں بعد یونی ورسٹی آئی تھی' چھٹی کے وقت دروازے سے باہر قدم رکھا تو سامنے ہلکی ہلکی بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ جینز کی جیب میں ہاتھ ڈالے وہ اپنی شان دار گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا دکھائی دیا۔

''آپ کی یہاں آنے کی ہمت کیسے ہوئی۔'' احسانہ اسے دیکھتے ہی بھڑک گئی' دبا ہوا غصہ عود آیا تھا۔

''احسانہ.... یہ کیا کہہ رہی ہو۔ آخر ہوا کیا ہے؟'' وہ نہ سمجھ میں آنے والے انداز میں دیکھ کر پوچھنے لگا۔

''کچھ نہیں ہوا.... مگر.... آپ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔'' اس نے نروٹھے پن کی انتہا کر دی۔

''تمہاری خاطر میں نے سب سے بیر باندھ لیا اور تم نے ہی قدم پیچھے ہٹا لیے۔'' اس کے دل میں پلتا شکوہ لبوں تک آگیا۔

''لیکن شازب صاحب' آپ نے تو مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا ہے۔'' وہ غصے سے بولتی ہی چلی گئی۔

''کیا مطلب.... '' وہ کچھ نہیں سمجھا۔

''ہم غریبوں کے لیے عزت سے بڑھ کر دوسری چیز کچھ نہیں ہوتی اور آپ لوگوں نے وہ ہی چھین لی۔'' اس کا جلال کم نہ ہوا۔

''کہنا کیا چاہتی ہو۔ میں تو تمہیں اپنی عزت بنانے چاہتا ہوں۔ اور تم ایسا گھٹیا الزام لگا رہی ہو۔'' وہ ہکا بکا سا رہ گیا۔

"افسوس تو مجھے ہے کہ میرا انتخاب اتنا غلط نکلا۔ جو شخص اپنی فیملی میں میری عزت نہ کرا سکا' کیا وہ اس قابل ہو سکتا ہے کہ میں اپنی پوری زندگی اس کے ساتھ گزاروں۔" احسانہ نے دل پر جبر کرتے ہوئے کہا۔

"احسانہ۔۔۔ اس قدر کی بدگمانی۔" اس کے یوں بدلنے پر وہ حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔

"آپ جائیں یہاں سے۔۔۔ مجھے اب کوئی رشتہ نہیں رکھنا۔" وہ منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔

"احسانہ۔۔۔ ایک بات سنو' ابھی تو تم نے الگ ہونے کی بات منہ سے نکالی ہے۔ مگر آئندہ ایسا سوچا بھی تو جان سے مار دوں گا۔" وہ جذباتی پن کی انتہاؤں کو پہنچ کر اس کے قریب جا کر چلایا۔

"اچھا۔۔۔ اگر اتنا ہی چاہتے تھے تو پھر رانیہ کے ہوتے ہوئے مجھ سے فلرٹ کیوں کیا؟" اس نے طنز سے پوچھا۔

"سچی محبت کی پرکھ تم کو بالکل بھی نہیں ہے' ورنہ ہمارے پیار کو فلرٹ کا نام نہ دیتی۔" اس کا لہجہ دکھوں میں ڈوب گیا۔ "جہاں تک رانیہ والا معاملہ ہے' میں اس بات پر تمہارے آگے شرمسار ہوں۔ مگر کروں تو کیا کروں۔" اس نے چوڑے سینے پر ہاتھ رکھ کر بے چینی سے کہا۔

"بات صرف اتنی سی نہیں۔" وہ اس کی سادگی پر مسکرائی۔

"تو۔۔۔ پھر؟" اس نے سوال کیا۔

"ہم دونوں کے بیچ کا طبقاتی تفاوت ہمیں کبھی ایک ہونے نہ دے گا۔" سرد آہ اس کے لبوں سے نکلی۔

"میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔ مجھے لوگوں میں تفریق کرنا پسند نہیں۔" شازب نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اچھا تو ذرا خالو جان سے جا کر پوچھ لیں۔ وہ تو بہت اسٹیٹس کونشس ہیں۔" اس نے طنز فرمایا۔

"یہاں۔۔۔ میرے والد۔۔۔ کا کیا ذکر۔" وہ اس کے پٹڑی سے اترنے پر حیران ہوا۔

"ان ہی کا تو سارا جمال ہے جو ابو کے دفتر پہنچ کر ان کی ایسی توہین کی کہ نہ پوچھیں۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔ وہ ایسا نہیں کر سکتے؟" وہ شاکڈ سا کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔

"یہ بکواس نہیں' حقیقت ہے اور انہوں نے ہی دھمکی دی ہے کہ بھلائی اسی میں ہے کہ ہم دونوں خاموشی سے اپنی محبت سے دستبردار ہو جائیں۔" اس کے انکشاف پر شازب کو یقین نہیں آیا۔

"نہیں۔۔۔ وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟" شازب کا ذہن کسی طرح بھی یہ بات قبول کرنے سے انکاری ہوا۔

"یہ قیامت ہم پر ڈھائی جا چکی ہے' شازب صاحب۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اذیت سے بولی۔ وہ ساکت و صامت اسے ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ "ویسے انہیں یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ ایک باپ کے سامنے اس کی بیٹی کی شرافت کی دھجیاں بکھیر ڈالیں۔" احسانہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپکا اور اس کے دل پر جا کر گرا۔ "بہتری اسی میں ہے کہ آج سے ہمارا ہر تعلق ختم ہو جائے۔" وہ ضبط کرتے کرتے بے حال ہو گئی۔ "میں آپ کی محبت کو اپنی زندگی کا ایک برا سپنا سمجھ کر بھول جاؤں گی اور آپ بھی۔۔۔" اس نے دل پر پتھر رکھ کر یہ الفاظ ادا کیے۔ "پلیز۔۔۔ دوبارہ یہاں آنے کی زحمت نہ کیجیے گا۔" ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہتے ہوئے وہ اندر سے رو دی۔ شازب خاموشی سے ایک لفظ بھی کہے بغیر الٹے پاؤں لوٹ گیا۔

☆ ☆ ☆

"شازب! ایسے مت کہو بیٹے!" ظفر بیگ نے زندگی میں پہلی بار اولاد سے نگاہ چرائی۔

"آپ نے مجھے تباہ کر دیا۔" وہ شکوہ بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں نے جو کچھ بھی کیا' اپنے خاندانی وقار اور عزت و ناموس اور رشتوں کو بچانے کے لیے کیا۔" وہ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر سمجھانے لگے۔

"ان سب چیزوں کے بیچ میں آپ کی اولاد بھی ہے۔ جس کے اندر زندگی کی حرارت موجود ہے۔" وہ

اذیت سے مسکرایا۔

"بیٹا۔ علی بھائی کا گھرانہ ہمارے معیار کا نہیں۔" وہ بیٹے کی حالت پر صفائیاں دینے لگے۔

"میں نہیں مانتا کہ دولت کی غیر مساویانہ تقسیم پر انسانوں کو تقسیم کردیا جائے۔" زندگی میں پہلی بار وہ کسی بات پر ڈٹا تھا۔

"رانیہ کا کیا ہوگا... یہ سوچا ہے تم نے... وہ میری بہن کی بیٹی ہے؟" وہ غصے میں چلائے۔

"اس بات پر مجھے بہت افسوس ہے' مگر زبردستی کے رشتے پائیدار نہیں ہوتے۔ اسی بات میں رانیہ کی بھلائی بھی ہے کہ کیونکہ میں اسے اپنا بھی لوں تو اپنے دل میں وہ مقام نہیں دے پاؤں گا' جو میری بیوی کا حق ہوگا۔" وہ صاف بات کرتا ہوا باپ کے سامنے سے جانے لگا۔ "ایک بات بتادوں۔ احسانہ نہیں تو زندگی نہیں۔ میں اس کے بغیر مرجاؤں گا۔" وہ جاتے جاتے ایسے لہجے میں بولا کہ ظفر بیگ کا وجود لرزنے لگا۔ انہیں اس بات کا اچھی طرح سے اندازہ ہوگیا کہ شازب اس لڑکی کی محبت میں آخری حد تک جاسکتا ہے۔ بیٹے کے منہ سے مرنے کی باتیں سن کر وہ حقیقتاً "ڈر گئے تھے۔ ظفر بیگ صاحب کو اس دن یہ ادراک بھی ہوا کہ شازب ان کی انگلی تھام کر چلنے والا بچہ نہیں رہا۔ جوان ہوچکا ہے۔ اس کی اپنی پسند نہ پسند اور ترجیحات ہیں۔ ایک ہفتے کی اعصاب شکن جنگ کے بعد آخر جیت اسی کی ہوئی۔ ظفر بیگ کو جھکتے ہی بنی۔ وہ ویسے بھی جوان اولاد کے ساتھ شادی کے معاملے میں زبردستی کیسے کرسکتے تھے۔ خاص طور پر جب اس نے دھمکی دی ہو کہ اگر اس کی شادی رانیہ سے طے کی گئی تو وہ گھر چھوڑ کر چلا جائے گا' مگر ایک عہد انہوں نے بھی دل میں کیا کہ احسانہ ان کے بیٹے کی بیوی تو باآسانی بن جائے گی' مگر ان کے دل میں بہو کا مقام پانا اس کے لیے آسان نہیں ہوگا۔

☼ ☼ ☼

احسانہ پچھلے چند ماہ سے عجیب طرح کی الجھن کا شکار تھی' مگر پھر بھی اپنی سوجھ بوجھ سے معاملات کو باآسانی لے کر چل رہی تھی' تاہم اس وقت گھر کے حالات پر کر اس کا دل بھر آیا' کچھ بھی ہو' اس کے سینے میں بھی ایک دل دھڑکتا تھا' جو خوشی ملنے پر خوش اور دکھوں کی وجہ سے دکھی ہوجاتا۔ سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی تھی کہ شازب اندر داخل ہوا۔

"خیر تو ہے... یہ گلوں پر خزاں کیوں چھائی ہے۔"

"کیا کروں رمضان شروع ہوگئے ہیں... روزے کی حالت میں اتنا سارا کام' تھک جاتی ہوں۔"

"اب تم اکیلی کہاں رہی... وانیہ بھی تو ساتھ دینے کو آگئی ہے اور اماں جان نے بھی تو اسے کچن میں تمہاری ہیلپ کی تاکید کی تھی۔"

"اسے کچھ بولو تو... چڑ جاتی ہے... جو بولوں۔ ہمیشہ اس کا الٹا کرتی ہے۔ پتا نہیں اس کو کیا پرابلم ہے۔ کھنچی کھنچی سی رہتی ہے' مجھے دیکھتے ہی چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آتے ہیں اور تو اور۔ ہر کام میں میری کاٹ کرتی ہے۔" اس نے بتایا۔

"مجھ سے بہتر تو تم جانتی ہو کہ اسے تم سے کیا پرابلم ہے۔" شازب کے معنی خیز انداز پر وہ جھینپ سی گئی۔

"ہاں... مگر میں چاہتی ہوں کہ ہم سب مل جل کر رہیں اور یہ گھر خوشیوں کا گہوارا بنا رہے' مگر صرف میرے چاہنے سے تو کچھ نہیں ہوتا۔"

"خیر اب تقریر چھوڑو اور نئی بات کیا ہوئی۔ یہ بتاؤ؟" شازب نے بات بدلی۔

"مجھے اتنے سالوں میں' سب کی پسند ناپسند کا پتا چل گیا ہے' میں اسی حساب سے کام کرتی ہوں اور اسے بھی بتاتی ہوں' مگر وہ میری کہی ہوئی ہر بات کے خلاف کرتی ہے۔" احسانہ نے منہ لٹکا کر کہا۔

"اوہ... وہ کیسے؟" شازب کو جھٹکا لگا۔

"آج کی بات ہی لے لیں۔ کئی سالوں سے۔ اس گھر کا معمول ہے نا کہ سب لوگ افطار پر لسی پیتے ہیں؟" اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں کیوں کہ بابا جان کو یہ بات پسند ہے۔" اس نے اثبات میں سرہلایا۔

"میں نے افطاری کی تیاری کے دوران وانیہ کو لسی بنانے کی ہدایت کی تو اس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے لیموں پانی بنالیا۔"

"اچھا، مگر دستر خوان پر تو لسی بھی موجود تھی۔" شازب نے بیوی کی طرف تجسس سے دیکھا۔

"جی... ہاں۔ کیوں کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ روزہ کھولتے ہوئے کوئی بدمزگی ہو اس لیے عین ٹائم پر جلدی جلدی لسی بنائی اور خاموشی سے دستر خوان پر رکھ دی۔"

"یہ تم نے ٹھیک کیا... پر اب مسئلہ کیا ہے؟"

اس بات پر محترمہ کا منہ مزید پھول گیا۔ وہ بات بہ بات مجھ پر طنز کیے جارہی ہے۔" احسانہ نے تھکے تھکے انداز میں بتایا۔ شازب کو اس پر پیار آیا کہ وہ روزے کی حالت میں بھی سب کی پسند نہ پسند کا کتنا خیال رکھتی ہے۔

"اس مسئلے کا کوئی پر امن حل بتائیں نا رمضانوں میں یہ کھاسی اچھی نہیں لگتی۔" شوہر کو خیالوں ہی خیالوں میں مسکراتا دیکھ کر اس نے کاندھا ہلایا۔

"اچھا... تو... وانیہ کی انا اسے تمہاری بات ماننے سے روکتی ہے۔" شازب نے سرہلا کر نتیجہ نکالا۔

"جی... یہ ہی تو مشکل ہے۔" اس نے اثبات میں سرہلایا۔

"ٹھیک ہے۔ تو تم بھی اس کے ساتھ ریورس نفسیات سے کام لو۔" شازب نے انگڑائی لیتے ہوئے بیوی کو گر سکھایا۔

"ریورس نفسیات... میں کچھ سمجھی نہیں۔" اس نے نہ سمجھ میں آنے والی نظروں سے شوہر کو دیکھا تو وہ اسے دھیرے دھیرے کچھ سمجھانے لگ گیا۔

"آپ کتنے اچھے ہیں۔" اس کی یوں معصوم سی تعریف پر وہ ہنستے ہوئے باہر چل دیا۔

☼ ☼ ☼

"کیا کر رہی ہیں بڑی بھابھی؟" وانیہ کے متجسس انداز پر اس نے بیسن کا ڈبا نکالنے کا ارادہ موخر کردیا۔

"بس... افطاری کی تیاری..." اس نے مختصر جواب دیا۔

"کیا کیا بنانا ہے؟" اس نے بھی تھوڑے اکھڑے لہجے میں پوچھا۔

"میں سوچ رہی ہوں کہ آج پکوڑے نہیں بناتے۔" اس نے وانیہ کی طرف دیکھتے ہوئے الٹی بات کی۔

"ارے... یہ کیا بات ہوئی... پکوڑوں کے بغیر تو افطاری ادھوری سی لگتی ہے۔" توقع کے مطابق وانیہ نے ناک چڑھا کر مخالفت کی۔

"ہاں... مگر... روز روز ایک ہی چیز کھاتے کھاتے دل اوب گیا ہے۔" احسانہ کو مزا تو آیا مگر سوکھے منہ سے کہا۔

"نہیں۔ بھئی۔ پکوڑے تو ضرور بنیں گے... آپ کو پتا ہے نا کہ ماموں جان کتنے شوق سے کھاتے ہیں۔" وہ ضدی انداز میں باؤل نکالتے ہوئے بولی۔

احسانہ نے اس کی بات پر کوئی جواب نہ دیا۔ فروٹ اٹھائے اور کچن ٹیبل پر جاکر بیٹھ گئی اور خاموشی سے کاٹتے ہوئے کن انکھیوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"آپ کو پکوڑے نہیں بنانے تو مت بنائیں... میں خود بنالیتی ہوں۔" وہ بے چینی سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔

"یہ بیسن کہاں رکھا ہے؟" وانیہ نے جلبلا کر پوچھا۔

"سامنے کیبنٹ پر رکھا ہے۔" احسانہ نے جواب دیا۔ وانیہ نے بیسن کا ڈبا اٹھایا اور بڑی دلجمعی سے کام میں لگ گئی۔

احسانہ کے لیے اپنی ہنسی ضبط کرنا مشکل ہورہی تھی۔ شوہر جی کا مشورہ کام آگیا اسے یاد آیا کہ پچھلے مہینے جب احسانہ نے مہمانوں کی اچانک آمد پر دیورانی سے پکوڑے بنانے کا کہا تو وہ صاف مکر گئی تھی کہ اسے تو پکوڑے بنانا آتے ہی نہیں ہیں۔

☼ ☼ ☼

"اماں جان... آپ نے بلایا تھا؟" احسانہ نے

ساس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ادب سے پوچھا۔

"جی بڑی بہو۔۔۔ آئیں بیٹھیں۔" راشدہ بیگم نے ہاں میں سر ہلایا اور بیڈ کے سامنے رکھے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

"جی ممانی جان۔۔۔ میں آگئی ہوں۔" اتنے میں دانیہ بھی کمرے میں داخل ہوئی اور اسے پہلے سے وہاں موجود دیکھ کر منہ بنایا۔

"بیٹا۔۔۔ ہم عید کے لیے یہ دو ایک جیسے سوٹ لائیں ہیں۔ بس رنگوں کا فرق ہے۔" شاپر میں سے شیفون کے قیمتی کام والے دو سوٹ سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"آپ دونوں اپنی اپنی پسند کا سوٹ اٹھالیں۔" راشدہ بیگم نے شفقت بھرے لہجے میں بولتے ہوئے ان دونوں کی جانب دیکھا۔

"مجھے تو گلابی رنگ بالکل پسند ہی نہیں۔" احسانہ نے جان بوجھ کر بلند آواز میں کہا تو دانیہ کا گلابی سوٹ کی جانب بڑھتا ہاتھ رک گیا اور اس نے جھپٹ کر سبز سوٹ اٹھالیا۔

"شکریہ۔ ممانی جان۔" دانیہ بولتی ہوئی وہاں سے اٹھ کر چل دی۔

"اماں جان۔۔۔ بہت ہی پیارا سوٹ ہے۔" احسانہ نے اطمینان سے اپنا فیورٹ کلر کا سوٹ اٹھایا اور مسکرا کر تعریف کی۔

"بیٹا۔۔۔ تمہیں تو گلابی رنگ پسند تھا پھر تم نے ابھی ایسی غلط بیانی سے کیوں کام لیا۔" راشدہ نے حیرت سے پوچھا۔

"بس۔۔۔ اماں جان ریورس نفسیات۔۔۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا بلا ہے؟" وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

"اس سے مراد یہ ہے کہ جو آپ چاہتے ہیں سامنے والے سے اس کے برعکس کہیں تو وہ یقیناً "ویسا کرے گا" جیسا آپ چاہتے ہوں۔" اس نے شازب کی سمجھائی ہوئی بات من وعن بیان کردی۔

"اچھا... تو پھر؟" وہ بھونچکی رہ گئیں۔

"بس... وانیہ کا مزاج سمجھتے ہوئے جب سے میں نے یہ طریقہ اپنایا ہے' مسئلے کافی حد تک کم ہوتے چلے گئے ہیں۔" احسانہ نے ایک دم ہلکے پھلکے انداز میں بتایا تو وہ چپ بیٹھی رہ گئیں۔

"کیا ہوا... آپ کو یہ بات پسند نہیں آئی؟" اس نے انہیں افسردہ دیکھا تو ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"نہیں بیٹا... بس ہمیں وانیہ کے طرز عمل پر افسوس ہو رہا ہے کہ اس سے سیدھا کام کروانے کے لیے تمہیں الٹی راہ اپنانی پڑ رہی ہے... خیر۔" وہ دھیرے دھیرے بولتی ہوئی نماز کے لیے اٹھ گئیں۔

احسانہ کے دل میں ساس کی بات گڑ گئی' اسے خود بھی افسوس ہونے لگا کہ اسے بلاوجہ یہ سب کرنا پڑ رہا ہے' مگر وہ گھر کا ماحول بھی ٹھیک رکھنا چاہتی تھی۔ الجھتی چلی گئی کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا تو اس نے ان باتوں کے دباؤ سے فرار حاصل کرنے کے لیے دو تین دن کے لیے میکے کا رخ کرنے کا سوچا اور شازب کی منت سماجت کے باوجود سنی کو لے کر چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

چاند رات کو احسانہ سر تھام کر بیٹھی تھی کہ کیسے سارے کام اکیلے نمٹائے اور پھر صبح کے لیے اہتمام بھی تو کرنا ہے' اتنے میں راشدہ بیگم اسے پکارتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔

"بڑی دلہن کیا بات ہے آپ نے ابھی تک مہندی نہیں لگوائی؟" راشدہ نے نرمی سے پوچھا تو وہ خیالات سے پیچھا چھڑاتی ہوئی ان کی جانب متوجہ ہوئی۔

"اماں جان... ابھی نہیں لگائی۔" اس نے سامنے سے آتی دیورانی کو دیکھ کر اپنے الفاظ گھما دیے۔

"ہائے... کیوں بیٹا... کیا عید پر ایسے ہی کورے ہاتھ لے کر پھریں گی؟" ان کے بے ریا لہجے میں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا' احسانہ کی آنکھیں نم ہو گئیں اور ذہن میں اپنی اماں کا ہزار بار کا کہا ہوا جملہ گونجا کہ یہ میری احسانہ کی خوش قسمتی ہے کہ اسے اس قدر چاہنے والی ساس ملی ہیں۔

"کیوں... بھابھی... مہندی کیوں نہیں لگوا رہیں؟" وانیہ نے قریب پہنچ کر پوچھا۔

"دیکھو نا۔ وانیہ۔ صبح عید ہے اور ابھی ڈھیروں کام باقی ہے۔ چھولے ابالنے ہیں۔ سویوں کے لیے میوہ کاٹنا ہے' کیک بیک کرنا ہے' پلاؤ کے لیے یخنی چڑھانی ہے' ڈرائنگ روم کی سیٹنگ ٹھیک کرنی ہے اور سارے کمروں کی چادریں بھی بدلنی ہے ایسے میں اگر میں ہاتھوں پر مہندی تھوپ کر بیٹھ گئی تو یہ سب کام کون کرے گا۔" احسانہ نے جان بوجھ کر کاموں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔

"واقعی احسانہ... یہ بات تو آپ نے صحیح کہی... ہمارے دماغ سے بھی نکل گیا کہ ابھی بہت سارے کام باقی ہیں۔" راشدہ بیگم کی بات پر' وانیہ سوچ میں پڑ گئی۔

"اوفوہ بھابھی... اس میں کیا مشکل ہے... چلیں... میں آپ کے ساتھ مل کر سارے کام کروا دیتی ہوں۔ پھر ہم دونوں جا کر پارلر سے مہندی لگوائیں گے۔" اس نے پہلی بار پورے خلوص دل سے کہا تو وہ حیرت زدہ سی رہ گئی۔

"چھوٹی دلہن ٹھیک کہہ رہی ہیں... آپ دونوں صفائی کا کام نمٹالیں... ہم چھولے ابال دیتے ہیں اور یخنی بھی چڑھا دیں گے... ساتھ میں جو بھی کاٹنا پیٹنا ہے وہ بھی ہمیں دے دیں۔" راشدہ نے مسئلے کا حل نکالتے ہوئے اپنی مدد پیش کی۔ احسانہ کے لبوں پر ایک اطمینان بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہاں تو بھابھی... بتائیں کہ کیا کرنا ہے۔" وانیہ نے فرماں برداری سے پوچھا۔

"نہیں۔ نہیں۔ وانیہ شادی کے بعد یہ تمہاری پہلی چاند رات ہے... ایسا کرو تم شارق کے ساتھ جا کر چوڑیوں کی خریداری کر لو۔" احسانہ کو اس پر ایک دم پیار آیا' بصد خلوص پیش کش کی۔

"مگر... اتنے سارے کام..." اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"میں اماں جان کے ساتھ مل کر سارے کام کرلوں گی۔۔۔ پہلے بھی تو تمہارے بغیر کرتی ہی تھی نا۔" احسانہ کے لبوں پر نرم سی مسکراہٹ کھل اٹھی۔

"بڑی بھابھی مجھے معاف کردیں۔" اس کے برابر میں کھڑی وانیہ نے اچانک اپنائیت سے گلے میں بازو ڈال کر معافی مانگی۔

"کس بات کی وانیہ؟" اس نے خوش گوار حیرت سے مڑ کر اسے دیکھا۔

"مجھ سے بہت غلطیاں ہوئیں، مگر شکر ہے وقت پر عقل آگئی۔" اس کا لہجہ دکھی ہوا۔

"تم یہ سب کیا کہہ رہی ہو۔۔۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا؟" احسانہ نے خوش گوار حیرت سے دوچار ہوکر پوچھا۔

"بھابھی آپ کے میکے جانے کے بعد گھر ایک دم ویران لگنے لگا' اپنی ناتجربہ کاری کے باعث مجھ سے کوئی بھی کام بھی ٹھیک سے نہیں ہوپاتا' کبھی چھولے کچے رہ جاتے تو کبھی پکوڑے جل جاتے۔ ایک بار تو اذان کا وقت ہوگیا' مگر کام ختم نہ ہوسکا۔ اس پر گھر والوں کا منہ بھی بن جاتا۔ شارق تو سب کے سامنے جھاڑ دیتے' اس کے بعد مجھے احساس ہوا کہ یہ آپ کی ذات ہی تھی جو میری غلطیوں پر پردے ڈالتی آئی ہمیشہ میرے دم قدم رہتے ہوئے مجھے بچایا' بس پھر مجھے خود پر بہت غصہ آیا۔" وانیہ کے لبوں پر بے ریا مسکراہٹ اور آنکھوں میں ہلکی سی التجا اور معذرت جھلک گئی۔

"وانیہ بیٹا۔۔۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا بڑا بننے کے لیے بڑا ظرف بھی رکھنا پڑتا ہے' احسانہ نے مصلحت کا راستہ اپناتے ہوئے گھر میں لڑائی جھگڑا کرکے ماحول خراب کرنے کی جگہ تمہارے بچپنے میں کی گئی غلطیوں کو اپنے بڑے پن کی چادر سے چھپالیا۔" راشدہ مخصوص مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے بولتیں ہوئی ان کے قریب چلی آئیں۔

"اماں جان۔۔۔ اس میں میرا کیا کمال ہے؟ وانیہ تو میری چھوٹی بہنوں کی طرح ہے اور اگر اپنے چھوٹوں کو برابر یا اپنے سے اوپر جگہ دے دی جائے تو انسان چھوٹا یا کمتر نہیں ہوجاتا۔" احسانہ نے بڑی متانت سے کہا تو وانیہ روتے ہوئے اس کے گلے لگ گئی۔

"بس۔۔۔ بس۔۔۔ چاند رات کو یہ برسات اچھی نہیں آج تو ہنسی' قہقہے اور خوشیوں بھری گھڑی سے لطف اٹھانے کا وقت ہے تو تم دیور جی کے ساتھ جاکر اپنی شاپنگ مکمل کرلو۔۔۔ اس کے بعد ہم دونوں مل کر مہندی لگوانے جائیں گے۔" احسانہ نے اسے خود سے الگ کیا اور نم آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کمرے کی جانب دھکیل دیا۔

"بڑی بہو۔ آپ ہمیں میوہ نکال دیں۔" راشدہ ہدایت دیتی ہوئی کچن کی جانب چل دیں۔ سامنے سے آتے شازب نے وکٹری کا نشان بناتے ہوئے بیوی کو داد پیش کی تو وہ کھل کر مسکرائی۔

☼ ☼

تنزیلہ ریاض

مہر کو کہانیاں سننے کا بے حد شوق ہے' اسکول کے فینسی ڈریس شو میں وہ شہزادی راپنزل کا کردار ادا کر رہی ہے' اس لیے اس نے اپنے پاپا سے خاص طور پر شہزادی راپنزل کی کہانی سنانے کی فرمائش کی۔ کہانی سناتے ہوئے اسے کوئی یاد آجاتا ہے' جسے وہ راپنزل کہا کرتا تھا۔

نینا اپنے باپ سے ناراضی کی وجہ سے اپنے خرچے مختلف ٹیوشن پڑھا کر پورے کرتی ہے۔ اس کی بہن زری ٹیلی فون پر کسی لڑکے سے باتیں کرتی ہے۔ نینا کی سلیم سے بہت دوستی ہے۔ سلیم کی محلے میں چھوٹی سی دکان تھی۔ ایک ایکسیڈنٹ کی وجہ سے وہ ایک ٹانگ سے معذور ہو جاتا ہے۔ سلیم نے پرائیویٹ انٹر کیا ہے اور اس کی غزل احمد علی کے نام سے ایک ادبی جریدے میں شائع ہوتی ہے۔

سمیع اور شہرین نے ضد کر کے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف جا کر شادی کی ہے' لیکن شہرین اپنے والدین کی ناراضی کی وجہ سے ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہے۔ سمیع اور شہرین دونوں اپنی بیٹی ایمن کی طرف سے بہت لاپروا ہیں اور انہوں نے گھر کی دیکھ بھال کے لیے دور کی رشتہ دار اماں رضیہ کو بلا لیا ہے۔

صوفیہ کا تعلق ایک متوسط گھر سے تھا' صوفیہ کی شادی کاشف نثار سے ہوتی ہے' جو وجاہت کا اعلا شاہکار بھی تھا۔ شادی کے بعد صوفیہ کو کاشف کا غیر عورتوں سے بے تکلفی سے ملنا پسند نہیں آتا اور وہ شک کا اظہار کرتی ہے' لیکن کاشف کاروبار کا تقاضا ہے کہہ کر اس کو مطمئن کر دیتا ہے۔ صوفیہ کو کاشف کے دوست مجید کی بیوی حبیبہ بہت بری لگتی ہے کیونکہ

وہ کاشف سے بہت بے تکلف ہے۔ صوفیہ کی ایک بیٹی پیدا ہوتی ہے۔ زرمین۔
حبیبہ کے شوہر مجید کا روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو جاتا ہے وہ اپنا سارا پیسا کاشف کے کاروبار میں انویسٹ کردیتی ہے۔ حبیبہ کاشف پر شادی کے لیے دباؤ ڈالتی ہے کاشف کے انکار پر ان کا جھگڑا ہو جاتا ہے اور وہ دبئی چلی جاتی ہے۔
کاشف کے تعلقات ایک ناکام اداکارہ رخشی سے بڑھنے لگتے ہیں اور وہ کاشف کو فلم بنانے کے لیے آمادہ کرلیتی ہے اور اس چکر میں کاشف اپنا سارا پیسا لٹا دیتا ہے۔ صوفیہ ایک مردہ بچے کو جنم دیتی ہے۔ کاشف کی ماں بی بی جان کا انتقال ہو جاتا ہے۔
سلیم کی بہن رخشی کا انتقال ہو جاتا ہے اور نینا اس کی بیٹی مہر کے لیے پریشان ہوتی ہے۔ نینا کی اسٹوڈنٹ رانیہ اسے بتاتی ہے کہ ایک لڑکا اسے فیس بک اور واٹس ایپ پر تنگ کررہا ہے۔ "آئی لو یو رانیہ" لکھ کر۔
شہرزین کو برین ٹیومر ہو جاتا ہے اور سمیع اس کا آپریشن کرواتا ہے اور اس کی ماں کو منا کر اسپتال لے آتا ہے۔
زری جس لڑکے سے بات کرتی تھی وہ شادی کے لیے کہتا ہے۔ زری نینا سے ذکر کرتی ہے۔ نینا اس کی تصویر دیکھ کر چونک جاتی ہے۔ بعد میں اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی لڑکا ہے جو رانیہ کو میسج کرتا تھا وہ زری کو منع کرتی ہے اور سلیم کے کہنے پر زری کو سمجھانے کے لیے رات کو سلیم کو گھر بلاتی ہے۔ زری اس پر سلیم سے محبت کرنے کا الزام لگاتی ہے۔ شور ہونے پر ابا جاگ جاتے ہیں اور سلیم کو تھپڑ مارتے ہیں۔ سلیم صدمے اور شرمندگی کی وجہ سے خودکشی کرلیتا ہے۔

اکیسویں قسط

وہ خواب کی سی کیفیت تھی۔ اس کا دماغ سویا جاگا سا تھا۔ ایک شخص تھا جس کی پشت اس کی جانب تھی۔ اس نے بغور اسے دیکھا اور یاد کرنے کی کوشش کی کہ وہ کون تھا، لیکن اسے یاد نہیں آیا تھا۔ وہ شخص اس نے پہلے نہیں دیکھ رکھا تھا۔
"وفا ایک وصف ہے۔۔۔" اس نے کہا تھا۔ وہ شخص ہنسا جیسے اس کا مذاق اڑا رہا ہو۔
"واقعی۔۔۔؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ اس کا استفہامیہ انداز اسے چڑنے پر مجبور کررہا تھا۔ نینا نے گھور کر اسے دیکھا۔
"تم کچھ بھی کہو، لیکن میں اپنے بیان سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔۔۔ میرے لیے مرد کا باوفا ہونا ہی سب سے ضروری امر ہے۔" وہ جتا کر بولی تھی۔ وہ شخص مزید زور سے ہنسا۔
"منڈیوں میں یہ چیز ناپید ہو چکی ہے بی بی۔۔۔ کس دنیا میں رہتی ہو تم۔۔۔"
"ناپید ہے تب ہی تو نایاب ہے۔۔۔ اور نایاب ہے تب ہی تو مجھے چاہیے۔" اس کا عزم دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ شخص پھر زور سے ہنسا۔
"کہیں مل ہی نہ جائے تمہیں یہ گوہر نایاب۔۔۔ اونہہ باوفا مرد۔" اس کا انداز تمسخر بھرا تھا۔ نینا ہنکارا بھر کر آگے بڑھ گئی۔ دوسرا منظر بھی عجیب تھا۔ اس نے دیکھا ایک مرد اور عورت ایک دوسرے کے قریب کھڑے تھے۔ عورت کا سراپا تھکا ہوا اور نڈھال سا لگتا تھا۔ نینا کو وہ اچھی لگی جبکہ مرد کچھ مانوس سا تھا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ مرد کے چہرے پر عجیب سرخوشی تھی جیسے اس کے ہاتھوں میں اس عورت کا ہاتھ نا ہو بلکہ کوئی خزانہ ہو۔ نینا کو وہ صورت حال اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ اس نے وہاں سے بھاگ جانا چاہا جیسے وہ ان دونوں کو دیکھنا نا چاہتی ہو۔ اس کے پورے وجود پر لرزش سی طاری ہوئی تھی اور تب ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا، مگر نینا کو ایسے لگا جیسے وہ بہت دیر تک نیند پوری کرکے اٹھی ہو۔
"عجیب بے سروپا سا خواب تھا۔" اس نے سوچتے ہوئے کروٹ بدلنی چاہی تھی۔ وہ بچپن سے ہی نیند میں بے تحاشا خواب دیکھنے کی عادی تھی، اور اکثر اوقات اسے خواب یاد بھی رہتے تھے۔ وہ بے دار ہو جانے کے بعد بھی

خوابوں کے متعلق سوچتی رہتی تھی کیونکہ وہ اسے بھولتے نہیں تھے۔ اس نے ٹمٹماتی ہوئی آنکھوں سے وال کلاک کی جانب دیکھا اور پھر کروٹ بدل لی اور تب ہی اسے یاد آیا کہ اس نے خواب میں جس شخص کو دیکھا وہ اس کی اسٹوڈنٹ ایمن کا باپ تھا۔ اس نے سر جھٹکا تھا جیسے اسے خود ہی اچھا نا لگا ہو۔

"نایاب ہے تب ہی تو نایاب ہے۔ اور نایاب ہے تب ہی تو مجھے چاہیے۔" دوبارہ نیند کی وادی میں اترتے ہوئے اپنا ہی کہا ہوا جملہ اس کی سماعتوں میں محفوظ رہا تھا اور ذہن پر سمیع کی شبیہہ نمایاں تھی۔

☆ ☆ ☆

"تمہاری جاب کا کچھ بنا یا نہیں؟" خاور اس سے پوچھ رہا تھا۔ وہ لیپ ٹاپ گود میں لیے کانوں پر ہیڈ فون لگائے اس سے باتیں کر رہی تھی ہاتھ تیزی سے لیپ ٹاپ پر چل رہے تھے۔ وہ ٹیوشن والے بچوں کے لیے مختلف قسم کی سرگرمیاں تیار کرتی رہتی تھی۔ ابھی بھی ایمن کے لیے رنگ بھرنے کے لیے نیٹ سے تصاویر تلاش کرنے میں مگن تھی۔

"میں نے ابھی تک سی وی ہی کہیں ڈراپ نہیں کیا... ہر روز صبح اٹھتی ہوں تو سوچتی ہوں آج سارے کام مکمل کرلوں گی، لیکن جیسے ہی دن چڑھتا ہے دوسری مصروفیات میں سب بھول بھال جاتی ہوں... میرے ٹیوشن والے بچوں کے ایگزامز قریب ہیں... خیر سوچ رہی ہوں کل مسٹر سمیع کو دے دوں اپنا سی وی..." وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولی تھی۔

"دوسری مصروفیات...؟ تمہاری کون سی دوسری مصروفیات ہیں... سارا دن ویلی نکمی ادھر ادھر پھرتی رہتی ہو۔" وہ چڑا رہا تھا اسے۔

"اپنے جیسا سمجھ رکھا ہے سب کو... اتنے کام کرتی ہوں میں... اب تو کھانا بھی پکانے لگی ہوں۔" وہ ہاتھ کی تصویر کی کاپی پیسٹنگ میں مصروف جواب دے رہی تھی۔ خاور کی استہزائیہ ہنسی کو اس نے ذرا بھی اہمیت نا دی تھی۔

"ماشاء اللہ... آپ کے خاندان میں کھیرا ٹماٹر کاٹ کر سلاد بنانے اور دہی میں سبز چٹنی مکس کر کے رائتہ بنانے کو کھانا بنانا کہتے ہیں۔" وہ ایسے ہی بات کرتے تھے۔

"نہیں تم لوگوں کے خاندان سے کچھ مختلف ہیں ہم... ہمارے یہاں کھانا بنانے کا مطلب واقعی کھانا بنانا ہوتا ہے... آج زری آئی ہوئی تھی... میں نے اس کی فرمائش پر دال چاول بنائے... کباب فرائی کیے... رس ملائی بھی بنائی... اتنا کچھ تو کرتی ہوں میں... پتا نہیں اور کیا چاہتے ہو تم لوگ مجھ سے۔" وہ چونکہ لیپ ٹاپ میں مصروف تھی اس لیے عام سے انداز میں بنا جھنجلائے جواب دیے جا رہی تھی۔

"میں تو بتا ہی چکا ہوں کہ میں کیا چاہتا ہوں... بار بار کیوں پوچھتی ہو... لیکن اگر پھر بھی تمہیں میری بات سمجھ میں نہیں آتی تو میں اماں کو ہی بھیج دیتا ہوں تم لوگوں کی طرف... بعد میں مجھ سے مت جھگڑنا۔" وہ اطمینان بھرے انداز میں جواب دے رہا تھا۔

"اف ف... ایک تو تم فوراً" پٹڑی سے اتر جاتے ہو... اور مجھے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تم جیسے فضول آدمی کی باتیں برداشت کیوں کرتی ہوں... چلو بند کرو فون... اچھا بھلا کام کر رہی تھی۔ سارا ٹیمپو خراب کر کے رکھ دیا۔" وہ سابقہ انداز میں بولی تھی۔ خاور نے قہقہہ لگایا۔

"تمہارا مسئلہ ہی یہ ہے کہ تمہیں کچھ نہیں پتا چلتا کہ تم چاہتی کیا ہو... تم ایک کنفیوزڈ پرسنالٹی ہو اور میں

تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ اسی لیے تو بار بار کہتا ہوں کہ میری بات مان لو۔۔۔ میں زندگی کے ہر معاملے میں تمہارا ساتھ دوں گا۔" وہ ہر ایک دو ہفتے بعد اپنی عدالت لگانا ضروری سمجھتا تھا۔

"یہ کنفیوزڈ پرسنالٹی کسے کہا ہے تم نے۔۔۔ وضاحت کرنا ذرا۔۔۔" وہ مصنوعی غصہ ظاہر کرتے ہوئے غرا کر بولی تھی۔

"میں تو بس اپنا تجزیہ پیش کر رہا ہوں اور میری بات کہیں لکھ لو نینا۔۔۔ یہی حقیقت ہے کہ تم خود ہی اپنے بارے میں کافی کنفیوزڈ ہو۔۔۔ تم کیا چاہتی ہو تمہیں خود اس کی خبر نہیں ہے۔۔۔ اسی لیے تم بعض اوقات غلط فیصلے بھی کر لیتی ہو۔۔۔ میری بات کا برا نا ماننا۔۔۔ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔۔۔ چاہتا ہوں تمہیں اسی لیے بتا رہا ہوں کہ تم ایک وقت پر جس چیز کے لیے جذباتی ہو۔۔۔ چند دن بعد اسے ہی بھول جاتی ہو۔۔۔ جب کسی انسان یا کسی مسئلے کو وقت دینا شروع کرتی ہو تو اپنا آپ بھول کر اس کے لیے تن من دھن قربان کرنے کو تیار ہو جاتی ہو 'لیکن چند دن گزرتے ہیں اور پھر تمہیں یاد بھی نہیں رہتا کہ تم اس انسان یا اس کے کسی مسئلے کے لیے کیسے پریشان ہوتی جا رہی تھیں حالانکہ تب تک اس شخص کو تمہاری عادت پڑ چکی ہوتی ہے۔" وہ دھیمے سے لہجے میں جیسے شکوہ کر رہا تھا۔ نینا کچھ نہیں بولی تو وہ مزید کہنے لگا۔

"اب یہی دیکھ لو۔۔۔ اپنا پی ڈی ڈراپ کرنے کا وقت نہیں ملا' لیکن رات کے اس پہر اپنی ایک ننھی اسٹوڈنٹ کے لیے ورک شیٹ بنانے بیٹھی ہوئی ہو۔۔۔" خاور نے اتنا ہی کہا تھا کہ نینا نے اس کی بات کاٹ دی۔

"وہ بندہ خدا اس ننھی اسٹوڈنٹ کی ذمہ داری ہے مجھ پر۔ پیسے ملتے ہیں مجھے اس کے۔۔۔" وہ چڑ کر بولی تھی۔
خاور کی چند لمحے کوئی آواز نا سنائی دی پھر وہ دھیمی سی آواز میں بولا۔

"پیسے تمہیں ہر اس بچے کے ملتے ہیں جسے تم ٹیوشن پڑھانے جاتی ہو' لیکن ایمن نام کی یہ بچی تمہارے دل کے ایک دم زیادہ قریب ہو گئی ہے۔۔۔ تمہیں احساس بھی نہیں ہو تا کہ تم اس بچی اور اس کے گھر والوں کے متعلق کتنی باتیں کرتی رہتی ہو۔۔۔ اب مجھ سے یہ نا پوچھنا کہ اس کی وجہ کیا ہے۔۔۔ ظاہر ہے مجھے وجہ نہیں پتا' لیکن میرا اندازہ ہے کہ اس کی وجہ کوئی نا کوئی ایسا جذباتی ایشو ہو گا جس نے تمہارے دل کو ڈائریکٹ ہٹ کیا ہو گا کیونکہ تمہارے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔۔۔" وہ تحمل بھرے انداز میں اپنی بات مکمل کر رہا تھا کیونکہ خدشہ تھا وہ ناراض بھی ہو سکتی ہے۔

"وہ نہی ہی بونگیاں مارتے جا رہے ہو۔۔۔ پتا تمہیں کچھ ہے نہیں۔۔۔ میرا خیال ہے تمہیں نیند آ رہی ہے۔۔۔ چلو چپ کر کے سو جاؤ اب۔" وہ اسے گھرک کر بولی تھی۔

"سو جاتا ہوں' لیکن میری بات پر غور کرنا۔۔۔" وہ پھر بھی ہنستے ہوئے ہی بولا تھا۔ اس کے فون بند کر دینے کے بعد بھی نینا اس کی بات پر غور کرتی رہی۔ یہ بات غلط نہیں تھی۔ ایمن اور اس سے وابستہ چیزیں یک دم اس کے لیے اہم ہو گئی تھیں۔ وہ ایمن کو پہلے سے زیادہ وقت دینے لگی تھی۔ اس کے لیے نئی نئی ورک شیٹس بناتی رہتی تھی۔ انہیں اپنے پیسوں سے پرنٹ بھی کرواتی تھی اور اس کے ذہن میں یہ سوچ بھی پروان چڑھ رہی تھی کہ اس کے لیے ایک ٹیبلٹ خریدے تاکہ اسی پر مختلف ایپس ڈاؤن لوڈ کر کے پڑھا جا سکے۔ وہ اپنے اسٹوڈنٹس پر محنت کرنے کی عادی تھی' لیکن ایمن کے لیے وہ کچھ زیادہ ہی کرنے لگی تھی اور اس کی ابتدا تب سے ہوئی تھی جب سے اس نے بتایا تھا کہ وہ اپنے پاپا سے محبت نہیں کرتی۔ وہ چند لمحے اسی متعلق سوچتی رہی پھر اس نے سر جھٹکا تھا۔

"اونہہ۔ یہ حضرت بھی بس اپنا ہی فلسفہ جھاڑتے رہتے ہیں۔" اور پھر ساری جھنجلاہٹ خاور پر اتار کر وہ

دوبارہ لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوئی، مگر چند لمحے بعد اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا تھا۔ اس سے کام نہیں ہو رہا تھا۔
"ایمن کو اپنے پاپا سے کیوں پیار نہیں ہے؟" یہ سوال جانے کیوں ذہن میں گردش کرنے لگا تھا اور پھر ایمن کے پاپا کا عکس ذہن میں جھلملانے لگا۔ کچھ دیر اس کے ذہن میں یہی سب چلتا رہا پھر صبح والا عکس ذہن کے پردے پر نمایاں ہوا تھا۔ وہ شخص جھک کر اپنی بیوی کی پیشانی کو چوم رہا تھا۔ اس کے انداز میں کس قدر محبت نظر آتی تھی اور اسے جیسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ اس نے ہمیشہ غور کیا تھا کہ ایمن کے باپ کو ایمن کی ماں سے بے حد محبت تھی۔ اس کی نظریں ہمیشہ اپنی بیوی کے ارد گرد طواف کرتی رہتی تھیں۔
"کیا کوئی مرد واقعی اتنی بھدی عورت سے اس قدر والہانہ محبت کر سکتا ہے۔۔۔؟" اس کے ذہن میں عجیب سا سوال اٹھا تھا۔ اس نے سر جھٹکنا چاہا، لیکن اگلا خیال زیادہ پریشان کن تھا۔
"ہر مرد کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔۔۔ اپنی بیوی کی قدر کرنے والا۔۔۔" اسے احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنی اسٹوڈنٹ کے باپ کے متعلق کچھ زیادہ ہی سوچنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

"جانی جانی یس اماں۔۔۔ ایٹنگ شوگر۔۔۔ نو اماں۔" ایمن ہل ہل کر رائم یاد کر رہی تھی۔ نمنا نے ابتدا میں تو دھیان نا دیا، لیکن چند لمحے بعد اسے احساس ہوا کہ ایمن ویسے یاد نہیں کر رہی جیسے اس نے یاد کروایا تھا۔ نمنا نے الجھ کر اس کی جانب دیکھا۔
"ایمن ایسے نہیں ہے۔۔۔ اسٹاپ اینڈ۔۔۔" اس نے اسے ٹوکنا چاہا تو ایمن چڑسی گئی اور منہ پھلا کر بولی۔
"نہیں۔۔۔ "یس پاپا" نہیں کہوں گی۔۔۔ آپ ہر بات میں پاپا کو کیوں لے آتی ہیں۔" اس کے انداز میں سخت ناپسندیدگی تھی۔ نمنا ششدر رہ گئی۔ ایسا سخت انداز تو شاید اس نے بھی کبھی اپنے باپ کے لیے نا اپنایا تھا۔
"او کے۔۔۔ ہم یہ رائم یاد ہی نہیں کریں گے۔۔۔ ہم "میری ہیڈ آلٹل لیمب" یاد کر لیتے ہیں۔" نمنا نے بغور اسے دیکھتے ہوئے رائم تبدیل کر لی تھی۔ ایمن کے انداز اس کی پریشانی اور تجسس کو بڑھانے لگے تھے۔ اب کی بار اس نے سوچا تھا کہ وہ اس موضوع پر ایمن کے والدین سے بات ضرور کرے گی۔ اس میں بحیثیت ایک اچھی عادت تھی۔ وہ ہر بچے کو پڑھانے پر راضی نہیں ہوتی تھی، لیکن جس کو بھی پڑھانے پر راضی ہوتی پھر اسے جی جان سے نا صرف پڑھاتی تھی بلکہ اس کی نفسیات کا اچھی طرح مشاہدہ کر کے اس کی مکمل رپورٹ رکھتی تھی اور والدین کو فیڈ بیک بھی دیتی تھی۔ ایمن کو رائم یاد کرنے کا کہہ کر وہ ابھی ڈرائنگ روم سے نکل کر باہر لاؤنج میں جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ مسز سمیع خود ہی اندر آگئیں۔ وہ ہمیشہ کی طرح تھکی ہوئی اور کچھ کنفیوز دکھائی دیتی تھیں۔ لباس اور حلیہ بھی ہمیشہ کی طرح ملگجا تھا۔
"کیسی ہو نمنا۔۔۔؟" وہ اب اس سے بے تکلفی سے بات کرنے لگی تھیں۔ نمنا نے رسمی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا تھا۔
"ایمن تو تمہاری گرویدہ ہو گئی۔۔۔ اماں رضیہ بتا رہی تھیں کہ ان سے بھی تمہاری باتیں کرتی رہتی ہے۔" وہ اطمینان سے ایمن کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔ ایمن نے کوئی توجہ نا کی بلکہ وہ چپ چاپ رائم یاد کرنے میں مگن تھی۔
"اس عمر میں بچے کافی کانشس ہوتے ہیں اپنے ٹیچرز کے لیے۔۔۔ ٹیچرز کا کہا حتمی اور آخری ہوتا ہے۔۔۔ ٹیچرز کی پسند ان کی پسند۔۔۔ ٹیچر کی ناپسندیدگی ان کی ناپسندیدگی" نمنا نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا پھر مسز شہرین کو بولنے کا موقع دیے بغیر مزید بولی مبادا موضوع تبدیل نا ہو جائے۔

"ایمن تو ویسے ہی بہت حساس ہے۔۔۔ بہت مضبوط سینس آف لائکنگ اینڈ ڈس لائکنگ ہے اس کا۔۔۔ جو چیز پسند ہے۔۔۔ پسند ہے اور جو نہیں پسند۔۔۔ وہ نہیں پسند۔۔۔" شہرین نے اس کی بات پر صرف سر ہلایا تھا۔
"اچھا۔۔۔ میں نے کبھی غور نہیں کیا اس بات پر۔۔۔ ایسی ہے میری بیٹی۔۔۔" وہ مسکرا رہی تھی۔ نینا کو سخت برا لگا۔
"آپ اور آپ کے میاں کو اپنی تھرڈ کلاس حرکتوں سے فرصت ملے تو آپ اپنی بیٹی کی طرف دھیان دیں نا۔" اس نے جل کر دل میں سوچا تھا' لیکن بظاہر چپ رہی۔
"دراصل میری بیماری نے مجھے اس کے معاملے میں اس طرح سے دلچسپی ہی نہیں لینے دی جیسے کہ ایک ماں کو لینی چاہیے۔۔۔ یہ کافی اگنور ہوتی رہی ہے۔" شہرین نے کہنا شروع کیا تھا۔ نینا کا دل مزید جل کر خاک ہو گیا۔
"اب پھر سے وہی قصہ چہار درویش نا شروع کر دینا بی بی۔۔۔ زبانی یاد ہو گیا ہے مجھے کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آپ بیمار تھیں اور آپ کی بیٹی کو آپ کا بھرپور وقت نہیں مل سکا۔۔۔ محترمہ یہ بات تسلیم نہیں کریں گی کہ رومانس سے فرصت ملتی تو بیٹی کو دیکھتیں۔" نینا کو اس کا انداز ایک آنکھ نا بھا رہا تھا' لیکن بظاہر وہ ان ہی کی بات سن رہی تھی۔
"لیکن میں خوش ہوں کہ تم مل گئی ہو ہمیں۔۔۔ مجھے بہت امید ہے کہ تم اسے ٹریک پر لے آؤ گی۔" شہرین کے صرف اس جملے کو اہمیت کے قابل سمجھا تھا اس نے۔
"بہت مہربانی۔۔۔ لیکن آپ ایمن کو مزید امپرود کرتے دیکھنا چاہتی ہیں تو پلیز اسے زیادہ وقت دیں۔۔۔ اس کی پڑھائی اور دوسری ایکٹیوی ٹیز میں ذاتی دلچسپی لیں۔۔۔ بچے پیرنٹس کی انوالومنٹ سے بہت موٹیویٹ ہوتے ہیں۔۔۔ انہیں اچھا لگتا ہے جب پیرنٹس انہیں پڑھائیں یا ان کی پڑھائی میں دلچسپی لیں۔۔۔ یہ بظاہر چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں۔۔۔ لیکن بچے کی پرسنالٹی ڈیولپمنٹ میں ان کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔" اپنی جانب سے وہ ایک لاپروا' غیر ذمہ دار ماں کو نصیحت کر رہی تھی۔ شہرین اس کی باتیں سن کر فقط سر ہلانے میں مصروف تھی' لیکن اس کی نگاہیں نینا کا جائزہ لینے میں مگن تھیں۔ چند لمحے بولتے رہنے کے بعد نینا کو محسوس ہوا کہ شہرین اس کی باتیں سننے سے زیادہ اسے دیکھنے میں مگن ہے۔ اسے اس کی نگاہوں کا تاثر کچھ عجیب سا لگا تھا۔ اس کی آنکھیں کھوئی کھوئی سی تھیں۔

☆ ☆ ☆

کچھ دن بعد اس نے اپنا سی وی تیار کر لیا تھا اور ارادہ تھا کہ سب سے پہلے ایمن کی ماما کو دے گی کہ وہ اپنے شوہر کو دے کر اس کے لیے کسی اچھی جاب کی بات کر سکیں' لیکن اس دن جب وہ ایمن کے گھر پہنچی تو ماحول کچھ کشیدہ سا نظر آتا تھا۔ نینا کو اس بات کا اندازہ ملازموں کی خاموشی سے ہوا۔ اماں رضیہ عام دنوں کی نسبت کچھ اکتائی ہوئی نظر آتی تھیں جب کہ ایمن کی ماما سے اس کی ملاقات نا ہو سکی تھی۔ اس نے سوچا تھا وہ ایک دو روز بعد سی وی دے دے گی۔ اگلے دن بھی یہی صورت حال تھی اور اس بار اماں رضیہ کچھ روئی ہوئی بھی نظر آتی تھیں ایمن بھی ضرورت سے زیادہ خاموش تھی۔ نینا سے صبر نا ہو سکا۔ اماں رضیہ جب چائے لے کر آئیں تو اس نے پوچھ لیا تھا کہ حالانکہ اس سے پہلے کبھی اس نے کسی بھی ٹیوشن کے بچے کی بات تو دور کسی رشتہ دار کی زندگی میں بھی ایسی دلچسپی نا لی تھی کہ ان سے ایسے ذاتی سوالات پوچھنے کی نوبت آتی۔
"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔۔۔ میں دو دن سے دیکھ رہی ہوں کہ آپ کچھ بجھی بجھی سی نظر آتی ہیں۔۔۔ سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

"ہاں بیٹی۔۔۔ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔۔۔ یہ بجھی ہوئی طبیعت تو بڑھاپے کی پیداوار ہے۔۔۔ اب اس عمر میں بجھی ہوئی ہی نظر آؤں گی نا۔" وہ بنا مسکرائے بولی تھیں۔ تھکن تو ہر عضو سے نمایاں تھی۔

"آپ نا بتانا چاہیں تو اور بات ہے، لیکن میں محسوس کر رہی ہوں کہ ایمن بھی بہت چپ چپ سی ہے اور میں نے پوچھا بھی اسی لیے تھا کہ ایمن سے وابستہ مسائل کی خبر رکھنی پڑتی ہے مجھے۔۔۔ اس کی ٹیچر ہوں۔۔۔ اس کو چلانے میں بڑی محنت کی ہے میں نے۔۔۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ دوبارہ سے اپنی ذات میں گم ہو۔۔۔ یہ اتنی حساس بچی ہے کہ ذرا سی بات بھی اسے دوبارہ اسی خول میں بند کر سکتی ہے۔" وہ بات کو گھما پھرا کر بولی تھی۔ اماں رضیہ کے چہرے کا رنگ پل بھر میں بدل گیا تھا۔ انہیں احساس تھا کہ ایمن کی ٹیچر اس کا بہت خیال رکھتی ہے۔

"تم صحیح کہہ رہی ہو بیٹی۔۔۔ میں تمہارے اس جذبے کی قدر بھی کرتی ہوں۔۔۔ ایک تم ہو جسے اتنی سی بچی کا اتنا احساس ہے اور ایک اس کی اپنی ماں ہیں جو جانے کیوں اتنی لاپروا ہوتی جا رہی ہیں۔۔۔ غلطیاں خود کرتی ہیں اور الزام دوسروں پر دھر دیتی ہیں۔" اماں رضیہ کو گھر کی بات باہر والوں کے سامنے کرتے ہوئے لاج آتی تھی، لیکن وہ بھی جیسے تھک سی گئی تھیں۔ نینا حیران ہوئی۔

"شیریں صاحبہ تو بہت اچھی خاتون ہیں۔۔۔ ایسا کیوں کر رہی ہیں وہ۔۔۔" اس نے پوچھا تھا۔ اماں رضیہ نے تاسف سے گردن ہلائی۔

"اسی بات کی تو سمجھ نہیں آ رہی ہمیں۔۔۔ عجیب سی ہوتی جا رہی ہیں۔۔۔ ماں، بہنوں کی بہت سننے لگی ہیں شاید۔۔۔ کل کو ایمن بیٹا کا ٹیکے لگوانے کا دن تھا۔۔۔ اس سے پہلے میں ہمیشہ خیال رکھتی آئی ہوں۔۔۔ لیکن اس بار سمیع بیٹے نے ان کو بولا تھا کہ ڈاکٹر سے ٹائم لے رکھا ہے۔ بچی کو ڈاکٹر سے ملوا لانا۔۔۔ انہوں نے مجھے بتایا نہیں اور سمیع بیٹے کے سامنے کہہ دیا کہ میں نے تو اماں رضیہ کو کہہ دیا تھا۔۔۔ یہی نہیں لے کر گئیں ایمن کو۔۔۔ سمیع خوب چلایا مجھ پر۔۔۔ حالانکہ میری تو کوئی غلطی نا تھی۔۔۔ بھلا بتاؤ مجھے کہا ہوتا تو میں لے کر نا جاتی کیا بچی کو، لیکن۔۔۔ اب کیا بتاؤں بیٹا۔۔۔ نمک کھایا ہے اس گھر کا۔۔۔ بس نصیب نصیب کی بات ہے۔" وہ گلوگیر لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ نینا چپ کی چپ رہ گئی، لیکن شیریں کے لیے اس کے دل میں سخت شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ماں تھی، لیکن اپنی ہی بچی کو اس بری طرح نظرانداز کرتی تھی۔ نینا کے لیے انسانوں سے نفرت کرنے کے لیے یہ ایک وجہ ہی کافی تھی کہ وہ اپنے ننھے معصوم بچوں کی ناقدری کرتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

"وہ ایک عجیب سی عورت ہیں۔۔۔ مجھے ان کی سمجھ نہیں آتی۔۔۔ حالانکہ پہلے ایسی نہیں تھیں۔۔۔" وہ خاور کو بتا رہی تھی۔ اس کی جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"یار تمہارا مسئلہ کیا ہے۔۔۔ تم ان لوگوں کے بارے میں اتنی باتیں کرتی رہتی ہو کہ ایسا لگتا ہے جیسے وہ تمہارے رشتہ دار ہیں۔" وہ طعنہ دے رہا تھا۔ نینا نے ناک چڑھا کر فون کی جانب دیکھا پھر تڑپ کر بولی۔

"خواہ مخواہ ہی۔۔۔ الزام دینے میں تو بالکل اپنی اماں پر گئے ہو تم۔۔۔ تمہیں میری ڈیڈیکیشن نظر نہیں آئی۔۔۔ میں جن بچوں کو پڑھاتی ہوں ان کا رشتہ داروں کی طرح ہی بے حد خیال رکھتی ہوں۔۔۔ اسی لیے کہہ بیٹھی تم سے۔۔۔ اب نہیں کروں گی کوئی بات تم سے۔" ناراض ہونے میں تو کوئی ثانی نہیں تھا اس کا۔ خاور کی ہنسی کی آواز سنائی دی۔

"میری اماں کے بارے میں بات کرتے ہوئے بھی کوئی ڈیڈیکیشن دکھا دیا کرو۔۔۔ آخر کو تمہاری ہونے والی

ساس ہیں۔"

"نہیں، ہو ہی نا جائیں میری ساس۔۔۔ اور تم بھی اس بات کے علاوہ بھی کوئی بات کرلیا کرو۔" وہ چڑ کر بولی تھی۔ خاور کی جانب سے چند لمحے کوئی آواز نا آئی تھی پھر وہ بولا تو اس کا لہجہ ذرا تلخ تھا۔

"اس بات کے علاوہ کیا بات کروں۔۔۔ کسی اور بات میں تمہیں دلچسپی ہے ہی نہیں۔۔۔ میں کچھ بھی کہوں گا تم گھما پھرا کر ایمن اینڈ ڈا کمپنی کی جانب موڑ لوگی۔۔۔ یقین کرو مجھے اب زبانی یاد ہو گیا ہے کہ ایک بچی ہے جس کا نام ایمن ہے۔۔۔ اس کے پیرنٹس اس کا بالکل خیال نہیں رکھتے' انہیں اس سے ذرا سی بھی محبت نہیں ہے جب کہ بچی کو بھی اپنے ماں باپ سے ذرا انسیت نہیں ہے۔۔۔ بالخصوص اپنے باپ کو بالکل پسند نہیں کرتی وہ۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔ اور بریک کے بعد پھر عرض کیا ہے کہ وغیرہ وغیرہ۔۔۔ بس کردو یار۔۔۔ مجھے نہیں سننی اب یہ باتیں۔" وہی بات جو اس نے تلخی بھرے انداز میں شروع کی تھی ختم کرتے ہوئے اس کا انداز ہلکا پھلکا سا ہو گیا تھا۔ نہنا چند لمحے چپ سی ہو گئی۔

"اب کیا ناراض ہو گئی ہو۔۔۔؟" وہ ہنستے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں تم جیسے کینچوے کی بات پر ناراض کیا ہونا۔۔۔ بس یہ سوچ رہی ہوں کہ کس قدر بک بک کرنے لگے ہو تم۔۔۔ کتنا سر چڑھا لیا ہے میں نے تمہیں۔" اس کی آواز سے ہی مخصوص نخوت چھلکنے لگی تھی۔ وہ اس انداز میں سلیم سے بات کیا کرتی تھی۔

"آپ کی دوسری بات کے لیے فدوی آپ کا مشکور رہے گا' لیکن پہلی بات کی وضاحت بندہ ضرور سمجھتا ہے۔۔۔ محترمہ بک بک نہیں ہے۔۔۔ یہ سچائی ہے کہ آپ اس فیملی کے بہت قریب ہو رہی ہیں۔"

"تو تمہیں کیا اعتراض ہے فدوی کے بچے۔۔۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ میں سوشلائزنگ کرنے لگی ہوں۔۔۔ لوگوں سے تعلقات بڑھا رہی ہوں۔۔۔"

"ارے بی بی تعلقات بڑھانے پر کب اعتراض کر رہا ہوں۔۔۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ تعلقات بڑھانے میں اتنا آگے مت جایا کرو کہ جب تم انہیں بھولنے لگو تو انہیں تکلیف نا ہو۔۔۔ تم چار دن کے لیے سوشلائزنگ کرتی ہو۔۔۔ ان چار دنوں میں لوگوں کو اپنا عادی بنا لیتی ہو۔۔۔ اور پھر یک دم سب سے اکتا جاتی ہو۔۔۔ اور سب کو چھوڑ چھاڑ اپنے قلعے میں دوبارہ محصور ہو جاتی ہو۔۔۔"

"اوہو۔۔۔ ایسی کون سی جائیدادیں ضبط کرلی ہیں میں نے تمہاری۔۔۔ الزام پر الزام دیے جا رہے ہو۔۔۔" وہ اس کی بات سمجھنے کو تیار نہیں تھی۔ خاور کی اچھی بات یہ تھی کہ نہنا کے معاملے میں اس کا ضبط کمال کا تھا۔ نہنا کی کوئی بات اسے بری نا لگتی تھی۔

"الزام نہیں دے رہا۔۔۔ صرف سمجھا رہا ہوں کہ لوگوں کو اپنا عادی بنا کر چھوڑ دینے سے بہتر ہے کہ پہلے ہی ان سے قربت مت پیدا کیا کرو۔۔۔ تمہارا کچھ نہیں جاتا۔۔۔ لیکن دوسرے کی جان پر بن جاتی ہے۔۔۔" اب کی بار اس کا لہجہ ایسا تھا کہ نہنا چند لمحے کچھ بول ہی نا پائی تھی پھر جب کچھ سمجھ نا آیا کہ کیا کہے تو جھنجلا کر بولی۔

"طعنہ دے رہے ہو نا۔۔۔"

"نہیں بھائی۔۔۔ طعنہ کیوں دوں گا۔۔۔ بس ایک بات سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔۔۔ کیونکہ مہر کے معاملے میں بھی میں تمہیں اسی طرح جذباتی ہوتے دیکھ چکا ہوں۔۔۔ تمہیں یاد ہیں وہ دن جب تم اپنی ہر مصروفیت پس پشت ڈال کر "مہر" "مہر" کرتی رہتی تھیں۔۔۔ اور اب تمہیں مہر کی یاد بھی نہیں آتی۔۔۔ کبھی خاص طور پر کال کر کے پوچھتی بھی نہیں ہو کہ وہ کیسی ہے۔۔۔ خیر ماشاء اللہ مہر کو چاہنے والے بہت ہیں اس لیے اسے تمہارے رویے سے زیادہ

دکھ نہیں ہوا' لیکن وہ بچی۔۔۔ ایمن۔۔۔ بقول تمہارے بالکل اکیلی ہے اور جس طرح تم اس کو وقت دے رہی ہوتا۔۔۔ ہر وقت ایمن ایمن کی گردان کرتی رہتی ہو۔۔۔ امید ہے کہ اسے اب تک تمہاری علوت ہو چکی ہو گی۔۔۔ اور پھر۔۔۔ اس کے بعد۔۔۔؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ نینا سے اس بار بھی کوئی جواب نا بن پڑا تھا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے۔۔۔ الزام تراشی بند کرو۔" وہ اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے بولی تھی حالانکہ اسے غصہ آرہا تھا' مگر یہ بھی حقیقت کہ اس کی باتیں اس کے دل میں گڑسی گئی تھیں جیسے۔۔۔

"کیا میں واقعی ایسی ہوں؟" یہ سوال اس نے اپنے پاس سے پوچھا تھا' مگر پھر سر جھٹکتے ہوئے اس نے خاور کی بات کو رد کر دیا تھا۔

"میں الزام نہیں دے رہا خدا۔۔۔ لیکن تم میری بات پر غور کرنا۔ جس دن سے تمہیں احساس ہوا ہے کہ ایمن اور اس کے والدین کے درمیان ایک جذباتی خلا ہے تب سے تم اس بچی کے قریب ہوتی جا رہی ہو۔ کیونکہ کہیں نا کہیں تمہیں اس کے اور اپنے حالات میں کچھ مماثلت نظر آنے لگی ہو گی۔۔۔" وہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا تھا۔

"مسٹر خاور آپ واقعی بہت سر چڑھ گئے ہیں۔۔۔ براہ مہربانی اتنی دلچسپی مت لیجیے میری زندگی میں۔۔۔ آپ کچھ نہیں جانتے میرے اور میرے حالات زندگی کے بارے میں۔۔۔ یہ قیاس آرائیاں آپ کو مہنگی بھی پڑ سکتی ہیں۔" وہ انتہائی خشک لہجے میں بولی تھی جیسے اس کی بات سخت بری لگی ہو اور دوسری جانب خاور کو بھی اس کا لہجہ اچھا نا لگا تھا۔ اس نے بھی خاموشی سے فون بند کر دیا' مگر نینا اس کے بعد اطمینان سے اپنا کام نا کر پائی تھی۔ اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا تھا اور سونے کے لیے لیٹ گئی تھی' لیکن خاور کی کہی باتیں اور باتوں باتوں میں دیے گئے طعنے' کیے گئے شکوے اس کی سماعتوں میں گونجنے لگے تھے۔ وہ یہ ماننے کو تیار نا تھی کہ اس نے جو بھی کہا تھا وہ کسی حد تک سچ ہی تھا۔ خاور کی باتوں نے اس کا حلق تک کڑوا کر دیا تھا اور وہ یہ تسلیم کرنے کو تیار نا تھی کہ یہ سچائی کی کڑواہٹ ہے۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن وہ ایمن کے یہاں پہنچی تو وہ گھر میں موجود نہیں تھی۔

"ایمن بٹیا ڈاکٹر کے یہاں گئی ہیں۔۔۔ ٹیکا لگوانا تھا نا ان کو۔" اماں رضیہ اسے دیکھ کر کچھ حیران ہوئی تھیں۔ وہ خاور کی باتوں سے بھی کچھ تپی ہوئی تھی اس لیے ناگواری سے بولی۔

"آپ مجھے کل ہی بتا دیتیں۔۔۔ میرا چکر تو نا لگتا۔۔۔" اماں رضیہ پہلے ہی کچھ ذرا الجھی ہوئی سی لگتی تھیں اس کی بات سن کر مزید کبیدہ خاطر ہو گئیں اور اسی انداز میں بولیں۔

"شہرین بٹیا نے بتایا نہیں آپ کو۔۔۔؟" انہوں نے استفہامیہ انداز میں اتنا ہی کہا تھا کہ نینا مزید سیخ پا ہو گئی اور ایسی حالت میں اس کو چپ کروانا مشکل ہی تھا۔

"خواب میں بتایا ہو شاید۔ عجیب لوگ ہیں آپ۔۔۔ آپ لوگوں کو ذرا احساس نہیں ہے کہ میں بس سے یہاں تک آتی ہوں۔۔۔ اب بتائیں تین گھنٹے تو میرے ضائع ہوئے نا۔۔۔ کسی کا کیا گیا۔۔۔ ایمن کے پیرنٹس سخت لاپروا ہیں۔۔۔ نا صرف لاپروا بلکہ انتہائی غیر ذمہ دار بھی۔۔۔ بچی کا انجکشن اتنا ہی ضروری تھا تو ایک کال کر دیتے مجھے۔۔۔ کال نا سہی ایک واٹس ایپ بھی کافی تھا۔۔۔ یہ کوئی انیس سو ایک کا زمانہ نہیں ہے کہ انسانوں تک رسائی ممکن نا ہو۔۔۔ دس سیکنڈ میں آپ کا پیغام دوسرے بندے تک پہنچ جاتا ہے۔۔۔ مگر کوئی پہنچانا چاہے تب نا۔۔۔ خیر آپ بتا دیجیے گا مسز

شہرین کو کہ ٹیوٹرز بھی گھر بار والی ہوتی ہیں۔۔۔ ان کے اماں ابا بھی ان سے جواب طلبی کر سکتے ہیں۔۔۔ اپنے اندر ذرا احساس ذمہ داری پیدا کریں۔۔۔ کیونکہ اس چیز کی سخت کمی ہے ان میں۔۔۔" وہ منہ کے انتہائی برے زاویے بنا کر بول رہی تھی۔ اماں رضیہ شرمندہ سی ہو گئیں پھر وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔

"ارے بیٹا بہت ذمہ دار بچی ہے وہ۔۔۔ لیکن جانے کیوں۔۔۔ بس اب کیا بولوں۔۔۔ جن کا نمک کھایا ہو ان کے متعلق کچھ بھی بولنا میرے نزدیک گناہ ہی ہے۔۔۔ میں معافی چاہتی ہوں آپ سے کہ آپ کو اتنی زحمت ہوئی لیکن انہوں نے بتایا تھا کہ آپ کو کل ہی بتا چکی ہیں اس بات کا۔۔۔ تب ہی تو سمیع بیٹا آفس جاتے ہوئے ان کو اور ایمن کو اسپتال لے گئے۔" اماں رضیہ کا انداز اتنا دل گیر تھا کہ نینا کو اپنے سخت لہجے پر شرمندگی ہوئی۔

"اوہو۔۔۔ معافی آپ کیوں مانگ رہی ہیں۔۔۔ جن کی غلطی ہے وہی مانگیں معافیاں بھی۔۔۔ خیر ان کو احساس ہو تو وہ ایسا کریں ہی کیوں۔۔۔ چلتی ہوں میں۔۔۔ خواہ مخواہ صبح صبح ہی موڈ خراب کر کے رکھ دیا ہے میرا۔" وہ اپنا تھیلا نما بیگ کندھے پر لٹکاتی ہوئی اٹھی تھی۔

اماں رضیہ تو چپ کی چپ رہ گئیں۔ وہ دھپ دھپ کرتی باہر کو نکلی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ باہر نکلتی اس نے کسی کو اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔ وہ یک دم پیچھے مڑی اور چند قدم پیچھے چل کر سامنے کی طرف والے راستے کی جانب ہو گئی۔ اس گھر کے دو گیٹ تھے۔ عقبی سمت والا سمیع اینڈ فیملی کے استعمال میں تھا جبکہ سامنے والا رانیہ کے گھر والے استعمال کرتے تھے۔ نینا رانیہ والوں کی سائیڈ پر ہو گئی تھی۔ چند لمحے اس نے وہیں گزارے جب تک کہ یہ یقین نا ہو گیا کہ جس کو اس نے دیکھا وہ اندر داخل ہو چکا ہے پھر وہ واپس پچھلے گیٹ کی طرف آئی تھی۔ گیٹ ابھی بھی کھلا تھا اور ادھ کھلے گیٹ سے ایک گاڑی کھڑی نظر آرہی تھی۔

نینا اس گاڑی کو بخوبی پہچانتی تھی کیونکہ اس گاڑی کے پچھلے دونوں دروازوں پر اس کے ابا کی دکان کا بڑا سا اسٹیکر واضح طور پر چسپاں تھا اور گھر کے اندر داخل ہونے والی درزن آنٹی سے بھی وہ بخوبی واقف تھی۔ وہ چند لمحے ایک بار پھر عجیب سی کشمکش و پیچ میں مبتلا وہیں کھڑی رہی پھر نا چاہتے ہوئے بھی مصلحتاً وہ واپس اسی جگہ جا کر کھڑی ہو گئی تھی جہاں پہلے گئی تھی۔ اس نے دس منٹ وہیں گزارے تھے۔ اسے گاڑی کے اسٹارٹ ہونے اور چلے جانے کی آوازوں سے احساس ہوا تھا کہ جو لوگ آئے تھے وہ جا چکے ہیں تو ایک بار پھر وہ واپس مڑی اور اندر داخل ہو گئی۔ اماں رضیہ ابھی بھی وہیں بیٹھی تھیں۔ اسے دیکھ کر حیران ہوئیں۔

"میں نے سوچا کہ اب آئی ہوں تو ایمن کو پڑھا کر ہی جاتی ہوں۔۔۔ اس لیے واپس آگئی۔" وہ کہہ کر دھپ سے صوفے پر گر گئی تھی۔ دل کی عجب سی حالت ہوئی تھی۔

"ابا کی گاڑی کا مطلب یہ تو نہیں کہ ابا ہی اس گاڑی کو ڈرائیو کر کے ان خاتون کو یہاں تک لائے ہوں۔" اس نے خود کو کہنا چاہا تھا اور پھر منہ بناتے ہوئے خود ہی اس نے یہ دلیل رد کر دی تھی۔ اس کا دل کبھی بھی ابا کی حمایت میں ایک لفظ نا بولتا تھا۔ اماں رضیہ اس کی بات سن کر ذرا الجھ سی گئیں۔

"آپ کا مزید وقت ضائع ہو گا بیٹا۔۔۔ ان کو تو دیر سویر ہو سکتی ہے۔۔۔ کوئی وقت تو بتا کر نہیں گئے کہ کب لوٹیں گے۔" انہوں نے بتانا ضروری سمجھا تھا لیکن نینا ایسے بیٹھی رہی جیسی کچھ سنا ہی نا ہو۔

"یہ جو خاتون ابھی آئی تھیں یہ کون تھیں؟" وہ اپنی ہی دھن میں سوال کر رہی تھی۔

"وہ کپڑے سیتی ہیں اجرت پر۔۔۔ درزن ہیں۔۔۔ اکثر آتی رہتی ہیں۔۔۔ ابھی بھی شہرین بٹیا کے کپڑے سی کر لائی تھیں۔۔۔ وہ موجود نہیں تھیں تو یہ بھی واپس چلی گئیں۔۔۔ مگر۔۔۔" انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ نینا نے ان کی بات کاٹ دی۔

"کس کے ساتھ آئی تھیں۔۔۔؟" اگلا سوال تو جیسے منہ سے خود بخود پھسل گیا تھا۔
"یہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں بیٹا۔۔۔ گاڑی پر آتی جاتی ہیں۔۔۔ شوہر یا بھائی کے ساتھ ہی آتی ہوں گی۔" اماں عام سے انداز میں بولی تھیں۔
"پہلے بھی آتی رہتی ہیں۔۔۔ اسی گاڑی پر۔۔۔؟" وہ اب مکمل طور پر اپنے ہی معمے سلجھا رہی تھی۔
"اللہ بہتر جانتا ہے بیٹا۔۔۔ میں نے تو کبھی دھیان ہی نہیں دیا۔ گاڑیاں واڑیاں کہاں یاد رہتی ہیں مجھے۔۔۔" اماں کچھ الجھ سی گئی تھیں۔ نیہنا نے سر ہلایا پھر یک دم اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔
"نہیں چلتی ہوں اب۔۔۔" وہ جیسے کھوئی کھوئی سی آئی تھی ویسے ہی واپسی کے لیے مڑ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆
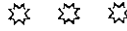
"ابا کہاں ہیں۔۔۔ کھانے کے لیے نہیں آئیں گے۔" اسی روز دوپہر کو اس نے کھانے کے وقت امی سے پوچھا تھا۔ وہ اکثر اوقات اکیلے ہی کھانا کھاتی تھی کیونکہ امی ابا کے ساتھ دوپہر کا کھانا پہلے ہی کھا لیتی تھیں، لیکن صبح والے واقعہ کے بعد اس نے غور کیا تھا تو اسے احساس ہوا تھا کہ کافی دن ہو چلے تھے امی اس کے ساتھ ہی کھانا کھاتی تھیں۔
"نہیں۔۔۔ آج کل صبح کے گئے شام کو ہی آتے ہیں۔۔۔" انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ نیہنا نے ناک چڑھا کر کہا۔
"آپ کیوں نہیں روکتیں انہیں اس آوارہ گردی سے۔۔۔" اس کا لہجہ ایسا تھا کہ امی کو برا لگا، مگر اب وہ تھک سی گئی تھیں اور شاید انہیں اب اس موضوع پر غصہ کرنا بھی کوئی اکتا دینے والا کام لگنے لگا تھا۔
"سو بکھیڑے ہیں ان کے۔۔۔ اسی کو نبٹاتے پھرتے ہیں۔" وہ سادہ سے انداز میں بولی تھیں۔ نیہنا نے منہ پھلا کر ان کی جانب دیکھا۔
"امی آپ کے اسی بھروسے نے ہی یہاں تک لا کھڑا کیا ہے ہمیں۔۔۔ اتنا بھروسا تو بس اللہ کی ذات پر کرنا چاہیے۔۔۔ انسانوں کی ذات پر اتنا بھروسا گناہ ہوتا ہے۔ آپ کو پوچھنا چاہیے ابا سے کہ وہ صبح سے شام تک اگر گھر نہیں ہوتے تو کہاں ہوتے ہیں؟ آپ کا حق ہے یہ۔۔۔"
"کاروبار پتا ہے کس چیز کو کہتے ہیں۔۔۔ اسی کی خاطر ہلکان ہوئے جا رہے ہیں بے چارے۔۔۔ جسے آوارہ گردی کہہ رہی ہو نا تم اس آوارہ گردی نے ہڈیاں گھسا کر رکھ دی ہیں ان کی۔۔۔ اولاد جسے ساتھ دینا چاہیے۔۔۔ اسے طعنے دینے سے فرصت نہیں ہے۔ اسی لیے بڑے کہہ گئے ہیں کہ ایک بیٹا تو ضرور ہونا چاہیے جو باپ کا بازو بن سکے۔۔۔ بیٹیاں تو بس۔۔۔" وہ لمحہ بھر کے لیے چپ سی ہوئیں پھر اس کی پلیٹ کی جانب اشارہ کر کے بولیں۔
"کھانا کھاؤ تم۔ باپ کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"
نیہنا کا اپنا موڈ صبح سے خراب تھا۔ وہ ان کا خیال کر کے کھانا کھانے بیٹھی تھیں کہ وہ ساتھ دے گی تو وہ بھی کھانا کھا لیں گی۔ ورنہ بھوکی بیٹھی رہیں گی، مگر ان کے اس طرح جھڑکنے پر اس کی بھوک بالکل ہی ختم ہو گئی تھی۔
"آپ کے بزنس مین شوہر آج صبح جوہر ٹاؤن میں اس درزن کے ساتھ گاڑی میں گھوم رہے تھے جسے آپ گھر بلواتے ہوئے کئی بار سوچتی ہیں۔۔۔ میں کب پروا کرتی ہوں باپ کی۔ باپ ہی جگہ جگہ میرے راستے میں آ جاتا ہے۔۔۔ بتائیں کیا کروں میں۔" وہ غرائی تھی۔ امی نے اس کا چہرہ دیکھا اور پھر اس کا انداز۔۔۔ جوان اولاد ایسے طعنے بلاوجہ تو نہیں دے سکتی، لیکن انہوں نے زندگی شوہر کی صفائیاں دیتے گزاری تھی۔ اب بھی وہ پہلے تو لمحہ بھر چپ سی رہیں پھر بہت ہی بجھے ہوئے انداز میں بولیں۔

"نینا وہ آج کل جلدی جانے لگے ہیں دکان پہ... اپنی نگرانی میں مال منگواتے ہیں دکان کے لیے... گاڑی دکان پہ ہی کھڑی ہوتی ہے ان کی... وہ خالہ زاد بہن ہے ان کی... بیوہ ہے... سوحق ہیں اس کے بھی... پہلے بھی کئی بار وہ گاڑی منگوا لیتی ہے دکان سے... اس میں اتنا ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" اس نے امی کی وضاحت کو مکمل نہیں ہونے دیا تھا۔

"امی یہ دیکھیں میرے ہاتھ... جوڑتی ہوں آپ کے سامنے... بس کردیں ابا کی حمایتیں کرنا... آپ بھی یہ بات جانتی ہیں اور میں بھی کہ ابا اپنی گاڑی کسی کو بھی ڈرائیو کرنے نہیں دیتے... انہیں اس بات سے الجھن ہوتی ہے... وہ کسی کی گاڑی خود ڈرائیو کرتے ہیں نا کسی کو اپنی کرنے کے لیے دیتے ہیں... میں کیسے سمجھاؤں امی آپ کو... آپ مان کیوں نہیں جاتیں کہ وہ شخص جو آپ کا شوہر اور میرا باپ ہے... کبھی نہیں سدھر سکتا... کبھی نہیں۔" وہ چلا کر بولی تھی۔ امی اس کے انداز پر پہلے ششدر رہ گئیں پھر جیسے ان کا حوصلہ ختم ہو گیا تھا۔

"مان بھی جاؤں تو کیا ہوگا... کیا ہو گا بولو..." وہ بے دم سی ہو کر بولی تھیں... آنسو آنکھوں سے بھل بھل کر کے بہنے لگے تھے۔

"چھوڑ دیں امی اس شخص کو... یہ آپ کے قابل نہیں ہے... چھوڑ دیں انہیں۔" وہ ان کے قریب ہو کر بولی تھی۔ امی کو جھٹکا لگا۔

"نینا... چپ کرو تم... اتنی بڑی بات کیسے نکال لی تم نے اپنے منہ سے... کیسے کہہ دیا تم نے... چپ کرو۔" امی گھبرا سی گئی تھیں۔ سو اختلاف تھے اس کے اپنے باپ سے مگر ایسا تو کبھی نا کہا تھا اس نے۔

"امی اور کیا کہوں میں... تھک گئی ہوں اب... والدین کو آوارہ اولاد نے پریشان کر رکھا ہوتا ہے اور یہاں ہمیں آوارہ باپ نے ذلیل کیا ہوا ہے۔ حد ہوتی ہے کسی بات کی امی... ایسے باپ سے تو بہتر ہے یتیم ہونا۔ ایسے باپ کا مر جانا ہی بہتر ہے ہمارے لیے۔" وہ چلا چلا کر بول رہی تھی۔ امی اس کے الفاظ کے چناؤ پر بھڑک ہی اٹھی تھیں۔ انہوں نے ایک تھپڑ رسید کیا تھا اس کے گال پر... اسے شاید ان سے اسی کی امید تھی۔

اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے انہیں دیکھا تھا، پھر وہ جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھی اور اپنے کمرے کی جانب چل دی تھی۔ دروازہ دھاڑ کی آواز کے ساتھ بند ہوا تھا اور پھر خاموشی چھا گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"مجھے کچھ تو بتائیں کہ ہوا کیا ہے؟" زری ان کے رونے دھونے سے اکتا کر بولی تھی۔ انہوں نے اسے فون کر کے بلوایا تھا اور اب وہ اس کے سامنے بیٹھی مسلسل رو رہی تھیں۔

"کیا بتاؤں کہ کیا ہوا ہے۔ بس تم ایک مہربانی کرو۔ کوئی رشتہ ڈھونڈ دو اپنی بہن کے لیے... ہم سے نہیں سنبھالی جاتیں اب... شکل نہ صورت... اور نا ہی سلیقہ ہے نام کو... بس ایک گز بھر کی لمبی زبان ہے... ان گنوں کے ساتھ کہاں سے رشتہ ڈھونڈوں میں۔" وہ رو بھی رہی تھیں اور بول بھی رہی تھیں۔

"امی مجھے بتائیں تو سہی کہ مسئلہ کیا ہے۔ جھگڑا ہوا ہے آپ دونوں کا؟" زری اپنے کمرے کی جانب دیکھتے ہوئے ان سے سوال کر رہی تھی۔ وہ جب سے آئی تھی اس نے نینا کو نہیں دیکھا تھا۔

"ہم دونوں کی کبھی صلح ہوئی ہی نہیں زری۔ میری یہ بیٹی پوری کی پوری مسئلہ ہے۔ ہر چار دن بعد کوئی نیا قصہ شروع کر دیتی ہے اور قصہ بھی ایسا کہ مجھے اپنے منہ سے کہتے بھی شرم آتی ہے۔ بھلا بتاؤ اولاد جوان ہو جائے تو اتنی منہ پھٹ ہو جاتی ہے۔ کوئی کہتا ہو گا اپنے منہ سے کہ میرا باپ مر جائے۔" وہ پھر چھکوں پھکوں رونے لگی

تھیں۔ زری کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔
"ایسا کہا نینا نے... لیکن کیوں... اتنی نفرت کرنے لگی ہے وہ ابا سے..." اسے یقین نہیں آیا تھا' امی نے آنکھیں صاف کیں۔
"اسے محبت تھی ہی کب کسی سے... اس کے لیے پاؤں کی جوتی بھی ماں' باپ سے زیادہ قابل عزت ہے۔" امی بہت دلبرداشتہ تھیں۔ انہیں پتا تھا کہ ان کے شوہر نے جوانی میں ان کا برا دل دکھایا تھا' لیکن عجیب بات تھی کہ وہ اب بھی ان پر آنکھ بند کرکے بھروسا کرتی تھیں۔
"لیکن ایسا کیوں کہا نینا نے... کوئی تو بات ہوئی ہوگی نا؟" زری کو اس بات کا تجسس بھی تھا۔
"تم چھوڑو زری... یہ لڑکی لاعلاج ہوچکی ہے۔ تعلیم نے اس کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ اب اس کا ایم اے ہوگیا ہے تو یہ ہم ان پڑھ ماں' باپ سے ایسے بدلا لے گی اس بات کا... یہ احساس نہیں اسے کہ اسے پیٹ کاٹ کاٹ کر پڑھایا کس نے ہے۔ یہی باپ جس کی ذرا عزت نہیں کرتی' یہ اسی باپ کے دم سے اس مقام تک پہنچی ہے۔"
"امی کی آنکھیں پھر بہنے لگی تھیں۔" زری نے زچ ہوکر ان کا انداز دیکھا۔
"امی بتائیں تو سہی کہ اب کی بار نینا نے کیا کردیا ہے؟" وہ مسئلے کی تہ تک پہنچنا چاہ رہی تھی۔
"ان سے کیا پوچھے جارہی ہو۔ مجھ سے پوچھ لو۔ جو گناہ کبیرہ کردیا ہے میں نے... میں ہی بتادیتی ہوں تمہیں۔" نینا کب کمرے سے نکل کر پانی کا گلاس لیے صوفے پر آبیٹھی تھی۔ زری اچھلی۔ انہیں اس کے آنے کا پتا نہیں چلا تھا۔
"آئے ہائے... تم کہاں سے آگئی۔ ڈرا ہی دیا مجھے۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھا تھا اور پھر شرمندہ سا ہوکر ہنسی تھی۔
"یعنی کہ شاباش... یہاں آپ کی والدہ محترمہ رو' رو کر ہلکان ہوئی جارہی ہیں۔ اور آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔" وہ اپنے حصے کا رو چکی تھی اور اب امی کو نئے سرے ستانے کے لیے مکمل تیار تھی۔ امی کے چہرے پر اس کو دیکھ کر ناگواری بڑھ گئی تھی۔ زری نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے سوال کیا تھا۔ نینا نے اس کے اشاروں کو نظر انداز کردیا تھا۔
"اچھا تم ہی بتادو۔ آخر کوئی تو بتاؤ۔" وہ جھنجلا گئی تھی۔
"زری تم ان چکروں میں نا ہی پڑو تو بہتر ہے۔ تم اپنے اظفر کو پیاری ہوچکی ہو۔ بس تمہارے اپنے ہی مسئلے بہت ہیں۔ یہ میرا اور امی کا معاملہ ہے۔ ہم خود ہی بات چیت سے نپٹا لیں گے۔" امی نے غرا کر اس کی بات کاٹی۔
"ارے بی بی کوئی معاملہ نہیں میرا اور تمہارا... میرا تو دل نہیں چاہتا کہ تمہاری شکل بھی دیکھوں۔ بات چیت تو دور کی بات ہے۔" امی سخت ناراض تھیں اس سے...
"یہی تو مسئلہ ہے امی کہ آپ نے کبھی مجھ سے بات کی ہی نہیں... کبھی سنا ہی نہیں مجھے۔ میرا تو سب کچھ میرے دل میں ہی رہ گیا۔" وہ جانتی تھی امی کی شوگر اور اور بلڈ پریشر آج کل ایک ساتھ اوپر نیچے ہوجاتا ہے۔ وہ انہیں مسلسل غصے میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ اسی لیے اپنے مزاج کی ساری تلخی کو دبا کر خود ہی اپنے کمرے سے نکل آئی تھی۔ امی کی ناراضی عروج پر تھی۔
"بس بھی کرو نینا... بس کرجاؤ... تم جیسی بدبخت اولاد تو اللہ میرے دشمنوں کو بھی نا دے۔ اتنا کینہ بھرا ہے تمہارے دل میں کہ خدا کی پناہ۔ یہ اتنی پتھر دل ہے کہ باپ بیمار بھی پڑجائے نا تو ڈاکٹر کے پاس بھی نہ لے کر جائے۔"

"میں تو ڈاکٹر کے پاس لے ہی جاؤں گی امی' لیکن ابا سے بھی تو پوچھیں کہ کیا وہ میرے ساتھ جائیں گے ڈاکٹر کے پاس... میری پیاری معصوم امی... ابا ہی کبھی مجھے ڈاکٹر کے پاس اپنے ہمراہ لے کر نہیں جائیں گے۔ کہیں ڈاکٹر نے مجھے بتا دیا کہ ابا کی کھانے پینے کی عادتیں ہی ان کی بیماری کا سبب ہیں تو کیا ہوگا۔ کھانا "پینا" تو سمجھتی ہیں نا آپ۔" اس نے سارا زور لفظ "پینا" پر لگا کر جملہ مکمل کیا تھا۔ امی کے تو پورے وجود میں جیسے آگ لگ گئی تھی۔

"لعنت ہو تجھ پر نینا... لعنت ہو تجھ پر... اور مجھ پر بھی جس نے ایسی کم بخت اولاد پیدا کی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ میں تجھے پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ کر مار دیتی۔" وہ چلا کر بولی تھیں۔ اس پر رتی برابر اثر نہ ہوا۔

"ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا امی... وقت ابھی بھی آپ کے ہاتھ میں ہی ہے۔ اٹھائیں کوئی چیز اور ماردیں میرے سر میں... یہ قصہ دردناک' اذیت ناک' شرم ناک اور بہت سارے ناک... بلکہ ناک کے ساتھ ساتھ آنکھیں' کان' بھیجا' پھیپھڑے سب ختم ہو جائیں۔" وہ اتنے تحمل سے بات کر رہی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ یہ اس کے مزاج کا حصہ تھا۔ دکھ کی حالت میں طعنے دے دے کر اپنی اور دوسروں کی اذیت میں اضافہ کرتی رہتی تھی۔

"کیا کر رہی ہو نینا تم بھی... امی پہلے ہی ناراض ہیں۔ اور تم ان کی ناراضی میں مزید اضافہ کر رہی ہو۔" زری نے اسے گھرکا تھا۔

"امی کبھی راضی ہوئی ہیں مجھ سے...؟" وہ اسی انداز میں بولی تھی۔ زری کی اکتاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ سب چیزیں تو وہ بچپن سے دیکھتی چلی آرہی تھی۔

"دفع ہو جا نینا... دور ہو جا میری نظروں کے سامنے سے... میری تو بددعا بھی نہیں لگتی تجھے... ماں ہوں نا..." امی نے غرا کر کہا تھا۔ وہ ہنسی... بلاوجہ کی تمسخرانہ واستہزائیہ ہنسی... جو دوسرے کو آگ لگا کر رکھ دے۔

"دے دیں امی... دے دیں بددعا... جھولی اٹھا کر دیں کہ جا نینا کسی سڑک پر چلتے یا بس میں بیٹھے تیرا ایکسیڈنٹ ہو جائے... کسی عمارت کا ملبہ گر جائے تجھ پر... اور تیری لاش تک نا ملے۔ کس نے روکا ہے آپ کو... دیں نا بددعا۔ شاید آپ کی بددعا ہی میرے لیے سکون کا باعث بن جائے۔ تھک گئی ہوں جلتے کوئلوں پر چلتے چلتے" اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اس نے انگڑائی لی تھی جیسے بہت تھک گئی ہو... لیکن چہرے پر بلا کا سکون تھا۔ بہت اطمینان سے وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی۔ امی کچھ نہیں بولی تھیں لیکن آنسو ایک تواتر سے ان کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ زری نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ وہ بے سکون ہونے سے نہیں آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ایسا کیوں کرتی ہو تم نینا...؟" زری نے رات یہیں رکنے کا پلان بنا لیا تھا اور اب سمجھانے کے ارادے سے اس کے پاس بیٹھی تھی۔ نینا نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

"کیا کر دیا ہے میں نے...؟" وہ الٹا اس سے سوال کر رہی تھی پھر کندھے اچکا کر مزید بولی۔

"ارے کچھ نہیں کیا ہے میں نے... کم از کم نیا کچھ نہیں کیا... جو بھی کیا ہے... پہلے سے یہی سب کرتی آئی ہوں۔" اسے باتوں کو گھما پھرا کر دوسروں کو غصہ دلا دینے کا فن خوب آتا تھا۔

"امی کو کیوں ناراض کرتی ہو یار... تمہیں پتا تو ہے ان کی طبیعت پہلے بھی ٹھیک نہیں رہتی... اوپر سے تم ان کا بلڈ پریشر ہائی کر دیتی ہو... صورت حال کو سمجھو نینا... امی بوڑھی ہو چکی ہیں... ان کے پاس اب اتنی طاقت اور توانائی نہیں رہی کہ ان سے اس طرح چلا چلا کر باتیں کرتی رہو اور وہ برداشت کرتی رہیں... میرے جانے کے بعد تو وہ اکیلی بھی بہت ہو گئی ہیں... ابا سارا دن دکان پر ہوتے ہیں... تم اپنے جھمیلوں میں گم رہتی ہو... وہ سارا دن گھر کی چار دیواری میں بولائی بولائی پھرتی رہتی ہیں... تم جب گھر آجاتی ہو تو بجائے ان سے لڑنے جھگڑنے کے

ان کو ٹائم دیا کرو۔۔۔ ان کے ساتھ اچھی اچھی باتیں کیا کرو۔۔۔ ان کے ساتھ ٹی وی دیکھا کرو۔۔۔" وہ بہت محبت سے اسے سمجھا رہی تھی۔

"ارے بھائی ہم سے نہیں ہوتے یہ سب ڈرامے۔۔۔ میری اچھی باتیں امی کو کبھی پسند نہیں آئیں گی۔۔۔ تم نے دیکھا ہی ہے انہیں۔۔۔ میں نے تو اتنی اچھی بات کہی تھی آج انہیں۔۔۔ دیکھا نہیں کیسے ناراض ہیں مجھ سے۔"

وہ ایسے بات کر رہی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نا ہو۔ ابا آج بھی اپنے وقت پر ہی گھر آئے تھے پھر اظفر گھر آیا ہوا تھا تو وقتی طور پر ماحول کچھ نارمل ہو گیا مگر اس کے جانے کے بعد امی کی بجھی بجھی حالت دیکھ کر ابا سمجھ گئے تھے کہ کچھ مسئلہ ہے۔ نیناں کو تو کوئی پروا نہیں تھی لیکن زری کو اندازہ تھا کہ صبح گھر کا ماحول مزید کشیدہ ہو گا۔ اسی لیے وہ نیناں کو سمجھانا چاہ رہی تھی۔

"نیناں۔۔۔ تم کیوں ایسے کرتی ہو۔۔۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔۔۔ بس یہی ایک دو سال ہیں تمہارے پاس۔۔۔ پھر شادی ہو جائے گی تو تم امی ابا کے گھر کو مس کرو گی۔۔۔ یاد آیا کریں گے یہ دن تمہیں جب تم امی کی ناک میں دم کیے رکھتی تھی اور پھر تمہیں افسوس ہو گا۔" زری کا لہجہ بے حد محبت بھرا تھا۔ نیناں نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"اونہہ۔۔۔! آہی نا جائیں کبھی ایسے دن کہ مجھے کسی بات پر افسوس ہو۔۔۔ میں نے کبھی کوئی غلط کام کیا ہی نہیں تو افسوس کیسا۔۔۔" زری چند لمحے کے لیے زچ ہو کر اسے گھور کر دیکھتی رہی پھر اس نے سر جھٹکا تھا۔

"اچھا چلو اٹھو۔۔۔ تمہارا فیشل کرتی ہوں۔۔۔ رنگ دیکھو کیسے خراب ہو رہا ہے۔ تم اپنا خیال کیوں نہیں رکھتیں۔۔۔ اب تو یونیورسٹی بھی ختم ہو گئی ہے۔۔۔ اپنے آپ کو ٹائم دیا کرو۔۔۔ کلینزنگ کیا کرو روزانہ۔۔۔ کتنے بلیک ہیڈز ہو رہے ہیں ناک پر۔" اس نے چڑ کر موضوع ہی تبدیل کر دیا تھا۔ نیناں کو اس کے انداز پر پیار آیا اور افسوس بھی ہوا کہ وہ غصے میں اس کے ساتھ بھی بدسلوکی کر جاتی تھی۔

"میرا دل نہیں کرتا زری کچھ بھی کرنے کو۔۔۔" وہ بظاہر ناک چڑھا کر بولی تھی۔

"اوہو۔۔۔ کیوں دل نہیں کرتا۔۔۔ اٹھو میں کرتی ہوں تمہارا فیشل۔۔۔ اور پلیز اپنے آپ کو اگنور مت کیا کرو۔۔۔ میری سب چیزیں پڑی تو ہیں۔۔۔ ماسک بھی کلینزنگ کریمز بھی۔۔۔ تم مارننگ شوز ہی دیکھ لیا کرو۔۔۔ ان میں ہی اتنا کچھ بتا دیتے ہیں آج کل۔۔۔ مگر تم خود ہی اپنا خیال نہیں رکھنا چاہتی۔" وہ اسے سرزنش کر رہی تھی۔۔۔ نیناں نے اس کے کھلے کھلے چہرے کی جانب دیکھا۔

"کیا کروں اپنا خیال رکھ کر زری۔۔۔ اور اتنی چیزیں ہیں جن کا خیال رکھنے میں ہلکان ہوئی رہتی ہوں میں۔" وہ بجھے ہوئے انداز میں بولی تھی۔ زری نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

"ایک تو تم لوگوں کی ان ذومعنی باتوں سے بڑی عاجز ہوں۔۔۔ کوئی کچھ بتاتا بھی نہیں کہ مسئلہ کیا ہے۔۔۔" نیناں اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گئی پھر اس نے زری کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔

"زری مجھے یقین ہے ابا اور درزن آنٹی کا افیئر چل رہا ہے۔۔۔" اس نے سرد لہجے میں کہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ زری آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھے گی اور پھر چیخ کر دوسرا سوال کرے گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ زری نے صرف آنکھیں چرانے پر اکتفا کیا تھا۔

"تمہیں حیرانی نہیں ہوئی۔۔۔" نیناں نے اسے گھورا تھا۔ زری نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑوایا۔

"نیناں تم اکیلی ہی علامہ تھوڑی ہو ادھر۔۔۔ باقی سب کی بھی آنکھیں اور کان ہیں۔۔۔" وہ سادہ سے لہجے میں بولی تھی۔

"تمہیں پہلے سے پتا تھا اس بات کا۔۔۔؟" نیناں واقعی حیران تھی۔ ان دونوں بہنوں کے درمیان ابا کی فطرت کے

متعلق کبھی کھل کر بات نا ہوئی تھی۔
"مجھے تو لگتا ہے امی کو بھی پتا ہے..... بلاوجہ بلڈ پریشر ہائی رہنے لگ جانا..... گلوکوز لیول کا اپ ڈاؤن ہوتے رہنا..... ان سب کی کوئی نا کوئی تو وجہ ہوگی نا..... میری شادی سے پہلے تو امی کی طبیعت بالکل ٹھیک رہتی تھی..... اب ہی کچھ عرصہ ہوا کہ امی اس قدر ڈاؤن رہنے لگی ہیں..... اب وہ ہمیں بتاتی نہیں ہیں تو اور بات ہے..... لیکن شوہر کی بدلتی ہوئی طبیعت کا اندازہ سب سے پہلے بیوی کو ہی ہوتا ہے....." زری سمجھ داری سے بولی تھی۔ نہنا کے چہرے پر ناگواری بڑھی۔
"رہنے بھی دو بہن..... امی کو اندازہ ہوتا تو امی ابو کو چھوڑ نا چکی ہوتیں..... ابا یک دم ایسے نہیں ہو گئے..... وہ تو بچپن سے بدفطرت ہیں لیکن امی کو ہی پتا نہیں چلتا۔"
"نہیں نہنا..... امی کو ہی تو سب سے بہتر اندازہ ہے..... ورنہ تم خود سوچو کہ درزن آنٹی کو یک دم امی نے کام دینا کیوں بند کر دیا تھا..... اچھے بھلے کپڑے سی رہی تھیں وہ میرے لیکن امی نے کہا..... کہ ہم درزی سے سلوائیں گے..... پھر درزن آنٹی کے ساتھ ان کا رویہ بھی بدل گیا..... وہ جب بھی آتی تھیں امی ان سے بہت اکھڑے ہوئے انداز میں بات کرتی تھیں..... جبکہ ابا ان کو دیکھ کر خوش ہو جاتے تھے.....
جب امی نے ان کو کام دینا بند کیا تو میں نے امی سے کہا بھی تھا کہ ان کو ہی دے دیتے ہیں کپڑے سلائی کے لیے..... بہت صاف ہاتھ ہے ان کا..... کپڑے میں جان ڈال دیتی ہیں..... لیکن امی نے صاف منع کر دیا کہ وہ ادھار بہت مانگتی ہیں..... ابا کے سیل فون پر رات کے وقت ان کی لگاتار مسڈ کالز میں نے بہت بار دیکھی ہیں..... تو کیا امی نے محسوس نہیں کیا ہوگا..... بس نہنا..... چھوڑو یہ باتیں..... جتنا بھی کریدیں گے..... اتنا ہی تکلیف ہوگی۔" زری کو اس موضوع پر بات کرنا اچھا نا لگ رہا تھا۔
"کریدے بغیر کون سی تکلیف نہیں ہوتی زری..... میں اب تھک گئی ہوں۔ میرا دل کرتا ہے میں ابا کی شکل بھی نا دیکھوں..... اس گھر سے دور چلی جاؤں..... لیکن امی کبھی نہیں مانیں گی۔ اور میں ابا کے ساتھ ان کو اکیلا کیسے چھوڑ دوں۔" وہ بے دم سی ہو کر بولی تھی جیسے توانائی بالکل ختم ہو گئی ہو۔
"نہنا یہ ہی تو تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ اپنا خیال رکھنا شروع کرو..... یہی تو وقت ہے..... اچھا رشتہ مل جانا بہت ضروری ہے..... پھر آرام سے اپنے شوہر کے ساتھ اپنی مرضی سے رہنا" زری کی تان پھر وہیں آ کر ٹوٹی تھی۔
"تمہیں میری شادی کی پڑی ہے..... اور میں سوچ رہی ہوں کہ امی کو شادی سے کیا ملا..... کیسی مشکل زندگی رہی ہوگی ان کی۔"
"تم ایک ہی رخ پر کیوں سوچتی ہو نہنا..... یہ بھی تو دیکھو کہ ابا جیسے ہینڈسم انسان نے بھی تو کمپرومائز کیا نا امی جیسی عام سی شکل و صورت عورت کے ساتھ..... ابا کو کس چیز کی کمی تھی..... وجیہہ بھی تھے' امیر بھی..... لوگوں سے ملنے برتنے کا سلیقہ بھی تھا..... جہاں جاتے تھے' لوگوں کو اپنا گرویدہ کر آتے تھے..... تم خود سوچو لڑکیاں کیسے دیوانہ وار مرتی ہوں گی ابا پر..... لیکن ابا نے امی جیسے سانولی سلونی خاتون کے ساتھ ساری عمر بھر نبھائی ہے..... اب بھی دیکھو..... ان کے بغیر گزارا نہیں ہے ابا کا..... یہ درزن آنٹی جیسی چیزیں تو بس ذرا دل بہلانے کے لیے ہوتی ہیں۔"
زری کا اپنا ہی الگ موقف تھا۔ نہنا کو اس کی بات سخت بری لگی۔
"بہت اچھی نبھائی ہے ابا نے..... امی کے لیے تو زندگی ایسی رہی ہوگی جیسے مرغی کو سیخ پر چڑھا رکھا ہو..... اتنی غیر محفوظ ازدواجی زندگی میں سکھ کیا ملا ہوگا..... ابا کے دل بہلانے نے میری ماں کا ساری زندگی دل جلا کر رکھا ہے۔"
وہ ناک چڑھا کر بولی تھی۔ وہ دونوں باتوں باتوں میں جیسے یہ بھی بھول گئی تھیں کہ جیسے وہ اپنے والدین نہیں بلکہ ٹی وی پر چلنے والے کسی ڈرامے کے کرداروں کے بارے میں بات کر رہی ہوں..... دونوں ہی گفتگو میں بدلحاظ ہوئی

جا رہی تھیں۔

"نیناتم نہیں سمجھوگی یار۔۔۔ ایسا ہی ہوتا ہے جب گھر میں بیوی اپنے سے کم صورت نظر آتی ہے تو مرد باہر منہ مارنے لگتے ہیں۔۔۔ اس میں مرد کا کیا قصور ہے۔ تب ہی تو تمہیں کہہ رہی ہوں کہ اپنا خیال رکھو۔ کل کلاں کو تمہاری بھی شادی ہونی ہے۔ دھیان دو اپنے آپ پر۔۔۔ کوئی اچھی نائٹ کریم لاؤ اور۔۔۔" زری مزید جانے کیا کہنا چاہ رہی تھی کہ نینا نے اس کی بات کاٹی۔

"لعنت ہو ایسے مردوں پر جو عورت کو صرف شکل و صورت کے معیار پر جانچتے ہیں۔۔۔ میں تمہاری اس بات سے بالکل اتفاق نہیں کرتی۔۔۔ مرد کی فطرت میں اگر عیاشی ہے تو گھر بیٹھی خوب صورت بیوی بھی اس کے لیے آوارہ بلی سے زیادہ اہم نہیں ہوتی۔۔۔ مرد کو اگر جگہ جگہ منہ مارنے کی عادت ہو تو خوب صورت بیوی بھی اسے گھر تک محدود نہیں رکھ سکتی۔ زری۔۔۔ بالکل غلط بات کی ہے تم نے۔" وہ اسے گھرک رہی تھی۔ زری کو برا لگا۔ وہ چند مہینوں کی بیاہتا یہ سمجھتی تھی کہ اس کی خوش گوار ازدواجی زندگی کا سارا کریڈٹ اس کے حسن کو جاتا تھا۔

"مت کرو اتفاق تم میری بات سے لیکن یہی سچ ہے۔۔۔ ورنہ ڈھونڈ کر دکھاؤ کوئی ایسا وجیہہ آدمی جس کی بیوی شکل و صورت میں بالکل ہی گئی گزری ہو اور وہ شخص اس کے ساتھ وفادار ہو۔" زری اکتا کر بولی تھی۔ نینا لمحہ بھر کے لیے چپ سی رہ گئی کیونکہ اس کے ذہن کے پردے پر ایک شخص کا ہیولا بالکل نمایاں ہو گیا تھا۔

"دیکھا ہے میں نے ایک ایسا شخص زری۔۔۔ بالکل دیکھا ہے۔۔۔" اس نے یہ بات اپنے آپ سے کہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن وہ نا چاہتے ہوئے بھی ٹیوشن پڑھانے نکل گئی تھی حالانکہ اسے ایمن اور اس کی لاپروا اماں پر سخت غصہ تھا مگر وہ گھر بھی نہیں رکنا چاہتی تھی کیوں کہ اسے اندازہ تھا کہ آج اس کا اور ابا کا خطرناک قسم کا جھگڑا ہو سکتا ہے۔ اسی لیے صبح ہی بیگ کندھے پر لٹکا کر نکل کھڑی ہوئی۔ ایمن کے گھر پہنچی تو وہاں روز سے زیادہ سناٹا تھا۔۔۔ اسے ڈرائنگ روم میں بیٹھے کافی دیر ہو گئی تھی لیکن ایمن نہیں آئی تھی۔۔۔ اس کا غصہ مزید بڑھنے لگا۔

"آپ لوگ بہت ہی غیر ذمہ دار ہیں۔۔۔ میں کب سے بیٹھی ہوئی ہوں لیکن ابھی تک آپ لوگوں نے بچی کو بھیجا ہی نہیں ہے۔۔۔ حد ہوتی ہے کسی بات کی۔" وہ جب اکتا گئی تو تن فن کرتی اٹھی اور کچن میں جا کر نہایت ناراضی بھرے لہجے میں بولی تھی۔ اسے غصے میں کب کسی کی پروا ہوتی تھی۔ اس نے بالکل دھیان نہیں دیا تھا کہ کچن میں اماں رضیہ کے علاوہ کوئی اور بھی بیٹھا ہے۔ اس کے اس طرح بولنے پر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے سمیع نے اس کی جانب دیکھا تھا۔ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں گرائے لاچار سا بیٹھا تھا اس کی آنکھوں میں ناگواری کے ساتھ ساتھ عجیب سی افسردگی تھی۔ نینا کو چہرے پڑھنے میں یا تاثرات کو پہچاننے میں بالکل بھی مہارت نہیں تھی لیکن جانے کیا بات تھی کہ سمیع کا بجھا بجھا چہرہ اس سے چھپا نہیں رہا تھا۔

"اونہہ ان کی شکل پر تو ہمیشہ بارہ ہی بجے رہتے ہیں۔" نینا نے جل کر سوچا تھا۔

"جائیں اماں آپ دیکھیں۔۔۔ کیا کر رہی ہے ایمن۔۔۔" سمیع نے اسے بالکل نظرانداز کرتے ہوئے اماں رضیہ سے کہا تھا۔ اس نے پہلی نظر کے بعد نینا کی جانب دیکھا بھی نہیں تھا اور اس پہلی نظر میں بھی اتنی ناگواری تھی کہ نینا کو مزید غصہ آگیا۔ وہ کون سا کوئی غلط بات کہہ رہی تھی۔

"دیکھیں جناب۔۔۔ میں بہت دور سے یہاں آپ کی بچی کو پڑھانے کے لیے آتی ہوں۔۔۔ ہر روز وقت کا ضیاع میں برداشت نہیں کر سکتی۔۔۔ کل بھی میرے تین گھنٹے ضائع ہوئے اور آج بھی میں پینتالیس منٹ سے منہ اٹھا کر بیٹھی انتظار کر رہی ہوں۔۔۔ اور آپ لوگ یہاں اطمینان سے بیٹھے چائے نوش فرما رہے ہیں۔۔۔ آپ لوگوں کو ذرا سا بھی

احساس نہیں ہے کہ میں آپ کی بچی کی ٹیچر ہوں۔۔۔ دو ٹکے کی درزن نہیں ہوں۔" اسے برا تو سمیع کا انداز لگا تھا اس لیے ناگواری بھرے انداز میں بولی تھی۔۔۔ سمیع نے دوبارہ سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"جی بہتر۔۔۔ معذرت خواہ ہیں کہ آپ کو انتظار کرنا پڑا۔۔۔ بس دو منٹ مزید انتظار کیجیے۔۔۔ ایمن آرہی ہے۔" اس نے اپنے چہرے پر ایسے ہاتھ پھیرا تھا جیسے نادیدہ ندامت صاف کر رہا ہو۔۔۔ نینا کچھ بولے بنا ناک چڑھاتی ہوئی واپس ڈرائنگ روم میں چلی آئی تھی۔

"کس مشکل میں پھنس گئی ہوں میں۔۔۔ ماں ہے تو وہ پہیلی لگتی ہے۔۔۔ باپ کو دیکھو تو وہ بھی معمہ ہی ہے۔۔۔ بے چاری نازک سی بچی کتنی مشکل میں گرفتار ہے۔۔۔ خیر ہم کون سا جنت سے نکل کر یہاں آتے ہیں۔۔۔ ہمارے تو اپنے ماں باپ نے ہمیں تگنی کا ناچ نچار کھا ہے۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی اپنی جگہ پر بیٹھ گئی تھی۔ پانچ منٹ کے بعد ایمن اماں رضیہ کے ساتھ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

"بیٹا معاف کرنا۔۔۔ بس مجھ سے تاخیر ہو گئی۔۔۔ شہرین بیٹا نے تو ہاتھ پاؤں پھلا کر رکھ دیئے ہیں۔" وہ عجلت کا مظاہرہ کرتی ہوئی بولی تھیں۔۔۔ نینا نے ناک چڑھا کر انہیں دیکھا۔

"اس کے علاوہ وہ اور کر بھی کیا سکتی ہیں۔۔۔؟" یہ بھی بڑبڑا کر کہا گیا تھا۔ اماں رضیہ نے سنا یا نہیں سنا اسے پتا نا چلا تھا کیونکہ وہ بھی کچھ پریشان سی نظر آرہی تھیں۔ انہوں نے کوئی جواب دیئے بنا ایمن کو کاؤچ پر بٹھایا اور چھوٹے چھوٹے قدم بھرتی واپس چلی گئیں۔

"کہاں تھیں آپ۔۔۔؟" اس نے ایمن کو گھورا۔ وہ لاتعلق سے انداز میں بیٹھی اپنی انگلیاں چٹخانے میں مگن تھی' اس نے نینا کی بات کا کوئی جواب بھی نا دیا تھا۔ نینا کو مزید تپ چڑھی۔

"میں آپ سے کچھ پوچھ رہی ہوں ایمن۔۔۔؟" اس نے اب کی بار ذرا سخت لہجہ اپنایا تھا جو کہ اس کی عادت نا تھی۔ اپنی تمام ٹیوشن والی لڑکیوں کے ساتھ وہ کبھی بھی سخت انداز نا اپناتی تھی۔ لڑکوں کے ساتھ سختی برت لیتی تھی' لیکن لڑکیوں کو زیادہ ڈانٹتی بھی نا تھی۔ ایمن نے اس کا انداز دیکھ کر سر مزید جھکا لیا تھا۔

"ایمن۔۔۔" اس نے گھر کا پھر لہجے کو بارعب بنا کر بولی۔

"یہاں آئیں۔۔۔ میرے پاس۔۔۔" ایمن ابھی بھی ٹس سے مس نا ہوئی۔ نینا نے گہری سانس بھری اور ایک سیکنڈ کے لیے کچھ سوچا۔ اسے حکمت عملی تبدیل کرنے کی ضرورت تھی۔ اس نے لہجے کو ذرا نرم کیا پھر ایمن کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

"ایمن۔۔۔ ٹیچر آپ کو بلا رہی ہیں نا۔۔۔ اور آپ اسٹیچو بنی بیٹھی ہیں۔۔۔ دیٹس ناٹ فیئر۔۔۔ یہاں آئیں۔۔۔ آپ تو بہت اچھی بچی ہیں۔۔۔ مجھے بتائیں کیا ہوا ہے۔۔۔" وہ اسے پچکارتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ایمن نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر منہ لٹکا کر بولی۔

"میں اچھی بچی نہیں ہوں۔" ایسا اس نے پہلے کبھی نا کہا تھا۔ نینا نے اس کے بجھے ہوئے انداز کو بغور دیکھا۔ وہ اپنا موقف بیان کرنے کے بعد دوبارہ سر جھکا کر انگلیاں چٹخانے لگی تھی۔

"یہ کس نے کہا۔۔۔ آپ تو بہت اچھی بچی ہیں۔۔۔ سب آپ کی تعریف کرتے ہیں۔۔۔ آپ کے پاپا سے ابھی ابھی ملی ہیں۔۔۔ وہ بھی کہہ رہے تھے ایمن بہت اچھی بچی ہے اور آپ کہہ رہی ہیں کہ آپ اچھی بچی نہیں ہیں۔" وہ اسے پچکار رہی تھی۔ اتنی دیر سے بچوں کو پڑھا رہی تھی۔ اسے اب بچوں کے مزاج کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ انہیں کس وقت کس طرح ٹریٹ کیا جانا چاہیے' اس کی بھی اسے بخوبی خبر تھی۔

"پاپا۔۔۔ کبھی مجھے اچھی بچی نہیں کہہ سکتے۔" وہ اسی طرح سر جھکائے بولی تھی۔

"ایسی بات تو نہیں ہے۔۔۔ وہ تو کہتے ہیں کہ ایمن میری بیسٹ بیٹی ہے۔" نینا نے محبت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"تو پھر وہ مجھے بورڈنگ کیوں بھیج رہے ہیں؟" نینا کی بات سن کر وہ ترنت بولی تھی اور نینا کو سمجھ میں آیا کہ اس کا مزاج اتنا خراب کیوں ہے۔

"یہ آپ کے پاپا نے کہا۔۔ کہ وہ آپ کو بورڈنگ بھیج رہے ہیں؟" نینا نے اپنے تجسس کو چھپاتے ہوئے اس سے سوال کیا تھا۔

"جی۔۔" اس نے فقط سر ہلایا۔ آنکھیں بالکل ڈبڈبا گئی تھیں۔

"آپ بورڈنگ نہیں جانا چاہتیں۔۔؟" نینا نے دوسرا سوال کیا تھا۔

"جی۔۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے بورڈنگ بھیج دیں گے۔۔ مجھے وہاں اکیلے ہی رہنا ہوگا۔۔ اماں رضیہ بھی وہاں نہیں ہوں گی اور ٹیچر نینا بھی نہیں۔۔" وہ بولتے بولتے رو پڑی تھی۔ اس کا رونا بالکل بے آواز تھا۔ نینا کو اس معصوم بے ضرر رونے پر جی بھر کر پیار آیا۔ وہ بنا کوئی آواز پیدا کیے بس رونے میں مگن تھی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر اس کے گالوں پر پھسل رہے تھے جنہیں وہ ہاتھ کی پشت سے صاف کرتی جاتی تھی جیسے کوئی فلم ایکٹرس نزاکت سے کیمرے کے سامنے رو رہی ہو۔

"ایسے کیسے بھیج دیں گے آپ کو بورڈنگ۔۔ میں ان سے بات کروں گی کہ ایمن کو بورڈنگ مت بھیجیں۔۔ ٹھیک ہے؟" وہ اسے پچکار رہی تھی۔ اس نے رونا بند نہیں کیا تھا لیکن اس کی بات کو غور سے سنا ضرور تھا۔

"میں نے کہا نا آپ مت روئیں۔۔ میں آپ کے پاپا سے بات کروں گی۔" نینا نے دوبارہ کہا۔

"پرامس۔۔؟" وہ روتے ہوئے ہی پوچھ رہی تھی۔ نینا نے سر ہلایا۔

"پرامس" نینا نے اسے یقین دلایا۔ یہ سوچے بنا کہ کسی کے ذاتی معاملات میں مداخلت اسے مہنگی بھی پڑ سکتی ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ گھر پہنچی تو زری ابھی گئی نہیں تھی۔ یہ ایک انوکھی بات تھی۔ زری شادی کے بعد بمشکل چوبیس گھنٹے سے زیادہ ان کے یہاں رکی تھی۔ وہ ابھی تک موجود تھی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ کچھ نا کچھ اہم بات ضرور تھی۔ نینا نے کن انکھیوں سے لاؤنج کا بھی جائزہ لیا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے کافی دل سے صفائی ستھرائی کی تھی۔

"تم واپس نہیں گئیں۔۔؟" اس نے لاؤنج میں دیوان پر بیٹھتے ہوئے بظاہر سرسری انداز میں سوال کیا تھا۔ زری نے اس کی جانب بہت غور سے دیکھا تھا۔

"نہیں۔۔ اور تم یہاں بیٹھ کر وقت ضائع مت کرو۔۔ ابا کے ایک جاننے والے شام کو چائے پر آ رہے ہیں۔" زری کا انداز کچھ سنجیدہ سا تھا۔

"میں نے تمہارے لیے کپڑے نکال کر رکھ دیے ہیں۔۔ چینج کر لو۔۔ لیکن پہلے ذرا کلینزنگ کر لینا۔۔ وہاں ڈریسنگ ٹیبل پر میں نے اپنا ماسک بھی رکھا ہے۔۔ اسکرب کر کے وہ ماسک لگا لو۔۔ پندرہ منٹ بعد چہرہ دھو لینا اور ساتھ ہی نہا کر کپڑے تبدیل کر لینا۔" وہ نصیحت کرتے ہوئے بولی تھی۔ نینا نے اسے گھور کر دیکھا۔

"کہیں لگا ہی نا لوں تمہارا کوئی امپورٹڈ ماسک۔۔" وہ حسب عادت تمام ناک چڑھا کر بولی تھی۔ زری نے زچ ہو کر اس کی جانب دیکھا۔

"دیکھو۔۔ پلیز جو میں کہہ رہی ہوں۔۔ ویسا کر لو۔۔ تمہارے فائدے کی بات ہے۔"

"میرا فائدہ چاہنے والا تو کوئی پیدا ہی نہیں ہوا آج تک میری پیاری بہن۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔

"نینا۔۔ ابا کے جو دوست آ رہے ہیں نا ان کے دو بیٹے قطر میں ہوتے ہیں۔ وہ ان کے رشتے دیکھتے پھر رہے ہیں

تو ابا کا خیال ہے کہ ایک دفعہ انہیں... میرا مطلب..." زری لمحہ بھر کو چپ ہوئی پھر اس کا چہرہ دیکھا آیا اس کو برا تو نہیں لگ رہا۔

"اچھا... یعنی تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ میرا رشتہ آیا ہے... واؤ... ہاؤ ایکسائیٹنگ... کوئی تفصیل تو بتاؤ... مجھے کافی دلچسپی محسوس ہو رہی ہے..." وہ مذاق اڑانے والے انداز میں کہہ رہی تھی۔ چہرے کے تاثرات ایسے تھے کہ زری کو فوراً" اندازہ ہو گیا کہ وہ کچھ گڑبڑ کر کے ہی رہے گی۔

"دیکھو نینا۔ ہمارے جیسے گھروں میں رشتے ایسے ہی ہوتے ہیں... لوگ ایسے ہی رشتے دیکھنے کے لیے گھروں میں آتے ہیں... تم اسے روٹین کی ٹی پارٹی سمجھو۔" وہ اسے بولنے کا موقع دیے بنا نصیحتیں کرنے میں مگن تھی۔ نینا نے آنکھیں گھما کر اسے دیکھا۔

"بس باجی... بس کریں آپ کی یہ جلی ہوئی روٹی پر گھی لگا لگا کر اسے کھانے کے قابل بنانے کی کوشش میرے معاملے میں کامیاب نہیں ہو سکتی... یعنی میں یہ جلی ہوئی روٹی نہیں کھانے والی... آپ جتنا مرضی گھی لگاتی رہیں' مجھے صاف صاف بتاؤ... ابا نے کیا نئے احکامات صادر کیے ہیں... کہیں کسی قطری موٹر مکینک سے میری شادی کروا کر مجھ سے انتقام تو نہیں لینا چاہتے۔" وہ عجیب ہی چیز تھی۔ ایمن کے گھر سے بھی پریشان ہو کر نکلی تھی۔ گھر میں چلنے والی کشیدگی بھی اسے پتا ہی تھی' لیکن زبان ایسے چلا رہی تھی جیسے ذہن بالکل تر و تازہ ہو۔ زری نے اسے چونک کر دیکھا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا... امی نے بتایا کیا...؟" وہ حیران تھی۔ نینا نے قہقہہ لگایا۔

"اچھا یعنی وہ واقعی موٹر مکینک ہے...؟" وہ ہنستے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں... لیکن الیکٹریشن ہے اور کسی کمپنی کے مینٹیننس ڈپارٹمنٹ میں ہے... اسی ہزار تنخواہ ہے اور تم یہ مت سمجھو کہ کوئی ان پڑھ جاہل انسان ڈھونڈا ہے ابا نے... گریجویٹ ہے..." وہ عجلت بھرے انداز میں بول رہی تھی۔ نینا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔

"اتنی میٹھی میٹھی باتیں مت کرو... مجھے بخوبی اپنی اماں ابا کی فطرت کا اندازہ ہے... کل جو کچھ بھی ہوا ہے اس کے بعد مجھے امی ابا سے بالکل بھی کوئی اچھی امید نہیں رہی... امی نے ابا کو میری ساری باتیں تفصیل سے بتائی ہوں گی... اب اس صورت حال کے بعد میرے لیے جو رشتہ ڈھونڈا ہو گا ابا نے... وہ کیسا ہو سکتا ہے... اس کا اندازہ ہے مجھے... لیکن مجھے بھی تم سب لوگ جانتے ہو... یہ نا ہو کہ میں گھر آئے مہمانوں کے سامنے... اب اپنے منہ سے کیا کہوں... تم خود سمجھ دار ہو۔" وہ کسی سوپ سیریل کی چالاک سی ہیروئن کی طرح آنکھیں مٹکا مٹکا کر بول رہی تھی۔

"اگر گھر آئے مہمانوں کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی کوشش کی تو یاد رکھنا... میں بہت بری طرح پیش آؤں گا۔" وہ دونوں بہنیں آپس میں بات کر رہی تھیں جب پیچھے سے یک دم ابا کی آواز سنائی دی۔ زری نے آنکھوں آنکھوں میں اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

"نو پرابلم مجھے عادت ہے ابا... آپ کبھی اچھی طرح پیش آئے بھی نہیں میرے ساتھ۔" وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی تھی۔

"تمہارے کرتوت ہی ایسے ہیں..." ابا غرا کر بولے تھے۔ زری سہم سی گئی' لیکن نینا نے بالکل پروا نا کی تھی۔

"کرتوت کی بات مت کریں ابا... ورنہ بات بہت بگڑ سکتی ہے..." وہ تلخ لہجے میں بولی۔

"چپ کرو نینا... تم جاؤ اپنے کمرے میں۔" زری نے اسے گھرکا تھا۔

"کیوں میں کیوں جاؤں اپنے کمرے میں... میں نے تو کچھ غلط نہیں کیا... جنہوں نے غلط کیا ہے... وہ جائیں

اپنے کمرے میں۔۔۔ وہ چھپائیں اپنا منہ۔۔۔" وہ بہت بدتمیزی سے بولی تھی۔ اسی دوران امی بھی کمرے سے نکل کر آگئی تھیں۔

"نینا۔۔۔ کچھ تو لحاظ کرلے۔۔۔ باپ ہے تیرا۔۔۔" امی تڑپ کر بولیں۔

"رہنے دو صوفیہ۔۔۔ مجھے اس سے کبھی کوئی اچھی توقع نہیں رہی۔۔۔ کوئی مت ٹوکے اسے۔۔۔ کرنے دو اسے من مانیاں۔۔۔ یہ ہماری اولاد نہیں۔۔۔ ہماری آزمائش ہے۔۔۔" ابا نے نہایت تحمل بھرے لہجے میں کہا تھا۔ نینا نے انہیں مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ مزید کچھ کہنا چاہتی تھی' لیکن اس سے کہا نہیں گیا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھی تھی۔

"ایک بات یاد رکھو۔۔۔ مہمانوں کے سامنے کسی قسم کی بدتمیزی کرنے کی کوشش مت کرنا۔۔۔ وہ تمہارے رشتے کے لیے آرہے ہیں۔۔۔ ان کے سامنے اپنی قینچی جیسی زبان بند ہی رکھنا۔۔۔ ورنہ اس کے نتائج بہت خطرناک ہوسکتے ہیں۔۔۔ باپ ہوں تمہارا۔۔۔ تمہارے لیے اچھا ہی سوچوں گا۔۔۔" وہ سرد لہجے میں بولے تھے۔ نینا مڑی تھی۔

"آپ میرے لیے کتنا اچھا سوچ سکتے ہیں۔۔۔ اس کا اندازہ تو مجھے بہت اچھی طرح ہے۔۔۔ لیکن اب بس کریں۔۔۔ مت کریں کچھ بھی میرے لیے۔۔۔ شکریہ۔۔۔ مہربانی۔۔۔" اس نے اپنے جذبات کو چھپا کر کہا تھا۔ اسے رونا آنے لگا تھا۔

"نینا چپ کرجاؤ نا۔۔۔ کیوں بولتی جارہی ہو فضول۔۔۔ باپ ہیں وہ تمہارے۔۔۔" زری نے اسے گھر کا تھا۔ اس نے ایک نظر اس کی جانب دیکھا۔ وہ بھی اسے خود سے بہت فاصلے پر محسوس ہوئی۔

"چپ کرجاؤ زری۔۔۔ کچھ مت کہو اسے۔۔۔ کوئی نا ٹوکو اسے۔۔۔ یہ ہم سب کی ماں ہے۔۔۔ کرنے دو اسے من مانی۔۔۔ اسے اتنا بھی احساس نہیں کہ ماں باپ اس کا بھلا ہی چاہتے ہیں۔۔۔" امی بھی میدان میں اتری تھیں۔ انہوں نے اپنا رخ ابا کی جانب موڑا۔

"آپ مت بلائیں اپنے دوست کو گھر۔۔۔ انکار کردیں انہیں۔۔۔ اس لڑکی کے کسی معاملے میں دلچسپی لینے کی ضرورت نہیں۔۔۔ چھوڑدیں اسے اس کے حال پر۔۔۔ اور سال گزرے گا تو کوئی بیاہنے بھی نا آئے گا تو ہوش آئے گا اسے کہ ماں باپ اس کا بھلا ہی چاہتے تھے۔" امی چلا چلا کر بول رہی تھیں۔

"آپ واقعی فکر مت کریں میری۔۔۔ کوئی نا کوئی تو آہی جائے گا مجھے بیاہنے بھی۔" وہ گلوگیر لہجے' مگر تلخ لہجے میں بولی تھی۔

"اس شکل وصورت کے ساتھ تو ضرور ہی آجائے گا کوئی۔۔۔ شکل نا عقل۔۔۔ بس نخرہ ہی نخرہ۔۔۔" امی نے اسے یہ طعنہ پہلے بھی بہت بار دیا تھا' لیکن اس لمحے نینا کو یہ طعنہ بہت زور سے چبھا۔۔۔ اس نے زری کی طرف دیکھا۔۔۔ وہ بھی امی کی حمایت میں ان کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔ ابا تو پہلے بھی اس کے نا تھے۔۔۔ نا ہی اسے ان کی ضرورت تھی۔۔۔ لیکن امی تو اس کے ساتھ ہوتیں۔۔۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ یہ منظر تو بہت بار پیش آیا تھا اس کی زندگی میں۔۔۔

امی ابا اور زری۔۔۔ تینوں ایک ساتھ تھے اور وہ اکیلی۔۔۔ بچپن میں بھی ایسے ہی گالیاں جھڑکیاں کھاتی تھی اور اب بھی کھا رہی تھی۔۔۔ بچپن میں بھی قلعے میں قید شہزادی کی طرح اکیلی تھی اور اب بھی اکیلی ہی تھی۔۔۔ وہ ان تینوں کی جانب دیکھے بنا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔۔۔ قلعے سے نکلنے کا وقت ہوا چاہتا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ تھکے ہوئے انداز میں باتھ روم سے نکلا تھا۔ کمرے کی روشنیاں گل تھیں' لیکن پنکھا فل اسپیڈ سے چل رہا تھا۔ بالوں کو خشک ٹاول سے جھاڑتے ہوئے اس نے فرش کی جانب دیکھا۔ باتھ روم سے دھیمی سی روشنی باہر تک آرہی تھی۔ اس نے دیکھا فرش بالکل خشک ہوچکا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ فرش کو مکمل صاف کیا گیا تھا۔ ٹاول کو

کاؤچ کی پشت پر پھیلا کر وہ بیڈ پر گر سا گیا تھا۔ اس کے اعصاب بالکل ٹوٹ چکے تھے۔ آج تو حد ہی ہو گئی تھی۔

"کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ ایسا بھی۔۔۔ یا اللہ اور کیا کچھ ہونا باقی ہے۔" اس نے چھت پر لگے پنکھے کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔ وہ باتھ روم میں بہت سا رو چکا تھا' لیکن ایسا لگتا تھا کہ آنسو ابھی خشک نہیں ہوئے تھا۔ اس کا دل بے حد بوجھل تھا۔ زندگی جیسے کوئی فلم تھی اور فلم بھی ایسی' جس کا دردناک حصہ ختم ہونے میں ہی نا آتا تھا۔

"کیوں۔۔۔ میرے ساتھ ہی کیوں۔۔۔؟" اس نے سوچا تھا۔ آنسو اس کی پلکوں سے گالوں تک کسی تیز رفتار جہاز کی طرح اڑتے ہوئے آئے تھے۔ اسی دوران دروازہ کھلا تھا اور باہر سے آنے والی روشنی نے بیڈ پر گرے اس کے وجود کا احاطہ کیا تھا۔ اس نے بازو آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔ دل چاہ رہا تھا دنیا سے کنارہ کر لے۔ کسی کو دیکھنے کی خواہش تھی نا ہی یہ دل تھا کہ کوئی اس کے شکست خوردہ وجود کو دیکھتا۔

"قدرت بھی بعض اوقات کیسے کیسے امتحان میں ڈال دیتی ہے۔" اس نے سوچا تھا۔

"یہ چائے رکھی ہے۔۔۔ لے لیں۔" کونین کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اس وقت اس کے کمرے میں وہی آسکتی ہے۔ اس نے بازو آنکھوں سے نہیں ہٹایا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بھیگی آنکھیں اسے نظر آئیں۔

"چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔۔۔ آپ کا غم نہیں۔۔۔ اس لیے پانچ منٹ کا بریک لے لیں۔۔۔ اپنی اور اس کی چائے کے کپ کی نا سہی۔۔۔ میرے ان دس منٹ کی قدر ضرور کیجیے جو میں نے اس چائے کو بنانے میں صرف کیے ہیں۔۔۔ چائے پینے کے بعد بھی غم زدہ ہوا جا سکتا ہے۔"

اس کا انداز طنزیہ نہیں تھا اگرچہ الفاظ کچھ سخت تھے۔ سمیع نے جواباً "کچھ کہا' نا ہی آنکھوں سے بازو ہٹایا تھا۔ نینا چند لمحے کھا جانے والی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتی رہی پھر وہ واپس جانے کے لیے مڑی تھی۔

"کونین۔۔۔" سمیع نے پکارا تھا۔ کونین مڑی تھی اور استفہامیہ انداز میں اسے دیکھا تھا۔ اس نے چہرے سے بازو ابھی بھی نہیں ہٹایا تھا۔

"کچھ دیر میرے پاس بیٹھ جاؤ۔۔۔ پلیز۔۔۔" اس کے لہجہ میں ایسی التجا تھی کہ کونین کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس نے پہلی بار ایسے کہا تھا ورنہ تو وہ اس کے سائے سے بھی دور بھاگتا تھا۔ وہ اس کے پاس ہی وہیں بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

"وہ کہاں ہے۔۔۔؟" سمیع نے اس کی جانب دیکھے بنا سوال کیا تھا۔ اس کا لہجہ ایسا تھا کہ کونین کا دل ڈوب سا گیا۔

"سلا دیا ہے۔۔۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ سمیع پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کونین اپنی جگہ سے تڑپ کر اٹھی تھی پھر اس نے آگے ہو کر سمیع کے وجود کو اپنی بازوؤں کے حلقے میں لیا تھا۔۔۔ سمیع اس کے ساتھ لپٹ کر مزید تڑپ تڑپ کر رو رہا تھا۔۔۔ کونین بھی پتھر تو نا تھی۔۔۔ اسے بھی رونا آنے لگا تھا۔

"آپ سنبھالیں اپنے آپ کو۔۔۔" کونین نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔

"نہیں ہوتا۔۔۔ مجھ سے کونین۔۔۔ نہیں ہوتا۔۔۔ بالکل ٹوٹ چکا ہوں میں۔۔۔ کرچی کرچی ہو گیا ہوں۔۔۔ مجھے سمیٹ لو پلیز۔۔۔ مجھے سمیٹ لو۔۔۔ یہ میری برداشت سے بہت زیادہ ہے۔۔۔" وہ مسلسل رو رہا تھا۔۔۔ کونین نے اسے ایسے اپنی آغوش میں سہارا دیا تھا جیسے ماں اپنے بلکتے بچے کو دیتی ہے۔

(اگلے ماہ ان شاء اللہ آخری قسط)

✲ ✲

نادیہ احمد

"درفٹے منہ موت جو گیا تینو اللہ پوچھے۔" سڑک پہ لوٹ پوٹ ہوتے اس نے دل کھول کر بددعائیں دیں۔

موٹر سائیکل والا ابھی کوئی چار گز کے فاصلے پہ تھا جب وہ حواس باختہ سی یہاں وہاں ہلکورے لینے لگی۔ وہ دائیں جاتا تو دائیں جانب مڑ جاتی' بائیں طرف رخ کرتا تو بائیں جانب سے نکلنے لگتی۔ سڑک کے بیچوں بیچ موٹر سائیکل سوار اور اس کے مابین کبڈی کبڈی جاری رہتی اگر وہ پھسل کر گر نہ جاتی۔ اتوار بازار سے نکلتے جہاں بے تحاشا رش اور سبزی کی ریڑھیاں کھڑی تھیں' موٹر سائیکل کی رفتار بمشکل دس پندرہ کلو میٹر ہی ہوگی لیکن وہ خواہ مخواہ کنفیوز ہوگئی اور گر کر ہی دم لیا۔ دھان پان سا موٹر سائیکل سوار اس اچانک افتاد اور عزت افزائی پہ گھبرا کر سر پہ پاؤں نہ رکھ سکا تو موٹر سائیکل کو ریس دے کر بھاگا۔

"ستیاناس ہو ان موٹر سائیکل والوں کا رہنے والو تے چڑھی اندے نے" (ستیاناس ہو ان موٹر سائیکل والوں کا اندھے بن کر اوپر چڑھے آتے ہیں) شاپنگ بیگ میں رکھے دو سو روپے کلو ٹماٹر کا حلوہ بن چکا تھا۔ سڑک پہ بکھری توریاں اکٹھی کرتے اس نے موٹر سائیکل والوں کی شان میں تھوڑی اور قصیدہ گوئی کی۔ شاپر پھٹنے سے دو کلو ہری توریاں مٹی مٹی ہوئی پڑی تھیں۔ سبزی کی ریڑھی سے ایک شاپر بیگ اٹھاتے اس نے عجیب سا منہ بنایا اور بھاگ کر توریاں اس میں بھرنے لگی۔ اس کی گالیاں اور کوسنے دیر تک اردگرد موجود لوگ سنتے رہے۔

"اللہ مارے دو سو روپے کی سبزی پہ چونی کا شاپر بھی رو رو کر دیتے ہیں۔ سامان بھی پورا نہیں آتا۔" چھوٹے سے لفافے میں سبزی ٹھونستے وہ کچھ اور سیخ پا ہوئی۔ جلی بھنی گھر کی طرف لوٹتی وہ اب اماں کی متوقع عزت افزائی کے متعلق سوچ رہی تھی جو گھر پہنچ کر اس کی شان میں ہونی متوقع تھی۔

☆ ☆ ☆

"اے کی کر آئیں اے مصیبتے۔" جمیلہ نے مسلے ہوئے ٹماٹر کا تھیلا دو انگلیوں سے اٹھاتے اس کے سامنے گھمایا۔ اس پل ان کی اپنی آنکھیں بھی پھٹی ہوئی تھیں۔ بخار کی وجہ سے اماں نے روزینہ کو سبزی لینے بھیج دیا تھا۔ ان کو تو اب تک یقین نہیں آرہا تھا وہ ان کے پیسے اس طرح برباد کر آئے گی۔

"میں گر گئی تھی۔ وہ موٹر سائیکل والا...." اماں نے لفافہ میز پہ پھینکتے گھور کر دیکھا تو وہ سہم گئی۔

"تا کب اور کہاں نہیں گرتی تو۔" کیونکہ گرنا تو جیسے اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ مری گئی تو مال روڈ کے بیچوں بیچ پاؤں مڑا اور وہ چاروں شانے چت گری پڑی تھی۔ اس وقت اماں نے ان اونچی کھڑاوں کو کوسنے دیے جو وہ اس پہاڑی علاقے کو لاہور کی ٹھنڈی سڑک سمجھ کر پہن آئی تھی۔ ابھی چند ماہ پہلے سیڑھیاں اترتے پاؤں مڑا اور وہ پورے وزن سے پہلی سیڑھی سے آخری پہ لینڈ ہوئی۔ پیر کی اندرونی جلد پھٹی' دو ہفتے پاؤں پہ گرم پانی کی ٹکور ہوئی' تین ہفتے بستر پہ آرام کیا۔ مشکلوں سے سوجن کم ہوئی۔ اور اب اتوار بازار سے نکلتے اس

رش والی جگہ پہ وہ خواہ مخواہ موٹر سائیکل والے کے سر چڑھ کر گری ہوئی تھی۔ اب تک اتنی بار گر چکی تھی کہ اماں کی نظروں سے بھی گر گئی تھی۔

روزینہ 'قیوم حسین اور جمیلہ کی تیسری اولاد تھی۔ فضیلہ اور شکیلہ کے بعد تیسرے سال ایک اور بیٹی کی پیدائش پہ اگلا "لہ" کیا ہوتا سمجھ ہی نہیں آیا تو بس جس کی سمجھ میں جو نام آیا رکھنے لگا۔ آخر قریمہ ساتھ والی پروین کے نام نکلا جس نے "نہ" لگا کر یہ سلسلہ ہی روک دیا۔ بیٹے نہ ہونے کا غم تو پہلے ہی جان کو آیا ہوا تھا اس پہ تیسری بیٹی کی پیدائش۔ ہر بخار' نزلہ' کھانسی' دانت کے درد تک پہ اس نے یہی سوچا شاید مر ہی جائے۔

"کیا تھا جو بیٹا ہو جاتا۔ تین جو نٹھیں میرے پلے پڑ گئیں۔" اماں کے سینے پہ اسے دیکھ دیکھ کر سانپ لوٹتے تھے۔ آخر قیوم حسین کی چھوٹی سی کریانے کی دکان سے ان تینوں بلاؤں کا جہیز کیوں کر بنتا۔

"پی ٹی وی پہ کپاس پہ امریکن سنڈی سے بچاؤ کے

بعد سب سے زیادہ جو اشتہار چلتا تھا وہ دو بچے خوشحال گھرانہ تھا۔ نہ لگاتیں شرطیں میں کون سا مری جا رہی تھی پیدا ہونے کو۔" وہ کون سی کم تھی۔ ٹکا کے جواب دیتی اماں کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔

"روزینہ میں جوتی لا لینی اے۔" وہ جل کے بولتیں۔

"آہو تے فیہاوی لینی اے۔" دوسری طرف ڈھٹائی کے تمام ریکارڈ توڑے جا چکے تھے۔

"ان دونوں کی مجال نہیں تھی کبھی میرے سامنے زبان چلانے کی' لیکن یہ میری تیسری اولاد تو میرے آکھے (کہنے) میں ہی نہیں۔" اماں نے پہلی دونوں بیٹیوں کو سولہویں سال میں پھڑکا میرا مطلب بیاہ دیا تھا بس ایک یہی تھی جو بائیس سال کی ہو کے بھی اماں کے کلیجے پہ مونگ دل رہی تھی۔ ایک تو بھاری بھرکم تن و توش اوپر سے دو چار گز بھر لمبی زبان.... اماں دل سے اس کے بیاہ کی آس نکال چکی تھیں۔

"رولو تم بھی تیسری اولاد کا رونا سکندر عثمان کی طرح۔ ایک وقت آتا ہے بس اس تیسری اولاد نے ہی تمہیں سنبھالنا ہے۔" واہ واہ واہ.... کیا شاندار ڈائلاگ مارا تھا وہ بھی موقع پہ (شکر چربی بس جسم پہ ہی چڑھی تھی عقل پہ نہیں)۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے خود کو داد دی تھی۔

"وہیں ہیں اب یہ نامہ نیم سکندر عثمان کون ہے منحوس مارا۔" اماں کے تو سر پہ سے ہی گزر گیا یہ بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔

"وہی تو ہے میرے سالار سکندر کا پیو (باپ)۔ کتنی باتیں سناتا تھا اس کو الو کا پٹھا' الو پٹھا کہہ کر۔ کیسا نام روشن کیا اس نے پیو کا۔" میٹرک تھرڈ ڈویژن میں کر کے ایف اے کی کتابیں سامنے دیکھ کر دل متلی سا ہوا تھا۔ اماں نے بھی زور زبردستی نہیں کی وہ خود اپنا نام لکھنے کے سوا لکھائی پڑھائی سے انجان تھیں۔ گھر بیٹھے ڈائجسٹ کا چسکا ایسا لگا کہ اب تو بس وہ تھی اور اس کی یہ خیالی دنیا۔ ڈائجسٹ کا چسکا دراصل پروین خالہ کی تھا۔ اسے تو گھر میں کوئی دوسری بار سالن بھی نہیں پوچھتا تھا۔ خالہ پروین کو شروع سے ہمدردی تھی اس سے'

نام بھی تو اسی نے رکھا تھا بس جب اماں کا میٹر گھومتا یہ عافیت کی تلاش میں وہیں لینڈ کرتی۔ ان ہی سے ڈائجسٹ کی لت لگی۔ عمیرہ احمد اس کی پسندیدہ رائٹر تھی محترمہ خود کو کسی امامہ ہاشم سے کم تو سمجھتی نہ تھی لہٰذا ذہن میں بھی بس سالار سکندر ہی رہتا تھا پر ہائے اب تو وہ بھی ساٹھ سال کا ہو گیا تھا۔ (استغفر اللہ)

"چلو خیر امامہ نہ سہی عکس سہی.... وہ بھی کون سا بری تھی۔ خوب صورت نہیں پر پڑھی لکھی تو تھی نا۔" آج کل وہ خود کو یہی سوچ کر تسلی دے رہی تھی۔

"کچھ زیادہ ہی پڑھی لکھی تھی خانہ خراب۔ خیر ہمیں کیا ہمیں تو بس ایک شیر دل سے مطلب ہے۔" اپنا میٹرک تھرڈ ڈویژن میں یاد آیا تو حلق تک کڑواہٹ اتر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اماں کو تو میری ہر بات گولی کی طرح لگتی ہے۔" اسے یقین تھا جمیلہ اس سے شدید نفرت کرتی ہیں اور تو کوئی سنتا نہیں تھا پر خالہ پروین کو تو کہہ سکتی تھی نا۔

"تیری شادی کی طرف سے پریشان ہے نمانی ورنہ شکیلہ اور فضیلہ کی طرح اسے تجھ سے بھی محبت ہے۔" خالہ نے ہمیشہ کی طرح سمجھایا گو قابل اعتبار بات نہ تھی پر چلو وہ کہہ رہی تھیں تو سننے میں کیا حرج تھا۔ کل والی واردات وہ خالہ کے گوش گزار کر چکی تھی اور ساتھ ہی اماں کی گل افشانیاں بھی۔

"اب اگر شادی نہیں ہو رہی تو میرا کیا قصور' کیا پتا شادی میرے نصیب میں ہو ہی نہیں۔" بچپن سے ایک بس یہی ٹھکانہ تھا جہاں جلے دل کے پھپھولے پھوڑتی تھی۔

"تو پھر کیا ساری زندگی اماں مجھ سے متریوں (سوتیلوں) والا سلوک کرے گی۔" وہ روہانسی ہوئی تھی۔ (کبھی کبھی ہو جاتی تھی جذباتی)

"نا پتر ایسے نہیں کہتے۔ اللہ نے سب کا جوڑ بنایا بس یہاں دنیا میں تھوڑا سا انتظار کرنا پڑتا ہے دونوں کو۔ تیرا شہزادہ بھی تیرا انتظار کر رہا ہوگا۔" خالہ نے

تسلی دی۔

"رہن (چھوڑ) دے خالہ مجھے جھوٹیاں تسلیاں نہ دے۔"

"لے تونے ناولوں میں نہیں پڑھا۔ ہیرو ہیروئن کس طرح حادثاتی طور پہ ملتے ہیں۔ لکھ کے رکھ لے میری بات ایک دن تیرا ہیرو بھی تجھے حادثاتی طور پر ملنا ہے۔" ڈائجسٹ پڑھ پڑھ خالہ خود بڑی اسٹوریاں بنالیتی تھیں۔ ہاتھ پہ ہاتھ مارتی ڈرامائی انداز میں بولیں تو روزینہ کا دھیان کل کے پھسلنے پہ جا اٹکا۔ اتنے سالوں سے جگہ جگہ گرنے کا "حادثہ در حادثہ" ہوئے جا رہا تھا ابھی اور کون سا مزید حادثہ ہونا باقی تھا۔ ہیرو کیا خاک ملنا وہاں تو اچھا بھلا تماشا لگ جاتا تھا۔ اس نے کلس کے سوچا۔

"اچھا میری بات سن۔" خالہ اس کے چہرے کے الجھے ہوئے تاثرات دیکھ کر سمجھ گئی تھیں وہ اس کی بات سے قائل نہیں ہوئی۔

"ہیروئن کے بغیر ناول ہوتا ہے کبھی؟" خالہ نے اب اس زبان میں بات شروع کی جو وہ سمجھتی تھی۔

"ہیروئن کے ساتھ ہیرو لازمی ہے کیونکہ کہانی آگے نہیں بڑھتی۔" خالہ کی بات دل کو لگی تھی۔ وہ خود ساری دوپہر ڈائجسٹ پڑھ کر گزارتی تھیں اور روزینہ نے یہ جوڑ توڑ کی ٹریننگ تو ان ہی سے لی تھی۔ وہ اب قدرے مطمئن تھی۔

☼ ☼ ☼

کچھ دیر کے لیے ہم اپنی کہانی کی ہیروئن کو خالہ پروین کے گھر ان کے حال پہ چھوڑ کر چلتے ہیں مرزا عبدالشکور عرف چھکن کے گھر۔ عبدالشکور اپنی لاڈلی امی کے لاڈلے اکلوتے بیٹے ہیں' عمر تیس کے لگ بھگ ہے۔ شجرہ نسب یہاں وہاں جانے کہاں کہاں سے ہو کر سیدھا مرزا اسد اللہ غالب تک جا نکلتا تھا۔ ویسے تھوڑا اور آگے جاتے تو کیا پتا نصیر الدین بابر تک پہنچ جاتا پر چونکہ پیشہ سپہ گری نہ تھا تو اس مشقت میں جانے کا سوچا ہی نہیں۔ آسان الفاظ میں یہ مغل بچے تھے "جو جس پہ مرتے ہیں اسے مار ہی دیتے ہیں" جیسی وصف سے محروم تھے۔ اپنی دھان پان سی شخصیت کی بدولت یہ سامنے والے کی توجہ جلد اپنی جانب مبذول کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔ شباہت بچوں کے فرضی اور مشہور کردار چچا چھکن سے ملتی تھی۔ شاید اسی لیے چھکن نام پڑ گیا جو ان کی منحنی شخصیت پہ بہت زیادہ سوٹ کرتا تھا۔

ہاں تو اب سوال یہ ہے کہ ہمارے چچا چھکن میرا مطلب مرزا عبدالشکور کرتے کیا تھا؟ تو جناب یہ آج کل بڑی شدت سے اپنی شادی کا انتظار کر رہے تھے۔ رنگ محل میں لیڈیز کپڑوں کی ایک بڑی سی دکان ان ہی کے دم سے چل رہی تھی جہاں ہر روز بنی سنوری پیسٹری نما شہزادیوں کو دیکھ کر ان کا دل بے قرار مچل مچل جاتا تھا۔ وہاں آنے والی ہر لڑکی' آنٹی حتیٰ کہ نانی دادی انہیں مدھوبالا یا مینا کماری سے کم نہیں لگتی تھی' لیکن حد ہے اس پریوں کے شہر میں ان کی والدہ محترمہ کو ایک لڑکی بھی اپنے اس لائق فائق برخودار کے لیے پسند نہیں آئی تھی۔

"ہمیں تو لگتا ہے امی حضور آپ ہماری شادی کروانا ہی نہیں چاہتی ہیں۔" چھکن میاں نے اپنا سارا زور اس ایک جملے کو کہنے میں لگا دیا تھا اور اب پھولی سانس کے ساتھ جواب کے منتظر تھے۔

"حیا آتی ہے؟" مہتاب بانو نے قسم کھائی تھی بیٹے کی شادی دیکھ پرکھ' ٹھوک بجا کر ہی کریں گی بھلے سو لڑکیاں کیوں نہ دیکھنی پڑیں اور اب ماشاء اللہ ننانویں دوشیزہ کو رد کر کے وہ اپنا موجودہ معرکہ بیٹے کے گوش گزار کر رہی تھیں۔

"ہم نے پوچھا حیا آتی ہے میاں عبدالشکور۔" اب کہ وہ ذرا کچھ اونچے لہجے میں بولیں۔

"آتی ہے پر قسم لے لیں جو ہم نے اسے کبھی آنکھ بھر کر بھی دیکھا ہو۔" انہوں نے نظریں چرائیں۔ امی جان کا پارہ یک دم اوپر گیا تھا۔

"ہم آپ سے شرم و حیا والی حیا کے متعلق پوچھ رہے ہیں اور آپ ہم سے کس قسم کی باتیں کر رہے

ہیں۔" امی حضور اس بار اونچی آواز میں بولیں تو وہ خوف کے مارے تخت سے گرتے گرتے بچے۔

"آپ کی خاطر' آپ کی اچھی زندگی اور بہتر مستقبل کی خاطر ہم ایک اچھی' سلجھی ہوئی اور خوب صورت دوشیزہ سے آپ کی نسبت طے کرنا چاہتے ہیں اور آپ ہمارے خلوص پہ شک کررہے ہیں۔ اپنی سوچ پہ آپ کو حیا نہیں آتی؟" امی حضور کی بات پہ وہ کچھ شرمندہ ہوئے۔ انہیں چھدن (اپنی دکان کے سیلز مین) پہ بھی غصہ تھا جس نے ان کی پیاری امی کے خلاف ان کے دل میں یہ زہر گھولا تھا۔

"ہم معذرت چاہتے ہیں امی حضور پر اب تو سنچری مکمل ہونے والی ہے اور آپ کا دعوا بھی تکمیل کے مرحلے میں پہنچ رہا ہے۔" انہیں یہ بھی خوف تھا سو کے بعد مہتاب بانو نئے سرے سے گنتی کا آغاز نہ کردیں اس لیے ڈرتے ڈرتے کہہ ہی ڈالا۔

"ہاں تو کیا یونہی کسی راہ چلتی کو لے آئیں بہو بنا کر؟" وہ کچھ شرمندہ ہوئے۔

"لگتا ہے اب آپ کو ہم پہ بھروسا نہیں رہا تو پھر ٹھیک ہے جو دل میں آئے کریں۔ جہاں چاہیں گے جس سے چاہیں گے ہم آپ کی شادی کرنے کو تیار ہیں۔ ہم آپ کی خاطر یہ زہر ہنس کر پی جائیں گے۔" مہتاب بانو کی جذباتی باتیں زہر ہلاہل ثابت ہونے ہی والی تھیں کہ اچانک وہ ہوش میں آئے۔ ایسا موقع یقیناً تیس سال بعد دوبارہ ملتا جب زحل ان کے زائچہ کے بارہویں حصے میں ایک بار پھر داخل ہوتا۔ (اب عبدالشکور کی شادی خانہ بربادی کسی ساڑھ ستی سے کم تھوڑے ہی تھی)۔

"ٹھیک ہے امی حضور' آپ کے حکم پہ ہم نے پہلے بھی کہاں پر مارا ہے جو اب آپ کی حکم عدولی کریں گے۔" (کل صبح دکان میں داخل ہونے والی پہلی دوشیزہ کو وہ اپنا آپ سونپ دیں گے) مہتاب بانو اس تابعداری پہ کھولتے تیل کی کڑاہی میں کود جانا چاہتی تھیں۔

"ہونہہ..." غصے میں ہنکارا بھرتیں وہ باورچی خانے میں گھس گئیں جب کہ میاں عبدالشکور عرف چھکن اپنا اگلا لائحہ عمل مرتب کرنے لگے۔

☼ ☼ ☼

کل رات یوں ہی عادتاً" شکوے شکایات کرتے جمیلہ نے شکیلہ اور فضیلہ کی عیدی کا ذکر قیوم حسین سے چھیڑا تھا اور حسب معمول طعنوں تشنوں اور تیس سالہ تنگ دستی کے ساتھ ایک اندوہناک زندگی کا نقشہ کھینچتے وہ قیوم حسین سے پانچ ہزار نکلوا چکی تھیں اور یہ خبر روزینہ کے تیز کانوں سے تو کنی کترا کر گزر نہیں سکتی تھی۔ بہنوں کے گھر عید بھیجنے میں اسے سرے سے کوئی دلچسپی نہ تھی ہاں اس کا اپنا عید کا جوڑا اہم تھا للذا صبح سے وہ جمیلہ کی جان کھا گئی تھی۔

"نینو میرا سر نہ کھا۔ عید میں ابھی پورے ستائس روزے باقی ہیں۔ کدرے نسیا نہیں جارہیا تیرا جوڑا۔" (کہیں بھاگا نہیں جارہا تیرا سوٹ)۔ تینوں بیٹیوں کو نام کے بجائے پیار کے ناموں سے بلایا جاتا تھا۔ محبت ہوتا ہو نام بگاڑنے کا شوق اپنی جگہ تھا۔ فضیلہ کو بے بی' شکیلہ کو کلو اور روزینہ کو نینو۔ ان دونوں کی نسبت وہ اپنے نام پہ شدید چڑتی تھی اور اماں سے برملا اس کا اظہار کرتی تھی پر وہ بھی اماں تھیں۔ کان پہ رینگتی جوں کو دو انگوٹھوں میں رکھ کر پٹاک سے مار دیتی تھیں پھر یہ روزینہ کیا چیز تھی۔

"جوڑا نہیں ورزی نسیا جاندا اے۔ اور آگے آگے اس نے ہماری دوڑیں لگوانی ہیں۔" بہرحال اسے ٹالنا جمیلہ کے بس سے باہر تھا اور وہ یہ بات بخوبی جانتی تھیں پھر بھی بحث چل رہی تھی۔

"ایک تو مجھے اس کڑی کی سمجھ نہیں آتی۔ چار روزے نہیں لگنے اپنے کپڑیاں دا رولا پا دیتا۔" کیا کمال کل یہی لاجک جب میاں نے دی تھی تو جمیلہ بیگم نے کیا ہی واویلا مچایا تھا اور اب روزینہ کی اسی بات پہ وہ سیخ پا ہو رہی تھیں۔ خیر یہ بحث مباحثہ اپنی جگہ پر جیت اسی کی ہوتی تھی۔ عید کی خریداری تو بہرحال اماں کو کرنی ہی تھی آج نہیں تو دو دن بعد' لیکن اب سوچنے والی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

بات یہ تھی کہ خریداری کی کہاں سے جائے اور یہ سوچ جمیلہ کی نہیں بلکہ ان کی صاحبزادی میڈم روزینہ کی تھی۔

"چھوٹی دکانوں پہ تو پرنٹ بھی کسی کام کے نہیں ہوتے۔" مسئلہ پرنٹ کا نہیں اس یکسانیت کا تھا جس سے ہر بار سامنا ہوتا تھا۔ آس پڑوس کی تمام خواتین اسی ایک دکان سے شاپنگ کرتی تھیں اور نتیجہ عید کے جوڑے کی بجائے یونیفارم ہوتا تھا۔ روزینہ کو اس بار یونیفارم نہیں پہننا تھا جس کی قیمت اور برانڈ کے متعلق وہ کوئی ڈینگ بھی نہ مار سکے۔ اب اماں کو کیسے راضی کیا اس کے لیے ہزار داستان الگ لکھنا ہوگی' لیکن نتیجہ یہ نکلا وہ بتی جھکتی روزینہ کی بات مان کر رنگ محل جانے کو تیار ہوگئی تھیں۔ چونکہ **فضیلہ** کا گھر وہیں تھا اسی لیے اس کو بھی ساتھ لے لیا گیا۔

☆ ☆ ☆

اللہ نظر بد سے بچائے ماشاء اللہ سستی اور کاہلی تو چھکن میاں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ عام دنوں میں بھی دکان پہ بیٹھنا جوکھم کا کام تھا پر اب تو رمضان کا بابرکت مہینہ شروع ہوچکا تھا اور چھکن میاں ٹھہرے' روزے دار لہٰذا دکان پہ آمد ظہر کے بعد ہی ہوتی تھی۔ البتہ سیلز مین لڑکا وقت پہ دکان کھول لیتا تھا۔ گرمی اور روزے کی وجہ سے دکان پہ معمول کا رش نہیں ہوتا تھا۔ خواتین اکثر سبزی خریدنے گھر سے نکلتیں اور کپڑوں کی دکان پہ دو چار دس تھان۔۔۔ کھلوا کر بھاؤ تاؤ کرتیں پھر کچھ پسند نہ آنے پہ وہی لیتیں گھر چلی جاتیں۔ چھکن میاں منہ زور میمنے کی طرح ٹوپی درست کرتے دکان میں داخل ہورہے تھے۔ سامنے سے ہماری روزینہ باجی بھی رسی چھڑائے بیل کی طرح جذباتی ہوتیں دکان میں ان سے پہلے داخل ہونے کی خواہش مند تھیں۔

"ہائے میرے اللہ۔۔۔" ان دونوں کی پہلی ملاقات بالکل ویسی ہی تھی جس طرح دو پہیوں والی سائیکل اور ٹرک کی ہوتی ہے نیز اس تصادم کے جملہ نتائج بھی لگ بھگ اسی سے ملتے جلتے تھے۔ اچانک یوں لگا پہاڑ عبدالشکور کے ناتواں وجود پہ پٹخ دیا گیا ہو۔ روزینہ کی چیخ و پکار پہ حواس باختہ وہ اس قبل از وقت قیامت کو سمجھنے کی کوشش کررہے تھے کہ پیچھے کھڑی اماں نے پوری طاقت سے اس آٹے کی بوری کو اٹھایا۔

"قلے منہ تیرا نیو' کوئی جگہ چھوڑ دی دے۔" سینے پہ دھرا وزن کچھ کم ہوا تو عبدالشکور نے چندھیا ہوئی آنکھوں اور گھومے ہوئے سر کے ساتھ گردو نواح کا جائزہ لیا۔

"اوئے تو۔۔۔ تیری تو۔" وہ بمشکل کھڑے ہوئے پر اپنے سامنے کھڑی شرمین ٹینک کو دیکھ کر سٹی گم ہوگئی۔ انہوں نے نظریں چرائیں پر اس چند فٹ کی دکان میں راہ فرار مشکل ہی نہیں ناممکن تھی۔ اب ان بے چاروں کے پیچھے کون سا گیارہ ملکوں کی پولیس لگی تھی جو وہ چور راستے بنا کر رکھتے۔

"اماں یہ وہی ہے جس نے میرے ٹماٹروں کا ملیدہ بنایا تھا۔" وہ تو مرکر بھی اس جھانسی کی رانی کو فراموش نہیں کرسکتے تھے جس سے دو روز قبل ان کا سامنا اتوار بازار کے باہر ہوا تھا اور کیا خوب ہوا تھا۔ روزینہ کی شعلہ بیانی یاد کرکے تو انہیں گرم دوپہر میں ٹھنڈے پسینے آگئے تھے۔

"محترمہ آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے ہم بے قصور تھے وہ تو آپ ہی ہماری سواری کے سامنے چلی آئیں۔" وہ منمنائے۔

"بکواس بند کر۔" اماں یک دم درمیان میں آئیں۔ **فضیلہ** نے آنکھیں دکھائیں تو روزینہ کی شعلے اگلتی زبان کو بریک لگا تھا۔ عبدالشکور نے کلمہ شکر کہتے اپنے اعصاب بحال کیے اور پھر خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے انہیں خوش آمدید کہا۔ **فضیلہ** ان کی پرانی کسٹمر تھی لہٰذا اب ماحول پرسکون تھا۔ سیلز مین انہیں مختلف تھان نکال نکال کر دکھا رہا تھا جب کہ وہ خود گلے پہ بیٹھے کن انکھیوں سے اس ہوکن کے زنانہ ورژن کو دیکھتے اپنے کل حالت روزہ میں کیے عہد واثق پہ نظر ثانی فرما رہے تھے۔ روزینہ ان کے اندر ہوتی کھدبد سے انجان

لان کے سوٹ دیکھ رہی تھی۔ اس پل اس کے چہرے پہ بھی سامنے کھلے کپڑوں کے تمام رنگ باآسانی نظر آرہے تھے۔ اگر اس کے موٹاپے کو نظرانداز کردیا جاتا تو بہرحال وہ ایک خوش شکل لڑکی تھی۔ کچھ ناولوں اور رسالوں کی ہیروئینوں سے متاثر ہوکر اس نے اپنے چہرے پہ لیپا پوتی نہیں کررکھی تھی۔ بس کاجل اور نیچرل شیڈ کی لپ اسٹک لگائے وہ نکھری نکھری لگ رہی تھی اور اپنے عبدالشکور عرف چھکن میاں تو منہ پہ میدہ ملی پیسٹری نما رنگین لڑکیوں کو بھی دیکھ کر باغ و بہار ہوجاتے تھے یہاں تو سامنے پری گلبہار بیٹھی تھی۔ اب وہ اسے عطائے ربی نہ سمجھتے تو پھر اور کیا کہتے۔ مغرب سے پہلے دکان سے نکلتے وقت تک دوبارہ ایک بھی لڑکی نہیں آئی تو روزینہ کی خونخوار اینٹری کے باوجود ان کے دل میں نرم گوشہ جگہ بنا گیا تھا۔

فضیلہ کے میاں رشک قمران کے پرانے جاننے والے تھے اور ادھار لین دین کی بدولت ان سے اچھی خاصی واقفیت تھی۔ دکان سے نکل کر وہ گولی کی طرح سیدھے رشک قمر کے دروازے پہ جا پہنچے۔ ان کی نیلا گنبد میں سائیکلوں کی دکان تھی اور جانتے تھے وہ اب تک گھر پہنچ چکے ہوں گے۔ رشک قمرانہیں دروازے میں کھڑے دیکھ کر ہراساں ہوئے انہیں لگا ضرور آج **فضیلہ** ان کی محنت کی کمائی اجاڑ آئی ہے پر جب مرزا عبدالشکور نے اپنی داستان غم سنائی تو دل سے ماؤنٹ ایورسٹ جیسا بوجھ اتر گیا۔ گھر پہنچنے تک وہ دل ہی دل میں سارے جوڑ توڑ مکمل کرچکے تھے۔ امی حضور کی ناوے **ریجیکٹڈ** لڑکیاں اور وہ اوپن آفر جسے انہوں نے فی الفور قبول کرلیا تھا۔ بہرحال کچھ سہارا سا تھا دل کو، لیکن اب مہتاب بانو کے سامنے یہ بات کہنا مانو شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔ بظاہر سب کچھ سہل تھا، لیکن جیسے جیسے سوچتے تھے مہتاب بانو کے غصے کے خیال سے حالت غیر ہوجاتی تھی۔

"کیا ہوا امی حضور آپ نے کھانا نہیں کھایا۔"

مہتاب بانو کا موڈ نارمل تھا، لیکن شاید بیسن کے پکوڑوں کا زیادہ استعمال ان کے نازک معدے پہ گراں گزر رہا تھا۔ اسی لیے رات کا کھانا کھائے بغیر وہ بستر پہ دراز ہوگئیں۔

"پیٹ میں درد ہورہا تھا ہمارے۔" وہ چادر سے منہ نکالے بولیں۔ چھکن میاں تو کچھ اور بات کے موڈ میں تھے، لیکن امی حضور کا مزاج اس پل اجازت نہیں دیتا تھا۔

"ہم دبادیں؟" انہوں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"پیٹ؟" وہ ناقابل یقین حیرت سے بولیں۔

"جب آپ کے سرپاؤں میں درد ہوتا تو آپ ہمیشہ ہم سے دبوا کر سکون محسوس کرتی ہیں امی حضور، ہم نے سوچا۔۔۔" وہ لب دبائے ان کے پیروں کی طرف بیٹھ گئے۔

"ارے میاں تو کل کو ہمارے گلے میں درد ہوا تو کیا گردن دبادو گے۔" مہتاب بانو پیٹ کا درد بھول اس سر درد سے نبرد آزما تھیں جنہیں عقل سلیم چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ عبدالشکور بس اپنا سا منہ لے کر رہ گئے، شادی کی بات کا سنہری موقع بہرحال یہ نہیں تھا کیونکہ امی حضور کے پیٹ کی طرح ان کا موڈ بھی شدید خراب ہوگیا تھا۔ چاروناچار انہوں نے بھی کمرے کا رخ کیا یہ اور بات تمام رات روزینہ کی آنکھوں میں پھوٹتے انار اور اس کے گالوں سے جھلکتے قوس و قزح کے رنگ انہیں بے قرار کرتے رہے۔ بہرحال وہ ایسے صابر بھی نہ تھے جواب دل کی بات دل میں چھپائے عمر گزار دیتے۔ سحری کے وقت بلاتمہید والدہ محترمہ کا موڈ دیکھے بغیر وہ اپنا عندیہ انہیں سنا چکے تھے۔

"کل تک جنہیں منہ دھونا نہیں آتا تھا آج اپنے لیے لڑکی پسند کرچکے ہیں۔" ماہتاب بانو چیخ کر بولیں۔ وہ دم سادھے بیٹھے رہے۔

"واہ میاں ایک دن میں کیا معرکہ مارا ہے۔" دہی کا پیالہ منہ سے لگائے انہوں نے والدہ محترمہ کی طرف دیکھنے سے برملا اجتناب کیا جانتے تھے اس وقت وہ شعلہ برق بنی ہوں گی۔ وہ اور بھی بہت کچھ بڑبڑاتی رہیں، لیکن عبدالشکور سنی ان سنی کرکے فجر سے پہلے

مسجد کی طرف نکل لیے۔

☆ ☆ ☆

نہایت خراب موڈ کے باوجود بھی وہ اگلے دن بیٹے کی خواہش کے آگے ہتھیار ڈال کر روزینہ کے گھر چلی گئی تھیں۔ جمیلہ اور قیوم پر شادی مرگ سی کیفیت طاری تھی اور کچھ یہی حال روزینہ کا تھا لیکن مہتاب بانو اکھڑی اکھڑی تھیں۔

"تو آپ چاہتے ہیں ہم اس موٹی بھینس سے آپ کا بیاہ رچا دیں۔ اتنی سنگل پسلی دیکھی ہے رات کو کروٹ بدلتے غلطی سے آپ نیچے آگئے تو اگلے دن چنوں پہ قل پڑھے جائیں گے آپ کے۔" گھر پہنچ کر اپنا غصہ انہوں نے حسب توقع اپنی لاڈلی اولاد پہ نکالا تھا۔ ماہتاب بانو نے کیا ہی دل دہلا دینے والا خاکہ کھینچا تھا' ایک پل تو کلیجہ اچھل کر حلق میں اٹک گیا' لیکن پھر وہی ننانوے کا ہندسہ ذہن کی دیواروں سے ٹکرایا۔

"امی حضور' ہمیں اچھی طرح یاد ہے لڑکی نمبر انیس اور لڑکی نمبر سینتالیس کو آپ نے اس لیے **ریجیکٹ** کر دیا تھا کہ ان کا وزن مطلوبہ حذف سے کم تھا اور آپ کو خطرہ تھا یا تو وہ ٹی بی کی مریضہ ہیں یا جلد ہو جائیں گی جب کہ چند ماہ بعد ان دونوں کی شادیاں خانہ آبادیاں طے پا گئیں اور اب تو بارہ من کی دھوبن بنی چار چار بچے اٹھائے بازاروں میں مٹر گشتیاں کرتی دکھائی دیتی ہیں۔" میاں چھکن نے احتجاج کیا۔

"تو بھلا ہی ہوا آپ کا' بروقت بچا لیا ہم نے آپ کو ورنہ وہ بارہ بارہ من کی دھوبنیں آج آپ کے پہلو میں کھڑی ہوتیں اور یہ تو ابھی سے نو من ہیں شادی کے بعد دو بچے ہوئے تو نو سو من ہو جائیں گی۔" ماہتاب بانو بھی چکنا گھڑا تھیں ان کے پاس گھڑی گھڑائی توجیہات کا ڈھیر ہوتا تھا جس سے وہ انہیں سالہا سال سے ٹرخا رہی تھیں۔

"روزینہ موٹی نہیں بس کچھ بھرے بھرے وجود کی ہیں اور پھر آپ سمجھتی کیوں نہیں' ہم انہیں اپنے شریک حیات کے طور پہ منتخب کر چکے ہیں۔" وہ شرماتے ہوئے بولے' یہاں وہاں نگاہ دوڑائی پر لال رومال نہ ملا تو ماہتاب بانو کا لال دوپٹا منہ پر رکھ لیا۔

"ارے واہ۔ چہ پدی چہ پدی کا شوربہ۔" مہتاب بانو نے دوپٹا کھینچا اور طنز سے بولیں۔

"ہمارے جیتے جی آپ کسی راہ چلتی کو گھر لا کر تو دکھائیں' لاتیں توڑ کر ہاتھ میں پکڑا دیں گے آپ کی بھی اور اس موٹی بھینس کی بھی۔ پھر گھومنا تمام عمر بنا ٹانگوں کے۔" ماہتاب بانو کی جارحانہ باتوں سے خوف زدہ وہ کچھ بوکھلائے پر یہ موقع ہار ماننے کا نہیں تھا۔ ایک بار یہ بازی ہاتھ سے نکل جاتی تو دوبارہ کبھی انہیں کھیلنا نصیب نہ ہوتا۔ ماہتاب بانو کی سنچری مکمل ہو جاتی اور چھکن میاں کہ تا عمر کنوارپن پہ مہر ثبت ہو جاتی۔

"ٹھیک ہے امی حضور' اگر آپ کے نزدیک ہماری دلی خواہش بس یہی معنی رکھتی ہے تو پھر ہم بھی اب اس گھر میں نہیں رہیں گے۔ یہ دنیا یہ محفل اب ہمارے کام کی نہیں ہم بھی اپنا بسیرا جنگلوں میں کر لیں گے۔ یہاں تنہا رہنے سے اچھا وہاں تنہا رہ لیں پھر دیکھیں گے آپ کس کی ٹانگیں توڑیں گی۔" عبدالشکور کا علم بغاوت ماہتاب بانو کی انا کو روندتا سرکشی پہ آمادہ تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب انہوں نے پسپائی اختیار کی کیونکہ بیٹے کو اپنے سامنے بضد دیکھ کر ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

"ٹھیک ہے عبدالشکور' ہم آپ کی خوشی کی خاطر یہ زہر کا پیالا پینے کو تیار ہیں' لیکن آپ کو بھی ہماری ایک شرط ماننا ہوگی۔" وہ ایک دم قدموں میں آ بیٹھے۔

"امی حضور' ہم آپ کی ہر شرط ماننے کے لیے تیار ہیں بس آپ ۔۔۔ینہ جی سے ہمارا عقد کروا دیں۔" اس چاپلوسانہ انداز نے ماہتاب بانو کے سنجیدہ چہرے پہ مزید تلخی نمایاں کی۔

"ہم اپنی شرط منگنی کی رسم ادا کرتے وقت بتائیں گے۔" ان کا انداز دو ٹوک تھا۔ منہ پھیرے اب وہ انہیں یکسر نظر انداز کر رہی تھیں۔ عبدالشکور جانتے تھے یہ گویا اوور اینڈ آؤٹ کا اعلان ہے۔

☼ ☼ ☼

جان پہچان' واقفیت آشنائی سب کچھ تو تھا لہٰذا دونوں طرف سے فی الفور رشتہ پکا ہوا اور چٹ منگنی ہوگئی البتہ پٹ بیاہ کو ابھی موخر کردیا گیا جس کی وجہ بھی ماہتاب بانو نے منگنی والے دن ہی بتادی۔

"شادی کی تاریخ اس وقت طے ہوگی جب مسماۃ روزینہ اپنا وزن کم سے کم دس کلو کم کریں گی۔" منگنی کی انگوٹھی پہنانے کے بعد مہتاب بانو نے اعلان کیا تھا۔

"نہ یہ کیسی شرط ہے کیا آپ کا بھی ڈراموں کی طرح کوئی خاندانی شادی کا جوڑا نسل در نسل چل رہا ہے جس کے شرارے میں روزینہ کو فٹ ہونا پڑے گا۔ ویسے پیسے بچانے کا اچھا رواج ہے یہ بھی۔" بلا تمہید پھوڑے گئے اس بم کے مابعد الاثرات وہاں موجود سب کی شکلوں پہ نظر آرہے تھے پھر بھی ہمت کرکے فضیلہ بول ہی پڑی۔ آخر کو رشتہ ان ہی کے توسط سے ہورہا تھا۔

"بے بی بہن برا مت منائیں' امی حضور بس صحت کے معاملے میں بہت احتیاط پسند ہیں۔ وہ نہیں چاہتیں ان کی ہونے والی بہو ضرورت سے زیادہ صحت مند ہو۔" میاں چھکن نے اپنے تئیں صفائی دی۔ وہ فضیلہ کے لہجے سے گھبرا گئے تھے۔

"وہ تو آپ کی صحت دیکھ کر اندازہ ہورہا ہے مجھے۔ ایک بات تو بتائیں آپ کو حفاظتی ٹیکوں کا کورس کرایا تھا۔ بچپن میں آپ کی امی حضور نے؟" فضیلہ کا جملہ تیر بہ ہدف تھا۔ عبدالشکور تلملا سے گئے تھے اس ذاتیات پہ ایسے میں منگنی کی رسم کا ماحول خراب نہ ہو اماں نے مداخلت ضروری سمجھی۔

"ویسے ہماری روزینہ موٹی تو نہیں۔ کھاتے پیتے گھر کی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔" آخری جملہ زیر لب بولتے اس آٹے کی پوری کو دیکھا جو سرخ جوڑے میں پھنسی بیٹھی ناقابل یقین حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ہم اپنی بات کہہ چکے۔ اب آپ اسے ہماری شرط سمجھیں یا درخواست' لیکن وزن تو انہیں کم کرنا ہی ہوگا۔ شادی اسی وقت ہوگی۔ اجازت دیں ہم چلتے ہیں۔" اس ساری گفتگو کا نتیجہ صفر تھا۔ مہتاب بانو کا انداز دوٹوک تھا۔ خوشی کے موقع پہ ان کی بات نے روزینہ کی منگنی کے رنگوں کو پھیکا کردیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلا دن بھی عام دنوں جیسا تھا کیونکہ روزینہ کی انگلی میں سجی منگنی کی انگوٹھی بھی دل کی کلی نہ کھلا پائی تھی۔ منہ اترا ہوا تھا جو یقیناً" کل رات ماہتاب بانو کی شرط کے باعث تھی۔ صرف وہی نہیں جمیلہ بھی اچھی خاصی پریشان تھیں کیونکہ اپنی تیسری اولاد سے تو انہیں کوئی امید نہیں تھی جو بکری کی طرح کھا کر بیل بنتی جارہی تھی۔ غم غلط کرنے وہ خالہ پروین کے گھر چلی آئی تھی جہاں اماں پہلے سے موجود تھیں۔ یقیناً" وہ بھی کچھ صلاح مشورے کی غرض سے ہی آئی تھیں اور مزے کی بات خالہ کے پاس اس کے مسئلے کا حل پہلے سے موجود تھا۔

"یہ دیکھ ڈیٹنگ چارٹ" (ڈائیٹنگ چارٹ)۔ کل رات وہ بھی تو منگنی میں موجود تھیں اور ان سب سے پہلے انہوں نے پریشانی کا حل نکال لیا تھا۔ محلے میں کھلے بیوٹی پارلر میں لیڈیز جم کی سہولت موجود تھی۔ صبح سویرے خالہ ان ہی سے یہ مسئلہ ڈسکس کر آئی تھیں اور اب ہاتھ میں تھا ایک عدد پرچا اس کی جانب لہراتے وہ فخریہ انداز میں بولیں۔

"خالہ میرے سے نہیں ہونا فاقہ۔" اس چارٹ پہ لکھی خوراک اور نظم وضبط کو پڑھتے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ اس نے گھبرا کر پرچا چارپائی پہ پھینک دیا۔

"بات سن میری۔ ویاہ کرانا اے کے نہیں۔" خالہ نے شانہ پکڑ کچھ درشتی سے ہلایا۔ جواب میں بس اس نے سر ہلایا۔ انداز بے بسی والا تھا۔ خالہ کو ہر بار کی طرح اس پہ ترس آیا۔

"تو کوئی عام لڑکی نہیں ہے نینو۔۔۔ تو ہیروئن ہے ہیروئن اور ہیروئن کیا کچھ نہیں کرتی۔ اسلام آباد کے منڈے سے گھر بیٹھے نکاح کر کے لاہور پہنچ جاتی۔ ٹکٹ کٹاتی ہیرو کو لینے ترکی نکل جاتی اور تو اور کورٹ میں کیس لڑ کے بندہ بچا کے گھر میں کدو گوشت تک پکالیتی نہ تو ایک ڈائٹنگ نہیں کر سکتی اپنی شادی کرانے کے واسطے؟" خالہ نے اس کی حوصلہ افزائی کے لیے پرانا حربہ چنا۔ وہ اس زبان میں جلد سمجھ جاتی تھی۔ یہ سب سنتے اس کی گردن تنتے جارہی تھی اس سے پہلے کہ زرافے جتنی ہو جاتی وہ اچانک ہوش میں آئی۔

"خالہ شادی نا ہوگئی عذاب ہوگیا۔ جب نہیں ہو رہی تھی تو سیاپا تھا اب جو ہو رہی ہے تو مصیبت۔ پائے میں کتھے سنجی ڈاواں۔" وہ ہتھے سے اکھڑ گئی تھی۔

مجھ سے نہیں ہونی یہ ڈیٹنگ شیٹنگ۔ تجھے تو پتا ہے نا میں جب تک صبح گھر کے بنے دیسی گھی کا تڑکا پراٹھا دو انڈوں کے ساتھ نہ کھالوں مجھے آنکھوں کے آگے ہنیوا (اندھیرا) ہی لگتا ہے اور رمضان میں مرچوں اور بینگن کے پکوڑوں سے تو مجھے خاص محبت ہے۔ دو ہی تو شوق ہیں میرے اچھا کھانا اور بہت کھانا۔" وہ چٹخارے لیتی بولی تو خالہ نے ماتھے پہ ہاتھ مارا۔ پاس بیٹھی اماں کا غصہ سوا نیزے پہ پہنچ گیا۔

"اے سنی ایدیاں گلاں۔۔۔۔ دو دن بعد گھر آجانا اس نے اور چار بندوں میں منہ دکھانے جوگا نہیں چھوڑنا ہمیں۔ لوگوں نے باتیں کر کر مار دینا ہے۔" انہوں نے جتاتے ہوئے خالہ پروین کو مخاطب کیا جو انہیں ٹھنڈا رہنے کے اشارے کر رہی تھیں۔

"ایک تو یہ چار بندے مل جائیں مجھے کہیں جو ہر وقت کچھ نہ کچھ کہتے ہی رہتے ہیں میں قسمے ٹینٹوا دبا دینا ان کا۔" روزینہ پہلے ہی جلی بھنی ہوئی تھی چڑ کر بولی۔

"نہ میری دھی بری بات' اچھی لڑکیاں ایسے نہیں بولتیں۔" خالہ نے بیٹھ تھپکتے پچکارا۔

"خالہ میں ان اچھی لڑکیوں سے سخت عاجز ہوں۔ اچھی لڑکیاں منہ نہیں دھوتیں' اچھی لڑکیاں تیل نہیں لگاتیں' اچھی لڑکیاں سانس نہیں لیتیں بس اچھی لڑکیاں مرجاتی ہیں۔" وہ آج کچھ اور ہی موڈ میں تھی۔

"تو تو نہیں کرے گی ڈیٹنگ فیر؟" اس باغیانہ انداز پہ اماں نے پاؤں سے جوتی اتاری۔

"اماں میں۔۔۔" وہ اٹکی۔

"ایک بات ابھی بتادے' ڈیٹنگ کرنی ہے یا پھر میں انگوٹھی مرزا کے گھر واپس بھجوادوں۔" اماں نے فیصلہ کن انداز میں پوچھا۔

"اماں اب ایسی باتیں تو نہ کر۔" وہ روہانسی ہوئی۔

"میں کرلوں گی ڈیٹنگ۔" اور کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا۔

"صرف ڈیٹنگ نہیں کرنی وہ جو سامنے سکینہ کا بیوٹی پارلر ہے نا وہاں اس نے وہ کیا کہتے جم ہاں وہ ہی جہاں مشینوں پہ دوڑ لگاتی ہیں کڑیاں۔۔۔ ہزار روپے میں بات مکا آئی ہوں میں۔" خالہ نے ایک اور بم پھوڑا۔

"یعنی میں روزے کی حالت میں پھیکی چائے اور دو پاپے کھا کر اس سکینہ کی مشینوں پہ دوڑ لگاؤں؟" اس کی تو جان نکل گئی تھی۔

"روزے میں نہیں پاگل روزے کے بعد شام کو جانا وہاں۔" اس کی پریشانی کم ہونے کے بجائے مزید بڑھی تھی۔

"بغیر تڑکے کی دال اور ایک پھلکا کھا کر تو میں ٹارزن بن جاؤں گی۔" ابھی تو روزہ رکھنے کا سوچ کر ہی دل دہل رہا تھا اس پہ ڈائٹنگ کے نام پہ یہ ظلم وہ بری طرح پھنس گئی تھی' لیکن پسپائی اختیار کر چکی تھی۔

اب اللہ جانے روزینہ اپنا وزن کم کر پائے گی یا نہیں یہ سوچ کل رات سے مرزا عبدالشکور کو دہلا رہی تھی۔ انہیں کیا خبر تھی امی حضور ان کی ضد پہ یہ انتقامی کارروائی کریں گی۔ منگنی کی خوشی اپنی جگہ پر خوف کا ناگ پھن اٹھائے انہیں ڈرا رہا تھا کہ یہ بیل منڈھے نہ چڑھ پائے گی۔ ڈرتے ڈرتے انہوں نے اماں سے شکوہ

کرہی ڈالا۔

"امی جان آپ کو نہیں لگتا آپ نے ایک معصوم دوشیزہ پہ ان کی برداشت سے زیادہ بوجھ لاد دیا ہے۔" وہ کل رات سے خاموش تھیں جس کا مطلب یہ تھا وہ اپنی ناراضی ان سے ظاہر کررہی تھیں۔ ایسے میں بیٹے کا شکوہ انہیں مزید غصہ دلا گیا تھا۔

"وہ بوجھ تمام عمر کے لیے آپ کے ناتواں کندھوں پہ نا آپڑے۔ بس یہی سوچا ہے اور وہ دوشیزہ ہیں بلکہ دس بیس شیزہ ہیں اتنا دل ہولانے کی ضرورت نہیں آپ ان کی چاہت میں یوں کٹی پتنگ بنے ہیں تو کیا وہ گھر بسانے کو اتنا جو ہم بھی نہیں کرسکتی ہیں۔" مہتاب بانو تنک کر بولیں اور ہمیشہ کے ڈرپوک مرزا عبدالشکور عرف میاں چھکن اپنا سامنہ لیے ٹوپی سنبھالتے دکان کی طرف نکل پڑے۔

☼ ☼ ☼

بے بی 'کلو' خالہ پروین کی مورل سپورٹ اور سب سے بڑھ کر اماں کی جوتیوں نے روزینہ سے پہلی بار وہ کروایا جو شاید وہ مرتے دم تک نہ کرتی۔ یعنی منہ پہ کنٹرول۔۔۔ ادھر وہ کھانے کو ہاتھ لگاتی ادھر سے اماں کی فلائی چپل ڈرون میزائل کی طرح اڑتی ہوئی وار کرتی۔ روزے بھی جبرا" رکھوائے جارہے تھے ورنہ وہ روزہ خور تو پورا مہینہ کان لپیٹے گزار دیتی۔ ادھر افطار کے بعد وہ لمبی تان کر سونے کا پروگرام بناتی اماں کان پکڑ کر جم لے جاتی۔ ایک گھنٹہ روزانہ ورزش اور اس قلیل خوراک نے سچ میں اپنا کام کر دکھایا۔۔۔ آپ کیا سمجھے وزن کم۔۔۔۔

ہرگز نہیں جناب وزن تو کچھ لے دے کر ہی جاتا ہار! البتہ اس میں صبر آگیا۔ جیسے جیسے رمضان کا مہینہ اختتام پذیر تھا روزینہ اس لائف اسٹائل کی عادی ہوتی جارہی تھی۔ دو ہفتہ کی مشقت کے بعد جب مشین کی سوئیاں گھٹنے لگیں تو اس کا حوصلہ بڑھا۔ زور زبردستی شروع ہونے والا یہ سلسلہ اب اسے اچھا لگنے لگا تھا۔ بے دلی سے کی سعی میں اب جنون شامل ہو رہا تھا اور وہ جم کے علاوہ اب گھر میں بھی ورزش کرتی تھی۔ چربی گھلنے لگی تو سستی نے بھی خیرباد کہا۔ پہلے جو کام سو جوتے کھا کر کرتی اب بھاگ بھاگ کر کرنے لگی۔ جمیلہ کی دعائیں رنگ لائیں یا شاید یہ معجزہ ہی تھا کہ تین ہفتوں میں اس سست' **نکمی** اور کام چور روزینہ سے جان چھوٹ گئی تھی۔ پتلی تو خیر کیا ہوتی کہ یہ ایک لمبا عمل تھا' لیکن وزن نے امید کا دیا روشن کردیا تھا۔

"اے نینو جلدی تیار ہو جا تیرے سسرال والے پہنچنے والے ہوں گے۔" چاند رات کو گھر میں دعوت کا اہتمام تھا۔ ماہتاب بانو' روزینہ کی عیدی لے کر آنے والی تھیں۔ تین دن پہلے جمیلہ بھی داماد کو عیدی دے آئی تھی۔ اماں کی ہانک پہ برا سا منہ بناتی وہ سراپا احتجاج تھی۔

"افوہ امی جی' یہ آپ مجھے نینو کہنا تو بند کریں۔ میرے سسرائیلیوں (یقیناً" یہ اسرائیلیوں کی کوئی بگڑی ہوئی شکل تھی) کے سامنے مجھے ذلیل کرائیں گی۔" بالوں کی چوٹی گوندھتے وہ ادا سے بولی۔

"اچھا جی تو اب آپ کو میں میڈم روزینہ کہا کروں؟" اماں نے تیوری چڑھائی۔

"نہیں آپ مجھے "روز" کہا کریں۔" برجستہ جواب آیا۔

"اب یہ "روز" کیا بلا ہے؟" انہوں نے ماتھے پہ ہاتھ مارا۔

"اوہو ایک تو میری ماں کو روز کا مطلب بھی نہیں پتا۔ امی جی "روز" مطلب "گلاب کا پھول۔" اماں پہ تفصیل سن کے ہنسی کا طویل دورہ پڑا تھا۔

"ماشاء اللہ' تو اور گلاب کا پھول۔ رمضان میں مجھ سے ایسے کفر نہیں بولا جاتا پتر جی' جے تجھے پھول ہی بننا تو میں تجھے گوبھی کا پھول کہہ دیتی ہوں۔ اب خوش۔" دل کھول کر ہنس چکیں تو ایک نئی پھلجھڑی چھوڑی۔ وہ جل بھن گئی۔

"میری تو ماں میری عزت نہیں کرتی میرے سوروں (سسرال والوں) نے میری کیا خاک عزت کرنی ہے۔" اماں اپنی ہی کہی بات سے حظ اٹھاتی اب بھی

ہنسے جا رہی تھیں جب کہ وہ پیر پٹختی کمرے سے نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا' سب کام روزینہ بھاگ بھاگ کر کرتی رہی۔ پچھلے دنوں کی مشقت کا رنگ اترے ہوئے چہرے سے عیاں تھا پر وہ نہایت تابعداری سے اماں کی ہر آواز پہ جی جی کرتی سسرال والوں کی خاطر مدارت میں لگی رہی۔ ماہتاب بانو چاہ کر بھی اس کی پھرتیوں کے ساتھ جھلکتے انداز کو نظرانداز نہ کرپائیں۔ دوسری طرف عبدالشکور منہ پھلائے بیٹھے تھے۔ وہ اس ناراضی کی وجہ جانتی تھیں۔ ان کا افسردہ انداز منگنی کے بعد سے سراپا احتجاج تھا۔ کل عید تھی اور اسے موقع پہ اپنی ہی اولاد اداس ہو جبکہ دکھ کی وجہ بھی آپ ہوں تو کون سی ماں سکون سے وقت گزار سکتی ہے۔ وہ بظاہر سخت اور دل میں لاکھ اپنی اکلوتی اولاد کی شادی کو لے کر غیر محفوظ تھیں انہیں چھکن میاں کی خوشی بھی اتنی ہی عزیز تھی۔ بس یہی سوچ کر انہوں نے بیٹھے بیٹھے شادی کی تاریخ کا مطالبہ کردیا۔ یہ اعلان وہاں موجود ہر شخص کے لیے غیر اعلانیہ لوڈ شیڈنگ سے زیادہ ہیجان انگیز تھا۔ چھکن میاں کی تو باچھیں کھل گئیں۔ دوسری طرف روزینہ کو ساعتوں پہ یقین نہ آیا۔ دس کلو وزن کم کرنے والی شرط پوری کیے بغیر اس کی شادی ہونا بالکل ایسا ہی تھا جیسے سیمی فائنل کھیلے بغیر ڈائریکٹ فائنل میں پہنچ جانا۔ جمیلہ اور قیوم نے اللہ کا شکر ادا کیا جس نے انہیں بیٹیوں کے فرائض سے سبکدوش ہونے کی توفیق دی۔ عید کے ایک ماہ بعد کی تاریخ سب کی باہمی مشورے سے طے کرلی گئی تھی لیکن ایک بڑا مرحلہ ابھی باقی تھا۔

اب آپ سوچ رہے ہوں گے روزینہ سدھر گئی' چھکن میاں کی شادی خانہ آبادی طے پاگئی' ماہتاب بانو بخوشی راضی ہوگئیں تو پھر اب کون سا مرحلہ باقی ہے۔ تو جناب چاند رات ہو اور ہیرو ہیروئن کو چوڑیاں نہ پہنائے..... کیا ایسا ممکن ہوسکتا ہے؟ دیکھا آپ بھی وہی کہہ رہے ہیں نا کہ بالکل نہیں۔ ڈھائی انچ کی دو درجن ریشمی چوڑیاں کب سے ان کی جیب میں پڑیں ان کی بے قراری کو بڑھا رہی تھیں۔ لیکن اتنے بہت سے لوگوں کے درمیان روزینہ کو یہ تحفہ دینا کچھ مناسب نہیں تھا ویسے بھی امی حضور کا کیا اعتبار اس حرکت پہ شادی کی تاریخ سال دو سال آگے بڑھا دیں۔ یہی سوچ کر اپنا مسئلہ رشک قمر کے سامنے رکھا۔ رشک قمر نے پہلے تو اپنی پوری بتیسی نمائش کے لیے حاضر کی پھر اپنی چندھیا پہ بچے کھچے بالوں میں کھجلی کی اور کچھ سوچتے ہوئے فضیلہ کے پاس گئے۔ فضیلہ نے مسئلہ سنا اور حل بھی پیش کردیا۔

ادھر بہانے سے رشک قمر نے مرزا عبدالشکور کو اٹھایا' فضیلہ باورچی خانے سے روزینہ کو کھینچتی چھت پہ لے آئی۔ وہ حیران پریشان بہن کے ساتھ چھت پہ پہنچی تو عبدالشکور کو دیکھ کر ساری بات سمجھ میں آگئی۔ (چلو شکر دیکھنے میں ہیرو نہیں لگتا پر کرتوت اس کے بھی

ہیرو جیسے ہیں شاید اس نے بھی میری طرح رسالے پڑھے ہوں گے) دل ہی دل میں سوچتی وہ پورے اعتماد کے ساتھ ان تک پہنچی۔ (شرمانے کی کوشش کی تھی پر کیا کرتی شرم آہی نہیں رہی تھی) دوسری طرف عبدالشکور حیا سے گلابی ہوتے اسے دیکھ کر نظریں جھکائے کھڑے تھے۔

"کیا ہے؟" اس کی رعب دار آواز کانوں سے ٹکرائی تو ان کا نازک سا دل لرز گیا۔

"آپ کی نازک کلائیوں کے لیے یہ حقیر سا تحفہ لائے تھے۔" نازک کا لفظ روزینہ کو ہضم نہیں ہوا تھا اسے لگا عبدالشکور نے یقیناً اس کا تمسخر اڑایا ہے لیکن ایک تو ان کی معصوم صورت دوسرے تنہائی میں میسر چند لمحے جو ظاہر سی بات ہے عبدالشکور کی کاوشوں کا ہی نتیجہ تھے تو اب کیا وہ اسے یہاں بلا کر شرمندہ کرنا چاہتے تھے۔ (رومانس کو انجوائے کرنا سیکھو روزینہ)

"شکریہ۔" چوڑیاں پکڑ کر دیکھتے اس نے اپنی سوچ پہ دو حرف بھیجے اور میٹھے لہجے میں بولی۔ عبدالشکور مسکرائے اور پھر کن انکھیوں سے یہاں وہاں دیکھتے کچھ گھبرائے۔

"اب کیا ہے؟" روزینہ کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا۔ (یہ ہیرو کہیں اکیلے میں موقع پاکر چھچھورا ہونے کا چانس تو نہیں ڈھونڈ رہا)۔ وہ دو قدم پیچھے ہوتی ان سے ایک محفوظ فاصلے پہ جا کھڑی ہوئی۔

"آپ کے لیے ایک اور تحفہ لائے تھے ہم۔" عبدالشکور نے سرخ چوکور لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا جسے روزینہ نے کونے سے تھاما اور نہ سمجھنے والے انداز میں پہلے حیرانی سے عبدالشکور کو دیکھا پھر اس لفافے کو الٹا پلٹا کر یوں معائنہ کیا جیسے خدشہ ہو اندر سے خودکش بم برآمد ہو جائے گا۔ لفافے کو سینہ چاک کیا تو اندر سے ایک دل نما کارڈ برآمد ہوا جس میں عید کی مبارکباد کے ساتھ جلی حروف میں عبدالشکور کے دل کا حال رقم تھا۔ اور نیچے ایک شعر لکھا تھا۔۔۔۔

عید آئی بڑی زمانے میں
روزینہ گر پڑی غسل خانے میں

شعر پڑھنے تک روزینہ کے چہرے پر موجود دھیمی مسکراہٹ رخصت ہو چکی تھی اور اب وہ کھا جانے والی نظروں سے اپنے ہونے والے نوشے میاں کو دیکھ رہی تھی جو ان ظالم نظروں سے سہمے کھڑے تھے۔

"مجھے تو پتا ہی نہیں تھا آپ کو شعر و شاعری کا بھی شوق ہے ویسے ذوق تو بہت اعلا ہے آپ کا۔" اچانک اس کے چہرے پہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"آداب۔" وہ کچھ سنبھلے اور ادا سے بولتے ہاتھ ترچھا کیے ماتھے تک لے گئے۔

"اسے پڑھ کر مجھے بھی ایک شعر یاد آیا قسمے آپ کی شان کے عین مطابق ہے۔" روزینہ کا موڈ ٹھیک دیکھ کر انہیں حوصلہ ہوا تھا۔ وہ یقیناً" ان کا مذاق سمجھ گئی تھی اور اس نے برا بھی نہیں منایا تھا تو یہ ایک خوش آئند بات تھی۔

"ارشاد۔ ارشاد۔" وہ برجستہ بولے۔

کھا کے قلفی کسی نے صحن میں پھینکا جو ایک تنکا
اس کی اماں نے اس کا نام مرزا عبدالشکور رکھا

"آداب عرض ہے۔" لہک لہک کر شعر سنانے کے بعد اس نے داد طلب نظروں سے میاں چھکن کی جانب دیکھا جو ناقابل یقین حیرت چہرے پہ سجائے اپنی مستقبل کی زوجہ محترمہ کو دیکھ رہے تھے جو سیر کو سوا سیر نہیں بلکہ پاؤ کو ڈھائی تین کلو تھیں۔ چہرے پہ معصومانہ مسکراہٹ سجائے اس نے عبدالشکور کو دیکھا جو گھبرائے ہوئے اس انتہائی ذاتی اٹیک پہ اپنا رد عمل دبائے بیٹھے تھے۔ چند لمحے سرکے اور پھر مسکراہٹ نے ان کے لبوں کا احاطہ کیا۔ اگلے ہی پل وہ دونوں بری طرح اپنی احمقانہ حرکت پہ ہنس رہے تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ یقیناً" یہ چاند رات ان دونوں کی زندگی کی یادگار ترین رات تھی۔

پیارے قارئین! دعا کریں ہمارے میاں چھکن اور لاڈلی روزینہ عرف روزی کی آنے والی زندگی اس عید کی طرح خوشیوں سے بھری رہے۔ آمین۔

✡ ✡

نصیحہ آصف خان
WWW.PAKSOCIETY.COM

"کوئی ایسے بھی کرتا ہے۔۔۔ ماں باپ کے ساتھ۔"
زرینہ میٹھے چاول بنانے کے لیے میوہ کتر رہی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ اداسی اور غصے سے بول بھی رہی تھیں "ضدی بھی ایسا ہے کہ خدا کی پناہ۔ چلو جہاں رہے خوش رہے۔" زرینہ کے اندر سے دعائیں نکلتیں اور لبوں پر آجاتیں ماں جو تھیں۔۔۔ وہ بھلا کب ناراض رہ سکتی تھیں اس سے۔

"فاطمہ!" انہوں نے سوچوں میں غرق فاطمہ کو آواز دی۔ جو بیٹھی تو ان کے پاس ہی تھی مگر ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔

"جی۔۔۔ جی تائی اماں۔" وہ کسی قدر بوکھلا کر بولی۔

"ہوا بہت تیز چل رہی ہے پتے بھی اڑ کر بر آمدے تک آرہے ہیں جاؤ بچے تار سے کپڑے اتار لے ورنہ دھلائی ضائع ہو جائے گی۔" زرینہ نے کہا تو وہ سعادت مندی سے "جی" کہتی صحن میں آگئی دور افق سے آندھی کی نوید مل رہی تھی۔

"کیا خبر وہ آج آہی جائے۔" روزانہ کی طرح ایک آس بھرا جملہ آس پاس ورد بکھیر گیا۔ فاطمہ کی آنکھوں میں چبھن بڑھنے لگی تھی۔

تائی اماں اس کے لیے میٹھے چاول بنا رہی تھیں۔ اسے پسند جو بہت تھے پسند تو اسے فاطمہ بھی بہت تھی جو اس کی عم زاد اور منکوحہ تھی۔ فاطمہ کی ماں اسے جنم دیتے ہی ملک راہی عدم ہوئی تو باپ باہر کے ملک چلا گیا وہیں بیاہ رچالیا۔۔۔ اور اپنی دنیا میں ایسا مگن ہوا کہ فاطمہ کو بھی بھول بیٹھا۔ فاطمہ کو تائی زرینہ نے پالا تھا۔
یہاں گاؤں میں تایا احمد حسن کی بہت ساری زرخیز زمینیں تھیں لاتعداد جانور تھے وہ انہی کی دیکھ بھال کرتے تھے دیکھ بھال تو اپنے اکلوتے بیٹے علی عباس کی بھی کی تھی۔ جو کئی بچوں کی وفات کے بعد زندہ و جاوید رہا۔

وہی اب دونوں کی آنکھ کا تارا و سہارا تھا، مگر ضد کا مارا تھا جو کہہ دیا۔ وہ کر لیا نفع و نقصان کی پروا کیے بغیر بچپن کے لاڈ، پیار اور توجہ نے اسے خود سر ہی تو بنا دیا تھا۔ فاطمہ سے بھی الجھ پڑتا، مگر والدین کی ایک سرزنش بھری آواز اسے روک دیتی۔ فاطمہ سے اس کا نکاح اس وقت ہوا جب وہ بارھویں جماعت کا امتحان دے کر فارغ ہوا اور بی اے کرنے کے لیے دوبارہ شہر جانے کو تھا۔

فاطمہ دسویں جماعت میں تھی من موہنی سی اپنی اپنی سی دونوں اس نئے رشتے پر نہ صرف خوش تھے بلکہ دل میں محبت اور بڑھ گئی۔ تایا۔ تائی کی محبت، اور ضدی و اکھڑ مزاج مگر اونچا لمبا، ڈیل ڈول والا علی عباس دل کا مکین بن گیا تھا۔
علی عباس کو بھی فاطمہ بہت پسند تھی۔ ورنہ اس اکھڑ مزاج کا کیا بھروسا انکار ہی کر دیتا۔ کیسے کرتا انکار۔۔۔ فاطمہ تھی ہی پیاری سی۔ دو سال اس کی پڑھائی مزید جاری رہی۔
اب وہ اس سے لڑتا، جھگڑتا کم پر ناراض زیادہ ہو جاتا۔ اس پر فاطمہ کی جان پر بن آتی۔ جب تک اس کا مزاج ٹھیک نہ ہوتا سانس سینے میں اٹکی رہتی۔
وہ تھا عجیب سا سر پھرا سا، شہر رہ کر اس کی رنگینیوں میں کھو سا گیا تھا۔ اب اس پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ بی اے کے بعد وہ شہر میں نوکری کرے گا۔
بی اے کا نتیجہ آگیا۔۔۔ وہ کامیاب کیا ہوا ذہن میں چھپا خناس بھرپور طریقے سے سر اٹھانے لگا تھا۔ اسے بھکانے لگا تھا جھگڑا طول پکڑ گیا۔ نہ ماں مانتی نہ باپ سنتا۔

"اتنی زمینیں ہیں۔ اتنے سارے ڈھور ڈنگر۔۔۔ کون سنبھالے گا مجھ میں اب اتنا دم خم نہیں۔۔۔ تو نے بس نگرانی کرنی ہے، افسر بن کر، سارا کام مزارع کریں گے۔ میں دیکھوں گا میرا ساتھ دے ہاتھ بٹا۔۔۔ اب تک تیرے آسرے پر تو بیٹھا ہوا تھا۔" تایا جی کی کوئی بات اس کے پلے نہ پڑی ماں نے الگ دماغ کھپایا۔
"اور ہے کون جو یہ سب نگرانی کرے، سنبھالے، تیرے باپ میں اب ہمت نہیں رہی، تو ہمارا اکلوتا سہارا ہے، کچھ خیال کر۔" زرینہ نے پیار سے ڈانٹ سے، ہر طرح سے سمجھایا۔ مگر اس کے کانوں میں جوں تک نہ رینگی۔ تب ان کی لمبی تقریر پر وہ کھول کر

بولا۔

"اتنا پڑھ کر اب مٹی مٹی ہو جاؤں' جانوروں کو سنبھالوں پاگل ہوں کیا؟" غصے سے اس کے نتھنے بھڑکنے لگے تھے۔لال بھبوکا ہو گیا۔

"کتنا پڑھا ہے تو نے جو کمشنر لگے گا۔!" باپ کی بات پر وہ کھسیا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"بس میں شہر جا کر نوکری ڈھونڈوں گا۔" اس کا آخری اور حتمی فیصلہ سب کو ڈھا گیا۔

"مان جاؤ ناں علی سب کی بات۔" آخر میں فاطمہ نے اپنا حربہ آزمایا۔

"تم تو استانی نہ ہی بنو۔ بڑی آئی سمجھانے والی۔" وہ اس پر بھی برس اٹھا زور تو اس پر ہی اس کا چلتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میں کل ہی شہر جاؤں گا اور تب تک نہ آؤں گا۔ جب تک نوکری نہ مل جائے۔"

رات کے کھانے کے بعد اس نے صور پھونک دیا۔ زرینہ اس کی ہٹ دھرمی پر دم بخود تھیں۔ احمد حسن مایوس ہو کر سر جھکا کر رہ گئے۔ اور فاطمہ دل پر ہاتھ رکھ کر اس کی جدائی جان لیوا محسوس کرنے لگی۔

کتنا بے حس انسان ہے جانو اس کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے۔ رات بے چینیوں کی نذر ہو گئی۔ کوئی معجزہ ہی ہوتا اگر وہ اپنا فیصلہ بدل لیتا فاطمہ کو اس پر شدید تاؤ آرہا تھا۔

کسی رشتے کا پاس نہ رکھا اس نے نہ کسی کی خوشی کا احساس صبح اس نے بیگ میں چار جوڑے اور ضرورت کی کچھ چیزیں رکھیں۔ بٹوے میں پیسے دابے اور کمرے سے باہر آ گیا۔

احمد حسن نے اسے ناشتے کے لیے پکارا جو چائے میں نوالے ڈبو ڈبو کر کھا رہے تھے۔ زرینہ نے تازہ پراٹھا اتارا' فاطمہ نے پیالے میں چائے انڈیلی اور ستی سوجی روئی آنکھوں سے دیکھا اور ناشتا سامنے رکھ دیا۔

پر وہ تازہ دم ہشاش بشاش تیار کھڑا تھا۔

گھر میں عجب سوگوار خاموشی رچی تھی۔ زرینہ نے اسے غور سے دیکھا وہ بالکل خاموش تھی۔ ناراض بھی تھی اور اداس بھی ناشتا کر کے وہ سب کو مشترکہ سلام کرتے بیگ اٹھا کر باہر نکل گیا۔ تب زرینہ اور فاطمہ کی آنکھوں سے سمندر ابل پڑے۔

احمد حسن نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کمرے میں آ گئے۔

☼ ☼ ☼

جذباتی فیصلہ نہ کوئی منزل تھی نہ کوئی راستہ۔۔۔ جیسے ہی گھر سے باہر کھلی فضا میں گہرا سانس لیا۔ سامنے ہی ہری بھری فصلیں تھیں۔ سکون آمیز خاموشی مسکراتی ہوا جانے کیا ہوا اسے۔ کسی شے میں کشش نہیں محسوس ہوئی بس راستہ وفاصلہ کم کیے جا رہی تھی اور فضا میں آلودگی بڑھتی جا رہی تھی۔ شہر آ گیا اور وہ اپنے دوست عالمگیر کے گھر جا پہنچا دو' تین دن تو خوب آؤ بھگت ہوئی پھر یہاں سے جانا پڑا۔ ایک معمولی سی سرائے میں جا ٹھہرا۔ جو سنتا حیران ہوتا۔ "بی اے پاس اور نوکری ارے یہاں تو ڈبل ایم اے رُل رہے ہیں۔ تو کس کھیت کی مولی ہے۔" اس کا مذاق بنتا رہا۔ اسے خود بھی پتا تھا' جانتا تھا' یہ اس معمولی تعلیم سے کچھ نہیں ملنے والا مگر دل کا کیا کرتا۔ جو کسی صورت کھیتوں کھلیانوں میں جانے پر آمادہ ہی نہ تھا۔ رات' رات بھر مچھر اور کھٹمل سونے نہ دیتے۔ گھر کی مچھر دانی یاد آتی۔ سوکھی روٹی چباتے ہوئے اماں کے ہاتھ کے پراٹھے منہ میں سواد بن جاتے۔ کالی سڑی چائے گھونٹ لیتا اور فاطمہ کے ہاتھ کی دودھ پتی یاد آ جاتی۔ گھٹن زدہ ماحول نوکری کے لیے دن بھر مارا مارا پھرتا' تھکن اور دھوپ میں پھر رُل کر رنگ جلتا جا رہا تھا۔ اور کلیجہ الگ۔ جیسے جیسے دن گزر رہے تھے۔ خواہش ناکامی اور مایوسی میں بدل رہی تھی اور اندر ہی اندر اک شرم کی کیفیت سر اٹھا رہی تھی۔

"واپس آ جا بچے نہ رُل وہاں پر۔" زرینہ کی پکار کو وہ

ان سنی کرتا جا رہا تھا۔ آخر کب تک کان نہ دھرتا احمد حسن بھی واپسی کے لیے زور دیتے۔ فاطمہ نے اس دوران ایک بھی کال نہ کی۔ نہ اس نے فون کیا۔ بس مشترکہ سلام کر دیتا۔ چند ہزار اب روپوں میں بدلنے والے تھے۔ وہ اب پشیمان سے زیادہ پریشان تھا۔

آگے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ وہ جلد کوئی فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ ایک اور فیصلہ جو مستقل اور کار آمد ہو۔

☼ ☼ ☼

"کتنے کٹھور ہو تم علی.... جا کے بھول ہی گئے۔"

فاطمہ اسے یاد کر کے رو پڑتی۔ زرینہ الگ آنچل بھگوئے رکھتیں۔ ماں تھیں روز اس کی پسند کی کوئی نہ کوئی چیز بناتیں کیا خبر آج چلا آئے ہفتہ دس دن ہو گئے تھے اسے۔

"جانے کیا کر رہا ہو گا۔ کیا کھاتا ہو گا یہاں تو رب کی مہربانی سے رزق کا انبار ہے۔ ہائے میرا بچہ آجا واپس۔" زرینہ ہولتی رہتیں۔ اور احمد حسن اسے سمجھاتے کہ آخر اسے لوٹ کر یہیں آنا ہے۔ زمانے کے سرد، گرم دیکھ لے پرکھ لے زندگی کو اونچ نیچ سمجھ لے۔ تو عقل ٹھکانے آئے گی ہمارے سمجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا اس پر اب زندگی کی ٹھوکریں ہی اسے صحیح راستہ دکھائیں گی۔ تو فکر میں نہ گھل اس کی۔" احمد حسن اپنے تجربے کی بنیاد پر زرینہ کو سمجھاتے۔

☼ ☼ ☼

دو چار دن اور گزرے کہ ماہ رمضان کا مقدس مہینہ رحمتوں کی برسات کرنے اس پر وارد ہو گیا۔

دعاؤں اور عبادتوں میں شدتیں آگئیں۔ ساتھ ہی اس کی یاد میں بھی۔ ظالم کہیں کا.... جب سے گیا ہے۔ حال تک نہ پوچھا، کیا میں اس کی کچھ نہیں لگتی، فاطمہ کو اپنی بے وقعتی پر صدمہ ہوتا، پھر نئے سرے سے دعائیں امید دلاتیں، رب کی رحمتیں سمیٹتے سمیٹتے آخری عشرہ آگیا۔ زرینہ اسے بازار لے آئیں، عید کی ہر چیز دلائی، کپڑے، جوتی، مہندی، ہار، بندے، سنگھار کی چیزیں دل یکدم گھر آکر رو پڑا کسی کے لیے سجے گی کون سراہے گا؟

زرینہ نے اس کی کیفیت دیکھ کر اسے ساتھ لگایا تو دونوں نے ساون بھادوں کو بھی مات دے ڈالی۔

ستائیسویں کی رات وہ شب بھر عبادت میں مشغول رہی۔ ایسی دعائیں مانگیں گڑگڑا کر پورا ہونے کا "کامل یقین تھا۔

صبح یکدم جانے کیا سوچ کر اسے اک میسج کر دیا یہ سوچ کر یہ اس کی طرف سے آخری پیغام ہے اس کٹھور کے لیے سنگدل کے لیے اس پتھر سے سر پھوڑنا اب اس کے بس میں نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

انتیسواں روزہ اہتمام سے تمام ہوا کہ چند منٹوں بعد ہی چاند دیکھنے کا شور مچ گیا۔ زرینہ نے آج افطاری پر بہت اہتمام کیا تھا کہ جیسے آج اس کے آنے کا مکمل یقین ہو اور دعاؤں کی قبولیت کا بھی۔

"مہندی گھول دی ہے میں نے فاطمہ ضرور لگا لینا۔" زرینہ کی آواز بھیگی ہوئی تھی خود فاطمہ نے آج آنکھیں دہلیز پر رکھی ہوئی تھیں اور ایک ہی راستہ تکے جا رہی تھی کہ اشکبار ہو گئی۔

عشا کی نماز ادا کر کے اس نے کپڑے استری کرنے شروع کر دیے۔

سب سے آخر میں علی کا سوٹ استری کیا۔ جو احمد حسن نے بطور خاص سلوایا تھا کہ یکدم آنکھیں بھر آئیں، زرینہ خاموشی سے صبح سویوں کے لیے میوہ کتر رہی تھیں دونوں خاموش تھیں۔ وہ استری کر کے فارغ تھی اب۔

کہ۔ اک دھاڑ سے دروازہ کھلا اور فاطمہ نے دلربا سا منظر دیکھا تایا جی کے ساتھ وہ نظریں جھکا کے کھڑا تھا۔ وہ کھڑکی میں جیسے جم سی گئی تھی۔ نادم قدموں سے چلتا ہوا وہ اندر آگیا اور زرینہ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ان کے پیروں پہ ہاتھ رکھ کر معافی طلب کی۔ زرینہ نے اٹھ کر فوراً "اسے گلے سے لگا لیا۔ جیسے کوئی چھوٹا سا بچہ ہو، ان کے لیے تو وہ نادان بچہ ہی تھا۔ کم عقل، بے

وقوف سا، رنگت سنولا گئی، پہلے سے خاصا دبلا لگ رہا تھا۔ احمد حسن نے بیگ اس کے پاس رکھ دیا۔ ابھی تک شرمندگی کے نرغے میں تھا۔

"اٹھ چل ہاتھ منہ دھو لے۔ میں کھانا گرم کرتی ہوں۔ کتنا سامنہ نکل آیا ہے۔" زرینہ اس کا چہرہ تھام کر تشویش سے بولیں سارے دکھ، غصہ، ہوا بن کر اڑ گئے تھے۔ اس کے آتے ہی۔

"اب آگیا ہے ناں۔ خوب کھلا پلا اسے۔ میں ذرا بھائی خورشید سے مل لوں۔ باہر ہی کھڑا ہے۔" احمد حسن بولتے بولتے مسکراتے ہوئے باہر چلے گئے۔ ندامتوں کا بوجھ لیے وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

"فاطمہ اپنے کمرے میں ہے جا۔ اس کے پاس بڑا رلایا ہے اسے بھی تو نے۔" زرینہ نے کہا تو وہ بیگ اٹھا کر اس کے کمرے میں آگیا۔ وہ رخ موڑے لرزہ بر اندام تھی۔

اپنی دعاؤں کے قبول ہونے پر دل ہی دل میں رب کی شکر گزاری کر رہی تھی۔ کھنکار کر اس نے اپنی آمد کی اطلاع دی۔ وہ ٹس سے مس ہی نہ ہوئی۔ بت بنی کھڑی رہی قوت جیسے سلب ہو گئی تھی۔

"ناراض ہو ناں۔" دھیمی آواز اس کے قریب سے ابھری۔ وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ انگلیاں مروڑتی لب کچلتی۔

"دیکھو تو ذرا... ادھر خود ہی تو بلایا ہے۔ اب منہ پھلا کے کھڑی ہو۔" علی کے مخمور لہجے میں کہنے پر وہ تیزی سے مڑی اس کی جانب۔ علی کے لبوں پر جان دار مسکراہٹ تھی۔ وہ دیدہ و دل فرش راہ کیے کھڑا تھا۔

"یہ دیکھو کیا ہے یہ... یہ کہتے ہوئے اس نے جیب سے موبائل نکالا پڑھوا اپنا مسیج یہی بھیجا تھا ناں۔

دن ہمارا بھی عید کا حسین ہو جائے
اسے کہنا کہ چاند رات ہی لوٹ آئے

شرارتی انداز میں وہ اس کا بھیجا ہوا شعر پڑھتا اور اسے دیکھتا تھا۔ جس کے چہرے پر گلال بکھر رہا تھا۔ دفعتاً شرما کر فاطمہ نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا تب علی نے دھیرے سے اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹائے اور تھام کر سرگوشی میں بولا۔

"چاند رات مبارک ہو، آگیا ہوں لوٹ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔"

وہ مدھ لٹا رہا تھا اور فاطمہ اس کے خمار میں ڈوبتی جا رہی تھی۔

"یہ لو..." بیگ سے چوڑیاں نکال کر اسے تھمائیں۔

رنگ برنگی لال، پیلی، ہری، چمک دار محبت کی پھوار کرتی چوڑیاں اور باہر چاند رات کی رونقیں جو اپنے جلو میں چہکتی مسکراتی جوان کے لیے خوشیوں کے در وا کرتی آرہی تھی۔ راہوں میں خوشیوں اور محبتوں کے پھول کھلائے۔

"آجاؤ علی... کھانا تیار ہے۔ باہر سے زرینہ کی آواز آئی تو وہ اس پر پیار بھری نگاہ ڈالتا۔ باہر آگیا۔ اور فاطمہ چوڑیاں سینے سے لگا کر وہی شعر گنگناتی رہی۔

دن ہمارا بھی عید کا حسین ہو جائے
اسے کہنا کہ چاند رات ہی لوٹ آئے

امت العزیز شہزاد

"آلو بخارے اور املی کی چٹنیاں ہم بنا چکے ہیں۔ ابھی چونکہ گرم ہیں' اس لیے وہیں باورچی خانے کی سلیب پر رکھ کر جالی سے ڈھک آئے ہیں۔ ذرا ٹھنڈی ہو جائیں تو آپ انہیں صاف ستھری شیشے کی بوتلوں میں محفوظ کر لیجیے اور فی الحال آپ شامی کبابوں کو سل پر پیسنے کی تیاری کیجیے۔ ہم بھی بس چند ثانیے اپنی سانس درست کر کے وہیں آ رہے ہیں۔ آج تو گرمی کے مارے چولہے کے سامنے کھڑا ہی نہیں ہوا جا رہا تھا۔" تمکنت بیگم نے لاؤنج میں دھرے نیلے صوفے کہ جس کی پشت پر ان کے ہاتھوں کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت سفید فرشیے سے بنے پیکٹ کورز سجے ہوئے تھے' پر براجمان ہو کر اپنی کل وقتی خاندانی ملازمہ مینا جو دراصل ان کی والدہ کی ذاتی ملازمہ کی نواسی تھی اور جسے انہوں نے اپنے مطابق "ٹرینڈ" کر رکھا تھا۔ سے مخاطب ہو کر کہا۔ وہ متودبانہ سر اثبات میں ہلا کر مڑ گئی۔ تمکنت بیگم ہلکا نیلا لان کا دوپٹا اپنے سر سے ہٹاتے ہوئے ماتھے پر چمکتا پسینہ نرم گلابی رومال سے پونچھنے لگیں۔ تبھی ان کے مجازی خدا جو کافی دیر سے یہیں براجمان صبح کے اخبار کے مطالعے میں بری طرح مستغرق تھے' اب اخبار ایک طرف ڈال کر ان کی جانب متوجہ ہو کر ذرا خفگی سے گویا ہوئے۔

"کیوں ہلکان کیے رکھتی ہیں آپ سارا دن خود کو' ایسے بے کار کاموں میں۔۔۔ کہتا بھی ہوں ناحق طبیعت بگڑ جائے گی تو آپ کی تینوں صاحب زادیاں میرے سر ہو جائیں گی کہ یقیناً" میں نے ہی آپ کا خیال نہیں کیا ہو گا۔ اب وہ کیا جانیں کہ ان کی والدہ ماجدہ کس قدر ضدی واقع ہوئی ہیں۔" ان کی ناراضی پر وہ بڑے دل سے مسکرائیں۔

"اچھا جناب! ہم تو سمجھے تھے کہ آپ حسب عادت اخبار بینی میں اس بری طرح مستغرق ہیں کہ آپ کو اردگرد کی کچھ خبر ہی نہیں۔"

"خبر کیسے نہیں ہو گی بیگم' آنکھیں اخبار پر ٹکی ہیں' مگر بفضل تعالیٰ کان تو ساری آوازیں سن رہے ہیں' سب سنا ہے میرے کانوں نے' پہلے آپ صفائی والی پر کتنا ناراض ہوئیں کہ وہ آپ کے بار بار تلقین کرنے کے باوجود اکڑوں بیٹھ کر پھول جھاڑو سے موٹا موٹا کچرا سمیٹنے کو ہی جھاڑو دینا تصور کر لیتی ہے اور پونچھا لگاتی ہے تو ایسے کہ زمین ہی کو داغ دار کر جاتی ہے۔ وہاں سے فراغت پا کر آپ کچن میں گئیں اور مینا کے دھوئے گئے برتنوں کا باریک بینی سے جائزہ لے کر آپ اس نتیجے پر پہنچیں کہ اس نے چائے کے کپوں کے ہینڈل ٹھیک طرح سے نہیں دھوئے اور گلاسوں سے صابن کی مہک بھی آ رہی ہے' جبکہ سلور کی پتیلیوں کو موئے جونے۔۔۔"

"بس کر دیجیے سید وجاہت حسین صاحب۔" تمکنت بیگم نے ان کا پورا نام لیتے ہوئے بتا دیا تھا کہ وہ ان سے واقعی خفا ہو چکی ہیں۔ "تو کیا چاہتے ہیں آپ؟" انہوں نے اپنا سرخ و سپید چہرہ ان کی طرف

کر کے چتون تیکھے کر لیے۔ "سارے ملازمین کو کرنے دیں' ان کی من مانیاں ارے ہم نہ ہوں نا تو دو دن میں آپ کا گھر کباڑ خانہ دکھائی دے اور ہم سے نہیں ہو سکتے' یہ پھوہڑ پنے برداشت' نو سال کی عمر سے اللہ جنت نصیب کرے' ہماری والدہ ماجدہ نے نوکروں کی فوج ہونے کے باوجود ہمیں چولہا چوکی سنبھالنے پر لگا دیا تھا۔" انہوں نے تفاخر سے ہزار مرتبہ کی بتائی ہوئی بات پھر دہرائی۔

"بس...." وجاہت صاحب نے بے مزا ہو کر اخبار صوفہ ٹیبل پر پٹخا۔

"آپ کی اماں کا کیا ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔" نہ جانے کیسے ان کے منہ سے پھسل گیا۔

"بھگت رہے ہیں؟" تمکنت نے ازحد صدماتی انداز سے ان کی جانب دیکھا۔ "گویا آپ پینتیس سالوں سے ہمیں بھگتتے چلے آ رہے ہیں؟ سارا خاندان' برادری' احباب ہمارے سلیقے کی وجہ سے آپ کی قسمت پر ہمیشہ رشک کرتا رہا ہے اور آپ.... آپ...." اس سے آگے ان سے کچھ کہا ہی نہیں گیا۔ پہلے آواز گلوگیر ہوئی' اس کے بعد بڑی بڑی سرمئی آنکھیں جو اس عمر میں بھی پرکشش تھیں میں آنسو ابھر آئے۔

"اوہ ہو' ارے بھئی.... آپ تو جانتی ہیں ہماری عادت' ارے بھئی مذاق کر رہے تھے آپ سے.... اب کیا ہمارا اتنا بھی حق نہیں۔" پہلے تو ان کی نم ناک آنکھیں دیکھ کر وہ بوکھلا سے گئے۔ پھر اچانک ہی یاد آیا کہ شوہر نامدار ہیں ان کے 'اگر ذرا سی دل لگی کر بھی لی تو کیا ہوا۔

"بس رہنے دیں آپ۔" وہ اسی گلابی رومال کے دوسرے حصے سے کہ جس سے کچھ دیر قبل اپنا پسینہ پونچھا تھا' اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے دل گیرسی ہو کر بولیں۔ "بس رہنے دیں سید صاحب' ہم سب جانتے ہیں' ہم میں لاکھوں گن ہیں' مگر بہرحال ہم آپ کی محبوبہ تو نہیں تھے' نہ جو آپ کو ہمارے عیب بھی ہنر دکھائی دیتے۔" وہ بڑی متانت سے بڑا ہی کرارا جوابی وار کرنے کے بعد ازحد طمانیت سے اپنی نشست سے اٹھ کر گھر کے پچھلے صحن کی جانب بڑھ گئیں۔ جہاں انہوں نے سیمنٹ کا احاطہ ایک کونے میں بنوا کر بڑے اہتمام سے مسالے وغیرہ پیسنے کی خاطر سل بٹا رکھوا رکھا تھا۔

"ذرا دیکھوں تو۔ کیسے پیس رہی ہے' موئی کام چور شامی کبابوں کا مسالا۔ لاکھ مرتبہ سمجھایا ہے کہ کبابوں کا مسالا ہلکے ہاتھ سے لمبائی کے رخ پر پیسا جاتا ہے' مگر مجال ہے جو سن لے.... کم بخت سل پر بٹے کو اتنی زور سے مارتی ہے کہ سل کے ننھے ننھے سے ذرات قیمے میں شامل ہو جاتے ہیں۔" وہ تو منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے نئے محاذ پر روانہ ہو گئیں' مگر پیچھے رہ جانے والے وجاہت اپنے ایک بے ضرر سے مذاق پر اتنا برا نانا اور دل دکھانے والا طعنہ سن کر ہک دک سے بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔

☼ ☼ ☼

سید وجاہت حسین کا تعلق دہلی کے ایک معزز اور متمول گھرانے سے تھا۔ پاکستان بننے کے بعد ان کے خاندان کے کچھ لوگ ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے اور کچھ نے وہیں رہنے کو ترجیح دی۔ (اور بعد ازاں پچھتائے بھی۔) وجاہت صاحب کے والد کی شادی اپنی خالہ زاد زیتون بانو سے وہیں ہندوستان ہی میں ہو چکی تھی۔ وجاہت اپنے دو بڑے بھائیوں فصاحت اور شجاعت کے بعد یہیں پاکستان آ کر پیدا ہوئے۔ یہیں ان کی تعلیم و تربیت اور پرورش ہوئی۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے۔ تب والدہ کو ان کی شادی کے ارمان جاگے۔ مگر وہ تو پسند کیے بیٹھے تھے اپنے دوست کی بہن رابعہ کو.... وہ ایک پڑھی لکھی' پراعتماد اور ان کے زمانے کے لحاظ سے خاصی ماڈرن دوشیزہ واقع ہوئی تھی اور یہی خوبیاں وہ اپنی شریک حیات میں دیکھنا پسند کرتے تھے۔ خاندان بھی اس کا اچھا اور تعلیم یافتہ تھا۔ مگر جیسے اس کا تذکرہ کرنا ہی غضب ہو گیا۔ وجاہت کی والدہ زیتون بانو نے تو ان کے وہ لتے لیے کہ انہیں اپنی

پیدائش پر افسوس ہونے لگا۔

رابعہ غیر سید تھی اور یہ معاملہ ان کے نزدیک چھوت اچھوت جیسا ہی حساس اور نازک تھا۔ اور پھر کچھ یہ بات بھی تھی کہ پچھلی مرتبہ وہ جب اپنی بہن سلمیٰ سے ملنے دہلی گئی تھیں تب ان کی بڑی بیٹی تمکنت انہیں بڑی بری طرح بھا گئی تھی۔ دونوں بڑے بیٹوں کو تو وہیں پاکستان میں بیاہ دیا تھا۔ وجاہت کے لیے انہیں تمکنت نہایت ہی موزوں لگی تھی اور اب اس کی یہ خواہش کہ وہ اپنے دوست کی بہن سے شادی کرنا چاہتا ہے نے فوراً" ہی انہیں فیصلہ کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ شادی وہ کرنا چاہتا تھا رابعہ سے، مگر ہوئی تمکنت سے۔

تمکنت بلاشبہ بے حد خوب صورت لڑکی تھی، سلیقے اور رکھ رکھاؤ میں اپنی مثال آپ۔ سلمیٰ نے واقعی اپنی بیٹیوں کی تربیت بڑے اچھے اور روایتی انداز میں کی تھی۔ مگر خرابی تھی تو صرف یہ کہ تمکنت میں ذرا بھی لچک نہ تھی۔ وقت بدل رہا تھا۔ وقت کے تقاضے تبدیل ہورہے تھے۔ حالات، ماحول سب بہت مختلف ہوچکے تھے۔ اگر کوئی نہیں بدل رہا تھا تو وہ تمکنت تھیں، ان کی اپنی راجدھانی تھی۔ جہاں ان کا سکہ چلتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آج شاید چاند ہوجائے۔ بس اسی لیے آج سہ پہر تک جتنا ہوسکے کام نپٹا دو۔ ویسے چٹنیاں اور کباب وغیرہ تو ہم کل ہی بنا چکے ہیں۔ بس آج کیچپ اور چاٹ مسالا پیسنا باقی رہتا ہے۔ گھر کی تفصیلی صفائی ستھرائی سے تو ہم آپ کی مدد سے ہفتہ بھر پہلے ہی فارغ ہوچکے تھے۔ یوں کوئی بھاری کام تو رہتا نہیں ہے۔" تمکنت صوفے پر بیٹھے بیٹھے پرسوچ انداز میں بولیں۔

ان کے پیروں کے پاس بیٹھی مینا چاندی کی سینی میں ڈھیر ساری مونگ کی دال نکالے بڑی احتیاط اور باریک بینی سے صاف کررہی تھی۔ صاف کرنے کے بعد حسب ضرورت دال بھگو کر پیسنا تھی، تاکہ دہی بڑے بنائے جاسکیں۔

"جی آپا بیگم۔۔۔ بس کھیر کے لیے دودھ چڑھانا باقی ہے۔" دبلی پتلی پرکشش چہرے والی مینا نے اثبات میں سرہلا کر کہا۔

"ارے ہاں۔۔۔ دیکھیے۔" تمکنت نے سیدھا ہاتھ اپنے ماتھے پر ہلکے سے مارتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ نے اچھا یاد دلایا، ہم تو بھول ہی چکے تھے۔ کھیر کے لیے دودھ تو صبح ہی چڑھادینا چاہیے، ورنہ کھیر کا اصل ذائقہ نہیں آتا۔ اب آپ ایسا کیجیے کہ یہ دال فی الحال چھوڑدیجیے اور جاکر پہلے دودھ چڑھادیجیے۔" انہوں نے کہا تو مینا میکانکی انداز میں سرہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اور ہاں دودھ ابالنے سے قبل پتیلا اچھی طرح کھنگالنا مت بھولیے گا۔" اسے کچن کی جانب بڑھتا دیکھ کر انہوں نے ہانک لگائی۔ پھر ایک لمبی، ٹھنڈی افسردگی آمیز سانس لی۔

آج رمضان کا چاند متوقع تھا۔ ویسے تو ہمہ وقت ہی انہیں اپنے بچوں کی یاد ستایا کرتی تھی، مگر کسی خاص دن یا تہوار پہ تو یہ یادیں دوچند ہوجایا کرتی تھیں۔ ابھی بھی ان کی یاد آنے پر تمکنت بیگم کا دل یک دم ہی بجھ سا گیا تھا۔ سارے ہی کاموں سے دل اچاٹ سا ہوگیا۔

تین بیٹیاں تھیں ان کی۔۔۔ تینوں ہی نیک اطوار ان ہی کی طرح سلیقہ شعار جنہیں مناسب تعلیم کے بعد انہوں نے بروقت (بلکہ وقت سے کچھ پہلے ہی) اپنے گھر کا کردیا تھا۔ بڑی دونوں طیبہ' منیبہ نے تو بلاچوں وچرا ان کے فیصلے پر سر تسلیم خم کردیا تھا۔ ہاں مگر تانیہ۔۔۔ اف اس نے انہیں بڑا پریشان کیا تھا۔ وہ آگے پڑھنا چاہتی تھی۔ اچھی قابل ممتاز طالبہ تھی' اپنے اسکول کی اور تمکنت جانتی تھیں کہ وہ ہرگز اتنا شور شرابا نہ کرپاتی' اگر جو وہ شریر' شہرام ان کا اکلوتا سپوت جس کی تانیہ سے گاڑی چھنتی تھی اس کی پشت پر نہ ہوتا۔

مگر خیر ہوا تو وہی جو انہوں نے چاہا اور پھر کچھ یہ بات بھی تھی کہ اس کے لیے آنے والا سید سجان علی کا رشتہ بھی اس قدر اچھا تھا کہ انکار کرنا کسی کو بھی مناسب اور آسان نہ لگ رہا تھا۔ یوں وہ بیاہی گئی اور کچھ ہی دن بعد پچھلی ساری نادانیاں بھول بھال اپنی نئی زندگی میں مگن ہوگئی اور شہرام جس نے ایک سو ایک نہیں پوری پانچ سو بہتر پٹیاں پڑھا کر بھیجا تھا کہ وہ کس کس طرح آگے پڑھائی جاری رکھنے کے لیے اپنے شوہر نامدار کو راضی کرسکتی ہے' اس کی ترجیحات بدلتی دیکھ کر اس سے باقاعدہ ناراض ہوگیا تھا۔ تاوقتیکہ اس کی گود میں پیاری سی گل گوتھنی سی پری نہ آگئی۔

پری کے بعد تو جیسے شہرام کی تانیہ سے ناراضی اپنی موت آپ ہی مرگئی تھی۔ ہر وقت اسے اٹھائے اٹھائے پھرتا' تانیہ سے زیادہ اسے اب پری کا انتظار رہتا تھا اور جس روز وہ اعلا تعلیم کے حصول کے لیے کینیڈا روانہ ہو رہا تھا' تمام حاضرین گواہ تھے کہ پری کو گود میں لے کر وہ باقاعدہ رو رہا تھا۔ تب ساری بہنوں نے مل کر اس کا کس قدر مذاق اڑایا تھا اور اب تو اسے اپنی تعلیم مکمل کیے بھی چھ ماہ ہونے کو آئے تھے اور وہ کسی کورس میں داخلہ لے کر مزید ایک سال کے لیے وہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ اپنے اکلوتے لخت جگر کی یاد تمکنت کی آنکھوں میں جگنو بن کر چمکنے لگی۔۔۔ اور ٹھیک اسی لمحے کوئی دبے پاؤں ان کے عقب میں آکھڑا ہوا اور چپکے سے ان کی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

"کک۔۔۔ کون۔۔۔" تمکنت بری طرح بوکھلا گئیں اور ایک جھٹکے سے نووارد کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے ہٹا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"کون ہے؟" وہ وحشت سے اونچی آواز میں کہتی اس کی جانب گھومیں۔۔۔ اور نظر کے سامنے جو چہرہ آیا۔۔۔ وہ فرط انبساط سے رو پڑیں۔ "شہرام۔۔۔ میرے بیٹے" انہوں نے اپنی کمزوری بانہیں وا کیں۔ وہ سوا چھ فٹ کا کسرتی جسامت والا "بچہ" دیوانہ وار ان کے سینے سے جا لگا تھا۔ وہ اسے بری طرح چوم رہی تھیں۔ اسی لیے دیکھ نہ سکیں کہ وہ اکیلا نہیں آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ہمیں تو یقین ہی نہیں آرہا کہ یہ ہمارے پاس ہمارے درمیان موجود ہے۔" شہرام کو آئے تین گھنٹے سے زائد وقت ہو چلا تھا' مگر تمکنت تاحال اسے خود سے لپٹائے بیٹھی تھیں۔ تینوں بیٹیوں کو بھی یہیں بیٹھے بیٹھے وجاہت صاحب سے فون کروا دیا تھا' نتیجتاً اگلے اک گھنٹے کے دوران ان کی تینوں دختران اپنی اپنی فخریہ پیش کش سمیت یہاں آن وارد ہوئیں۔ ظاہر ہے ان کا اکلوتا بھیا راجہ تھا۔ انہیں کم پیارا نہیں تھا۔ کئی سال بعد یوں اچانک واپس لوٹا تھا۔ ایسے میں بھلا ان کا اپنے گھروں میں دل لگنا تھا؟

"بے اندازہ خوشی اچانک مل جائے تو انسان یوں ہی بے یقین ہوجاتا ہے۔" طیبہ نے متانت سے مسکرا کر اپنے ازلی فلسفیانہ انداز سے کہا۔ وہ نہ صرف انداز نشست و برخاست بلکہ چہرے مہرے سے بھی ہوبہو تمکنت بیگم کا پرتو تھی۔

"آپا جان بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" یہ منیبہ تھیں' جن کا طرہ امتیاز یہ تھا کہ ان کی اپنی کوئی رائے شاید ہی کبھی رہی ہو' ان کا ہر جملہ اور عمل "آپا جان ٹھیک ہیں" سے شروع اور "امی جان نے بجا فرمایا۔" پر اختتام پذیر ہوا کرتا تھا۔ یقین نہیں آیا نا؟ ملاحظہ فرمایئے۔

"انسان اچانک خوشی ملنے پر یوں ہی بے یقین ہوجاتا ہے۔ امی جان کا رویہ اپنی جگہ بالکل درست ہے۔" انہوں نے پہلے سے سر پہ سجا دوپٹا دوبارہ اچھی طرح جما کر یہ بیان جاری کیا۔

"اوہ ہو چھوڑیں نا یہ باتیں آپ لوگ۔" ہاتھ ہلا کر تیز لہجے میں ان کی ایک جیسی باتوں پر اکتاہٹ کا مظاہرہ کرنے والی' بتانے کی ضرورت تو نہیں' یہ تابعہ تھی' جس کے سرخ و سپید چہرے پر خوب صورت اور نفیس سے اس مہمان خانے کے دوسرے کونے پر قدرے سہمے سہمے سے انداز میں کافی دیر سے چپ چاپ براجمان اس اجنبی مگر پرکشش وجود کو دیکھ کر ڈھیر سارا اشتیاق اور دبا دبا سا جوش صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ "اور یقین نہیں آرہا تو برائے مہربانی اپنے اپنے دانت اپنی کلائیوں پر گاڑ کر دیکھ لیں۔ فوراً" یقین آجائے گا۔ کیوں ابا حضور؟" اس نے شرارتاً" تائید طلب نگاہوں سے وجاہت صاحب کی جانب دیکھا' جو اس کی بات سن کر پہلے ہی گل و گلزار ہوئے بیٹھے تھے۔

"اوہو بھئی ہاہاہا۔" انہوں نے تائید کرتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "ویسے بالکل ٹھیک مشورہ دیا ہے' تابعہ بٹیا نے۔۔۔ آپ کو یقین آجائے تو پھر آگے باتیں ہوں' وگرنہ پچھلے تین گھنٹوں سے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہم آپ کے لبوں سے اسی ایک جملے کی تکرار سن سن کر نیم دیوانے ہوچلے ہیں۔"

"دیکھ رہے ہو شہرام۔۔۔" تمکنت نے بے حد برا مناتے ہوئے شکایتی نظر سے بیٹے کو دیکھا' جو مسکراہٹ بہ مشکل تمام اپنے لبوں میں دبائے بیٹھا ہوا تھا۔ "بس اسی طرح زچ کیے رکھتے ہیں' جناب پورا دن ہمیں۔۔۔ بس آپ سب گواہ رہیے کوئی دن جاتے ہیں یہ جان جلا جلا کر ہماری جان بالکل ہی نکال کر دم لیں گے۔" وہ روہانسی ہوگئیں۔

"ابا جان آپ جانتے بھی ہیں امی جان کتنی زود رنج اور حساس واقع ہوئی ہیں۔" طیبہ شاکی نگاہوں سے ہنوز مسکراتے والد محترم کی جانب دیکھ کر گلہ کرنے لگی۔ "پھر بھی آپ ان سے ایسے انداز میں گفتگو

کرتے ہیں۔ یہ تو بہت نامناسب بات ہوئی۔"
"ہاں میں جانتی ہوں آپا جان نے ٹھیک کہا۔" اس سے پہلے کہ منیبہ لب کشا ہوتی تابندہ نے جلدی سے درمیان ہی سے بات اچک لی' منیبہ جو پہلے ہی گم گو تھی منہ ہی منہ کچھ بڑبڑا کر رہ گئی۔ "اور یہ بھی بتادوں کہ ابا حضور محض مذاق کررہے ہیں اور پھر بات یہ بھی پوائنٹ کی ہے' تاکہ اگر ابا حضور' امی حضور سے مذاق نہیں فرمائیں گے تو پھر کیا پڑوس میں رہنے والی بقول امی حضور' پر کٹی کبوتری سے دل لگی کریں گے؟ اگر ایسا کیا تو پھر امی حضور کے مزید ناراض ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے یہ ٹاپک فی الحال یہیں چھوڑو اور شہرام تم جلدی سے ان کا تعارف تو کرواؤ جو اتنی دیر سے یہاں ایسے بیٹھی ہیں گویا یہاں موجود ہی نہیں ہیں۔" تابندہ نے گردن سے اس جانب اشارہ کیا۔
"آہم۔" شہرام نے ہلکے سے گلا کھنکارا' اس کا مختصر تعارف تو وہ آتے ساتھ ہی تمکنت اور وجاہت سے کرواچکا تھا۔ تاہم ہمشیرگان کے سامنے اس نے دوبارہ مفصل انداز سے بتانا شروع کیا۔
"یہ منتو.... اوہ آئی مین منتہا ہے.... یونی ورسٹی میں میری کلاس فیلو تھی۔ اس کی فیملی نے دیار غیر میں میرا بہت خیال رکھا تو اس سے بھی بہت دوستی ہوگئی۔ دراصل اسے ہمیشہ ہی سے پاکستان کے رمضان اور عید دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اب میں اس موقع پر یہاں آرہا تھا تو میں نے سوچا کیوں نہ اس کا یہ دیرینہ شوق بھی پورا کروا دیا جائے۔"
کالا سید ھا ٹراؤزر' سفید ڈھیلی ڈھالی شرٹ کے اوپر گلے میں پڑا سیاہ و سفید چیک دار مفلر' سنہری رنگت' نیلی آنکھیں' بوٹا سا قد' قدرے بھرا بھرا سا جسم' ہلکے بھورے پریشان بالوں کا بالکل چندیا پر بنایا گیا چھوٹا سا جوڑا۔۔۔ سب ہی نے اس تعارف پر بڑے غور سے ایک مرتبہ پھر اس کا مفصل جائزہ لے کر دل ہی دل میں اس اجنبی حسینہ کے لیے کوئی نہ کوئی رائے قائم کی تھی اس سے ہاں مگر وجاہت صاحب۔۔۔ انہوں نے اس کے بجائے اپنے بیٹے کا چہرہ منتخب کیا تھا' نہ صرف کھوجنے بلکہ رائے قائم کرنے کے لیے بھی۔۔۔

☆ ☆ ☆

"اب ہم کیا کہیں۔" تمکنت بیگم سونے سے قبل عادتاً" اپنا بستر جھاڑ رہی تھیں۔ چاند آج نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا ان کی تینوں بیٹیاں اب سے کچھ دیر قبل ہی ایک مزے دار سے عشائیے کے بعد بہت اطمینان سے اپنے اپنے گھر سدھاری تھیں۔ منتو محترمہ کو انہوں نے مہمان خانہ کھلوا کر وہاں بصد عزت و احترام ٹھہرادیا تھا' لیکن وہ اپنے نالائق سپوت کی اس درجہ بے باکی پر سخت نالاں بلکہ برہم دکھائی دے رہی تھیں۔
"یہ آج کل کی نئی پود تو اپنے آگے کسی کو کچھ گردانتی ہی نہیں اور ایک ہمارا زمانہ تھا حق ہا۔" وہ تکیہ جھاڑتے جھاڑتے ماضی کی کسی سنہری یاد میں کھو سی گئیں۔ "ادب آداب' شرم و حیا سماجی حدود و قیود کو خاص اہمیت حاصل تھی' لیکن بس میاں' لوگئے وہ زمانے۔" انہوں نے تکیہ زور سے پٹخا اور خود بھی جیسے تھک کر بیٹھ گئیں۔
"پر ہوا کیا بیگم.... کچھ پتا تو چلے۔" بستر پر نیم دراز وجاہت صاحب نے انجان بنتے ہوئے استفسار کیا۔ (اور یہ استفسار بھی اس ڈر سے تھا کہ کہیں "نہ" کرنے کی پاداش میں ساری رات کوئی میگھ ملہار سننے کو نہ مل جائے۔ اور ان کی اپنی آنکھیں برسنے پر مجبور کردی جائیں۔)
"اب آپ ایسے انجان بھی نہ بنیں۔" انہوں نے براماں کر ان کی جانب دیکھا۔ "بتائیں ذرا' جواں جہاں خوب صورت' اوپر سے مغربی معاشرت کی پروردہ لڑکی کو آپ کے صاحب زادے کس دھڑلے سے اپنی دوست بنا کر گھر میں لے آئے اور آپ پوچھ رہے ہیں کہ ہوا کیا؟ ارے ہمارے دل کو تو عجیب و غریب اندیشے ستا رہے ہیں۔ ہم کس کس کو جواب دیتے پھریں گے بھلا؟" وہ واقعتاً" بہت پریشان تھیں۔
"مگر آپ سے سوال کرنے کی ہمت کرے گا کون؟" وجاہت صاحب نے سوال داغا تو وہ بے طرح

چڑ گئیں۔

"کیوں؟ کیا آپ کسی جنگل میں سکونت پذیر ہیں، جو خلق خدا کے سوال و جواب کا اندیشہ لاحق نہیں۔۔۔ اور بھجوائیں باہر پڑھنے کو اکیلا لڑکا۔۔۔ ایسے ہی کسی وقت کے آجانے سے ڈرا کرتی تھی میں۔"

"آپ تو ایسے فکر مند اور مضطرب ہو رہی ہیں جیسے وہ اپنی سہیلی نہیں، بلکہ آپ کی بہو ساتھ لے کر لوٹا ہو۔" وجاہت صاحب نے ان کی فکر زائل کرنے کو، کرنی تو دل لگی چاہی تھی مگر الٹا غضب ہو گیا۔

"خدا نہ کرے وجاہت صاحب۔" تمکنت بیگم نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔ "یہ کیا آپ وقت دیکھتے ہیں، نہ موقع، بس اول فول منہ سے نکالنا شروع کر دیتے ہیں، فی الفور استغفر اللہ کہیں۔" چتون تیکھے کر کے حکم جاری کیا گیا اور حکم "حاکم" مرگ مفاجات کے مصداق وجاہت صاحب کو "فی الفور" استغفار کرتے ہی بنی، مگر کیا ان کے استغفار کرنے سے اس "بلا" نے ٹل جانا تھا؟ یہ سوچ ان کے ذہن و دل میں آئی ضرور، مگر منہ سے نکالنے کی بے وقوفی اس مرتبہ ان سے سرزد نہ ہوئی، کیونکہ ساری رات توبہ تلا میں گزارنے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

"تو فائنلی۔۔۔ تم میرے گھر میں۔۔۔"

جگہ تو اس کے لیے خیر نئی تھی، مگر اجنبیت کا احساس نام کو نہیں تھا۔ اس لیے آرام سے غسل کرنے کے بعد اس نے صاف ستھرے نفاست سے آراستہ اس کمرے کے سفید اور ہلکی نیلی چادر والے بیڈ پر لیٹ کر اپنے ہلکے نم بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سکون سے آنکھیں موندی ہی تھیں کہ اس کے فون نے پیغام موصول ہونے کا اشارہ دیا۔ اس نے جھٹ آنکھیں کھولیں اور سرعت سے سرہانے پڑا فون جس کی سم راستے ہی سے شہرام نے اسے دلوائی تھی، ہاتھ میں پکڑ کر پیغام مسکراتی آنکھوں سے پڑھا۔

"ہاں تمہارے گھر میں۔۔۔ مگر تم فی الحال دسترس سے دور ہو۔" اس کی نیلی آنکھوں کی چمک اور احمریں لبوں کی مسکراہٹ ذرا ماند پڑ گئی تھی، یہ جواب لکھتے لکھتے۔

"اتنا بھی نہیں۔۔۔ تم کہو تو حاضر ہو جاؤں؟" ساتھ ہی دانتوں کی نمائش والی اسمائلی ارسال کی گئی۔ یقیناً" وہ اس کی ذہنی کیفیت بھانپ گیا تھا۔ تب ہی اس کا دھیان ہٹانے کی غرض سے یہ پیغام بھیجا گیا تھا۔

"بلی کو ہمیشہ خواب میں چھیچھڑے کیوں نظر آتے ہیں؟" وہ اس کی شرارت سمجھ کر مسکرادی۔

"میرے ساتھ رہ کر تمہاری اردو بہت اچھی نہیں ہو گئی؟" وہ ہلکے سے ہنس دیا۔

"اردو ہی نہیں۔۔۔ میری زندگی بھی۔۔۔" ممنونیت سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"تم رونے لگی ہو؟" وہ جان گیا تھا۔

"نہیں تو۔۔۔" اس نے ہمیشہ کی طرح اپنی آنکھوں کے کنارے انگلی کی پور سے جھاڑتے ہوئے جلدی سے جواب لکھا۔ مبادا وہ یہاں آن دھمکے۔

"جھوٹ۔۔۔ میں آرہا ہوں۔" اف۔۔۔ یہ محبت کرنے والے ایک دوسرے کے متعلق اتنا درست اندازہ کیسے لگا لیتے ہیں آخر؟

"خبردار شہری! یہ بہت نامناسب بات ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں میں تمہیں پانے سے پہلے ہی کھو دوں۔" اور وہ چشم تصور سے اس کا ہراساں چہرہ دیکھ کر بڑے دل سے مسکرا دیا۔ لاکھ مغربی ماحول میں پلی بڑھی، مگر اس کی رگوں میں تو بہرحال ایک مشرقی باپ کا لہو گردش کر رہا تھا نا۔ وہ اس کے سارے ڈر اور اندیشے سمجھتا تھا۔

"ڈونٹ وری۔" اس نے لکھا۔ "میں صرف مذاق کر رہا تھا۔ اب ایسا کرو فون رکھو سائڈ پر اور اچھی بچیوں کی طرح سو جاؤ۔"

"تم مجھے یہاں تک لے آئے ہو۔" وہ تفکر سے ناخن چبانے لگی۔ "مگر تم نے بتایا نہیں کہ مجھے کرنا کیا ہو گا؟"

"یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم۔" اس نے حماقت

سے سر کھجا کر سوچا۔ تاہم یہ شان دار بات اسے بتا کر پریشان تو نہیں کر سکتا تھا' اس لیے جھٹ لکھ ڈالا۔
"کھانا ابھی اطمینان سے۔ بس اپنی نیند پوری کرو۔ یہ کام کی باتیں کل پر اٹھا رکھو۔"
"اچھا۔ اوکے پھر گڈ نائٹ.... سوئٹ ڈریمز...."
جب شہری اس قدر پر اعتماد ہے' تب اسے فکر کرنے کی واقعی ضرورت بھی کیا تھی؟ اس نے سوچا اور پھر واقعی فون واپس سرہانے رکھ کر بڑے آرام سے اپنی نیند سے بوجھل آنکھیں موندلیں۔ بلاشبہ یہ "مسز مریہ ایڈم" کے بعد اس کی اب تک کی زندگی کی سب سے پر سکون رات تھی۔
جبکہ دوسری طرف اسے تسلیاں دے کر نیند کی وادی میں پہنچانے والا خود اپنا سر فکر مندی سے تھامے بیٹھا اور سوچ رہا تھا' کوئی ایسا بے عیب منصوبہ جو اگلے تین دنوں میں اس کی "منتو" کو والدہ حضور کی "منتہا" بنا ڈالے۔

☼ ☼ ☼

"U O F T" (یعنی یونی ورسٹی آف ٹورنٹو) میں یہ شہرام کا تیسرا روز تھا۔ وجاہت صاحب کا ہمیشہ ہی سے خواب تھا کہ شہرام اپنی ماسٹرز کی ڈگری باہر کی کسی یونی ورسٹی سے حاصل کرے۔ خوش قسمتی سے شہرام کا داخلہ اس یونی ورسٹی میں با آسانی ہو گیا۔ یوں وہ آج یہاں موجود تھا۔ اس وقت وہ اپنے اس شان دار اور جدید لیکچر ہال میں اپنی کرسی پر بیٹھا بہت بے دلی اور کسی قدر بے زاری سے اپنے ارد گرد کا جائزہ لینے میں مشغول تھا۔ پروفیسر شا کا لیکچر شروع ہوئے ابھی پانچ یا سات منٹ ہی گزرے ہوں گے۔ تب ہی لیکچر ہال کے چوکھٹ میں ایک زمانے بھر کی بوکھلائی اور بکھرے بکھرے حلیے والی لڑکی نمودار ہو کر اندر آنے کی اجازت ڈرتے ڈرتے طلب کرنے لگی۔ پروفیسر نے اپنا لیکچر روک دیا۔ ساری کلاس نے بے ساختہ چونک کر ان کی جانب دیکھا۔ شہرام بھی انگلیوں میں بال پوائنٹ گھماتے ہوئے لاشعوری طور پر دلچسپی سے اسی کو دیکھنے لگا۔ جو سر جھکائے شرمندہ شرمندہ سی نظر آرہی تھی۔ پروفیسر شا نے پہلے تو اپنے دونوں کندھے اوپر کر کے چشمے کی اوٹ سے اسے گھورا۔ پھر اس کی اتری شکل پر ترس کھاتے ہوئے خاصے اکھڑے لہجے میں اسے اندر آنے کی اجازت مرحمت فرماتے ہوئے ساتھ ہی اسے آئندہ ٹھیک وقت پر ہال میں آنے پر سرزنش بھی کر دی۔ وہ کتابیں سینے سے لگائے۔ بوجھل قدم گھسیٹتے ہوئے نظریں غالباً" شرمندگی سے نیچے کیے ہال میں داخل ہو کر پروفیسر کے سامنے رکی اور اپنی "میاؤں میاؤں" جیسی آواز میں ان سے معذرت کرتے ہوئے مڑ کر نشستوں کی جانب بڑھ گئی۔
اور کہتے ہیں کہ دنیا میں وقوع پذیر کوئی واقعہ بھی اتفاق نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس روز بھی اگر "اتفاقاً" شہرام کے بالکل برابر والی نشست خالی تھی تو اس میں یقیناً" قدرت کی پلاننگ ہی کو دخل تھا۔ اس لیے وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی اس کرسی تک آئی اور کتابیں اپنے سامنے دھرتی ہوئی کرسی پر گویا ڈھے سی گئی....
اس کے بیٹھنے پر پروفیسر کا لیکچر دوبارہ شروع ہوا تو ساری کلاس بھی اسے دیکھنے کا شغل ترک کر کے پروفیسر کی جانب متوجہ ہو گئی' لیکن شہرام ایسا نہ کر سکا.... وہ دور سے اسے صرف پر کشش محسوس ہوئی تھی' جوں جوں قریب آتی گئی وہ مسحور ہوتا گیا اور جب بالکل نزدیک آ بیٹھی پھر تو گویا مبہوت ہی ہو کر رہ گیا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس نے آج سے قبل کوئی حسین چہرہ دیکھا نہیں تھا' مگر ہاں اتنا غیر معمولی اور بے پروا حسن اس نے بے شک آج پہلی مرتبہ ہی دیکھا تھا۔ بنانے والے نے کیا صورت بنائی تھی' سبحان اللہ.... سنہرے چاند سے مشابہ چہرے پر سب سے خاص اور نمایاں چیز اس کی گہری نیلی چمک دار گلابی ڈوروں والی نم آنکھیں تھیں.... مستزاد اس کی بے نیازی واہ!
"لوگ ایویں تو نہیں مغلی حسن کی تعریفیں کیا کرتے ہیں واللہ...." اس کا دل پھڑک اٹھا اور اس کے اندر نہ جانے کب سے مری پڑی ایک عدد رومانوی گلوکار کی روح جیسے پھر سے زندہ کر دی گئی۔

"ساگر جیسی آنکھوں والی... یہ تو بتا تیرا نام ہے کیا؟" وہ دھیرے سے زیر لب گنگنایا تو ساگر جیسی آنکھوں والی نے بے طرح چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

"منٹو" اس کے شنگرفی لبوں سے بے ساختہ نکلا... اور وہ اس پر ایک اچٹتی نگاہ ڈال کر دوبارہ سامنے دیکھنے لگی۔

"من... ٹو... اوہ اچھا... اچھا۔" اور وہ جو اسے بدیسی سمجھا ہوا تھا ہوش میں آکر بری طرح بوکھلا گیا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ "کینیڈین منٹو۔" اتنے حسین ہوتے ہیں اور ایک ہمارے منٹو تھے۔ محترم نے خون جگر پی پی کر اپنی اچھی خاصی صورت کا ناس مار رکھا تھا۔" وہ جانتا تھا کہ اس وقت اول فول بک رہا ہے مگر اس کے علاوہ فی الحال وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا؟

"پلیز... مجھے ڈسٹرب مت کرو۔ میں پہلے ہی پروفیسر کا اچھا خاصا لیکچر مس کر چکی ہوں۔" اس بار وہ بنا اس کی جانب دیکھے از حد رکھائی سے بولی تو شہرام فی الحال خاموش ہو گیا۔

"بائی دا وے میں آپ کو مقامی سمجھا تھا۔" لیکچر ختم ہونے کے بعد اس نے دوبارہ لب کشائی کی۔

"میں مقامی ہی ہوں۔" وہ اپنے سامنے پڑے اپنے نوٹس وغیرہ سمیٹتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

"لیکن آپ نے میرے اردو میں پوچھے گئے سوال کا جواب دیا تھا اس وقت۔" وہ بات تو تسلسل انگریزی ہی میں کر رہی تھی اس لیے ذرا الجھ کر پوچھنے لگا۔

"آپ نے سوال نہیں پوچھا تھا۔" وہ بیگ کندھے پر ڈال کر آگے بڑھ گئی۔ "آپ گانا گا کر فلرٹ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس لیے آپ کو جتانا ضروری تھا کہ میں آپ کی زبان سمجھ سکتی ہوں۔" وہ درشتی سے بولی تو بلا ارادہ اس کے ساتھ چلتے شہرام کا دماغ آن واحد میں گھوم کر رہ گیا۔

"ایکسکیوزمی مس... آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں شاید... نہ میں ایسا شخص ہوں اور نہ ہی میرا کوئی ایسا واہیات ارادہ تھا۔" اس نے غصہ دبا کر وضاحت دی۔

"ڈگریٹ۔" وہ استہزائیہ ہنسی۔ "آپ کا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ تب ہی آپ مسلسل مجھے فالو کرتے ہوئے یہاں تک آچکے ہیں۔"

"میں کیوں آپ کو فالو کرنے لگا۔" اس بار شہرام نے اپنا غصہ دبانے کا تردد نہیں کیا۔ پتا نہیں کیسی بدگمان لڑکی تھی۔ "یہاں سے باہر نکلنے کا واحد راستہ یہی ہے 'شاید آپ کے علم میں نہیں۔" اس کا لب و لہجہ بھی طنزیہ ہو گیا۔ (بڑی آئی... حسین ہو گی اپنے گھر کی۔)

"میرے علم میں سب کچھ ہے مسٹر' اچھی طرح جانتی ہوں میں آپ ایشنز کو۔ اس لیے بہتر ہو گا کہ آپ مجھ سے دور رہیں... اور مجھ پر ڈورے ڈالنے کے بجائے یہاں جو کرنے آئے ہیں وہ کریں۔" وہ منہ سے آگ اگل کر اسے ہکا بکا چھوڑ کر وہاں سے جا چکی تھی۔ اتنی معمولی سی بات پر ایسی سنگین الزام تراشی... شہرام نے اسی لمحے اس بت طناز کے لیے اپنے دل میں بے پناہ نفرت ابھرتی محسوس کی۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ بہت جلد اس نفرت نے اپنا دم توڑ دینا تھا۔

☼ ☼ ☼

ایسا نہیں تھا کہ وہ کوئی دل پھینک... آوارہ مزاج انسان تھا' بس وہ کوئی لمحاتی کیفیت تھی' جس کی سزا بھی اس نے اسی دن اچھی طرح بھگت لی' اس کے پتھریلے الفاظ کے ہاتھوں۔ اب وہ کلاس میں یا یونی میں کہیں دکھتی بھی تو وہ دیدہ دانستہ اسے دیکھ کر برے برے منہ بناتے ہوئے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیتا تھا۔ پھر ایسے ہی کئی دن بیت گئے... اور ایک روز وہ یونیورسٹی کی لائبریری کے سامنے واقع باغ کے ایک بینچ پر اپنے اردگرد سے بے گانہ بری طرح آنسو بہاتی دکھائی دی۔ وہ اسے نظرانداز کر کے آگے نکل جانا چاہتا تھا مگر برا ہو اس دل کا۔ جو اس کے ارادے کے مقابل آکر ڈٹ گیا۔

"منٹو... سب خیریت تو ہے؟" وہ جاناتو لائبریری کی

جانب جاتا تھا' مگر قدم آپ ہی آپ اس روتی بسورتی لڑکی کی جانب بڑھ گئے۔ "کیا ہوا' پلیز بتاؤ مجھے۔" وہ اتنی بے بسی سے بلک رہی تھی کہ اسے حقیقتاً" بے حد افسوس اور ہمدردی محسوس ہوئی تھی اس وقت۔۔۔

"ڈاکٹر لیتا کا اسائنمنٹ جمع کروانے کی آخری تاریخ ہے کل۔" اس نے ہاتھوں سے چہرہ ہٹا کر سسکیوں کے درمیان پہلی بار شہرام سے اردو میں بات کی۔۔۔ وہ بری طرح چونک اٹھا۔ (اوہ تو محترمہ کو اردو نہ صرف سمجھ بلکہ بولنی بھی آتی ہے۔ چہ خوب۔) تاہم اس نے اپنی حیرت ظاہر نہ کی اس پر۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اس وقت بری طرح دل گرفتہ بلکہ دل شکستہ دکھائی دے رہی تھی' ایسے میں اپنی کہنے سے زیادہ اسے سننا ضروری تھا۔

"اس الو کے پٹھے جوزی نے مجھے کہا تھا کہ تم بے فکر ہو جاؤ' میں اپنے ساتھ ساتھ تمہارا اسائنمنٹ بھی وقت پر جمع کروادوں گا۔ مگر۔۔۔" لڑکھڑاتی آواز میں یہاں تک کہہ کر وہ دوبارہ رو پڑی۔

"یہ جوزی ہے کون؟" شہرام نے مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھ کر پوری سنجیدگی سے سوال کیا۔ اس کا مسئلہ اور رونے کی وجہ وہ سمجھ گیا تھا۔

"کلاس فیلو ہے تمہاری طرح اور کون ہو سکتا ہے۔" اس نے اپنی بھیگی پلکیں اٹھا کر اپنے سر پہ متفکر سے کھڑے شہرام کو دیکھا اور ایسا دیکھا کہ شہرام کی سدھ بدھ ہی کھو دی' مگر اس واردات کا ادراک اسے بہت بعد میں جا کر ہوا۔

"اور اس الو کے پٹھے نے تمہارا اسائنمنٹ جمع نہیں کروایا ہوگا' ہے نا؟" وہ اب گھٹنوں کے بل پنچ کے نزدیک بیٹھ کر گھاس سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔

"اس ست کچھوے نے اپنا بھی نہیں کروایا۔" غالباً" اس کا دل ہلکا ہو گیا تھا۔ تب ہی ہاتھ کی پشت سے اپنا گال رگڑتی ہوئی نسبتاً" معتدل اور ہموار لہجے میں بولی۔ "لیکن اس بات سے اسے کیا فرق پڑے گا' وہ تو ملین ایر باپ کا بیٹا ہے سمسٹر میں فیل ہو بھی گیا تو اس کا باپ بڑی آسانی سے دوبارہ اس کی سمسٹر فیس بھر دے گا' مگر میرے پیچھے کون بیٹھا ہے۔" حسرت ناکی سے کہتے کہتے ایک مرتبہ پھر اس کی آواز بھرانے لگی۔ "یونی کے بعد مجھے کام پر جانا ہوتا ہے' میرے پاس تو بالکل وقت نہیں۔"

"تم پہلے ہی بہت رو چکی ہو منٹو۔" وہ ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کر کھڑا ہوا۔ "اس لیے میرا مشورہ ہے کہ اب خاموش ہو جاؤ اور بے فکر بھی کیونکہ تمہارا وہ اسائنمنٹ جو وہ جوزی ست الوجود کچھوا پلس الو کا پٹھا نہ بنا سکا۔ وہ انسانی ہمدردی کے ناتے اور کلاس فیلو ہونے کی وجہ سے تمہیں یہ شہرام حسین عرف شہری بنا کر دے گا اب۔۔۔ اور وہ بھی ایک رات میں۔۔۔ اس لیے اب خوشی خوشی اطمینان سے اپنے کام پر جاؤ۔۔ ان شاء اللہ کل یونی ہی میں ہماری ملاقات ہوگی۔ البتہ تمہارا ٹاپک کیا تھا؟ یہ مجھے ضرور بتادو اور اپنا پورا نام بھی۔۔۔" یہ حد سے زیادہ فراخ دلانہ بلکہ کسی حد تک بے وقوفانہ آفر تھی۔ لیکن اس نے منٹو کو دی' کیونکہ ابھی بتایا نا۔۔۔ کہ اس کا باغی دل اس چھ فٹیے بندے کے بس سے باہر ہو چکا تھا اور جہاں تک منٹو محترمہ کے تاثرات کا سوال رہا۔۔۔ وہ اپنا سارا رونا دھونا بھول بھال اپنی ساحر آنکھیں حیرت و تعجب سے پوری کھولے بس اسے تکے جا رہی تھی اور بس تکے ہی جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میرے والد تمہاری ہی طرح شاید یہاں پڑھنے آئے تھے اور اپنی لینڈ لیڈی جہاں وہ بطور پے انگ گیسٹ رہا کرتے تھے کی خوب صورت اور معصوم سی بیٹی یعنی میری والدہ مریہ ایڈم سے دل لگا بیٹھے۔ میری والدہ کو ایشیائی مرد بہت پرکشش اور مسحور کن لگا کرتے تھے۔ کچھ ان کی "کالی آنکھوں" کی وفاداری کے قصے بھی یہاں بے کار زیادہ ہی مشہور ہیں۔ للذا مریہ ایڈم ان کی محبت میں "ماریہ بلال خان" بن گئیں۔ میں پیدا ہوئی تو میرا نام بڑے چاؤ سے میرے والد نے منتہا بلال خان رکھا۔ نام مشکل لگا ہوگا' اس لیے اپنی آسانی کی خاطر یہاں والوں نے مجھے منٹو پکارنا شروع کر دیا۔

میں پانچ برس کی تھی مجھے یاد ہے' ویسے تو سب ٹھیک ہی تھا' پر نہ جانے ڈیڈ ان دنوں کیوں کچھ پریشان' ماما سے اکھڑے اکھڑے اور تناؤ کا شکار رہنے لگے تھے۔ انہی دنوں میرے والدین کے مابین ہونے والی تکرار پہلے معمولی جھڑپوں' بعد ازاں بڑے بڑے جھگڑوں میں تبدیل ہو گئی۔ اس وقت تو کچھ سمجھ نہیں آیا' بس سہم گئی۔ یہ تو بعد میں علم ہوا کہ وہاں پاکستان میں دادی بیمار تھیں۔ ڈیڈ کو واپس بلا رہی تھیں۔ انہیں شک تھا کہ ڈیڈ یہاں شادی کر چکے ہیں۔ اس لیے واپس آنا نہیں چاہتے۔ اب وہ انہیں اپنی جان کی قسمیں دے کر واپس آ کر اپنی بچپن کی منگیتر سے شادی کرنے پر مجبور کر رہی تھیں۔

پھر ایک روز انہیں دل کا دورہ پڑا اور ڈیڈ ہر مصلحت اور ہم دونوں کو بالائے طاق رکھ کر پہلی فرصت میں اپنی "آخرت" سدھارنے واپس چلے گئے۔ اور کچھ ہی دنوں میں انہوں نے ماما کو طلاق بھجوا دی۔ ماما کی دنیا تہ و بالا ہو گئی۔ جانتے ہو شہری عورت چاہے کہیں کی بھی کیوں نہ ہو' اپنے گھر بار کی چاہت اس کے اندر قدرت نے رکھی ہے۔ ماما اپنا گھر اجڑنے کی تاب نہ لاتے ہوئے نفسیاتی مریضہ بن گئیں۔ میری تعلیم' تربیت و پرورش کا کوہ گراں میری نانو کے ضعیف کاندھوں پر آ گرا۔ ماما کو میں نے ڈیڈ کے بعد کبھی مسکراتے نہ دیکھا۔ انہیں تو بے قصور سزا دی گئی تھی۔ کبھی کبھار میں سوچتی ہوں کیا تھا جو دادی اپنا دل اور ظرف ہمارے لیے بڑا کر لیتیں۔ تو ہم یوں برباد نہ ہوتے۔ باپ تو میرا جا ہی چکا تھا ہمیشہ کے لیے.... پر جاتے جاتے وہ مجھ سے میری ماں بھی چھین لے گیا۔

میں تمہیں بتاؤں شہری.... وہ میری صورت تک دیکھنے کی روادار نہیں تھیں۔ انہیں میری صورت میں بلال دکھائی دیتا تھا۔ اپنا اجڑا چمن اپنا خسارہ دکھائی دیتا تھا۔ میں اگر کبھی ان کے کمرے میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر جاتی تو وہ مجھ پر ہسٹریائی انداز سے مختلف چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکنا شروع کر دیتی تھیں۔ پھر نانو نے مجھے سمجھایا کہ اگر اپنی ماما کو پرسکون دیکھنا چاہتی ہو تو اس کے کمرے میں جانا ترک کر دو۔"

یہاں تک بتانے کے بعد وہ ضبط کرتے کرتے پھپک کر رو پڑی۔ اور اس کے سامنے میز کی دوسری جانب براجمان شہرام نے اس لمحے اس زمانے بھر سے خفا اور در حقیقت عدم تحفظ کا شکار لڑکی کا ہر ہر آنسو اپنے دل کی زمین پر گر کے جذب ہوتا محسوس کیا' جہاں جہاں یہ آنسو جذب ہوئے تھے ٹھیک اسی جگہ ایک ننھی سی کونپل نے سر اٹھایا تھا۔

وہ اسائنمنٹ والا واقعہ ان دونوں کے مابین دوستی کا نقطہ آغاز ثابت ہوا تھا۔ چونکہ شہرام اپنا اسائنمنٹ اپنے گروپ کے ساتھ کافی پہلے ہی سبمٹ کروا چکا تھا۔ اس لیے اس نے کسی قدر آسانی سے اپنا قول نبھا کر دکھا دیا۔ اگرچہ یونی کے بعد کا آدھا دن اور تقریباً" ساری رات اس چکر میں قربان کرنی پڑی تھی۔ لیکن یہ قربانی اس نے "کسی کو" ناکامی سے بچانے کی خاطر دی تھی۔ اس لیے باوجود بے تحاشا تھکن اور سر درد کے وہ بے حد مطمئن اور شاد تھا۔ جب اس نے اسائنمنٹ فائل منو کو تھمایا تب اس کے چہرے کے تاثرات قابل دید ہو گئے۔ بے تحاشا خوشی' بے یقینی احساس تشکر اور اپنے سابقہ رویے پر ندامت.... شہرام تو اتنے رنگوں کی قوس قزح دیکھ کر سحر زدہ سا رہ گیا۔ بہرحال اس کے بعد پتا ہی نہیں چلا کہ وہ دونوں کب کیسے اتنے نزدیک آ گئے کہ ان دونوں کے دل ایک دوسرے کی دھڑکن کے ساتھ دھڑکنے لگے۔

"میں نے ان کے کمرے میں جانا ترک کر دیا۔" اس نے ٹشو سے اپنی آنکھیں اور ناک بری طرح رگڑنے کے بعد سلسلہ تکلم وہیں سے جوڑا' شہرام سنجیدگی سے متوجہ تھا' کیونکہ میں انہیں خوش اور مطمئن دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن میری یہ چاہت ہمیشہ ادھوری ہی رہی.... کیونکہ اس کے بعد وہ صرف پانچ برس زندہ رہیں اور جب تک سانس لی.... ایسی ہی منتشر حالت میں رہیں۔ نانو واقعی ایک باہمت خاتون تھیں۔ ان کے بعد انہوں نے مجھے بہت خوبی سے سنبھالا۔ میں بہل گئی۔ زندگی کی طرف دوبارہ لوٹ آئی'

مگر میرے اندر جیسے کچھ کھو گیا۔ میں جب ہائی اسکول سے پاس آوٹ ہو گئی' تب ایک روز میری پیاری نانو۔ میری زندگی کا واحد رشتہ بھی مجھ سے منہ موڑ گیا۔ وہ شاید تھک چکی تھیں۔ ظالم زندگی نے یقیناً" ان کی ہمت سے زیادہ بوجھ ان کے ناتواں کاندھوں پر ڈال دیا تھا۔" اس کی نیلگوں آنکھیں خلاؤں میں کوئی غیر مرئی منظر تلاش کر رہی تھیں غالباً"۔

"اور تمہارے فادر..." شہرام کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "انہوں نے کبھی تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی؟"

"جو از خود سارے رابطے ختم کر کے گئے ہوں' وہ دوبارہ پلٹ کر نہیں آیا کرتے شہری۔" اس نے زخمی نگاہوں اور زخم زخم ہی لہجے میں کہا۔ "اب میں بھری دنیا میں اکیلی ہوں۔ میرا کوئی نہیں... لیکن شاید میں خوش ہوں' کیونکہ زندگی سے میں نے سیکھا ہے کہ رشتے انسان کو دکھ دیتے ہیں۔" وہ اس بار روئی نہیں۔ عجیب سے مضبوط مگر کرلاتے لہجے میں کچھ ایسے بولی کہ شہرام کا دل ہل کر رہ گیا۔

"آج تو کہہ دیا ہے۔" بلا ارادہ اس کے منہ سے نکلا۔ "مگر آج کے بعد مت کہنا کہ تم اکیلی ہو' کیونکہ میں آج سے اپنی زندگی کا ہر لمحہ تمہارے نام کرتا ہوں۔ بولو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟" وہ اپنی ساحر آنکھیں' اس کی سمندر آنکھوں میں ڈالے سراپا سوال بنا اور ہاں... یہ نظارہ بھی آسمان و زمین نے ایک ساتھ دیکھا کہ ساحر کی ساحری سمندر کے تلاطم پر غالب آ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"برخوردار! کیا یہی ہے وہ "کورس" جس کی خاطر آپ اپنی پڑھائی ختم ہونے کے بعد بھی ایک سال مزید وہاں ٹھہرنے کا سامان کیے ہوئے ہیں۔" وجاہت صاحب نے باتوں باتوں میں یک دم ہی سوال داغ دیا۔

آج رمضان الکریم کی چاند رات یقینی تھی' پھر بھی وہ لوگ چاند کی کھوج میں بڑے اہتمام سے چھت پر جا کر چاند کو تلاش کر رہے تھے۔ مغرب ہونے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ سارا دن تابڑ توڑ گرمی برسانے کے بعد شاہ خاور اب کچھ معتدل موڈ میں واپس آ چکے تھے۔ ان کا موڈ درست ہوتا دیکھ کر ٹھنڈی مست ہوا نے بھی چل پڑنے کی جسارت کر لی تھی۔ یوں بھی کراچی کی شام تو اکثر سہانی ہی ہوا کرتی ہے۔ چھت کے ایک کونے میں دھری پلاسٹک کی سفید میز کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھی منٹو کالے کرتے پاجامے میں سر پہ سفید و سیاہ پرنٹڈ دوپٹا اوڑھے' اپنے برابر والی کرسی پر براجمان' گلابی دوپٹا نماز کے سے انداز میں باندھے اور ہاتھ میں پکڑی تینتیس دانوں والی تسبیح مسلسل گھماتی ہوئی تمکنت بیگم سے ان کی زبانی کوئی بہت ہی دلچسپ قصہ بڑے اشتیاق و انہماک سے سن رہی تھی۔ مینا کچھ دیر پہلے ٹیبل پر چائے اور دال موٹھ رکھ گئی تھی۔ اب خود بھی سر پہ دوپٹا ڈالے چھت کی مغربی دیوار کے قریب کھڑی متلاشی نگاہوں سے آسمان کی جانب سر اٹھائے دیکھ رہی تھی۔ جبکہ وجاہت صاحب اپنے لخت جگر کے ساتھ بڑی ساری چھت پر دھیرے دھیرے ٹہلنے کا شغل فرما رہے تھے اور کافی دیر پہلے ہی بھانپ چکے تھے کہ موصوف موجود تو ان کے ساتھ ہیں' مگر ان کا سارا دھیان ماں کے پہلو میں اٹکا ہوا ہے۔

"آں... اوں... آں وہ..." اچانک سوال پر وہ بری طرح گڑبڑا کر رہ گیا۔ "وہ... دراصل وہ..."

"بس... بس... ٹھیک ہے۔" وجاہت صاحب نے محظوظ نگاہوں سے اس کا رنگ اڑا چہرہ دیکھا۔ تاہم سنجیدگی اپنے لہجے سے جانے نہ دی۔ "آپ کا جواب ہمیں مل گیا۔ لیکن کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ انہیں گھر تک لے آنے کی اتنی جلدی کیا تھی؟" اور وہ تو پہلے ہی والد محترم کے سامنے اپنا اتنا بڑا راز افشا ہو جانے پر شرمندگی سے ٹھوڑی سینے سے لگائے کھڑا تھا۔ اس دوسرے "برننگ کوئسچن" پر تو بس سجدے میں گرنے کی کسر رہ گئی۔ اور اس سے پہلے کہ اس سے کوئی جواب بن پڑتا مساجد سے سائرن بجنے کی آوازیں سنائی

دینے لگیں۔

"آہا۔ آپا بیگم۔۔۔ دیکھیے۔۔۔ وہ رہا چاند۔" ساتھ ہی مینا کی سرخوشی سے چہچہاتی آواز سنائی دی۔ وہ انگشت شہادت سے افق کی جانب اشارہ کرتے ہوئے انہیں متوجہ کر رہی تھی۔ تمکنت بیگم نے اپنا قصہ ادھورا چھوڑ کر چونک کر بدقت تمام دکھائی دیتے دھندلے سے ہلال کو دیکھا اور اپنے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز سے بلند کر دیے۔

منٹو کے لیے یہ سب نیا' انوکھا اور متاثر کن تھا۔

مریہ ایڈم نے بھلے سے اسلام بلال خان کے لیے قبول کیا تھا' لیکن بعد میں نہ صرف اس مذہب کو دل سے اپنایا تھا' بلکہ اسلام کی بنیادی تعلیمات بھی بڑے ذوق و شوق سے حاصل کی تھیں۔ وہ روزے بھی رکھتی تھیں' نماز بھی ادا کرتی تھیں۔ بلال کے بعد وہ ٹوٹ ضرور گئی تھیں' مگر تب بھی انہوں نے اپنا مذہب دوبارہ تبدیل نہیں کیا تھا۔ ہاں البتہ وہ خود کو دوبارہ "مریہ ایڈم" کہلوانے لگی تھیں اور یہ عمل ان کے بے بسی آمیز غصے کے علاوہ اور کسی چیز کی عکاسی نہیں کرتا تھا۔ بچپن میں بلال بڑے مسحور کن انداز سے منٹو کو مشرقی معاشرت کے قصے' وہاں کی زمین سے جڑی کہانیاں الف لیلوی داستانیں وغیرہ سنایا کرتے تھے۔ وہ لاشعوری طور پر ہمیشہ ہی سے مشرق کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی متمنی رہی تھی اور آج جب وہ ساری روایات و طرز معاشرت آنکھوں کے سامنے حقیقت کا روپ دھارے موجود تھا تو اس کی خوشی کا عالم دیدنی تھا۔

تمکنت بیگم کی دیکھا دیکھی اس نے بھی بالکل ان ہی کی طرح لیکن ذرا جھجکتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں چہرے کے سامنے لا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے انداز میں ایک جذب تھا' عقیدت مندی تھی اور اس کے عقب میں اس سے ذرا دور کھڑے شہرام نے یہ منظر بہت طمانیت اور پرامید نظروں سے دیکھا تھا۔ اور خود بھی رب کے حضور دعا مانگنے کے لیے ہاتھ بلند کر دیے۔

"اے اللہ۔ اگر اسی میں ہم سب کی بہتری ہے تو اس بچی کے لیے تمکنت کے دل میں نرم گوشہ پیدا کر دے۔۔۔ تو رب رحیم ہے' نیتوں کے حال خوب جانتا ہے۔ ہماری نیتیں ہمارے اعمال سے بھی زیادہ اچھی کر دے۔ آمین ثم آمین۔" وجاہت صاحب کی آنکھوں میں ان سب کو باری باری دیکھ کر تفکر اکٹھا ہو رہا تھا۔ تاہم لب ان کے بھی دعا گو تھے اور کیا معلوم۔۔۔ آج کس کی دعا نے بارگاہ الٰہی میں مستجاب ہونا تھا؟

☆ ☆ ☆

رمضان کیا شروع ہوئے گویا چہار اطراف نور کی چادر سی تن گئی۔ سحری کی رونق' نماز و تلاوت کے ساتھ ساتھ نماز تراویح کا اہتمام' افطار کی گہما گہمی و مسرت اور دن رات تو جیسے ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑنے لگے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پتا بھی نہیں چلا اور عشرہ رحمت کے پانچ روز یونہی بیت بھی گئے۔ وقت بہت تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا اور یہ گزرتا وقت' شہرام کی بے چینی' فکر اور وجاہت صاحب کی تشویش میں بے پناہ اضافے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر رہا تھا اور اس سے پہلے کہ ان کا بھانڈا بڑے غلط انداز میں تمکنت کے سامنے پھوٹ پڑے اسے جلد ہی کچھ کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم پاگل ہو؟" شہرام کے منہ سے سارا ماجرا سننے کے بعد بے انتہا' بے یقینی سے اسے دیکھتی تابیہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ دراصل ساری رات ہر ہر پہلو سے اپنے اس نازک معاملے پر اچھی طرح غور و غوض کرنے کے بعد شہرام اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اب "بیرونی امداد" لیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔۔۔ بس پھر کیا تھا۔ صبح جلدی اٹھا اور سیدھا تابیہ کے گھر چلا آیا۔ پری کی چونکہ اسکول سے چھٹیاں تھیں' اس لیے وہ اپنے کمرے میں آرام سے سو رہی تھی۔ سبحان ظاہر ہے کہ آفس جا چکا تھا اور وہ اس کے لاؤنج میں بیٹھا اپنے دکھڑے رو رہا تھا۔

"عشق نے غالب پاگل کر دیا۔" بڑے فخر سے

دانت نکال کر تسلیم کیا۔ ذرا جو شرمندہ ہوا ہو۔

"غالب کو تو نکما کیا تھا۔" اس نے گھور کر تصحیح کی۔

"چلو تو مجھے پاگل کر دیا۔ اب بھئی اپنے اپنے مزاج کی بات ہوتی ہے۔" کندھے اچکا کر اپنے آپ کو مزید لاپروا ظاہر کیا' ورنہ سچ تو یہ ہے کہ تابیہ کے تاثرات کی سنجیدگی نے تو اسے اندر ہی اندر بے پناہ خوف زدہ کر دیا تھا۔

"ویسے تمہیں اتنا تھرڈ کلاس فلمی آئیڈیا آیا کیسے۔" تابیہ نے ناراضی آمیز تیز نگاہ اس پر ڈالی۔

"ظاہر ہے فلموں ہی سے آیا ہے یار۔" وہ اس بار اس کی جرح پر اکتا کر بولا۔ "میں نے سوچا اچھا ہے' تاکہ پہلے وہ امی جان کا دل اپنی خدمت اور سگھڑاپے سے جیت لے۔"

"ہونچ..." تابیہ نے از حد تاسف سے بلکہ ترحم آمیز نگاہوں سے اسے دیکھ کر نفی میں سر ہلایا۔ "تف ہے تمہاری عقل پر شہرام... تمہیں کیا لگتا ہے۔ امی جان اس جیسی ماڈرن لڑکی کے نادیدہ سگھڑاپے سے متاثر ہوں گی؟"

"تو کیا نہیں ہوں گی؟" اس نے سر کھجا کر بے چارگی سے استفسار کیا۔

"پہلے یہ بتاؤ' کیا وہ سگھڑ ہے؟" تابیہ نے طنزیہ پوچھا۔

"ہاں یار..." اس بار اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔ "اپنے گھر کا سارا کام خود کرتی ہے۔ کھانا بھی پکا لیتی ہے۔"

"تم بات سمجھ نہیں رہے شہرام۔" تابیہ ذرا زچ ہو کر بولی۔ "امی جان اپنے دارالحکومت میں بھلا ایک چند روزہ مہمان سے کام کیونکر کروائیں گی؟ اور بالفرض محال امی نے اس کے اصرار پر یا کسی بھی وجہ سے اسے کچھ کرنے کا موقع اگر دے بھی دیا تب بھی متاثر ہرگز نہیں ہوں گی اور سب سے اہم بات..." اس مرتبہ تابیہ کے لب و لہجے میں سنجیدگی کا عنصر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ "انہوں نے اپنی اکلوتی بہو کے حوالے سے کچھ خواب دیکھ رکھے ہیں۔ کئی ارمان ہیں ان کے اور میں یہ بتا کر تمہارا دل نہیں دکھانا چاہتی' مگر کیا کروں دکھانا پڑے گا۔" اس نے تیز تیز آنکھیں جھپکیں۔ "کہ تمہاری منتو اس خاکے پر پوری نہیں اترتی جو امی نے بہو کے حوالے سے اپنے ذہن میں بنا رکھا ہے۔"

"یہ ساری باتیں یقیناً" میرے ذہن میں تھیں۔" اس نے تابیہ کی پوری بات توجہ سے سن کر کہنا شروع کیا۔ "اور میں اسی لیے یہ چاہ رہا تھا کہ اچھا ہے' تاکہ پہلے امی کے دل میں منتو کی جگہ بن جائے' تب..."

"تم کتنے کی دم ہو۔" تابیہ بھڑک گئی۔

"اور تم تمکنت بیگم کی سب سے بدتہذیب بیٹی۔" اسے بھی غصہ آگیا۔ کیسے نہ آتا آخر کو بڑا بھائی تھا۔

"اچھا... سوری..." شہرام کے چہرے پر سرعت سے پھیلتی طیش آمیز ناراضی دیکھ کر تابیہ کو اپنے نامناسب لہجے کا احساس ہوا تو جلدی سے معذرت کرتے ہوئے سمجھانے والے لہجے میں بولی۔ "میں تو تمہیں صرف یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ یہ ہونا ناممکن ہے۔"

"انسان اگر کچھ کرنے کی ٹھان لے تو کچھ بھی ناممکن نہیں تابیہ۔" وہ پرعزم اور پختہ لہجے میں اس کی بات سے اختلاف کرتا ہوا بولا۔ "تم صرف یہ بتاؤ... کیا تم میرا ساتھ دو گی؟" اس نے سوالیہ' پرامید نگاہوں سے تابیہ کی جانب دیکھا۔ تو تابیہ سمجھ گئی کہ وہ اب کچھ بھی سمجھنے' سمجھانے کے مرحلے سے بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ اس لیے ٹھنڈی سانس لے کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ تمکنت کا خوف اپنی جگہ' مگر وہ اس کا ساتھ دینے سے پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آنٹی! میں اندر آجاؤں؟" منتو نے تمکنت کے کمرے کا کھلا ہوا دروازہ ہلکے سے بجا کر اجازت طلب کی تو وہ اپنے بستر پر دھلے کپڑوں کے ڈھیر کے درمیان بیٹھی تھیں' نے چونک کر اپنا سر اٹھایا۔

"اچھا... آپ ہیں۔" وہ ہلکے سے مسکرائیں۔

"آجائیں بیٹا۔۔۔ یہ ہم ذرا اپنے دھلے کپڑے تہ کر رہے تھے۔" انہوں نے بستر کے کنارے سے کپڑے ہٹا کر اس کے لیے جگہ بنائی۔

"آپ اپنے کپڑے خود دھوتی ہیں۔ لانڈری نہیں بھیجتیں۔" اس نے محتاط انداز سے کنارے پر ٹک کر بات برائے بات کی غرض سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ ہم اپنے تمام کپڑے اپنے ہاتھ سے بالٹی میں بھگو کر دھوتے ہیں۔ ہمیں مناسب نہیں لگتا کسی اور سے یہ کام کروانا۔۔۔ البتہ وجاہت صاحب کے کپڑے اور دیگر کپڑے چادریں وغیرہ دھوبی لے جاتا ہے۔" انہوں نے اپنی دھلی ہوئی قمیص ہلکے ہاتھ سے جھٹکی۔ پھر اپنے سامنے بچھا کر اس کی شکنیں دور کرتے ہوئے بتایا، منتو بہت دلچسپی اور انہماک سے سارا عمل ملاحظہ کر رہی تھی۔

"آپ ہاتھ سے کپڑے دھونے میں اتنی محنت کرتی ہیں خواہ مخواہ، اس سے تو اچھا ہے واشنگ مشین ہی لگالیا کریں۔" اس کے ذہن میں ایک خیال آیا تو اظہار کر گئی۔

"نہ بیٹی!" وہ ناگواریت سے بولیں اور احتیاط سے قمیص کو پہلے دائیں اور پھر بائیں جانب سے اندر کی طرف موڑا۔ "ہمیں نہیں اچھا لگتا مشین میں کپڑوں کو گتھم گتھا کروانا۔ ایک کا رنگ، میل نہ جانے کیا کیا چڑھ جاتا ہے، دوسرے پر۔۔۔ اور پھر ہمیں تو شروع ہی سے عادت رہی ہے کپڑے ہاتھ سے دھونے کی۔"

"بہت محنت کرتی ہیں آپ۔" وہ سخت متاثر ہوئی۔

"ہاں۔۔۔" وہ تفاخر سے مسکرائیں، مگر انکساری سے بولیں۔ "بس بیٹی، وہ عورت ہی کیا جو گھر گرہستی کو خوش اسلوبی سے نہ سنبھال سکے۔ پر آپ شاید اس لیے اتنی حیران ہو رہی ہیں کیونکہ وہاں آپ نے یہ سب کچھ نہ دیکھا ہوگا۔ دراصل مغرب کی عورت نے اپنی زندگی کا محور باہر کی دنیا کو بنا رکھا ہے۔ اس لیے اسے گھر بنانے اور سنوارنے سے کیا دلچسپی۔۔۔" انہوں نے تہ کی ہوئی قمیص پہلے سے تہ شدہ کپڑوں کے ڈھیر پر احتیاط سے جماتے ہوئے نامحسوس جتاتے لہجے میں کہا۔

"ایسی بات نہیں آنٹی۔" وہ اس اثنا میں کپڑے تہ کرنا سیکھ گئی تھی۔ (کپڑے وہ خیر پہلے بھی اپنے تہ کر کے ہی الماری میں رکھتی تھی، تاہم اتنی نفاست سے نہیں۔) اس لیے کپڑوں کے ڈھیر میں سے ایک قمیص نکالتے ہوئے نرم لہجے میں ان کے تجزیے سے اختلاف کرتے ہوئے بولی۔ "ویسے عام تاثر یہی ہے، جو آپ نے ابھی کہا۔ لیکن وہ کیا کہتے ہیں۔۔۔" اس نے قمیص بالکل انہی کی طرح جھٹکی تو اس کی آواز پر انہوں نے چونک کر اپنا سر اٹھایا۔

"پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔" وہ مسکرا کر بولی، مگر تمکنت کی توجہ اس قمیص کی جانب زیادہ تھی، جو وہ تہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی، اس لیے اس کی بات ان سنی کر کے جلدی سے بولیں۔

"ارے بیٹی۔۔۔ یہ آپ کیا کرنے لگیں۔ رہنے دیں۔ ابھی مینا آتی ہوگی باورچی خانے سے، وہ ہمارے ساتھ مل کر کروا لے گی۔" انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ سے قمیص لینی چاہی، مگر منتو نے ہاتھ اٹھا کر انہیں نرمی سے ٹوک دیا۔

"کوئی بات نہیں آنٹی۔ مجھے آپ کا کام کر کے خوشی محسوس ہوگی۔ پھر آپ کا یہ تاثر بھی تو غلط ثابت کرنا ہے، ناکہ مغربی لڑکیاں۔۔۔ گھر کے کام نہیں کر سکتیں۔" وہ بات کے اختتام پر شریر انداز سے مسکرائی تو تمکنت لاجواب ہو کر مسکرا بھی نہ سکیں۔

"مگر آپ ہماری مہمان ہیں بیٹی۔" انہوں نے نیا اعتراض ڈھونڈ نکالا۔

"تین دن گزر چکے آنٹی۔" وہ بہت بھرپور انداز سے مسکرائی اور ان سے زیادہ تیزی سے، لیکن بالکل انہی کی طرح ان کی قمیص تہ کر کے رکھ بھی دی۔ تمکنت نے بڑی گہری نظروں سے یہ عمل اور اس کے چہرے کی جاندار مسکراہٹ دیکھی، مگر اس بار بولیں کچھ نہیں۔ یوں بھی "اس سے" کہہ سن کر انہیں کرنا بھی کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"دہلی والوں کا آلو گوشت بنانا آتا ہے؟" تابیہ نے اپنے سامنے کچھ گھبرائی سی بیٹھی منتو سے پرسوچ لہجے میں استفسار کیا تو وہ بے ساختہ اچھل پڑی۔

"دہلی والوں کا آلو گوشت۔" اس نے زیر لب دہرا کر جھرجھری لی۔ "مائی گاڈ تابیہ! یہ تم کیسی خوف ناک باتیں کررہی ہو؟" اس کی نیلگوں آنکھیں دہشت سے پھیل کر اس کا اچھا خاصا چہرا انگریز بھوتنی جیسا بنا چکی تھیں۔ آج شہرام اسے لے کر بطور خاص تابیہ کے ہاں آیا تھا۔ تاکہ اطمینان سے اس مسئلے پر سوچ و بچار کی جاسکے۔

"او میرے اللہ!" تابیہ نے تلملا کر آسمان کی جانب دہائی دینے والے انداز سے دیکھا۔ "کہاں پھنس گئی ہیں۔" اس کے انداز پر منتو کا چہرا اتر گیا۔ اس نے یقیناً" تابیہ کی بات سے غلط معنی اخذ کیے تھے۔ صورت حال سنگین تھی۔ لیکن شہرام کا قہقہہ بے ساختگی سے نکل گیا۔

"ہاں بھئی ساری فکر ہمارے سر جو تھوپ دی ہے۔" تابیہ نے ناراض نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"بس اب تم تو صرف قہقہے ہی لگاؤ۔"

"شدید ذہنی تناؤ اور تفکر کے وقت قہقہہ لگانے کی افادیت جدید تحقیق سے ثابت شدہ ہے۔ بس ذرا وہی پریکٹس کررہا تھا۔" اس نے سنبھل کر جلدی سے بات بنائی' مبادا وہ واقعتاً" ناراض ہوجائے۔ یوں بھی آج کی یہ "خفیہ میٹنگ" بڑی دقتوں سے ہورہی تھی۔ منتو کو اس نے کل رات ہی تابیہ کے اپنے ہم راز ہونے کے متعلق بتایا تھا۔ وہ تو سن کر حد درجہ پریشان اور مختلف خدشات کا شکار ہوگئی تھی۔ لیکن اب تابیہ کے دوستانہ اور نرم رویے نے اس کا اعتماد کسی حد تک بحال اور الجھن دور کردی تھی۔

"اچھا۔۔۔ اچھا ٹھیک ہے اپنی علمیت کا خواہ مخواہ رعب مت ڈالو مجھ پر۔" اس نے بے پروائی سے ہاتھ ہلایا اور ایک مرتبہ پھر اس دوران گم صم صورت بنائے بیٹھی منتو سے دوبارہ مخاطب ہوکر وضاحت سے اپنا سوال دہرایا تو اس نے مجرمانہ انداز سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ہوں۔۔۔" تابیہ نے پرسوچ انداز میں ناک پر انگلی رکھی۔ "دہلی والوں کی بریانی؟" ہرچند کہ جواب اس کے چہرے سے عیاں تھا' مگر پھر بھی۔ منتو نے بے چارگی سے ایک بار پھر گردن ہلا کر دزدیدہ نگاہوں سے شہرام کے چہرے کے تاثرات جانچے۔ (اوف۔ یہ مجھے کتنا پھوہڑ سمجھے گا۔)

"دہی بڑے؟" اگر کوئی امید پہلے سوالیہ لہجے میں تھی بھی تو اب دم توڑ چکی تھی۔ اس بار جواب نہیں دیا۔ بس شرمندگی سے لب چبانے لگی۔

"ہم تو کہہ رہے تھے کہ اسے کوکنگ آتی ہے۔" طنزیہ' جتاتی نگاہیں ہونق بنے شہرام پر ڈال کر تابیہ بولی۔

"نسبتاً" آسان کھانے تو اسے بنانے آتے نہیں' کیا خاک کوکنگ آتی ہے؟"

"اب تم اس سے اتنے خالص دیسی قسم کے کھانے تو ایکسپیکٹ مت کرو یار۔" شہرام احتجاجاً" بولا۔

"یہ سراسر زیادتی ہے اور یہ میں نے بالکل سچ کہا تھا۔ یہ وہاں پر اپر کوکنگ کرتی ہے۔ کیوں بتاؤ نا کیا پکاسکتی ہو تم ایسے خاموش کیوں بیٹھ گئی ہو۔" اس نے ہمت افزا لہجے میں اسے ڈپٹا۔

"ہاں مجھے کوکنگ آتی ہے۔ مگر میں یہ والے کھانے اتنے اچھے نہیں پکاسکتی۔" اس کی پہلے سے ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنی نااہلی پر آنسو بہہ نکلے۔ پاکستانی ہوتی تو اپنی نااہلی کے باضابطہ اعلان پر بھی بھنگڑے ڈالتی' مٹھائیاں تقسیم کرتی۔ مسرت کا اظہار کرتی' مگر تھی نا کم فہم' بے عقل وغیرہ وغیرہ۔

"تو پھر کیا اچھا پکاسکتی ہو' وہ بتاؤ نا پگلی۔" اس کے آنسوؤں نے تابیہ کو اپنے لہجے کی درشتی کا احساس دلایا تو اس بار ملائمت سے اسے مخاطب کرکے پوچھنے لگی۔

"ہم سب یہاں تمہارے مسئلے کا کامیاب حل ہی تو تلاش کرنے کے لیے بیٹھے ہیں' اب تم ہی ایسے ہمت چھوڑ دوگی تو کیسے چلے گا۔" وہ اپنی نشست سے

اٹھ کر اس کے ساتھ آ بیٹھی اور اسے حوصلہ دینے کے لیے خود سے لگالیا اور تابندہ کے اتنے سے عمل نے اس کے چہرے کو یوں گل و گلزار کرڈالا کہ اسے محویت سے تکتے شہرام کو اپنی روزے دار نگاہیں اس پر سے فی الفور ہٹاتے ہی بنی۔ وہ بالوں پر ہاتھ پھیر کر منہ ہی منہ کچھ بدبدانے لگا۔

"اب تم کیا کہہ رہے ہو۔ ذرا اونچی آواز میں بولو بھائی۔" تابندہ نے استفسار کیا تو وہ جھٹ بولا۔

"ارے کچھ نہیں یار' ہاں تم بتاؤ نا جلدی کہ کیا کیا کچھ پکا سکتی ہو؟"

"تھیں چائنیز' اٹالین' امریکن فاسٹ فوڈز وغیرہ بنالیتی ہوں اچھے۔ اکچوئلی میں نے کافی عرصہ ایک ایوریج قسم کے فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں بھی کام کیا ہے اپنے ہائی اسکول کے زمانے میں۔۔۔" اس نے اس بار کسی قدر پر اعتماد بلکہ تفاخر آمیز لہجے میں جتایا۔ تو تابندہ کو خوش گوار حیرت ہوئی۔

"ارے۔۔۔ یہ تو بہت اچھا ہو گیا۔"

"واقعی؟" شہرام کے بھی دانت نکلے۔

"ہاں نا۔" اس نے زور و شور سے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ "اب دیکھو امی جان کو تو یہ سب کلنٹیننٹل کھانے وغیرہ بنانا آتے نہیں۔ ہو سکتا ہے منتو انہیں یہ ساری ڈشز بنا کر متاثر کرنے میں کامیاب ہو جائے۔" اس نے ذرا پر جوش ہو کر حکمت کے متعلق سراسر خوش گمانی سے سوچنا چاہا۔ اور فی الوقت ان لوگوں کے پاس اس خوش گمانی یا خوش فہمی سے کام لینے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ تھا بھی تو نہیں۔ ایک صریح حماقت شہرام سے سرزد ہو چکی تھی۔ اب بات سنبھالنے کے لیے حماقت در حماقت کیے بغیر چارہ نہ تھا۔

"لیکن مجھے نہیں لگتا کہ آنٹی کو امپریس کرنا اتنا آسان ثابت ہو گا۔" منتو نے خدشات سے پر آواز میں کہا۔

"اور پھر اسے اپنا یہ سگھڑاپا دکھانے کا موقع ملے گا کیسے؟ امی تو اسے مہمان سمجھتی ہیں' وہ کیوں بھلا اسے کچن میں گھسنے دیں گی؟" شہرام نے منتو کے خدشات سے اتفاق کرتے ہوئے بات آگے بڑھائی تو تابندہ کی جان جل کر رہ گئی۔

"سب تمہارا کیا دھرا ہے۔" اس نے سخت نگاہوں سے شہرام کو گھورا۔ "یہ سب تو پہلے سوچنے والی باتیں تھیں نہ جو تم سے سوچی نہیں گئیں اور لے آئے اس بے چاری کو "دل والے دلہنیا۔۔۔" کا شاہ رخ خان بنا کر کہ جی پہلے لڑکی میرے گھر والوں کا دل جیت لے اس کے بعد میں مزے سے اس کے اور اپنے درمیان رشتے کا اعلان کردوں گا تو کسی کو کوئی اعتراض نہ ہو گا واہ جی! ایسا بھلا اصلی زندگی میں کہیں ہوتا ہے؟ ارے پہلے ہمیں اعتماد میں لے کر یہ راز کی بات بتاتے تو سہی یہاں آنے سے پہلے۔۔۔ ہو سکتا تھا کوئی بہتر راستہ نکل آتا۔" وہ عمر رسیدہ بے بس عورتوں کی طرح ہاتھ نچا نچا کر دل جلے لہجے میں بولتی چلی گئی۔ منتو کی ذہنی حالت عجیب سی ہونے لگی۔ اس کا احساس جرم بڑھنے لگا۔ اس کی محبت شہرام کے لیے کیسا بوجھ بن گئی تھی۔

"اب تو جو ہونا تھا ہو گیا نا۔" شہرام ذرا غصے سے بولا۔ "ساری فکر تو یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے؟" چند ثانیے یونہی خاموشی کی نذر ہو گئے۔ تب ہی ڈرائنگ روم کا دروازہ اچانک ایک زور دار دھماکے سے کسی نے کھولا۔ وہ تینوں ہی بے ساختہ اچھل پڑے۔

"ماما۔۔۔ آپ کب آئے۔ مجھے جگایا کیوں نہیں۔" بے انتہا جوش' مسرت و جذباتیت سے پری صاحبہ ابھی بھی نیند کے خمار سے بوجھل اپنی آنکھیں رگڑتی ہوئی آئی اور بھاگ کر شہرام کی گود میں چڑھ گئی۔

"ارے میری لال پری۔" شہرام نے بھی والہانہ اسے گود میں بھر کر اس کے سرخ سیب جیسے گال چٹاچٹ اپنے مخصوص انداز میں چوم کر سائڈ میں رکھا بڑا سارا چاکلیٹ' جو یہاں آتے وقت ہمیشہ بطور خاص وہ اسی کے لیے لے کر آیا کرتا تھا' اس کے حوالے کیا تو اس معصوم کا چہرہ چمکتا ستارہ بن گیا۔ کچھ دیر کے لیے سب ہی کی توجہ اس کی جانب مبذول ہو گئی۔

"یہ بلیو آئیز والی آنٹی کون ہیں ماما؟" اسے کچھ دیر

بعد خیال آیا تو شہرام ہی سے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے استفسار کیا۔ اس کے سامنے وہ تابندہ کو یونہی نظرانداز کیا کرتی تھی۔ شہرام سوالیہ نظروں سے تابندہ کی صورت دیکھنے لگا۔

"یہ بھی تمہاری طرح فیری ہیں بیٹا۔" تابندہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا۔ "ایک ایسی فیری جو بہت مشکل میں پڑ گئی ہے' مگر ہمیں یقین ہے کہ تمہاری دعا میں انہیں پرابلم سے نکال دیں گی پیاری پری۔ کیا تم ان کے لیے دعا کرو گی؟" پری نے کچھ دیر معصومانہ تاسف سے اس کا چہرہ دیکھا۔ پھر پورے جوش و خروش سے سر اثبات میں ہلا کر بولی۔

"وائے ناٹ امی۔ ویسے بھی یہ مجھے بہت پسند آئی ہیں۔" اس کا لہجہ اتنا بے ساختہ اور پیارا تھا کہ سب ہی ہنس دیے۔ اور ٹھیک اسی لمحے تابندہ کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔

✡ ✡ ✡

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو ڈیر پری۔ ہیپی برتھ۔" نانا' نانی' خالاؤں اور ماما وغیرہ کی پرجوش تالیوں کے شور میں گہرے نیلے پریوں کے سے لباس میں خوشی و جوش سے تمتماتے چہرے والی پری نے پنک' وائٹ اور ریڈ فیری ہاؤس جیسے شاندار کیک پر سجی پانچ عدد اسپارکنگ کینڈلز کے بجھتے ہی فانٹ کیک پر چھری پھیرنے کے بعد' چھری فورا" پاس کھڑی تابندہ کے حوالے کی اور خود بھی ان کے ساتھ مل کر تالیاں پیٹنے لگی۔

"پری کی سرپرائز برتھ ڈے پارٹی۔ منٹو کی طرف سے۔" کا کارگر آئیڈیا دراصل انہی کی والدہ محترمہ کا تھا۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے کے بجائے انہیں کچھ تو کرنا ہی تھا' تو یہی سہی۔ سارا مسئلہ اس برتھ ڈے پارٹی کے لیے تمکنت کو راضی کرنے کا تھا۔ سو اس دشوار کام کو آسان بنانے کے لیے وجاہت صاحب سے رجوع کیا گیا۔ وہ راضی تو ہو گئے۔ تاہم خود بھی اپنی کامیابی پر زیادہ پرامید نہیں تھے۔ لیکن بہرحال ایک کوشش انہوں نے کل صبح بعد از سحری کی کہ شہرام یہ برتھ ڈے پارٹی۔ اپنے گھر میں منعقد کروانا چاہ رہا ہے۔ یہ کوئی ایسی قابل اعتراض بات تو تھی نہیں' بلکہ الٹا ان کے دل میں طمانیت کا احساس بڑھ گیا کہ اکلوتے بھائی کو بہنوں کے بچوں کا اتنا خیال ہے۔ مگر وہ گھر میں کام کے بے پناہ پھیل جانے سے سخت گھبرا رہی تھیں اور پھر واقعی روزے میں ان سے اتنا کام کیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ تب وجاہت نے خاصے محتاط انداز میں منٹو کا ذکر کرتے ہوئے انہیں بتانا چاہا کہ "کوئی بات نہیں' سارا انتظام منٹو کر لے گی۔"

مگر حسب توقع وہ تو سنتے ہی بے حد ناراض ہو گئیں کہ "گھر ہمارا ہے۔ وہ چار روز کی مہمان سارا انتظام ایسے کیسے کرے گی۔" الغرض کافی بحث و تمحیث کے بعد وہ بادل ناخواستہ اس بات پر نیم رضامند دکھائی دیں کہ "چلو ٹھیک ہے۔ کچھ بد ذائقہ کھانے وہ اس سے بنوا لیں گی۔"

وجاہت صاحب کے لیے یہ رضامندی بھی غنیمت تھی۔ گھر تو خیر پہلے ہی چمکتا رہتا تھا۔ سجاوٹ کا سامان شہرام جا کر لے آیا۔ اور وہ ساری ضروری اشیا بھی جو کوکنگ کے لیے منٹو کو درکار تھیں اور تمکنت کے باورچی خانے میں عدم دستیاب تھیں۔ بہرحال۔ شہرام ڈرائنگ روم کی سجاوٹ کرتا رہا۔ منٹو کچن میں گھسی مینا کی مدد سے اپنا کام کرتی رہی۔ تمکنت بریانی پکانا چاہتی تھیں۔ مگر کچن کاؤنٹر اور ٹیبل پر پھیلی اشیا کی تعداد دیکھ کر اپنے ارادہ ترک کر دیا۔ پیزا' نوڈلز' چکن برگر' تھائی رائس' بروسٹ' الاسکا فروٹ کسٹرڈ' مختلف ساسیز' البتہ ڈھیر سارے فرنچ فرائیز بنانے کا کام مینا کے سپرد کر دیا تھا۔ جو اسے مغرب کے بعد بنانا تھے۔ پانچ چھ گھنٹے کی محنت کے بعد' مغرب سے پہلے پہلے سب کچھ تیار تھا۔ البتہ بروسٹ تلنے اور نوڈلز کو سبزیوں کے ساتھ ملانے کا کام اس نے کھانا لگانے سے پہلے کے لیے باقی چھوڑ کر۔ پورا کچن پہلے کی طرح چمکانے کے بعد خود نہانے کے لیے چل دی کہ اب افطار کا وقت قریب تھا۔ روزے میں بے نقط کام کر کر کے اب اس

کی ٹانگیں بری طرح درد کررہی تھیں۔وہ صرف عصر کی نماز کے لیے کچن سے باہر نکلی تھی۔ورنہ تو ظہر کی نماز کے بعد سے اب تک کچن میں رہی تھی۔

کل رات ہی شہرام نے دونوں بڑی بہنوں کو بھی مغرب کے بعد اس سرپرائز برتھ ڈے پارٹی میں شریک ہونے کی دعوت دے دی تھی۔انہوں نے بھی مغرب کی نماز کے بعد پہنچ جانا تھا۔البتہ پری سے واقعی یہ پارٹی مخفی رکھی گئی تھی۔نہ رکھی جاتی تو اس کا "ری ایکشن" اتنا "نیچرل" کیسے ہوتا۔

"لاجواب۔۔۔ کمال بھئی مزا آگیا۔" کیک کاٹتے ہی مینا نے فوراً "کھانا لگا دیا۔یوں بھی شہرام کی خصوصی ہدایت کے موجب آج سب ہی کی افطاری محض کھجور، شربت اور تھوڑے بہت کالے چنوں وغیرہ پر مشتمل تھی۔کھانا چکھتے ساتھ ہی پہلا ردعمل منیبہ کے سرتاج کی جانب سے آیا جو یوں بھی ان ذائقوں کے بے حد شوقین واقع ہوئے تھے مگر بیگم پکانے سے قاصر تھیں اور بالفرض سیکھ بھی لیتیں تو شاید اتنی مہارت سے نہ پکاسکتیں، جتنی مہارت اور پیش کرنے کا سلیقہ یہاں دکھائی دے رہا تھا۔

"ہاں واقعی امی۔" طیبہ کے بڑے صاحب زادے جو ابھی پانچویں جماعت کے طالب علم تھے بھی چہکے۔

"یہ بروسٹ تو بالکل کے ایف سی جیسا لگ رہا ہے۔" وہ مرغی کی ٹانگ سے گوشت علیحدہ کرتے ہوئے بولے۔

"منع کیا ہے نا آپ کو کتنی مرتبہ۔" طیبہ نہ جانے کیوں ناراض سی ہو گئیں۔"کہ دسترخوان پر اتنی اونچی آواز سے بات نہیں کرتے۔" انہوں نے صاحب زادے کو تنبیہہ گھوری سے نوازا۔

"مگر یہ تو ڈائننگ ٹیبل ہے ماما۔۔۔ چل کریں۔" انہوں نے گھوری کا اثر لیے بغیر الٹا والدہ کو سمجھانا چاہا تو سب ہی بے ساختہ ہنس پڑے۔

"ہاں بھئی بیٹی طیبہ۔" وجاہت صاحب تھائی رائس پر ساس انڈیلتے ہوئے محظوظ انداز سے مسکرا کر بولے۔"زمانہ بدل رہا ہے۔۔۔ واقعی چل کرو۔"

سارے ہی افراد خانہ رغبت سے کھانے سے بھرپور انصاف کررہے تھے، سوائے تمکنت، طیبہ اور خود منٹو کے۔۔۔ منٹو کو تو خیر تھکاوٹ ہی بہت تھی مگر یہ تمکنت اور طیبہ کو کیا ہوا تھا؟

"زمانہ ہم سے ہے ابا جان۔۔۔" طیبہ جتاتے لہجے میں بولیں "ہم تو نہیں بدل رہے۔"

"چھوڑیں آپا یہ بحث۔۔۔" اس سے پہلے کہ یہ ہلکی پھلکی بات چیت کسی گرما گرم ڈی بیٹ میں تبدیل ہوجاتی، تابہ نے عین موقع پر مداخلت کی اور سر جھکائے تمکنت کے برابر والی کرسی پر بے دلی سے فرنچ فرائیز ٹونگتی منٹو کو بطور خاص مخاطب کرکے زوردار آواز میں بولی۔"بھئی منٹو۔۔۔ تم نے میری بیٹی کی سالگرہ کے لیے اتنی محنت کی، اس کے لیے میں تمہاری بہت شکر گزار ہوں۔ورنہ آج کل کون کسی کے لیے اتنی محنت کرتا ہے۔"

"کیسی باتیں کررہی ہو تابہ!" منٹو جھینپے جھینپے سے لہجے میں بولی کہ اس وقت سب ہی اس کی جانب متوجہ ہوگئے تھے۔"شہرام وہاں پری کو اتنا مس کرتا تھا، اتنا ذکر کرتا تھا اس کا کہ یہ مجھے بھی بہت پیاری ہوگئی تھی۔" وہ سچ کہہ رہی تھی۔

"پھر بھی آپ کا بہت شکریہ منٹو۔۔۔ آپ نے میری بٹی کے لیے اتنا اہتمام کیا۔" چھری کانٹے سے پیزا کھاتے اسمارٹ اور ماڈرن سے سبحان بھی اس کی جانب دیکھ کر متشکرانہ لہجے میں بولے تو تمکنت نامحسوس انداز میں پہلو بدل کر رہ گئیں۔

"آپ تو مجھے شرمندہ کررہے ہیں سبحان بھائی۔۔۔ پیاری پری میری بھی تو بھانجی ہے۔" اس نے پیار سے اپنے ساتھ والی کرسی پر چپکی بیٹھی پری کی پونی ٹیل کو چھیڑا۔

"آپ بہت اچھی ہیں سوئٹ آنٹی۔" پری تو پہلے ہی خوشی سے نہال تھی اس کے پیار سے چھیڑنے پر معصوم بچوں کی عادت کے عین مطابق ریشہ خطمی ہی ہوگئی۔

"اس دن تو آپ ہمارے گھر سے واپس چلی گئی

تھیں۔ مگر آج میں آپ کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔" اس نے گال پھلاتے ہوئے ٹھنک کر فرمائش داغی۔ تو آن واحد میں منتو کا مسکراتا چہرہ فق ہوگیا۔ اتنی دیر سے مسلسل اس کی تعریفوں پر پھولے نہ سماتے شہرام کے ہاتھوں کے توتوں نے بھی یک دم ہی اڑان بھری تھی۔

"بیٹا فضول نہیں بولتے۔" تابعہ نے بری طرح گڑبڑاتے ہوئے بات سنبھالنی چاہی۔ مگر تب تک طیبہ کی باریک بین اور شکی نگاہیں "کسی گڑبڑ" کا بخوبی اندازہ لگا چکی تھیں۔

"آنٹی آپ میری برتھ ڈے پارٹی بھی ارینج کریں نا۔" منیبہ کے چار سالہ سپوت نے مچلتے ہوئے اچانک ہی فرمائش داغی۔ "(سارے گفٹس یہ باگڑبلی رکھے گی۔ اسے تو اس بات کا صدمہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔)

"ضرور کیوں نہیں... کب ہے آپ کی برتھ ڈے۔" منتو نے بھی گہری سانس لے کر سنبھلتے ہوئے کہا۔

"ففتھ اگست کو۔" اس نے بتیسی باہر نکال کر جلدی سے بتایا۔

"غیروں سے ایسی فرمائشیں نہیں کرتے معاذ میاں، یوں بھی یہ ہماری مہمان ہیں۔ چند روز میں واپس لوٹ جائیں گی۔" تمکنت اب تک نامحسوس انداز سے چپ چاپ بیٹھی تھیں اور اب جب بولا... تو ایسا جملہ جو ہزار باتوں پر بھاری تھا۔ سب ہی نے ان کا غیر معمولی سنجیدہ انداز محسوس کیا۔ تاہم اس وقت بولا کوئی کچھ نہیں اور یوں بھی ان کے آگے بھلا کوئی کیا بول سکتا تھا؟

☼ ☼ ☼

"میں پہلے ہی جانتی تھی کہ آنٹی کو متاثر کرنا اتنا آسان نہیں۔" سارے مہمان جا چکے تھے... منتو کا دل ہر شے سے یک دم اچاٹ ہوا تو چھت پر آگئی۔ اس کے پیچھے پیچھے شہرام بھی چلا آیا۔ کبھی کبھار احتیاط پسندی کو ملحوظ خاطر رکھنا انسان کے بس سے باہر بھی تو ہو جاتا ہے۔

"تم دل چھوٹا مت کرو۔ تم نے سنا نہیں سب ہی کھانے کی بہت تعریف کر رہے تھے۔" وہ اس کی دلجوئی کی خاطر بولا۔

"مگر جس کے لیے اتنی محنت کی انہوں نے تو کوئی چیز چکھی تک نہیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ظاہر ہے آخر اس نے پورا دن روزے سے ہونے کے باوجود محنت کی تھی۔

"نہیں یار... چاول تو لیے تھے۔ وہ ویسے ہی بہت کم کھاتی ہیں۔" وہ اس بار بھی اس کا دل رکھنے ہی کو بولا تھا، وگرنہ ان کی خالی پلیٹ اس کی نظر میں بھی تھی۔

"تم کچھ بھی کہو... پر نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے جیسے انہیں میرا یہ سب کرنا بالکل اچھا نہیں لگا۔" وہ الجھے الجھے انداز سے انگلیاں چٹخانے لگی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ شہرام کے دل کو کچھ ہوا۔

"دیکھو منتو... آج تو ابتدا کی ہے ہم نے۔ کسی کے دل میں جگہ بنتے بنتے ہی بنتی ہے۔ تم فکر مت کرو... ہم ان شاء اللہ ضرور امی جان کا دل جیتنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔" اس نے ایک ایسی بات کی تسلی اسے دی۔ جس پر خود اسے بھی اتنا زیادہ یقین نہ تھا۔ بلکہ جتنے فیصد بھی تھا وہ آج تمکنت کا روکھا پھیکا اور حوصلہ شکن رویہ دیکھ کر مزید کم ہو گیا تھا۔ مگر وہ یہ بات اس زود رنج لڑکی کو بتا کر اس کی مزید پریشانی کا سامان نہیں کر سکتا تھا۔

"ہاں شہری... " وہ پھیکے انداز سے مسکرائی۔ "شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں بھی نہ خواہ مخواہ جلد بازی کا مظاہرہ کرنے لگتی ہوں۔" اس نے ہمیشہ کی طرح فوراً ہی اس کی بات سے اتفاق کیا تو شہرام کو پہلی بار اپنے دل پر بوجھ بڑھتا محسوس ہوا۔ وہ اس معصوم سی لڑکی کو خوابوں کی ڈور سے باندھے اپنے یقین کے ساتھ یہاں تک لے آیا تھا۔ لیکن کیا اس کا اپنی ذات پر یہ یقین اب بھی اتنا ہی مستحکم تھا؟ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان اس کی آنکھوں کے سامنے رقصاں ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"امی جان! پتا نہیں یہ بات آپ سے کرنا مناسب ہے بھی یا نہیں۔" طیبہ رات تو بوجوہ چڑ کر گئیں۔ پر صبح ہوتے ساتھ ہی پہلی فرصت سے بھی پہلے والدہ ماجدہ کو فون ملا کر علیک سلیک کرنے کے بعد فی الفور اصل مدعا پر آتے ہوئے بولیں۔ "لیکن کل جو کچھ ہم نے محسوس کیا' اب کیا کہیں۔ ہمیں لگتا ہے کہ آپ کے گھر میں آپ کی ہی ناک کے نیچے کوئی کھیل کھیلا جارہا ہے۔ لہٰذا ہمارا مشورہ ہے کہ آپ بھی اپنی آنکھیں کھول کر ذرا غور کریں کہ آیا ہمارا اندازہ درست ہے یا نہیں؟" وہ اس وقت شرلاک ہومز کی سگی خالہ کا کردار ادا کررہی تھیں۔

"بفضل خدا تعالیٰ۔" تمکنت نے دزدیدہ نگاہوں سے کمرے کے کھلے دروازے کے باہر احتیاط دیکھ کر کہنا شروع کیا۔ "نہ صرف ہماری آنکھیں کھلی ہیں' بلکہ حواس بھی صحیح سلامت ہیں۔ اب آپ نے ذکر کر ہی دیا ہے تو بتادیں کہ جس بات کا اندازہ آپ کو کل کی تقریب میں ہوا ہے۔ اس کا ادراک تو ہمیں اسی روز ہوگیا تھا کہ جس روز شہرام' محترمہ (یعنی منٹو) کو لے کر ہمارے گھر میں داخل ہوئے تھے۔" (اس روز ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ کل کے بعد تو واقعی ہوگیا تھا۔) انہوں نے اپنے مخصوص متین و حلیم لہجے میں شائستگی سے دھماکا کیا۔

"گویا آپ جانتی ہیں سب کچھ؟" طیبہ تحیر آمیز بے یقینی سے بولیں۔ "مگر کیسے کیا شہرام نے خود کوئی اقرار کیا ہے آپ کے روبرو؟"

"نہیں طیبہ' ابھی تو ہمارے ساتھ آنکھ مچولی کھیلی جارہی ہے۔ لیکن ایک بات صاحب زادے فراموش کرگئے۔ کہ وہ ہماری اولاد ہیں۔ ہم ان کی نہیں۔ پھر بھلا ہم کیسے ان کی نیت اور ارادے سے ناواقف رہ سکتے تھے؟" وہ بظاہر سپاٹ لہجے میں بولیں۔ لیکن درحقیقت ان کے من ہی من کئی طوفان کروٹ لے رہے تھے۔

"تب پھر آپ نے اب تک کیوں کوئی قدم نہیں اٹھایا امی۔" طیبہ ازحد پریشانی اور فکرمندی سے لبریز لہجے میں بولی۔ "ایسے تو ان کی جرات اور امیدیں بڑھ جائیں گی۔"

"ان کی بڑھتی جرات اور امیدوں سے ہمیں کیا فرق پڑے گا طیبہ۔ جبکہ ایک بات تو طے ہے کہ نہ منٹو جیسی آزاد خیال لڑکی ہمیں متاثر کرسکتی ہے اور نہ ہی ان جیسی مغربی ماحول کی پروردہ لڑکی کو ہم اپنی اکلوتی بہو کے روپ میں بھی قبول کرسکتے ہیں۔ تب ہمیں تشویش کیوں ہونے لگی۔ شہرام کے بقول وہ رمضان اور عید کرنے پاکستان آئی ہیں نا۔ کرنے دیں اگر کوئی احمقوں کی جنت میں خوش رہنا چاہ رہا ہے' تب ہم کیا کرسکتے ہیں۔ ہاں البتہ ہمیں اب فکر ہے تو صرف اس بات کی کہ جلد از جلد من پسند لڑکی دستیاب ہوجائے تو ہم شہرام میاں کو اس بار یہ زنجیر کیے بنا واپس جانے نہ دیں گے۔" انہوں نے کسی ظالم بے لچک مصنف کی طرح فیصلہ صادر کرکے قلم توڑ دینا چاہا' پر صد شکر وہ قلم اس وقت بھی کاتب تقدیر ہی کے پاس تھا۔

☼ ☼ ☼

"مروادیا تم نے شہرام۔ میں تو گئی۔" صوفے پر اب سے کچھ دیر قبل اطمینان سے براجمان تانیہ اب بے ہوش ہونے کی تیاریوں میں تھی۔

"اوہو۔" سامنے سراپا اضطراب بنے بیٹھے شہرام نے بال مٹھی میں جکڑ کر چھوڑنے کے بعد اسے دیکھ کر دانت پیسے۔ "میرے جانے کے بعد تسلی سے بے ہوش ہوجانا فی الحال میری پوری بات تو سکون سے سن لو۔"

"اب کہنے سننے کو رہ ہی کیا گیا ہے بھائی۔" وہ بے اندازہ مغموم لہجے میں بولی۔ "بس یوں سمجھو کہ ہمارے بلکہ تمہارے مقدمے کی از خود سماعت یک طرفہ کارروائی کے بعد مکمل کرلی گئی۔ بس اب تو اس محفوظ فیصلے کا انتظار کرو جو کبھی بھی کسی بھی وقت تمہیں سنایا جاسکتا ہے۔"

"مگر یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔" شہرام اس کی بے تکی نظرانداز کرکے کسی ماہر وکیل کی طرح جرح کرنے والے لہجے میں پرسوچ انداز سے بولا۔ "کہ امی جان کو میرے اور منٹو کے اصل عزائم کی بھنک آخر پڑی کیسے؟ کہیں بادشاہ سلامت نے تو ان پر اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لیے ہماری مخبری نہیں کردی؟"

"کچھ شرم کرو۔" تابیہ نے لتاڑا۔ "روزے میں اپنی ماں کی غیبت اور باپ پر میرے سامنے بیٹھے شک کررہے ہو۔" یکایک تابیہ کی دخترانہ محبت نے جوش مارا۔

"تو اس کے علاوہ اور کرنے کو رہ ہی کیا گیا ہے پیاری بہن۔" وہ روہانسے لہجے میں بولا۔ دراصل قصہ کچھ یوں تھا کہ آج صبح جب وہ لان میں جانے کے لیے والدہ محترمہ کے کمرے کے سامنے سے گزرنے ہی والا تھا کہ اس کے حساس کانوں نے کچھ ایسے جملے کیچ کرنا شروع کردیے کہ قدم آگے بڑھنے سے قطعی انکاری ہوگئے۔ وہ تو اچھا ہی ہوا کہ اسے فوراً ہی اپنے روزہ دار ہونے کا خیال آگیا اور وہ دھڑکتے دل کے ساتھ بجائے آگے بڑھنے کے مڑ کر واپس اپنے کمرے میں چل دیا۔

جو کچھ اس کی سمجھ میں آسکا تھا' اس کا لب لباب کچھ یوں تھا کہ "تمکنت نہ صرف منٹو کی اصلیت جان چکی تھیں بلکہ اس سے کسی قیمت پر بھی متاثر نہ ہونے کی قسم کھانے کے علاوہ اپنی من پسند لڑکی کو اس کی زندگی میں شامل کرنے کے عزم کا ارادہ بھی ظاہر کرچکی تھیں۔" تو ایسے میں اب واقعی کیا باقی بچا تھا؟

"میں آج اور ابھی بلکہ اسی وقت تمہاری مدد کرنے کے ارادے سے دستبردار ہونے کا اعلان کرتی ہوں۔ ہاں بھئی مجھے کوئی شوق نہیں امی جان کے ہاتھوں اپنی درگت بنوانے کا۔ وہ تو یوں بھی مجھ سے نالاں رہتی ہیں۔ اگر انہیں ذرا سا بھی شک گزرا کہ میں تمہارے ساتھ ملی ہوئی ہوں تو سمجھو میری خیر نہیں۔" وہ تیز تیز بولتی گئی۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" شہرام یک دم ہی بنا کچھ کہے اٹھ کھڑا ہوا۔ "مت کرو میری مدد۔۔۔ مجھے کسی کی بھی مدد کی ضرورت نہیں۔ اتنا بھی کمزور نہیں ہوں میں۔۔۔ جو کرنا ہے خود کرلوں گا اب۔" وہ سرخ چہرے کے ساتھ کہتا ہوا ڈرائنگ روم عبور کرگیا۔ اس کے عقب میں تابیہ اسے پکارتی ہی رہ گئی۔۔۔ وہ تو حسب عادت اس سے مذاق کررہی تھی۔ پتا نہیں وہ اتنا برا کیوں مان گیا۔ شاید اس لیے کہ وہ ذہنی طور پر بہت منتشر تھا۔ اور اسے آگے بلکہ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دے رہا تھا۔ وہی اندھیرا جو بڑھ جائے تو صبح کی نوید ہے۔

☼ ☼ ☼

"بس تمو آپا' آپ تو جانتی ہی ہیں کہ ہماری والدہ مرحومہ۔۔۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔ کتنی سختی سے کنواری لڑکی کو میت والے گھر میں لے جانے کی ممانعت کیا کرتی تھیں۔ بلکہ ہماری والدہ ہی پر کیا موقوف' آپ کے ہاں بھی تو اس عمل کو ناپسندیدہ شمار کیا جاتا تھا۔" دھان پان سے وجود کی حامل شہربانو اپنے سامنے والے صوفے پر براجمان "تمو آپا" یعنی تمکنت بیگم سے مخاطب تھیں اس وقت۔۔۔ وہ تمکنت بیگم کے میکے کی طرف سے دور پار کی رشتے دار تھیں' بلکہ ان کا ایک مضبوط حوالہ یہ بھی تھا کہ ان کی والدہ اور تمکنت بیگم کی والدہ آپس میں دوپٹا بدل بہنیں ہوا کرتی تھیں۔

"ہاں تو درست ہی تھا نا۔" تمکنت بیگم جو بہت دلچسپی سے شہربانو کے ساتھ بیٹھی' پرنٹڈ کرتے پاجامے میں ملبوس بلا مبالغہ ڈھائی گز کے دوپٹے سے اپنا سر ڈھانپے ان کی اکلوتی نور نظر سائرہ بانو کو دیکھنے میں محو تھیں' ذرا چونکتے ہوئے اثبات میں سر ہلا کر بھرپور دفاعی لہجے میں گویا ہوئیں۔ "ہماری نانی اماں بتایا کرتی تھیں کہ میت والے گھر میں چالیس دن تک مختلف ارواح کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اور روحیں کنوارے بدن کی خوشبو پر بڑی جلدی عاشق ہوجایا کرتی ہیں۔" تمکنت بیگم نے عقیدت مندی سے پر لہجے میں یوں بتایا گویا نانی محترمہ کوئی بہت بڑی عالمہ فاضلہ واقع ہوئی

تھیں۔

"مگر روح میں عاشق ہو کر کرتی کیا ہیں بے چاری۔ آپ کی نانی مرحومہ نے اس سلسلے پر کبھی کچھ روشنی ڈالی؟" داہنے ہاتھ والے صوفے پر کافی دیر سے مئودب اور خاموش بیٹھے شہرام کی زبان میں کھجلی ہوئی۔

"آپ ذرا جا کر دیکھیے' یہ مینا کی چائے کہاں رہ گئی۔" تمکنت نے فوراً" سے پیشتر ایک خطرناک نادیبی گھوری سے نواز کر اسے فی الفور یہاں سے چلتا کیا۔ بظاہر سنجیدہ دکھائی دیتی سائرہ بانو نے کن انکھیوں سے اس کے چہرے کے بگڑتے زاویے ملاحظہ کیے تو لبوں پر آپ ہی آپ خفیف سی مسکراہٹ رینگ گئی۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے نا تمو آپا۔" اس کے ڈرائنگ روم عبور کرتے ہی شہربانو بے چینی سے دوبارہ گویا ہوئیں۔ "آپ رکھ لیں گی نا سائرہ بانو کو تین دن یہاں' اب کیا کریں جانا بھی بے حد ضروری ہے۔ آپ جانیں ضمیر صاحب (سائرہ کے والد) کی اکلوتی لاڈلی بہن کی سسرال کا معاملہ ہے۔ ان کی ساس صاحبہ کی مٹی منزل (یعنی تدفین) میں اگر ہم لوگ نہ گئے تو خواہ مخواہ ان کے میاں کے ہاتھ انہیں دق کرنے اور طعنے دینے کا ایک اور موقع لگ جائے گا۔" وہ پریشانی' فکر مندی اور تشویش سے پر آواز میں بولیں۔ دراصل انہیں اپنی نند جو لاہور میں رہائش پذیر تھیں کی ساس کی تدفین میں ہر حال میں پہنچنا تھا۔ سائرہ کو لے جایا نہیں جا سکتا تھا اور نہ ہی اکیلے گھر میں تنہا نوکروں کے رحم و کرم پر چھوڑا جا سکتا تھا۔

"کیسی غیروں جیسی باتیں کر رہی ہیں آپ آج شہر بانو۔" تمکنت اس بار خفگی سے بولیں۔ "آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ آخر سائرہ ہماری بھی تو بیٹی ہیں۔" انہوں نے ایک بار پھر بڑی نرم اور پسندیدہ نگاہ اس دوران مکمل خاموشی سے بیٹھی سائرہ بانو پر ڈالی۔

"بہت شکریہ آپ کا تمو آپا۔" وہ ممنون دکھائی دیں۔ "بس تین دن کی بات ہے۔ تین دن بعد تو خیر ہم لوگ ان شاء اللہ واپس آ ہی جائیں گے۔"

"ارے ہاں... ہاں بھئی۔" تمکنت ہاتھ ذرا سا ہلا کر انہیں مزید مطمئن کرنے کو بولیں۔ "بس اب آپ اطمینان سے جائیں۔ سائرہ بیٹی آج سے ہماری ذمے داری ہیں۔" وہ مسکرائی تھیں۔ اور اس وقت ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ آئندہ آنے والے دنوں میں سائرہ بانو تمکنت کی ذمے داری ہی نہیں بلکہ اولین پسند بھی بن جانے والی تھی۔

☼ ☼ ☼

"واہ بٹی۔" افطار کے دسترخوان پر تمکنت سرد ھنتی ہوئی بولیں۔ "کیا عمدہ دہی بڑے اور چنے کی چاٹ بنائی ہے آپ نے کہ جواب نہیں۔ ماشاء اللہ ہمارے خاندان کا مخصوص ذائقہ ہے آپ کے ہاتھوں میں سبحان اللہ۔" وہ واقعتا" جھوم اٹھی تھیں۔ دستر خوان پر اس وقت بشمول منٹو گھر کے تمام ہی افراد خانہ موجود تھے۔ مینا کا تو پتا نہیں' البتہ وجاہت صاحب اور شہرام کھلی آنکھوں سے صاف دیکھ رہے تھے کہ تمکنت بیگم ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تعریفوں کے پل باندھ رہی ہیں۔

"شکریہ خالہ جان۔" سائرہ مسکرا کر بولی۔ "میں نے تو یونہی عام طریقے سے بنائے ہیں۔"

"ہاں وہ تو شکل سے دکھائی دے ہی رہا ہے... نہ کوئی ڈیکوریشن' نہ پیش کرنے کا کوئی خاص طریقہ۔" شہرام لگی لپٹی بغیر منہ بنا کر بولا۔

"سیانے کہتے ہیں کہ صورتوں پر ریجھنے والے لوگ بے وقوف کے علاوہ کچھ نہیں ہوتے۔" اس سے پہلے کہ شہرام کو کھا جانے والی نگاہوں سے گھورتی ہوئی والدہ محترمہ لب کشائی کر پاتیں۔ سائرہ بانو نے خود ہی ٹکا کر جواب عنایت فرما دیا۔ وجاہت صاحب زور سے ہنس پڑے تو وہ ذرا خفیف سی ہو گئی۔ منٹو خاموشی سے سر جھکائے گھونٹ گھونٹ شربت حلق میں اتارتی رہی۔ اگرچہ یہ راز کہ تمکنت اس کی سچائی سے باخبر ہیں۔ شہرام نے اس سے چھپا لیا تھا۔ تاہم سالگرہ والے دن کے بعد سے وہ خود محسوس کر چکی تھی کہ تمکنت کا اس کے ساتھ رویہ خاصا خشک اور لیے دیے

انداز کا سا ہو چکا تھا اور اس جیسی حساس اور زود رنج لڑکی کے لیے ان کے روکھے پھیکے رویے کا بار اٹھانا خاصا دشوار ثابت ہو رہا تھا۔

"بھئی جواب نہیں سائرہ بیٹی۔" وجاہت صاحب محظوظ ہو کر بولے۔ "کیا اچھا جملہ بولا ہے۔ ہاں بھئی برخوردار.... ہے کوئی جواب؟" وہ صاف صاف اسے اکسا رہے تھے۔

"آپ کیا یہاں دنگل کروانے بیٹھے ہیں میاں۔" تمکنت بھانپ گئیں۔ "بجائے اس کے کہ گھر کے سربراہ ہونے کے ناطے آپ سب کو خاموشی سے افطار کی تلقین کریں' خود بھی بچوں کے ساتھ بچہ بن بیٹھے۔" وہ ناراضی سے بولیں۔

"کبھی کبھار بچوں کے ساتھ بچہ بن کر ان کا دل رکھنے میں کوئی ہرج نہیں ہوتا بیگم۔" وجاہت صاحب اس بار انہیں بغور دیکھ کر گمبھیرتا سے بولے۔ "آپ بھی کبھی ایسا کر دیکھیے اور یقین جانیے.... دلی مسرت حاصل ہوگی۔" یہ نصیحت تھی یا مشورہ.... جو کچھ بھی تھا' مگر تمکنت کو تیر کی مانند لگا۔ اور وہ خون خوار نگاہوں سے انہیں دیکھے گئیں۔ البتہ اس مرتبہ بولی کچھ نہیں.... عقل مند جو ٹھہریں.... جانتی تھیں کہ ہر جگہ' ہر بات کہہ دینے کی نہیں ہوتی۔ دسترخوان پر اب مکمل خاموشی تھی۔ صرف برتنوں کو آواز کرنے کی اجازت تھی۔ سو وہ وقتاً "فوقتاً" آواز پیدا کر کے اپنے ہونے کا احساس دلا رہے تھے۔

✡ ✡ ✡

"ابا جان.... کیا آپ نے امی کو منتو کے متعلق سب سچ بتا دیا ہے؟" اس رات وہ تراویح سے واپسی پر وجاہت صاحب سے پوچھے بنا رہ نہ سکا۔

"ہرگز نہیں۔" وہ ناراضی سے ڈپٹ کر بولے' "لیکن آپ کو یہ خیال کیوں کر گزرا؟"

"کیا آپ ان کا منتو کے ساتھ دن بہ دن خراب سے خراب تر ہوتا رویہ ملاحظہ نہیں فرما رہے۔ وہ واضح طور پر سائرہ بانو کو منتو پر فوقیت دے رہی ہیں۔ بے چاری منتو نے اتنی محنت سے چکن سینڈوچ بنائے وہ انہوں نے چکھنا تک گوارا نہ کیے اور اس سائرہ بانو کے بنائے گئے بے کار دہی بڑوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتی رہیں۔" وہ گلہ آمیز لہجے میں احتجاجاً" بولا۔

"پہلی غلطی تو آپ نے اپنی والدہ کو کم عقل سمجھ کر کی اور دوسری منتو کو یہاں لا کر۔" وجاہت صاحب کمر پر ہاتھ ٹکا کر آہستگی سے قدم بڑھاتے ہوئے سنجیدگی سے بولے۔ "آپ نے یوں بنا کسی رشتے کے انہیں یہاں لا کر اپنی والدہ کی نظروں میں پہلے ہی ارزاں کر دیا۔ پھر آپ ان سے کیا امید رکھتے ہیں' اپنا کیس تو خود آپ نے اپنے ہاتھوں سے کمزور کیا ہے۔"

"نہیں ابا۔" شہرام بے اختیار تڑپ گیا۔ "منتو خدانخواستہ کوئی گری پڑی لڑکی ہرگز نہیں ہے۔ وہ تو حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ مجھے مجبوراً" اسے اپنے ساتھ یہاں لانا پڑا۔" اسے آخر کار بتانا ہی پڑا۔

"کیسے حالات؟" وجاہت صاحب بے پناہ تشویش سے بے ساختہ پوچھ بیٹھے۔

"دراصل منتو کا اس دنیا میں کوئی نہیں۔" وہ مناسب اور مختصر لفظوں میں وجاہت صاحب کو منتو کے خاندانی پس منظر و حالات کے متعلق دھیرے دھیرے بتانے لگا۔ وجاہت صاحب بہت غور اور دلچسپی سے سنتے رہے۔ "یوں تو اس کی زندگی پہلے بھی اتنی آسان نہ تھی۔ مگر اس نے اپنی نانی کے گزر جانے پر بہت برا وقت دیکھا۔ بے پناہ دکھ' تنہائی کا احساس' مالی پریشانی اور آنے والے مستقبل کے اندیشے.... خیر وہ وقت بھی جیسے تیسے گزر گیا.... مگر اس کی آزمائش ابھی ختم نہ ہوئی تھی۔ نانی کے انتقال کے ایک سال بعد نہ جانے کہاں سے اس کی والدہ کے ایک کزن آدھمکے اور انہوں نے اسے بتایا کہ اس کی نانی مختلف مواقعوں پر ان سے قرضہ لیا کرتی تھیں اور چونکہ وہ بے بغیر مر گئی ہیں۔ اس لیے اب ان کا قرضہ چکانا اس کا فرض بنتا ہے اب یا تو وہ اس کا قرض اتارے' یا اپنا گھر ان کے نام کر دے یا پھر.... ان سے شادی کر کے انہیں اپنے گھر

میں بخوشی رہائش اختیار کرنے کی اجازت مرحمت فرما دے۔" اس کا مدھم لہجہ اب بلند آہنگ ہو کر اس کے اندر دبے بے پناہ غصے کی غمازی کرنے لگا۔

"میں نے دیکھا ہے مسٹر جوزف کو۔ وہ ایک انتہائی خبیث صورت موقع پرست بد اور سفاک شخص ہے۔ اس نے وہاں دن رات اس اکیلی، تنہا ڈری سہمی لڑکی کی زندگی دو بھر کر رکھی تھی۔ اب آپ ہی بتائیے ابا جان ایسے نازک حالات میں کیا میں اسے وہاں یونہی تنہا چھوڑ آتا۔ محبت وحبت تو چھوڑ دیں کیا انسانیت کے ناطے اس کی مدد کرنا کیا میرا فرض نہیں بنتا۔" شدت جذبات سے اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی۔ وجاہت صاحب منتو کی کہانی سن کر متاثر ہوئے تھے اور اس کے لیے شہرام کے طرز فکر سے بھی۔ مگر سارا مسئلہ تو ان کی ضدی نصف بہتر کا تھا نا۔

"ایسے حالات میں جو مجھے بہتر لگا میں نے کیا۔ اب دیکھتے ہیں زندگی آگے کیا رنگ دکھاتی ہے۔ مگر میں آپ سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میری خاطر اپنے اختیارات استعمال نہیں کر سکتے۔"

اس نے بڑے آس بھرے لہجے میں پوچھا۔ وجاہت صاحب کا دل اس کے لہجے پر رقیق ہو گیا۔ یہ اس کے بچپن کی عادت تھی۔ جب تمکنت اس کی کوئی بات کسی بھی حربے کے باوجود ماننے سے صاف انکار کر دیا کرتی تھیں۔ تب وہ ان کے سامنے یونہی منہ پھلائے آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر آس و امید لیے اس وقت تک کھڑا رہتا تھا جب تک کہ وہ اس کے حق میں فیصلہ نہیں سنا دیا کرتے تھے۔ وجاہت صاحب بے بسی سے ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔

"میں اس عمر میں آپ کی والدہ کو کھونا نہیں چاہتا شہرام بیٹا۔ امید ہے آپ میری بات کا مطلب بخوبی سمجھ گئے ہوں گے۔ لیکن میں آپ سے یہ بھی نہیں کہہ رہا کہ آپ مایوس ہو جائیں۔ ہم اپنی ایک کوشش ضرور کریں گے۔ دیکھیں اس کے بعد جو اللہ کو منظور ہو۔" گھر نزدیک آ رہا تھا۔ وجاہت صاحب نے گفتگو سمیٹ دی۔

✡ ✡ ✡

"آپ بہت لکی ہیں سائرہ۔" سائرہ کے ساتھ عشا کے بعد لان میں ٹہلتی ہوئی منتو رشک آمیز لہجے میں بولی۔ آج سائرہ کی اس گھر میں دوسری رات تھی، چونکہ اس کا بستر منتو ہی کے کمرے میں لگایا گیا تھا۔ کہ ظاہر ہے گیسٹ روم وہی تھا۔ لہٰذا دونوں کے درمیان ابتدائی تعارف وغیرہ کے بعد اچھی خاصی بات چیت ہو گئی تھی۔ جہاں سائرہ اس کے معصوم حسن اور بے ساختگی سے متاثر ہوئی تھی وہیں منتو کو بھی وہ روایتی سنجیدہ عقل مند بردبار قسم کی مشرقی لڑکی بہت بھلی لگی تھی لیکن اس کے رشک کرنے کی وجہ دوسری تھی۔ وہ تمکنت کا اس کی طرف واضح جھکاؤ اور نرم رویہ صاف محسوس کر رہی تھی۔ آج بھی سارا دن تمکنت نے اس کے ساتھ بڑے خوش گوار لہجے میں گپ شپ کرتے گزارا۔ افطاری کی تیاری کے سلسلے میں بھی جب اس نے ان کا ہاتھ بٹانا چاہا تو وہ ذرا بھی معترض نہ ہوئیں، بلکہ آج پھر اسے دہی بڑے بنانے کو بڑے لاڈ بھرے محبت آمیز لہجے میں کہا گیا۔ منتو اول تو ان کی نظر میں تھی ہی نہیں اور اگر کہیں تھی بھی تو اب پس منظر میں جا چکی تھی۔

"اپنی اپنی جگہ لکی تو سب ہی ہوتے ہیں منتو۔" سائرہ نے ملائمت سے مسکرا کر کہا۔ "لیکن تم مجھے کس حوالے سے لکی سمجھ رہی ہو ذرا پتا تو چلے۔" اس نے دلچسپی سے جاننا چاہا۔

"آپ کی ایک فیملی ہے۔" منتو احساس کمتری کا شکار لہجے میں بولی۔ "ایک مضبوط بیک گراؤنڈ ہے۔ آپ ڈیسینٹ ہیں۔ بہت ٹھہر ٹھہر کر سمجھ داری سے بات کرتی ہیں۔ جبکہ میں ان ساری خصوصیات سے عاری ہوں۔"

"فیملی تو تمہاری بھی تھی، ظاہر ہے تم آسمان سے تو گری نہیں۔" وہ ازراہ تفنن بولی۔ "یہ الگ بات کہ مشیت الٰہی سے تم تنہا رہ گئیں۔ میں تو خود تم جیسی بہادر اور بلند ہمت لڑکی سے بہت متاثر ہوئی ہوں منتو۔ جو

حالات تم پر گزرے، تم نے انہیں نہ صرف جواں مردی سے انہیں فیس کیا، بلکہ اخلاقی طور پر زوال پذیر معاشرے میں رہتے ہوئے بھی تم نے خود کو وہاں کی برائیوں کے ہاتھوں یرغمال بننے نہیں دیا۔ یہ کیا کوئی کم کامیابی ہے تمہاری؟" وہ متاثر و پسندیدہ لہجے میں بولتی چلی گئی اور منتو حیران رہ گئی۔ اچھا۔۔۔ تو اتنی زیادہ خوبیاں ہیں مجھ میں بھئی واہ۔۔۔

"آپ مذاق کر رہی ہیں۔" وہ ذرا سا جھینپ گئی۔

"میں مذاق کرتی ہوں، مگر اس وقت مکمل سنجیدہ ہوں۔" وہ مسکرائی۔ "تب یہ خوبیاں تمکنت آنٹی کو دکھائی کیوں نہیں دے رہیں؟" اس نے افسردگی سے سوچا۔۔۔ کہہ نہ سکی۔۔۔ یوں بھی یہ شہرام کے بقول ان کا "ٹاپ سیکرٹ" تھا اور ٹاپ سیکرٹ ہر کسی کے سامنے کھولنے کے لیے تھوڑا ہی ہوا کرتا تھا۔

"کیا سوچنے لگیں؟" سائرہ نے خالی آسمان کی جانب نگاہ کرتے ہوئے استفسار کیا۔ دوسرا عشرہ ختم ہوا چاہتا تھا۔ چاند بڑھ کر گھٹ چکا تھا۔ اس لیے آسمان پر اندھیرا تھا۔ لیکن پھر بھی چہار اطراف اس ماہ مقدس کا مخصوص نور بکھرا صاف دکھائی دے رہا تھا۔

"کچھ نہیں۔" منتو نے سوچیں دامن سے جھٹکتے ہوئے کہا۔

"اچھا چھوڑو یہ۔۔۔ یہ بتاؤ پاکستان میں رمضان گزار کر کیسا لگا۔" سائرہ نے بھی کسی فکر سے ذہن چھڑاتے ہوئے استفسار کیا۔

"ناقابل بیان۔۔۔" وہ بے ساختہ بولی۔ "اتنے پر کیف اور پر رونق رمضانوں کا وہاں تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔" اس نے دل سے کہا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں۔" سائرہ مسکرا کر بولی۔ "ابھی آخری عشرہ شروع ہونے پر مساجد کی رونق اور عبادات کا اہتمام دیکھنا۔۔۔ اور اس پر عید کی تیاری کا جوش و خروش ارے منتو۔۔۔" سائرہ معتدل لہجے میں بولتی بولتی یک دم پرجوش ہو کر اس کی جانب مڑی۔ "پھر تو تمہارے لیے چاند رات کو بازار جا کر چوڑیاں پہننا اور مہندی لگوانا بڑا پرجوش اور انوکھا تجربہ ہوگا۔

بس ٹھیک ہے۔ ڈیسائڈ (طے) ہو گیا۔ ہم دونوں یہ کام کرنے چاند رات کو بازار کی طرف نکلیں گے، ٹھیک ہے؟"

"واقعی بہت مزا آئے گا۔" منتو بھی ساری کلفت بھول بھال آنے والی چاند رات کے تصور میں کھو گئی۔ "میں وہاں چاند رات کو پاکستان نیوز چینل لگا کر دیکھا کرتی تھی۔ کیا رونق اور گہما گہمی ہوتی ہے واہ!" اس نے چٹخارہ لیا جیسے۔۔۔

"پتا ہے، بچپن میں تو میں پوری چاند رات سوتی ہی نہیں تھی، مارے ایکسائٹمنٹ کے۔ کبھی اٹھ اٹھ کر اپنے نئے نویلے لشکتے چمکتے کپڑے دیکھا کرتی بار بار، کبھی بیڈ کے نیچے رکھے گئے سینڈل، چوڑیوں اور جیولری کا باکس امی اپنے کمرے میں رکھ لیتی تھیں کہ کہیں میں جذبات میں آکر انہیں پہننے کے چکر میں پہلے ہی نہ توڑ تاڑ کر برابر کردوں۔۔۔ ساری رات اسی مشقت میں گزار کر اذان سے کچھ دیر پہلے نیند کے آگے بے بس ہو جاتی۔" سائرہ ہنستے ہوئے بچپن کی یادوں میں کھو گئی۔ منتو ازحد اشتیاق سے یہ سب سن رہی تھی۔ رات بھیگ رہی تھی۔ وقت کا پہیہ آگے بڑھ رہا تھا۔ زندگی کی کچی پگڈنڈی پر اپنے نشان ثبت کرتے ہوئے۔

☆ ☆ ☆

"کچھ خدا کا خوف کریں بیگم، کیوں گھر آئے مہمان کے ساتھ یوں بے رخی برت کر رب کے حضور خود کو گناہ گار رقم کروا رہی ہیں۔" وجاہت صاحب اب سے کچھ دیر قبل سحری ختم کر کے اپنے کمرے میں واپس لوٹے تھے۔ جو نہی تمکنت بیگم کو اندر داخل ہوتے دیکھا، کہے بغیر نہ رہ سکے۔

"کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟ سائرہ بیٹی کی؟ آپ نے کب ہمیں ان کے ساتھ رکھائی سے پیش آتے دیکھ لیا ہماری بہن (رشتے کی) کی بیٹی ہیں۔ ہمیں آپ سے زیادہ فکر ہے ان کی۔" تمکنت بیگم نے ٹیبل سے ان کی دواؤں کا باکس اٹھاتے ہوئے تجاہل

برتا۔۔۔ آرام کرسی پر بیٹھے وجاہت صاحب نے تاسف آمیز مگر تیز نگاہ ان پر ڈالی مگر وہ متوجہ نہیں تھیں۔
"میں منٹو کی بات کررہا ہوں۔" وہ جتاتے لہجے میں بولے۔
"خود ہی کہہ رہی تھیں ہمیں ایک روز کہ انہیں مہمان نہ سمجھا جائے۔" وہ استہزائیہ لہجے میں بولتی ہوئیں باکس سے دوائیاں بھی برآمد کرتی رہیں۔
"کیا تھا اگر آپ ان کا دل رکھنے کے لیے ان کی بنائی پڈنگ چکھ لیتیں تو۔۔۔" وجاہت صاحب سرزنش کیے بغیر رہ نہ سکے۔
"پڈنگ میں انڈے ڈلتے ہیں اور سحری میں انڈے کھانے سے ہماری طبیعت بھاری ہوجاتی ہے۔" ان کے پاس ہر سوال کا جواب موجود تھا۔
"اور انڈے کا حلوہ؟ وہ کس چیز سے بنتا ہے؟" وجاہت صاحب نے چشمے کی اوٹ سے انہیں طنزیہ دیکھا تو وہ ذرا کی ذرا کھسیا سی گئیں۔ دراصل آج سحری میں پتلے شوربے والا مرغی کا سالن 'بل دار پراٹھے جو مینا نے بنائے تھے اور میٹھے میں انڈے کا حلوہ جو خود فرمائش کرکے تمکنت نے سائرہ بانو سے بنوایا تھا' دستر خوان کی رونق تھے۔ منٹو سے پڈنگ بنوانے کا خیال شہرام کو بڑے استحقاق (اس کی نظر میں) اور دھڑلے سے کچن میں کام کرتی سائرہ بانو کو دیکھ کر آیا تھا۔
"حلوے میں سبز الائچی کا بگھار ڈالتے ہیں میاں جو طبیعت کو بوجھل نہیں ہونے دیتی۔" شفاف ہتھیلی پہ وجاہت صاحب کی گولیاں نکال کر ان کی جانب بڑھاتے ہوئے تمکنت خفیف سی ہوکر بولیں۔ "مگر کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ آپ ان کی طرف داری اتنی شدومد سے کس لیے کررہے ہیں ہمارے سامنے؟" انہوں نے سرد لہجے میں کہتے ہوئے وجاہت صاحب کو گھورا۔۔۔ وجاہت صاحب نے ان سے گولیاں لے کر پانی سے نگلیں۔ منہ رومال سے تھپتھپایا اور کرسی سے اٹھ کر بغور انہیں دیکھ کر اطمینان سے بولے۔
"نہ آپ پوچھ سکتی ہیں' اور نہ ہی ہم بتانے کے پابند ہیں۔" وہ کہہ کر انہیں یونہی ہکا بکا چھوڑ کر کمرہ عبور کرگئے۔ مساجد سے سائرن کی آواز آنا شروع ہوگئی تھی اور تمکنت کے ذہن و دل سے بھی۔

☆ ☆ ☆

"اچھا بیٹی۔۔ کہا سنا معاف۔"
تمکنت سائرہ بانو کو بڑی گرم جوشی سے گلے لگاکر الوداع کرتے ہوئے بولیں۔ "بہت رونق ہوگئی تھی تمہاری آمد سے۔۔۔ اب دل ذرا مشکل سے لگے گا۔" پتا نہیں کہ اس بیان میں سچائی کا عنصر کتنا تھا بہرحال جس قدر بھی تھا' ان سب کے درمیان' سائرہ بانو کو الوداع کرنے کی غرض سے ایستادہ منٹو کو تو ان کا لہجہ بہت محسوس ہوا۔ شہربانو' نند کی ساس کے سوئم کے بعد کل لوٹ آئی تھیں اور آج چار روز بعد یہاں سے سائرہ بانو کی رخصتی تھی۔ تمکنت تو اسے ابھی کچھ روز اور یہاں ٹھہرانے پر مصر تھیں لیکن شہربانو اور خود سائرہ نے سہولت سے انکار کرتے ہوئے فی الحال واپسی کو ترجیح دی۔
"خالہ آپ تو شرمندہ ہی کرکے چھوڑیں گی مجھے۔" سائرہ ذرا سا جھینپ گئی۔ "سچ کہوں تو مجھے بھی یہاں آکر بہت اچھا لگا۔ مجھے منٹو جیسی پیاری اور مخلص دوست مل گئی۔ جسے میں نے اپنی گیجٹ بدل بہن بنانے کا پکا ارادہ کرلیا ہے۔" وہ مسکراکر منٹو کو دیکھنے لگی۔ منٹو نے بھی مسکراتے ہوئے خیر مقدمی انداز سے سر بائیدا" ہلایا شہرام کے چہرے کے تنے عضلات بھی ڈھیلے پڑگئے۔ اسے یوں سب کے سامنے سائرہ کا منٹو کی تعریف کرنا بلاشبہ بہت بھایا تھا۔ جبکہ وہ تناؤ اب تمکنت کے چہرے پر واضح نمایاں ہوگیا۔
"بھئی دوپٹا بدل تو سنا تھا۔" وجاہت صاحب بھی شفقت سے مسکرادیے۔ "یہ گیجٹ بھلا کیا بلا ہے؟"
"چھوڑیں خالو ابا' آپ نہیں سمجھیں گے۔" اس نے شریر انداز میں انہیں دیکھا۔
"ہاں بھئی نئے زمانے کی نئی نئی باتیں۔" شہربانو نے ہنس کر کہا۔ "بہرحال تمو آپا' ہم آپ کی مہمان نوازی

کے شکر گزار ہیں' آپ لوگ بھی تشریف لائیے نا ہمارے ہاں کسی روز۔" شہربانو نے تمکنت بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے اخلاقاً" کہا۔" سائرہ بانو اب منتو سے گلے مل کر نہ جانے کیا کہہ رہی تھی۔ ٹراؤزر کی جیبوں میں دونوں ہاتھ پھنسائے شہرام کی ساری توجہ اسی جانب تھی۔

"ہاں شہربانو۔" تمکنت بیگم نے گمبھیرتا سے کہا۔

"ہمارا ارادہ ہے دو چار روز میں آپ کے ہاں رونق بخشنے کا۔ ان شاء اللہ جلد ہی دوبارہ ملاقات ہوگی۔" ان کا لہجہ اتنا غیر معمولی کھنک لیے ہوئے تھا کہ ان کے نزدیک کھڑے وجاہت صاحب نے بے طرح چونک کر ان کا چہرہ دیکھا۔

☆ ☆ ☆

"اچھا وقت گزرا تمہارا اس سائرہ بانو کے ساتھ ویسے وہ اتنی بری بھی نہیں میں نے ہی شاید خواہ مخواہ اس سے بیر پال لیا تھا۔" شہرام سر جھٹک کر ہنستے ہوئے بولا۔ یہ مغرب کے بعد کا وقت تھا۔ وہ دونوں درمیانی میز پر بڑے بڑے چائے کے مگ سجائے لان چیئرز پر براجمان تھے۔ تمکنت اس وقت ذرا دیر آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں چلی جایا کرتی تھیں۔ وجاہت صاحب لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی پر خبریں دیکھ رہے تھے۔ مینا کچن صاف کر کے اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

"شہری سنتے ہیں دعا سے ہر چیز مل جاتی ہے۔" غیر مرئی نقطے کو تکتی منتو کا دھیان یقیناً" کہیں اور تھا۔ شہرام نے غور سے اس کا پرسوچ چہرہ دیکھ کر تشویش زدہ سے لہجے میں پوچھا۔

"ہوا کیا ہے؟"

"پتا ہے شہری۔" وہ ہنوز کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔ "مجھے کبھی کسی نے دعا کی طاقت اور اہمیت کے بارے میں بتایا نہیں تھا۔"

"ہاں منتو بے شک۔" وہ ایقان آمیز مضبوط لہجے میں بولا۔ "دعا تقدیر تک بدل دینے کی طاقت رکھتی ہے بشرطیکہ خلوص دل اور یقین کامل کے ساتھ مانگی جائے۔ مگر تمہیں اچانک یہ خیال کیوں آیا؟"

"کیوں کہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے شہری۔" اس نے فلسفیانہ انداز سے کہا۔ "کہ معاملات ہمارے ہاتھوں سے نکل چکے ہیں۔ اور اب دعا کے علاوہ کوئی چیز بھی ہمارا ساتھ نہیں دے سکتی۔" اس کے بظاہر سادہ لہجے میں کوئی ایسا وجدان بول رہا تھا اس وقت کہ شہرام چپ کا چپ رہ گیا۔ کوئی تسلی یا دلاسا نہ دے سکا اسے۔ اور ان سے چند قدم کے فاصلے پر لان کی جانب کھلنے والے لاؤنج کے گلاس ڈور پہ کھڑی تمکنت انہیں محو گفتگو دیکھ کر خاموشی کے ساتھ وہیں سے لوٹ گئیں۔ جو کچھ سوچ بچار کرنا تھی وہ کر چکی تھیں۔ بس اب انہیں جلد ہی کوئی فیصلہ کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ہم کل سائرہ بانو کا ہاتھ شہرام کے لیے مانگنے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں اگر آپ لوگ ہمیں کوئی اچھا مشورہ دینا چاہیں تو ہم ہمہ تن گوش ہیں۔" دو دن مشکوک قسم کی سرگرمیوں میں ملوث رہنے کے بعد بالآخر دوسرے دن کے اختتام پر تمکنت بیگم نے اپنے کمرے میں موجود حاضرین پر نگاہ ڈالتے ہوئے وہ دھماکا کر ہی دیا کہ جس کا انٹیلی جنس اداروں بلکہ شخصیات کو پہلے ہی سے کچھ کچھ اندازہ ہو چکا تھا۔

"امی حضور..." تابیہ کی آنکھیں حیرت و غم سے پھٹنے کے نزدیک ہو گئیں "آپ اس بڑھیا کو اس عمر میں میرے اکلوتے خوبرو جوان جہاں بھائی کی بیوی بنا کر آخر کیا ثابت کرنا چاہ رہی ہیں۔"

"بے تکی ہانکنا بند کریں تابیہ" تمکنت بیگم نے تو اسے صرف گھورنے ہی پر اکتفا کیا جبکہ طیبہ نے باقاعدہ جھاڑ کر رکھ دیا۔ "امی جان شہربانو خالہ کی بیٹی کی بات کر رہی ہیں اس وقت۔"

"لیکن بیگم! یہ کیا طریقہ ہوا۔" وجاہت صاحب دبے دبے غصے سے بولے۔ "نہ آپ نے ہم سے کوئی صلاح لی۔ نہ مشورہ ہی کیا۔ بس یک طرفہ فیصلے کا ڈنڈا اٹھا کر ہمارے سر پہ مار رہی ہیں۔"

"وہ بھی صلاح مشورہ کرنے ہی کی خاطر بیٹھے ہیں یہاں' اور یوں بھی میاں آپ کو ان کے خالص زنانہ معاملات کے متعلق کیا پتا کیسے طے کیے جاتے ہیں۔" انہوں نے اپنے ازلی رعونت آمیز انداز سے کہا تو وجاہت صاحب چیں بہ چیں ہو کر بولے۔

"ہم سے نہ سہی۔" انہوں نے ایک پریشان نظر اس دھماکا خیزبات کو سننے کے باوجود سر نیہواڑے بیٹھے شہرام پر ڈال کر کہا۔ "مگر جس کی زندگی کا معاملہ ہے اس کی پسند ناپسند کے بارے میں تو پوچھنا چاہیے نا آپ کو۔ یہ اس کا حق ہے۔"

"ہمیں حقوق و فرائض پر درس نہ دیں وجاہت حسین صاحب۔" وہ چمک کر بولیں' تینوں بیٹیاں پریشانی سے کبھی ماں تو کبھی باپ اور گاہے گاہے سر جھکائے بیٹھے بھیا راجہ کی جانب کی نظر ڈال رہی تھیں۔

"ہم ماں ہیں شہرام کی' ہمیں اس کی بہتری کے بارے میں اس سے زیادہ معلوم ہے۔" وہ تو اپنے تئیں سب کچھ طے کیے بیٹھی تھیں مگر وجاہت صاحب نے تو یہاں باقاعدہ بحث شروع کر دی تھی۔

"ماں ہیں' تب ہی آپ کی رضامندی کے لیے اپنی جان مار رہے ہیں آپ کے صاحبزادے ورنہ آج کے اس بدلحاظ دور میں کون سا بیٹا' والدین کی اتنی پروا کرتا ہے۔" وجاہت صاحب کو حقیقتاً غصہ ہی آگیا تھا ان کی ہٹ دھرمی پر۔

"میری رضامندی؟ کیسی رضامندی؟" وہ ناسمجھی سے ان کی صورت دیکھنے لگیں۔

"اتنی انجان مت بنیں تمکنت بیگم۔" وجاہت صاحب چبا چبا کر بولے "کیا آپ ناواقف ہیں اپنے بیٹے کی پسند سے؟"

"اوہ! تمکنت نے ایک کاٹ دار نگاہ اپنے مجازی خدا پر ڈالی۔ "یعنی ہمارا اندازہ بالکل درست تھا کہ آپ شروع ہی سے ان کے رازدار ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ساری پٹی دراصل آپ ہی نے انہیں پڑھا کر یہاں بلوایا ہو۔" وہ بے اعتباری سے بولیں تو وجاہت صاحب بری طرح بھنا کر قدرے بلند آواز سے دھاڑے۔

"آپ جیسی شکی فطرت خاتون کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں اور نہ ہی ہم اتنے بے وقوف واقع ہوئے ہیں جو ایسا بچکانا مشورہ انہیں دیتے۔"

"تب پھر آپ کیوں اس معاملے میں بحث کر کے ہم سب کا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں وجاہت صاحب۔" وہ سرد لہجے میں بولیں۔ "جبکہ ہم ہر طرح سے سوچ بچار کرنے کے بعد سائرہ بانو کو بہو بنانے کا حتمی فیصلہ کر چکے ہیں۔ پھر اعتراض کی گنجائش کہاں نکلتی ہے؟" واہ کیا خوب آمرانہ انداز تھا ان کا۔

"گنجائش نکلتی ہو یا نہ نکلتی ہو۔" اتنی دیر سے سر جھکائے بیٹھا شہرام یکدم سر اٹھا کر سرخ آنکھوں سمیت بڑے ضبط سے بولا۔ "مگر میں کسی قیمت پر بھی یہ رشتہ قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں۔"

"ہماری جان کی قیمت پر بھی نہیں؟" چند ثانیے اس کی صورت تکنے کے بعد تمکنت بیگم نے سنسناتے لہجے میں عجیب انداز سے پوچھا اور۔۔۔ اس وقت موجود یہاں ہر ذی نفس کو گویا سانپ سونگھ گیا۔

☆ ☆ ☆

"پتا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ قسمت مجھے اتنی آسانی سے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی یوں کیسے دے سکتی ہے۔" اس نے رو رو کر اپنا حال بگاڑ رکھا تھا۔ اس کے خدشے بے جا نہیں تھے آخر وہی ہوا نا جس کا اسے ڈر تھا۔

"آسانی سے کیا" شہرام ایک سے دوسرے ہاتھ پر زوردار مکا بے بسی سے مارتے ہوئے بولا۔ "یہاں تو مشکل سے بھی ہمارے سنگم کا کوئی چانس نہیں باقی بچا اب۔" ظاہر ہے اس کی ضدی والدہ محترمہ نے بات ہی ایسی کر دی تھی۔

"میرے یہاں رہنے کا اب کیا جواز باقی بچا ہے۔" "میری ٹکٹ کنفرم کروا دو شہری۔ میں اب جلد از جلد یہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہوں۔" وہ مزید اونچا

اونچا رونے لگی تو اتنی دیر سے تحمل مزاجی سے ان دونوں "ناکام عاشقوں" کے جذباتی مکالمے بڑے ضبط سے سنتے وجاہت صاحب کو اس بار حقیقتاً" طیش آگیا۔

"خاموش ہو جاؤ منتو بیٹی۔ یہ کیا اتنی دیر سے بھاں بھاں کر کے نادان بچوں کی طرح روئے چلی جارہی ہو۔"

"تو اور کیا کروں ابا؟" ان کے ڈپٹنے پر وہ خفیف سی ہو کر سسکیاں ضبط کرتے ہوئے بے چارگی سے بولی۔ "اب کرنے کو رہ ہی کیا گیا ہے۔"

"کیوں ؟ حرف دعا بھول گئیں ؟" انہوں نے فہمائشی نگاہ اس پر ڈالی۔ "آپ کو دو چار روز پہلے دعا کی اہمیت پر کتنا مفصل لیکچر پلایا تھا کیا اس کا یہی نتیجہ ہے؟"

"چھوڑیں ابا جان۔" شہرام بھی اترے منہ اور ٹوٹے دل کے ساتھ ڈوبے لہجے میں بولا۔ "اب دعا بھی کیا کرے گی؟"

"ہمارے جلد باز 'جذباتی احمق برخوردار۔" وجاہت صاحب نے اپنے ساتھ والی کرسی پر لٹے پٹے انداز سے براجمان شہرام کے کندھے پر حوصلہ افزائی سے ہاتھ رکھتے ہوئے پدرانہ شفقت سے کہا۔ "دعا سے معجزے رونما ہو جاتے ہیں۔"

"آپ کو معجزوں پر یقین ہے؟" منتو ڈبڈبائی آنکھوں سے انہیں دیکھ کر بولی تو وہ اس کے استفسار پر مسکرا اٹھے۔

"کیوں بیٹی۔ کیا آپ کو نہیں ہے۔ معجزوں پر یقین کرنا تو جز ایمان ہے۔ بہرحال ہمارا مشورہ فی الحال آپ دونوں کے لیے یہی ہے کہ اب خدارا اپنا یہ طفلانہ رونا دھونا بند کر کے نیچے چلیں اور آج کی یہ ساری رات رب کے حضور مناجات کرتے گزاریں۔ پھر دیکھیے' انہونی کیسے ہونی میں بدلتی ہے" وہ ان کے خالی ہاتھوں میں پھر سے امید کے جگنو تھمانے لگے۔ آہ بے چارے وجاہت حسین صاحب۔ ہر بے بس انسان کی طرح جب کچھ نہ کر سکے تو انہیں خالی خولی دعاؤں کے راستے پر لگا دیا۔

☆ ☆ ☆

"پر کچھ پتا تو چلے کہ آخر ہوا کیا؟ امی تو شہربانو خالہ کے ہاں بہت خوشی خوشی گئی تھیں صبح۔" پریشانی سے پر آواز میں طیبہ والد بزرگوار کی جانب ناسمجھی سے دیکھ کر مستفسر ہوئیں۔ پرسوں رات اپنی جیت پر کتنی مسرور تھیں وہ۔ ان کی جان سے گزر جانے والی دھمکی کتنی کارگر ثابت ہوئی تھی۔ وجاہت صاحب تو وجاہت صاحب خود شہرام ان کی اس انتہائی بات کی تاب نہ لاتے ہوئے قریب قریب سرینڈر کر چکا تھا۔ اور منتو تو خیر ان کے نزدیک کسی گنتی میں نہ تھی۔ تمکنت بیگم کا ارادہ پہلے شہربانو کے ہاں جا کر ان کے کان میں بات ڈال دینے کے بعد باضابطہ طور پر سب کے ساتھ جا کر رسم کرنے کا تھا اور آج صبح وہ اسی سلسلے میں وہاں گئی بھی تھیں۔ لیکن جب واپس پلٹیں تو گویا وہ تھیں ہی نہیں۔ اب پتا نہیں وہاں ایسی کیا بات ہو گئی۔ صبح سے یوں ہی کمرہ بند کیے اکیلی پڑی تھیں اندر افطار کے وقت بھی باہر نہ نکلیں بس مینا سے اندر دو کھجوریں اور پانی منگوا کر افطار کر لیا۔ وجاہت صاحب نے ہمت کر کے استفسار کیا مگر انہیں بھی زیادہ لفٹ نہیں کروائی گئی۔

"بھئی میں کیا جانوں" وجاہت صاحب چڑ گئے۔ وہ خود ان کے ناقابل فہم رویے پر الجھے ہوئے تھے۔

"آپ خود جا کر کیوں نہیں پوچھ لیتیں ان سے۔ آخر کو لاڈلی ہیں آپ ان کی۔ شاید وہ آپ کے سامنے کچھ بتانا پسند کریں۔"

"رہنے دیں ابا" طیبہ نے دامن بچایا۔ "اتنا تو آپ بھی سمجھتے ہیں کہ اس وقت ان کا موڈ کچھ ٹھیک نہیں۔ جب مناسب سمجھیں گی خود ہی بتا دیں گی۔ فی الحال انہیں چھیڑنا کچھ نامناسب لگ رہا ہے۔"

"ہاں درست کہتی ہو۔" وجاہت صاحب نے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلایا۔ "یہ بتاؤ النصر میاں کہاں ہیں؟"

"وہ شہرام کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔

آپ یہ بتائیں۔" انہوں نے آواز کا والیوم رازداری کی وجہ سے کم کرلیا اور وجاہت صاحب کی جانب جھک کر بولیں۔ "وہ منٹو صاحبہ کہاں ہیں' کیا واپس چلی گئیں۔"

"اپنے کمرے میں ہوگی' آپ ایسا کریں مینا سے کہہ کر سب کے لیے فٹافٹ چائے تو بنوائیں۔ آپ کی والدہ تو لگتا ہے اب صبح ہی اٹھیں گی۔" انہوں نے لاپروائی سے کہا۔ اور ٹی وی کی آواز بڑھادی۔

"ٹھیک ہی کہتی ہیں امی کہ ابا کو ان کی بالکل پروا نہیں۔" طیبہ ان کا بے فکرا انداز دیکھ کر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی وہاں سے اٹھ گئیں۔ جبکہ وجاہت صاحب دل و جان سے نیوز چینل کی جانب متوجہ ہوچکے تھے۔

☆ ☆ ☆

"آہ ماں۔ ایسی سبکی' اتنی بے عزتی' اس قدر تذلیل۔" اور اپنے کمرے سے باہر کی چہل پہل اور رونق سے قطعی بے نیاز' بے قراری سے کروٹ پر کروٹ بدلتی تمکنت بیگم بار بار آہیں بھرتی ہوئیں اس وقت خود اپنے آپ سے مخاطب تھیں۔

"معاف کیجئے گا تمو خالہ مگر مجھے آپ جیسی آمر خاتون کے گھر کی بہو بننے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میری تو ساری زندگی آپ کی آنکھوں کے تیور دیکھنے ہی میں گزر جائے گی۔ سو سوری خالہ' مگر میں ایک جیتا جاگتا انسان ہوں آپ کے گھر کا کوئی بے جان سامان نہیں جسے آپ جب چاہیں اپنی مرضی سے یہاں سے وہاں کردیں یا دل چاہے تو اٹھا کر کاٹھ کباڑ میں پھینک آئیں۔" ایک مرتبہ پھر ان کے کانوں میں اس سائرہ بانو کی بے مروت اور اخلاقیات سے عاری آواز گونجی جو آج صبح تک بطور بہو ان کی اولین پسند تھی۔ انہوں نے اذیت سے آنکھیں بند کرلیں۔

"ویسے میرا آپ کو مخلصانہ مشورہ ہے کہ بہتر ہے آپ کسی روبوٹ سے شہرام کو بیاہ دیں۔ اور اس کا ریموٹ اپنے پاس رکھ لیں تاکہ وہ بالکل آپ کے اشاروں پر ناچ سکے۔" ہونٹوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ اور آنکھوں میں بدلحاظی۔ یہ وہ سائرہ بانو تو نہیں تھی جو تین دن ان کے ہاں گزار گئی تھی۔ وہ اتنی متحیر تھیں کہ بے ساختہ منہ سے یہ بات نکل ہی گئی وہیں اس کے سامنے۔

"ہاں تو مہمان تھی میں آپ کے ہاں اس وقت لیکن اب تو بات دوسری ہے یہ میری ساری زندگی کا معاملہ ہے اور میں ایسی ہی ہوں آپ دیکھ سکتی ہیں مجھے۔" اس نے اپنی جانب پورے اعتماد اور تفاخر سے اشارہ کیا۔ وہ اس وقت ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس تھی۔ کندھے تک آتے سیدھے بالوں کو پونی میں جکڑ رکھا تھا۔ تمکنت کی آنکھوں میں اس کا سراپا ٹھہرا انہوں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ "دیکھیں خالہ... میں ٹو دا پوائنٹ بات کروں گی۔ امی نے سکھایا سب کچھ ہے مگر کوکنگ کرنا مجھے پسند نہیں۔ نہ ہی میں کرتی ہوں۔ ہاں کبھی کبھار کی بات الگ ہے۔ جبکہ آپ نے تو اپنی زندگی کا مقصد ہی تینوں وقت زور و شور سے کوکنگ کرنا اور ہر وقت گھر کی نادیدہ گرد جھاڑتے رہنا بنا رکھا ہے تو ظاہر ہے آپ اپنی بہو سے بھی یہی امید رکھیں گی۔" اس کی سپاٹ آواز ایک مرتبہ پھر ان کے کانوں میں گونجی تو وہ اس بار بے کلی سے اٹھ بیٹھیں۔

"ویسے شہرام ایک آئیڈیل لائف پارٹنر ثابت ہوسکتا ہے مگر سوری خالہ' مجھے لگتا ہے۔ میری آپ کے ساتھ نہیں بنے گی۔" لفظ تھے یا برچھی؟ جو سیدھے دل میں ترازو ہوگئے۔

"آہ... تو مسترد کیے جانا اتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔" وہ سامنے سنگھار میز کے آئینے میں منعکس ہوتا اپنا بکھرا بکھرا وجود دیکھ کر تکلیف سے رو پڑیں۔ "بڑا زعم تھا نہ تمہیں خود پر' کیا سمجھا تھا تم نے کے سارے اختیارات قدرت نے صرف تمہیں ہی دے رکھے ہیں۔ غرور تکبر کی چادر ہے' اور جو نادان انسان اس چادر کو اوڑھنے کی کوشش کرتا ہے وہ بالکل اسی طرح ذلت اٹھاتا ہے جیسا کہ آج تم نے اٹھائی اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کے ہاتھوں۔ پتا نہیں اس ضمیر کی آواز

ہمیشہ اتنی بلند اور کرخت کیوں ہوتی ہے؟ تمکنت بیگم ہچکیوں سے رو رہی تھیں۔ شاید عام لوگوں کے نزدیک یہ بہت معمولی بات ہو لیکن تمکنت بیگم جیسی ضدی انا پرست اور خود پسندی کے مرض میں مبتلا خاتون کے لیے یہ بہت بڑی چوٹ تھی۔

"اور اب اتنا رونا کس لیے؟ تم خود ہی تو اتنے دن سے مسلسل اس معصوم بچی کے ساتھ ایسے ہی کھدرے انداز سے پیش آرہی ہو۔ تم انو یا مانو تمکنت بیگم، تمہیں اس لڑکی کا دل دکھانے کی سزا دی گئی ہے، جو تمہارے جگر گوشے کی محبت میں، تمہارا دل جیتنے کی کوشش کر رہی ہے اور تم اسے اتنی ہی شدومد سے مسترد کرتی آرہی ہو۔ اپنے آگے کم تر اور حقیر سمجھتی آرہی ہو۔" اور یہ ضمیر بھی نا ایک بار جو بولنا شروع ہو جائے پھر چپ ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ ان کے دل پہ ضرب لگائی جا چکی تھی۔ اور آئینہ بھی سامنے ہی تھا۔ پھر اب اور مزید سمجھنے یا سمجھانے کو باقی ہی کیا رہ گیا تھا؟

☼ ☼ ☼

"آنٹی کیا میں اندر آجاؤں؟" ان کے کمرے کے باہر کھڑی منتو نے ڈرتے ڈرتے اندر جھانک کر اجازت طلب نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ ایک دو روز یوں ہی اداس اور گم صم رہنے کے بعد تمکنت اب خود کو سنبھال چکی تھیں۔ گھر والوں کے استفسار پر انہوں نے "سائرہ کی مرضی نہیں" کہہ کر انہیں ٹال دیا تھا (ظاہر ہے مطمئن تو خیر کوئی بھی نہیں ہوا تھا ان کے جواب سے) وہ خود احتسابی کے عمل سے گزر چکی تھیں۔ تب بے وجہ وہاں خود پر بیتی اوروں کے سامنے دہرا کر خود کو ان کی نظروں سے ارزاں کرنے کا کیا فائدہ تھا؟ کسی نے زیادہ کھوج اس لیے بھی نہیں کی کہ سب ہی اس طوفان کے خاموشی سے گزر جانے پر خدا کے شکر گزار تھے۔ شہرام بھی اس بلا کے اتنی آسانی سے ٹل جانے پر تاحال بے یقین تھا۔ اور وہ جو اس کی امیدیں آخری دموں پر تھیں دوبارہ سے زندہ ہو چکی تھیں۔

"اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے بیٹی۔" تمکنت اپنی الماری کے نیچے خانے سے کوئی شے برآمد کرتے ہوئے حلاوت سے بولیں تو ان کے لہجے پر منتو بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ مگر جھجکتے ہوئے اندر داخل بھی ہو گئی۔

"کھڑی کیوں ہیں۔ بیٹھ جایئے۔" وہ خود بھی بستر پر بیٹھ کر اپنے سامنے رکھا کپڑے کا سیاہ تھیلا احتیاط سے کھولنے لگیں۔

"وہ۔ وہ آنٹی۔" وہ میکانکی انداز سے ان کے سامنے بیٹھ کر متذبذب لہجے میں کہنا شروع ہوئی۔

"میں آپ سے سوری کرنے آئی ہوں۔" "سوری۔" تمکنت نے تھیلے میں سے کوئی بہت شوخ رنگ، آبدار سی شے برآمد کرتے ہوئے تعجب خیزی سے دہرایا۔ "مگر کس بات کی؟"

"میری وجہ سے اتنے دن خواہ مخواہ آپ کو ذہنی کوفت اٹھانا پڑی۔" وہ ان کے ہاتھ میں موجود اس چمکیلی شے پر نظریں مرکوز کرتی ہوئی بولی۔ "لیکن اب آپ بالکل فکر نہ کریں۔ کیونکہ میں نے واپسی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور شہری کو بھی سمجھا دیا ہے کہ وہ آپ کی پسند سے نہیں شادی کر لے۔" باوجود ضبط کے اس کی آواز لڑکھڑا سی گئی۔

"اچھا! وہ زیر لب مسکرائیں۔" تب پھر کیا جواب دیا آپ کو شہرام میاں نے؟ کیا وہ اس بات پر رضا مند ہو گئے۔ انہوں نے سچے سنہرے گوٹے اور ستاروں سے سجا لال آنچل کھول کر بستر پر پھیلا دیا اور بہ نظر عمیق، تنقیدی نگاہوں سے اس کا جائزہ لینے لگیں۔ اچھا تو یہ دوپٹا ہے۔ مگر کس کا۔ دوپٹے کی خوب صورتی اور چمک میں کوئی کلام نہ تھا۔

"یہ تو نہیں پتا آنٹی کہ وہ میری بات مان گیا ہے یا نہیں۔" وہ افسردگی سے بولی مگر اس کی نگاہیں اسی آنچل پر گویا گڑی ہوئی تھیں۔

"چلیں" تمکنت نے دوپٹا ہلکا سا جھٹکا اور بجائے واپس تھیلے میں رکھنے کے اسے ہینگر میں ڈال کر الماری

میں لٹکانے لگیں۔ "آپ نے اپنی سی کوشش تو کی' اب انہیں سمجھ آئی یا نہیں۔ یہ ہم ان سے خود پوچھیں گے۔ اور فی الحال آپ جا کر باورچی خانے میں ذرا مینا کا ہاتھ بٹا دیں تو ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے۔ دراصل آج ستائیسویں شب ہے اور ہم نے آج افطاری مسجد اور محلے میں بھجوانے کا ارادہ کر رکھا ہے۔" انہوں نے الماری بند کر کے غسل خانے کی جانب بڑھتے ہوئے اسے ہدایات دیں۔ اس کے اس قدر اعلا ظرفی کے مظاہرے کے باوجود ان کے منہ سے کوئی تسلی یا دلاسے کا جھوٹا لفظ تک نہ نکل سکا تھا منتو کے لیے۔ اس بات نے اس کی آنکھیں نم اور دل میں واپسی کا ارادہ پختہ کر دیا۔

☼ ☼ ☼

"دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا۔" شہرام بھڑک کر دہاڑا۔ "یہ ساری بکواس تم امی کے سامنے کر کے آئی ہو۔ ارے بولنے سے پہلے ذرا سوچ تو لیتیں۔ ابھی تو سائرہ بانو نامی خطرہ سر سے ٹلا ہے صرف۔ باقی شہر کی لڑکیاں زندہ سلامت موجود ہیں۔" اس نے تو زبردستی منتو کو تمکنت کی مزاج پرسی اور دلجوئی کی خاطر ان کے کمرے میں دھکیلا تھا اور موصوفہ وہاں یہ الٹا کام کر آئی تھیں۔

"نہیں شہری۔ ؟ وہ افسردگی سے پر مگر مضبوط لہجے میں بولی۔ "میں نے واقعی واپسی کا یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ میں کسی پر ناپسندیدہ ہستی بن کر مسلط نہیں ہونا چاہتی اگر وہ راضی نہیں ہیں تب تم میری وجہ سے اپنی امی کو ناراض مت کرو۔ کیونکہ محبوبائیں تو اور بھی مل جائیں گی تمہیں۔ مگر ماں کہیں نہیں ملے گی۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"میری تو سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اگر تم نے اردو سیکھ ہی لی تھی تب گھٹیا دو پیسے کے جذباتی اردو ناول خرید خرید کر پڑھنے کی ضرورت کیا پڑی تھی تمہیں۔" وہ اس کے مکالموں پر دانت کچکچا کر بولا۔

"تم شاید میری بات مذاق سمجھ رہے ہو۔" وہ زخمی لہجے میں بولی۔

"مذاق نہیں سمجھ رہا۔" شہرام نے سرخ آنکھوں سے سفید دوپٹے کے ہالے میں مقید اس کا دھلا دھلایا پاکیزہ چہرہ دیکھا۔ جو آج نجانے کیوں بہت پھیکا پھیکا محسوس ہو رہا تھا۔

"پر اس محبت کا کیا جو ہمیں ایک دوسرے سے ہے۔"

"محبت کا کیا ہے شہری اس کے تو نصیب میں ازل سے جدائی لکھی جا چکی ہے۔" وہ پھیکے انداز سے مسکرائی۔ جبکہ مسکرانا تو درکنار وہ تو اس بار کچھ بول ہی نہ سکا۔ کیا وقت جدائی آن پہنچا تھا؟

☼ ☼ ☼

اور آج "لیلتہ الجزا" یعنی چاند رات تھی۔ پورا مہینہ احتساب کے ساتھ روزے رکھنے والے اور رب کی خوشنودی کی خاطر عبادات کی مشقت خوشی خوشی اٹھانے والے مومن مومنات کو رب کی طرف سے ملنے والی انعام کی رات۔ اپنی زندگی کا ایک اور رمضان المبارک بخیر و خوبی گزار لینے پر سبھی بہت شاداں و فرحاں تھے۔ اس وقت تمکنت بیگم کے ڈرائنگ روم میں جشن کا سا سماں تھا۔ آج صبح ہی تمکنت نے اپنی تینوں بیٹیوں کو رات اپنے گھر پہنچنے کی ہدایت کر دی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی دعوت تھی کہ سب ہی جانتے ہیں کہ چاند رات ہماری زندگی میں گوناگوں مصروفیات لیے داخل ہوتی ہے اور ایسے میں ان کے ہاں جا کر کیا کرنا تھا یا وہاں کیا ہونا تھا؟ طیبہ اور تابیہ سوچ سوچ کر الجھ رہی تھیں کچھ متجسس اور مشتاق بھی تھیں کو دیکھیں۔ آخر کیا معاملہ ہے جبکہ منیبہ کا معاملہ آج ان دونوں کے برعکس تھا۔ تمکنت نے تو آج صبح کیا تھا نا اسے فون۔ اس نے تو دو روز قبل ہی والدہ محترمہ کو فون کر کے نم ناک لہجے میں دو چار ایسی باتیں کیں کہ نہ صرف تمکنت کا دل مزید دکھا بلکہ اگر ان کے ذہن میں کہیں کوئی گرہ ہمن میں ذرا سی تشویش کہیں باقی بھی تھی تو وہ بھی مکمل ختم ہو گئی۔

"امی جان' وہ کہہ رہی تھی' پندرہ کا سن تھا جب

آپ نے اپنی زمانے کے مطابق ہمیں تھوڑی بہت تعلیم دلا کر مگر گھریلو امور میں مکمل طاق کر کے ان کے ساتھ رخصت کر دیا۔ یہ تو بیاہ کے بعد پتا چلا کہ ہم ان کی نہیں ان کی والدہ کی پسند ہیں ورنہ انہیں تو اعلا تعلیم یافتہ' ماڈرن اور ان کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلنے والی شریک سفر کی خواہش تھی۔ ان کے بقول میرے اندر تو کوئی 1950ء کی بڈھی روح گھسی ہوئی ہے جسے نہ ہنسا بولنا آتا ہے' نہ زمانے کے مطابق پہننے اوڑھنے کا سلیقہ اور تو اور انہیں تو وہ کھانے بھی مرغوب نہیں جو ہم بڑی محنت سے بناتے ہیں۔" وہ ٹوٹے لہجے میں بولتی گئی۔ تمکنت بیگم دم بخود سن رہی تھیں۔

"امی جان' چھوٹا منہ بڑی بات۔۔۔ کیا ہے اگر آپ اس بے چاری منتو کو خوشی خوشی گلے سے لگا لیں تو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آپ کے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں لیکن ایک مرتبہ ٹھنڈے دل سے آپ غور تو کر کے دیکھیں۔ وہ نئے دور کی تعلیم یافتہ لڑکی ہونے کے باوجود آپ کی رضامندی سے آپ کے بیٹے کے نکاح میں آنا چاہتی ہے۔ آپ کا دل جیتنا چاہتی ہے۔ ذرا سوچیے۔۔۔ اگر وہ دونوں وہیں شادی کر لیتے تب آپ کیا کرتیں۔۔۔ یوں بھی بے چاری کے والدین حیات نہیں۔ آپ سر پہ دست شفقت رکھ دیں گی تو ساری زندگی آپ کی مشکور فرماں بردار رہے گی۔" یہ ان کی کم گو' نسیتا" کم عقل بیٹی انہیں کون سے سبق پڑھا رہی تھی؟ جتنی بار غور کیا اتنی مرتبہ آنکھیں بھر آئیں۔

"تو ثابت ہوا تمکنت بیگم کہ تم سے زیادہ تو تمہاری اولاد معاملہ فہم اور عقل مند ہے۔" یہ ضمیر کا بچہ بھی نا۔۔۔ اسے زبان مل چکی تھی' اب بھلا اس سے خاموش رہ کر کیا کرنا تھا۔

"اوفوہ امی جان!" تابندہ بے چین ہو ہو کر تھک چکی تھی اب۔ تجسس بھی غنودگی میں جا چکا تھا اور تمکنت تھیں کہ کچھ بتانے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔

"پلیز اب بتا بھی چکیں کہ آخر اتنی ایمرجنسی میں ہم سب کو یہاں بلوانے کا مقصد کیا ہے؟" تمکنت دلکشی سے مسکرائیں اور منیبہ کو آنکھوں کے اشارے سے خفیف سا اشارہ کیا۔ وہ سر ہلا کر فوراً" باہر نکل گئی۔ اور جلد ہی واپس پلٹی تو اس کے ہاتھ خالی نہ تھے۔

"آپ سب گواہ رہیے۔" وہ اپنی نشست سے اٹھ کر نا سمجھی سے سب کو دیکھتی فق چہرے والی منتو کے سامنے جا کھڑی ہوئیں' حاضرین محفل ہمہ تن وہیں متوجہ تھے۔ "ہم آپ سب کے سامنے منتہا بیٹی کو اپنے شہرام کی دلہن بنانے کا باضابطہ اعلان کرتے ہیں۔" انہوں نے منیبہ کے ہاتھ سے لے کر وہی لال دسہرا دوپٹا جو اس دن نکال کر دیکھ رہی تھیں اور جو ان کے اپنے نکاح کی یادگار تھا اور جسے انہوں نے اس موقع کے لیے بہت سینت سینت کر سنبھال رکھا تھا اوڑھاتے ہوئے کہا تو ایک لحظہ کے لیے جیسے سب ہی کو سکتہ سا ہو گیا۔۔۔ پھر اس کے بعد چہار جانب جو شور اٹھا ہے تو بس۔۔۔ مبارک' سلامت' قہقہے' مسرتیں گویا سب ہی کے دل میں یہی چاہت تھی بس ایک طیبہ ذرا سنجیدہ ہی بیٹھی تھیں۔

"آنٹی آپ بہت اچھی ہیں۔" سرمئی ٹراؤزر کے اوپر ملگجی سی سفید قمیص پہنے سر پہ زرتار آنچل اوڑھے مضحکہ خیز حلیے والی دلہن فرط انبساط سے رو پڑی تھی۔

"بس بیٹا آج کے بعد کبھی مت رونا۔" وہ پیار سے اس کا سر تھپک کر اسے نزدیک ہی بیٹھ گئیں۔۔۔ اور طیبہ کو دیکھ کر بولیں۔

"طیبہ۔۔۔ اپنی دادی مرحومہ کے خاندانی کنگن آپ پہنا دیجیے انہیں۔ پھر باقی لوگ باقی باری باری مٹھائی کھلا کر رسم کریں گے۔"

"کوئی میری بھی تو سن لو۔" خوشی سے لال ٹماٹر چہرے والے شہرام نے یک دم بلند آواز سے دہائی دی۔ اتنی دیر سے تو وہ سکتے میں تھا اسے تو یقین ہی اب جا کر آیا تھا کہ یہ معجزہ رونما ہو چکا ہے' کہاں تو جدائی کی کڑکتی دھوپ میں جھلس جانے کا اندیشہ تھا اور یہاں تو ملن کی بارش برسنے کو تیار کھڑی تھی۔

"برادر محترم۔۔۔" پیچھے سے آکر سبحان نے شرارت

سے اسے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دبایا۔ "تمہاری جتنی سنی جانی تھی سن لی گئی۔ اب آئندہ کے لیے صبر سے کام لو۔"

"لیکن دولہا میں ہوں کیا میری رسم نہیں ہوگی؟ اچھا ذرا والدہ محترمہ سے گلے تو ملنے دو۔" دیوانہ وار ان کی جانب بڑھا مگر انہوں نے آنکھیں دکھا کر اسے ٹوک دیا۔

"بس... بس ٹھیک ہے وہیں رہیے۔ ہم خود ہی آکر آپ سے گلے مل لیتے ہیں۔"

"ہاں بس' اب نکاح تک پردہ ہوگا۔" تابیہ شوخی سے چہکی۔

"میر جعفرنی..." شہرام نے گھورا۔ سارے بچے بشمول مینا بیگم' بڑے شوق سے منتو کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ وجاہت صاحب نے بھرپور طمانیت سے یہ مکمل منظر دیکھتے ہوئے کبھی نظر نہ لگنے کی دعا کی اور چپکے سے باہر نکل کر کسی کو فون ملانے لگے۔

"ہیلو انکل... چاند مبارک۔" دوسری طرف سے فوراً" ہی فون ریسیو کرلیا گیا۔

"جیتی رہو بیٹا۔ ہمیشہ خوش رہو۔ میری بات رکھ کر تم نے ہمیں آج جو خوشی دی ہے' اس کا اجر عظیم تمہیں اللہ تعالیٰ ضرور عطا فرمائیں گے ان شاء اللہ!" وہ بہت دل سے بولے تھے۔

"اچھا... یعنی آنٹی منتو کے لیے مان گئیں گریٹ!" وہ بری طرح چونک کر چہکی۔

"تم ساتھ نہ دیتیں تو شاید یہ ممکن نہ ہوتا۔" وہ مشکور ہوئے۔

"ویسے آپ نے ٹھیک کہا انکل!" وہ شرارت سے بولی۔ "امی تو اتنا اچھا دیکھا بھالا رشتہ یوں میری بدتمیزی کی وجہ سے ہاتھ سے نکل جانے پر مجھ سے اب تک شدید ناراض ہیں' مگر آپ کا ساتھ دینا بھی تو ضروری تھا نا۔ منتو واقعی بہت پیاری لڑکی ہے۔ میں نے اسے یونہی تو اپنی گیٹ اپ بدل' بہن بنانے کا ارادہ نہیں کیا۔ ویسے مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ خالہ ایک ہی جھٹکے میں منتو کے لیے رضامند ہوجائیں گی۔" وہ مسکرانے لگی۔

"ہاں اس بات کا اندازہ تو خیر ہمیں بھی نہیں تھا' ہم تو بس فی الحال آپ کا مسئلہ کسی طور ٹالنا چاہ رہے تھے۔ لیکن چلیں ہمارا یہ مسئلہ بھی قدرت نے دعاؤں کے طفیل حل کردیا۔" وہ بھی بہت دن بعد بڑے دل سے مسکرا کر بولے۔

"ویسے جتنی بدتمیزی میں نے تمو خالہ سے کرلی ہے۔ اب شاید ہی وہ میرا چہرہ بھی دیکھنا پسند کریں۔" وہ نادم لہجے میں بولی۔

"ارے نہیں نہیں۔" وجاہت صاحب نے جھٹ اسے دلاسا دیا۔ "اس بات کا تو آپ غم ہی نہ کریں ہم خود آپ کی طرف سے ان کا دل صاف کرنے کی پوری پوری کوشش کریں گے۔"

"پر آپ نے شہرام اور منتو کو اپنے اس راز میں شریک کیوں نہیں کیا میں یہ بات نہیں سمجھ سکی۔" اس نے ذہن میں آیا سوال پوچھا۔

"ارے بھئی دونوں کے دونوں جذباتی احمق ہیں اعلا پائے کے' ان کو شریک راز کرنے میں اس وقت خطرہ ہی خطرہ تھا۔" وہ منہ بنا کر بولے تو سائرہ بانو بے ساختہ ہنس پڑی۔

"چلیں اب تو مسئلہ حل ہوگیا نا۔ اب بتادیں یوں بھی میں نے منتو کو چاند رات کو اپنے ساتھ بازار سے چوڑیاں دلانے اور مہندی لگوانے جانا تھا۔"

"ہاں... ہاں کیوں نہیں بس ذرا اندر جاری ہنگامہ سرد پڑجائے۔ ہم ساری صورت حال سے آگاہ کرکے بھیجتے ہیں ان دونوں کو آپ کی طرف۔" انہیں عقب سے کوئی پکار رہا تھا اندر آنے کے لیے۔ انہوں نے بعجلت فون بند کیا اور گھر کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئے۔ جہاں ہزارہا مسرتیں ان کی منتظر تھیں۔

☼ ☼

منشا محسن علی

رات شر ہے اور شر آگ ہے' جو راکھ کرتی ہے۔
آگ نے فاروق احمد کی فصل کو راکھ کر دیا تھا۔ سب کچھ سواہ ہو گیا تھا۔ جانے کہاں سے اور کیسے کوئی آوارہ چنگاری اڑی فصل میں جا چھپی... تیار کھڑی فصل دھڑ دھڑ جل اٹھی تھی۔ ساری بستی کھوکھر روشن ہو گئی اور ایسی روشنی کس کام کی؟ آدھی رات کو سنسان گلیاں' بازار ہو گئیں۔ جانے کتنوں کی پگڑیاں گریں جنہیں دبوچ آوارہ کتے جنگلوں کو کھسک گئے۔ فاروق احمد کے گھر کا لکڑی والا دروازہ زور' زور سے دھڑ دھڑایا گیا تھا۔

"فاروق احمد... او... فاروق احمد چھیتی باہر آ... تیری فصل آگ کی لپیٹ میں ہے۔" رات روشن ہو گئی تھی۔ آگ اور دھواں... فاروق احمد ننگے پاؤں باہر بھاگے تھے۔ اماں اور جیدی بھی پیچھے دوڑے تھے... بچے' بوڑھے' جوان' عورتیں' بزرگ سب کے سب فصلوں کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔ دھوئیں کے مرغولے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ جمال چچا نے ٹیوب ویل کو ہینڈل دیا... مٹکوں' بالٹیوں سے پانی بھر بھر چھڑکا جانے لگا تھا... آگ اور بھڑکی... سب نالے پر کھڑے ہو گئے تھے۔ فاروق احمد دل تھامے نالے پر بیٹھے رہ گئے۔ ساکت نظریں دھڑ دھڑ جلتی فصل پر تھیں۔ اماں نے نظریں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا تھا۔
"سونہڑے ربا... یہ کیا ہو گیا... یہ کس گناہ کی سزا ٹی ہے۔" فاروق احمد فصل کی طرف بڑھ گئے۔ چاروں طرف آگ ہی آگ تھی۔ ان کے منہ سے سسکیاں نکل گئیں۔ ننگے پاؤں جلنے لگے۔ پیروں کی انگلیوں کی پوریں جھلس گئیں... وہ فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ کون سی تکلیف زیادہ تھی؟ وہ ہمیشہ ایک ہی بات کہتے تھے۔
"یہ جو کسان ہوتا ہے نا زمین کا پتر ہوتا ہے اور زمین تو ماں ہوتی ہے... اور فصل تو اولاد کی طرح ہوتی ہے' خود ہی سینچنا' سنوارنا پڑتا ہے' پھر کہیں جا کر محنت کا صلہ ملتا ہے۔ فصل پر کی گئی محنت بھی ثواب ہوتی ہے۔ اگر فصل کو سنڈی' کیڑا لگ جائے تو ان کا شر محنت کا ثواب نگل جاتا ہے۔ تب بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔" اور آج ایک سوال پھن پھیلائے ان کے رستے کی دیوار ہو گیا تھا۔ اگر فصل کو آگ راکھ کر دیے تو تب کیا' کیا جائے؟ اماں پھپک پھپک کر رو رہی تھیں۔ جیدی بھی رو رہا تھا۔
"سب راکھ ہو گیا۔ کچھ بھی نہیں بچا۔" آہ... یہ لفظ اردگرد کی آوازیں جفت قطار ہو گئیں... اور فصل کالی رات ہوئی پڑی تھی' بس ایک دھواں تھا جو اٹھ رہا تھا۔

"بے چارے فاروق احمد سال کی محنت مٹی ہو گئی۔" جانے مٹی ہو گئی تھی یا راکھ؟ خبر نہ تھی۔
"اتنی محنت' ریاضت کے بعد ہاتھ کیا آیا... سواہ... اللہ کسی کو ایسی آزمائش میں نہ ڈالے۔"
"جانے کیسے اور کہاں سے چنگاری اڑی... جانے کیسے؟" تو آگ کی چنگاری معمہ ہو گئی۔ سارے فاروق احمد کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ تسلیوں' دلاسوں کے ڈھیر تلے دب کر رہ گئے تھے۔ جھکی نظر نہ اٹھائی۔ چپ...
"فاروق بھرا... غم نہ کر شاید اسی میں رب کی

چوتھی قسط
ناولٹ
WWW.PAKSOCIETY.COM

مصلحت ہوگی۔ وہ کچھ بہتر کرے گا۔ دکھی نہ ہو۔"
اور جیدی کی سوچ پہاڑے پڑھ رہی تھی۔ اس کا کچا اور معصوم ذہن بوجھل تھا۔ کیسے 'اچانک' اتنا کچھ… ؟ تو دانہ چگتے پکھیوں نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر برکت کی دعا نہیں کی تھی؟ کیا اب پکھی دعا نہیں کرتے؟ کیا خبر آئندہ ابا پکھیوں کو فصل پر نہیں اترنے دیں گے اور دوسروں کی طرح اڑا دیں گے؟ تو کیا کہیں کنیزاں کی بد نظری تو نہیں؟ جیدی نے نظر اٹھا کر دیکھا تھا۔ ماسی کنیزاں بھی رو رہی تھی۔ تاریک سنسان گلی کے نکڑ والے گھر میں بیٹھی مریاں سیانی حیرت سے ٹوٹے گھڑے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ دنیا سے بے نیاز ہوئی پھرتی تھی اور دنیا اس سے بے نیاز ہوئی پھرتی تھی۔ وہ تو "چل میلے نوں چلیے۔" گا رہی تھی۔ جانے کیسے چاندی کے چھلے کی ضرب سے گھڑا ٹوٹ گیا تھا۔ کبھی چاندی کے چھلے سے 'ہلکی سی ضرب سے گھڑے ٹوٹتے دیکھے ہیں؟ نہیں دیکھے؟

"جو ہمیشہ نہیں ہوتا۔ وہ کبھی کبھی ضرور ہو جاتا ہے… اور تب شکایت نہیں صبر کیا جاتا ہے۔" فاروق احمد نے ارد گرد کھڑے بستی کھوکھر کے باسیوں کو دیکھا تھا اور مسکرائے… پھر نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا تھا۔

"کوئی بات نہیں… اوپر والے رب سونہڑے کی رضا میں راضی ہوں۔ آزمائش کا وقت ہے تو صبر گھٹ نہیں ہوگا۔ اللہ تو دے کے بھی آزماتا ہے اور لے کر بھی آزماتا ہے۔ شکر ہے جان اور صحت دے رکھی ہے۔ گھاٹے کا سودا نہیں۔" بستی کھوکھر کے سارے باسی نالوں پر کھڑے کیکر کے درخت ہو گئے۔ ساکت اور حیرت زدہ… صبر تھا 'تو کمال تھا اور شکر تھا تو لاجواب تھا۔ ہجوم چھٹ گیا۔ سارے دکھی دل سے گھروں کو جانے لگے تھے۔ فاروق احمد نے ہنس کر سب کا شکریہ ادا کیا تھا اور اس "ہنسی" کو جیدی نے بہت غور سے دیکھا تھا۔ وہ تینوں گھر آ گئے تھے۔ دروازہ کھولا اندر آئے۔ ٹھٹک گئے۔ بھوری گیا بھن بھینس نے بچہ دیا تھا' جسے وہ اب چاٹ رہی تھی۔ فارق احمد نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور ہنس دیے۔

"سونہڑا ربا… تیرے کام نرالے ہیں۔" اماں اور ابا بھینس کی خاطر میں لگ گئے۔ طاق پر رکھا فون بجنے لگا تھا۔ جیدی نے فون اٹھایا تھا۔

"ہیلو… جیدی… بتاؤ… کیا ہوا؟" بیلا کی آواز رندھی ہوئی تھی' اسے وہ تینوں سنبھالے ہوئے تھیں۔

"سب جل گیا بیلی۔" سب جل گیا تو باقی بچا کیا کچھ؟ شکر… صبر… کیا یہ کافی نہیں؟

"ابا روئے تھے؟" کتنا عجیب سوال تھا… کھڑکیوں کے پار رات ڈھل رہی تھی۔ رات ڈھل ہی جاتی ہے۔

"نہیں… وہ تو مسکرا رہے تھے۔" جیدی کو وہ مسکرانا یاد آ رہا تھا۔ مقدس ہنسی… بے مثال…
"میں جانتی تھی وہ مسکرا رہے ہوں گے۔" وہ روتی ہوئی ہنسی تھی۔ وہ تینوں حیرت سے جامد ہو گئیں۔ تب ہی ابا نے جیدی سے موبائل لیا تھا۔

"کیسی ہے بیلا میری بیٹی… اس وقت تک کیوں جاگ رہی ہے؟"

"ابا… انجان مت بنیں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

"جھلی نہ ہوئی کر… رب کی مرضی تھی… ہمیں تو صرف سر جھکانا ہوتا ہے۔"

"اتنا صبر ابا کہاں سے آ گیا؟"

"آزمائش صبر ساتھ لاتی ہے۔ خیر فکر نہ کر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" کیا صبر کے ساتھ سب ٹھیک ہو جاتا ہے؟

"مسکرا کر دکھائیں ذرا۔" وہ انگلی کی پوروں سے آنکھوں کے آنسو پونچھ رہی تھی۔ دوسری طرف وہ قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔ وہ نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

"مردہ قہقہے مت سنائیں مجھے۔"

"کیوں باپ کا دل کمزور کرتی ہے جھلی۔ لے ماں سے بات کر۔" فاروق احمد نے اماں کو فون پکڑا دیا تھا۔

"بیلی…" اماں کی آواز میں کوک تھی' وہ کانپ گئی

تھی۔

"اماں۔۔۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ سب ٹھیک ہوگا۔ میری دھی تو دھیان سے اپنی پڑھائی کرنا۔۔۔ سب بھل جانا۔"

"اماں۔۔۔ کیسے بھلاؤں گی۔ کوشش کروں گی۔"

ریحانہ نے کھڑکی بند کردی تھی۔ باہر ہوا کھلی کھڑکی پر دستک دیتی رہی۔

"بیلی بھوری نے کٹا دیا ہے۔" اماں نے اسے بتایا تھا۔

"سچی اماں۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ بڑا پیارا ہے۔ ماتھے کی چوٹی سفید ہے۔ کھر کے اوپر بال بھی چٹے ہیں۔"

"اماں۔۔۔ میرا ہوگا نا؟" وہ پوچھ رہی تھی۔۔۔ اماں نے مڑ کے جیدی کو دیکھا تھا۔

"جیدی نے دو ہفتوں سے سر کھایا ہوا تھا کہ کٹا ہوا یا کٹی ہوئی وہ لے گا۔" جیدی چارپائی کی ادوائن پر بیٹھا تھا۔

"اماں۔۔۔ بیلی کو دے دے۔۔۔ مجھے نہیں چاہیے۔"

"اماں۔۔۔ جیدی کو فون دیں ذرا۔" انہوں نے اسے فون پکڑا دیا تھا۔

"لے بہن سے بات کر۔"

"ہاں بیلی۔۔۔" اور بیلا کو اس رات لگا تھا وہ کچے پکے سے ذہن والا تارے گنتا لڑکا اچانک بڑا ہو گیا۔ شعور لمحوں میں سفر کرتا ہے۔

"جیدی۔۔۔ میرے بھائی۔۔۔ اماں اور ابا کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنا۔ انہیں تمہاری ضرورت ہے۔۔۔ اور دھیان سے دیکھتے رہنا کہ کہیں ابا چپکے چپکے رو نہ رہے ہوں۔ میں اب دو ماہ بعد ہی آؤں گی۔ اپنا خیال رکھنا۔" فون بند ہو گیا تھا۔ ککڑ بانگیں دے رہے تھے۔ اندھیرے میں شگاف پڑنے لگے تھے۔ آخری تارا ڈوبنے کو تھا۔

"وے دھمی دے تاریا۔۔۔" (اے فجر کے تارے۔)

"آج ویکھ ساڈے صبراں نوں۔" (آج ہمارے صبر کو دیکھ۔)

"آزمائشیں ہی تو بشر کو کندن کرتی ہیں، ورنہ آسائش تو خام کہانی ہی ہوتی ہے۔"

✡ ✡ ✡

رات فجر ہوئی اور فجر دوپہر ہوگئی۔ وہ چاروں یونی ورسٹی آگئی تھیں۔ بیلا چپ چپ سی تھی اور وہ تینوں اسے سنجیدگی کے خول سے باہر لانے کی پوری کوشش کررہی تھیں۔ سر عارف اردو ڈرامہ کی کلاس لینے آئے تھے۔ شاید انہیں پہلے ہی کچھ پتا چل چکا تھا۔ کرسیوں کی قطاروں میں چھوڑی گئی خالی جگہوں کو عبور کرتے وہ بیلا تک پہنچے تھے۔ وہ ان کی فیورٹ اسٹوڈنٹ تھی اور دل کے قریب بھی تھی۔ وہ کچھ سوچتے رہے اور پھر گویا ہوئے۔

"آپ کو پتا ہے بیلا کچھ فیصلے اوپر والے کے ہاتھ

میں ہوتے ہیں اور ان میں کوئی ضرور کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ تب ہماری آزمائش ہو رہی ہوتی ہے اور اس وقت ہمیں صرف اور صرف صبر سے کام لینا ہوتا ہے۔ مجھے واقعی بہت افسوس ہے کہ آپ کے والد کی فصل حادثاتی طور پر جل کر راکھ ہو گئی۔ شاید اسے قدرت کہتے ہیں۔ بعض اوقات ایسے حادثات ہمیں بڑے بڑے سبق دے جاتے ہیں۔ یہ زندگی کے لیے ضروری ہوتا ہے۔" انہوں نے اس کا سر تھپتھپایا تھا۔ ساری کلاس کی نظریں بیلا پر تھیں۔ اور منعم علی کی نظریں ان گھنی پلکوں پر ٹھہرے آنسوؤں پر تھیں۔

"بریو گرل۔۔۔ ڈونٹ وری بیٹا۔" روسٹرم سے رجسٹر اٹھاتے وہ کلاس روم سے باہر نکل گئے۔ سارے کلاس فیلوز ایک ایک کر کے اس کے پاس افسوس کرنے آئے تھے۔ وہ تینوں اسے وہیں بیٹھنے کا کہہ کر فوٹو اسٹیٹ شاپ کی طرف چلی گئی تھیں۔ کلاس خالی ہوتی گئی تھی۔ وہ لیڈ پنسل سے کورے کاغذ پر آڑھی ترچھی لکیریں لگاتی رہی۔ عجیب و غریب نقش و نگار بنے۔ انہیں دیکھتی رہی۔

"السلام علیکم۔" کرتے شلوار میں ملبوس وہ نکھرا نکھرا شخص سامنے بیٹھ گیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔" بیلا نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ اسے لائبریری میں ہونے والی اس دن کی گفتگو یاد آ گئی تھی۔ وہ اس کے سامنے تھا۔

"مجھے ابھی سر سے ہی علم ہوا اس حادثے کا۔۔۔ بہت دکھ ہوا۔"

"جی۔۔۔ بس جو اللہ کی مرضی۔" اب وہ جیسے مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کوشش کو غور سے دیکھا گیا تھا۔

"یہ بہت کریٹکل سچویشن ہوتی ہے۔ بہت حوصلہ اور ہمت چاہیے۔ ہماری فیکٹری میں بھی چند سال پہلے شارٹ سرکٹ سے آگ لگی تھی۔ سب جل گیا تھا۔ ڈیڈ بہت پریشان رہے تھے۔"

"اوہ۔۔۔ سو سیڈ۔" واقعی افسوس ناک بات تھی۔

"تب سب کچھ مینیج کرنا بہت مشکل تھا، مگر کر لیا گیا۔ وقت لگتا ہے، مگر پھر سب پہلے جیسا ہو جاتا ہے۔" دیواریں سنتی رہیں۔

"سب پہلے جیسا ہو جاتا ہے؟" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ پلکیں آنسوؤں کے بوجھ سے لدی ہوئی تھیں۔

"ہاں۔۔۔ ہو جاتا ہے۔" منعم علی نے سوچ کر جواب دیا تھا۔ اس کے ساتھ سب پہلے جیسا ہو رہا تھا۔ شروعات یا ابتدا!؟ وہ ہولے سے ہنسی تھی اور منعم علی نہیں جان سکا تھا کہ وہ ہنسی تھی تو کیسی تھی؟ خاموشی پر ضرب پڑی تھی۔

"میرے ابا نے زندگی میں دو چیزوں سے محبت کی ہے منعم علی۔۔۔ اپنی اولاد سے اور دوسرا اپنی فصل سے۔۔۔ کہتے تھے دونوں کی تکلیف ایک جیسی محسوس ہوتی ہے۔ فصلیں بھی تو اولاد سی ہوتی ہیں۔ بیج بویا جاتا ہے۔ کونپل پھوٹتی۔ پھر کہیں وجود نظر آتے ہیں۔ ابا مجھے ہنس کر دکھا رہے ہیں کہ انہیں کوئی فرق نہیں پڑا۔ کیا واقعی کوئی فرق نہیں پڑتا؟ فرق پڑتا ہے، اور ابا تو اچھے اداکار بھی نہیں ہیں۔ بیٹی کے سامنے بھرم رکھنے والے جو ماں، باپ ہوتے ہیں نا کچے اداکار ہوتے ہیں۔ ان کا چور ان کی پیشانی پر نظر آ جاتا ہے۔" وہ فاروق احمد کی ایک ایک رمز سے واقف تھی۔ اسے کیسے خبر نہ ہوتی۔ سب خبر تھی۔ کرسی کی ہتھی کو ناخن سے کھرچتے ہوئے وہ گویا ہوا تھا۔

"اور میرے ڈیڈ کو صرف ایک چیز سے محبت ہے۔ وہ ہے دولت اور اسٹیٹس۔"

"ایسا نہیں ہوتا۔" بیلا نے ٹشو سے نم آنکھیں صاف کی تھیں۔ کاجل پھیل گیا تھا۔ دھوپ کا عکس دیواروں پر ٹھہر گیا۔

"کیسا نہیں ہوتا؟"

"والدین کو اولاد سے دنیا کی کسی بھی چیز سے زیادہ محبت ہوتی ہے، مگر کچھ پیرنٹس اپنی فیلنگز میں ایکسپریسو نہیں ہوتے۔" وہ علی صاحب کا دفاع کر رہی تھی۔ اس نے بھی تو ان ٹوٹے قدموں کی لڑکھڑاتی چال دیکھی تھی۔ وہ "شاہد" تھی کیسے گواہی سے مکر جاتی؟

"شاید واقعی ایسا ہو۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے غور سے بیلا فاروق کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اس جیسی لڑکی سے کیسے اور کیونکر فلرٹ کر سکتا تھا۔ اس میں عجیب سا رعب تھا۔ دبدبہ تھا اور وقار سا تھا۔ وہ دونوں اکٹھے کلاس روم سے باہر آئے تھے۔ قائداعظم بلاک کی سیڑھیوں پر نغمانہ کا گروپ شیلے پر بحث کر رہا تھا۔ مختلف پرفیومز کی مہک راہ داریوں میں چکرا رہی تھی۔ وہ دونوں راہ داری سے گزرتے تھے۔ جب وہ اس کی آواز پر مڑی تھی۔

"سنیں بیلا۔"

"جی۔۔۔" وہ راہ داری میں کھڑا تھا۔ دراز قد' روشن آنکھیں' ہلکی بڑھی ہوئی شیو۔

"آپ کی آنکھوں کا کاجل اسپریڈ ہو گیا ہے۔" وہ چلتا ہوا جا رہا ہے اور وہ ٹشو سے پھیلا ہوا کاجل درست کر رہی ہے۔

☼ ☼ ☼

That i shall love always
I anque thee that love is life
And life hath immortality!!

لمبے اور چھدرے پتوں والے درخت جیسے پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ سرمئی تارکول کی سڑک پر گاڑی دوڑتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ فیریا بھاگتے دوڑتے مناظر کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ ہلکی ہلکی روشنی پھیل رہی تھی۔ درختوں کی چوٹیوں پر پکھی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ تاحد نظر ریت کے طویل ٹیلے تھے' سونے کے ذرات سی چمکتی ہوئی ریت ہلکی روشنی میں سحر طاری کر رہی تھی۔ ہوا میں جنگلی پھولوں کی ترش سی مہک رچی ہوئی تھی۔

"کتنا خوب صورت اور پیارا ہے نا یہ سب؟"
ڈرائیونگ کرتے منعم سے وہ مخاطب ہوئی تھی۔

"ہے تو۔۔۔ تمہیں تھکن تو نہیں ہوئی؟" اس نے پوچھا تھا۔ وہ رات سے سفر میں تھے۔ اس کا خیال تھا

پیرس کی باسی وہ کامنی سی لڑکی تھک جائے گی۔ وہ خود جب بھی لاہور اور بھکر کا سفر کرتا تھا تو کئی کئی دن تھکن کا احساس رہتا تھا۔ فیریا کو ایسا فیل نہ ہوا تھا۔

"تمہارے شہر کے انتظار نے مجھے تھکن نہیں ہونے دی۔" وہ ہوا سے اڑتے بالوں کو کیچو میں قید کر رہی تھی۔

"ہاہا۔۔۔ اچھا واقعی میں تو ایسی تھکن کا شکار ہوتا ہوں کہ بس یوں لگتا ہے کہ اس تھکن کے احساس کے زائل ہونے میں صدیاں لگیں گی۔"

"ماریانا اور میں کبھی طویل سفر نہیں کر سکتیں۔ اگر ماریانا کو میں اس طویل سفر کا بتاؤں گی تو وہ بہت حیران ہوگی۔"

"میں بھی تو حیران ہوں کہ تمہیں ذرا بھی تھکن نہیں ہوئی۔" موڑ کاٹتے ہوئے وہ ونڈو کے پار دیکھنے لگا تھا۔

"شاید واپسی کے سفر میں مجھے ایسی تھکن کا بوجھ ملے جس کا قرض میں صدیوں تک چکاتی رہوں گی۔" وہ ہولے سے بڑبڑائی تھی۔

"تم نے کچھ کہا؟"

"نا۔۔۔ نہیں۔۔۔" اس نے رخ موڑ لیا تھا۔ ریت کے مردہ ٹیلوں کو جگانے ہلکی سی ہوا چلی تھی۔ سنہری ریت اڑنے لگی تھی۔

"بس اب آگے پچیس منٹ کا سفر باقی ہے۔ یہ لو پانی پی لو۔" وہ اس کی طرف منرل واٹر کی بوتل بڑھا رہا تھا۔ فیریا نے تھام لی۔

"تھینک یو۔۔۔" ریت کے ٹیلے پیچھے رہ گئے۔ کھردری گھاس کے قطعات شروع ہو گئے تھے۔ روڈ پر مویشیوں کے ریوڑ پھیل گئے۔ وہ چراگاہوں کا رخ کر رہے تھے۔ بھیڑوں، بکریوں کے بچے ساری سڑک پر پھیل گئے تھے۔ منعم کو کار روک کر ان کے گزرنے کا انتظار کرنا پڑا تھا۔ فیریا دلچسپی سے اتنی بڑی تعداد میں ایک ساتھ گزرتے مویشیوں کو دیکھ رہی تھی۔ بکریوں کے چھوٹے چھوٹے بچے روڈ پر اچھلتے کودتے آگے بڑھ رہے تھے۔ جیسے ان کے وجود میں پارہ بھرا ہوا تھا۔

"اف۔۔۔ منعم۔۔۔ یہ کتنے پیارے ہیں نا۔" وہ موبائل کا کیمرہ آن کیے ان کی تصویریں بنا رہی تھی۔ نوعمر چرواہے نے شرم سے پیٹھ پیچھے موڑ لی تھی۔

"ہاں۔۔۔ پیارے ہیں اور بہت سارے ہیں۔" وہ شرارت سے ہنسا تھا۔ "تمہیں ایک بکری کا بچہ خرید دوں، ساتھ پیرس لے جانا؟"

"ہیں۔۔۔ سچ۔۔۔؟" وہ خوشی خوشی اس کی طرف مڑی تھی۔ اس کی شریر مسکراہٹ دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔

"تم بہت برے ہو۔" وہ خفا سی رخ موڑ گئی تھی۔ مویشیوں کے گلوں میں بندھی دھاتی گھنٹیاں بج رہی تھیں اور مدھم سا خوش گوار شور پیدا ہو رہا ہے۔ "یہ ان کے گلے میں چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں کیوں ہیں؟" وہ حیران ہوئی تھی۔

"اس لیے کہ اگر کوئی مویشی ریوڑ سے الگ ہو جائے تو اس گھنٹی کی آواز سے اسے آسانی سے ڈھونڈا جا سکے۔" مویشی گزر گئے۔ کار چل پڑی۔ روشنی پھیل گئی۔ فیریا نے بیک سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ تب ہی اس کے موبائل کی میسج ٹیون بجی تھی۔ اس نے میسج اوپن کیا تھا۔ ماریانا کا میسج تھا۔

"تمہارے ہجر و فراق میں تڑپتے پھڑکتے اس امیر زادے ڈیرک باف نے ہمارے کیفے میں آکر کافی کے چار کپ توڑ ڈالے ہیں۔" افس (افسوس کا کلمہ) ماریانا نے پیرس میں بیٹھے فیریا کا رپلائی دانت کچکچاتے ہوئے پڑھا تھا۔

"ڈیر ماریانا۔۔۔ وہ درجن بھر پرانے کپ جو ہم ضائع کرنے کا سوچ رہی تھیں وہ تم ڈیرک کے سامنے کیوں نہیں رکھ دیتیں؟ ہم انہیں توڑنے کی زحمت سے بچ جائیں گے۔" فیریا نے بھکر کی طرف رواں دواں سفر میں مسکراتے ہوئے ماریانا کا رپلائی پڑھا تھا۔

"تم پیرس واپس تو آؤ میں تمہارے درجن بھر دانت توڑ دوں گی' بدتمیز لڑکی۔" منظر آگے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ سنبل کے درخت ساکت کھڑے ہیں۔ فیریا نے دوبارہ سے آنکھیں موند لی ہیں۔

The silence that is in
the starry sky
the sleep that is among
the lonely hills

☼ ☼ ☼

"تم نے مجھے شرمندہ کروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔" **جیکسن** باف لان میں پودوں کی کٹائی کے ساتھ ساتھ اس کی زبانی "دھلائی" میں بھی مصروف تھے۔ وہ شخص جس کی دھلائی ہو رہی تھی' وہ واٹرٹینک سے پودوں کو پانی دے رہا تھا۔

"پانی کی آبشار تلے بھیگو لائیزیا' ڈیزی اور سفید گلاب' مجھے یقین ہے اگلی بہار میں تم یہ گھر پھولوں سے بھر دو گے۔" مسکراہٹ تھی کہ ہونٹوں سے چپک کر رہ گئی تھی۔ قینچی سے مور پنکھ کی کٹائی ہو رہی تھی۔ **جیکسن** کو تاؤ آیا تھا۔

"ایسی گنگناہٹ کے ساتھ ساتھ تمہیں **ٹینگو** ڈانس بھی پیش کرنا چاہیے۔"

"اوہ... رئیلی... آپ کو میرا **ٹینگو** اتنا پسند ہے؟" ابرو اٹھا کر دیکھا اور کارنیل کے پودوں کے گملوں میں سیلاب آگیا۔

"تم بہت بدتمیز ہو۔" کٹ... کٹ... دل چاہا ایک قینچی اس کی گردن پر بھی چلا دیں۔ اف یہ بے بسی۔

"آپ برابر دو ہفتے سے اپنی غلطی کا الزام مجھ معصوم کے سر ڈالتے آرہے ہیں۔" نروٹھے پن کی انتہا کردی گئی تھی۔

"معصوم... اور تم..." **جیکسن** نے دانت کچکچائے تھے۔ "معصوم کا بیٹا بھی مہا معصوم... ہمم..."

"آپ ماریانا کو فیریا سمجھ کر گفتگو کر آئے اور خاص راز و نیاز بھی ضرور **ڈسکس** کیے ہوں گے۔" وہ پلاسٹک چیئر پر ڈھے گیا تھا۔

"تم نے حلیہ ہی ایسا بتایا تھا۔" انہوں نے اعتراض کیا تھا۔

"جی نہیں... میں نے ٹھیک ہی بتایا تھا' مگر آپ نے اشتیاق میں کچھ سنا ہی نہیں۔" ڈیرک نے کندھے اچکا دیے تھے۔

"تم خود تو فیریا کے ساتھ گھوم پھر رہے تھے۔ میں نے کیفے کے سامنے اتنا ویٹ کیا تھا۔" انہیں آتے جاتے لوگوں کی ہنسی یاد آئی تھی۔

"گھومنے پھرنے کی بات مت کریں... میں تو صرف اس کے ساتھ کٹلری خریدنے گیا تھا۔" بھرپور انداز میں وضاحت کی ناکام کوشش کی گئی۔ وہ چپ چپ سے پودوں کی کٹائی میں مگن رہے۔ دیواروں پر لگا پینٹ چمک رہا تھا۔ پام کے درخت جھول رہے تھے۔

"سنو..." وہ قینچی گھماتے اس کی طرف مڑے تھے۔ ڈیرک کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"قتل کریں گے؟"

"نہیں... بے فکر رہو۔ مجھے جیل جیسی جگہ سے سخت نفرت ہے۔ میرا ایک سوال ہے۔"

"پوچھیں..." فروٹ باسکٹ سے وہ ناشپاتی اٹھا رہا تھا۔ پلٹ کر انہیں دیکھنے لگا۔ ہوا پھولوں کی پتیاں گرا رہی تھی۔

"سپوز کرو اگر... صرف تم نے فرض کرنا ہے کہ اگر فیریا مجھے پسند نہ آئی تو؟" وہ غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ڈیرک نے ناشپاتی باسکٹ میں واپس رکھ دی اور ہولے ہولے چلتا ان تک آیا تھا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے؟" کندھے تھام لیے۔ **جیکسن** باف نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔

"**آئی نیڈ جسٹ یور آنسر... پلیز ٹیل می۔**" (مجھے صرف تمہارا جواب چاہیے۔ پلیز مجھے بتاؤ۔) وہ ہلکے سے ہنسا تھا۔ پھولوں کی پتیاں گر گئیں۔ ہوا ٹھہر گئی تھی۔

"فیریا کو چھوڑ دوں گا۔ آپ سے بڑھ کر میرے لیے کچھ نہیں۔" یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا تھا۔ وہ کچھ سوچتے رہے۔ اب قینچی کٹاکٹ چل رہی تھی۔ گنگنانے کے ساتھ ساتھ وہ "**ٹینگو**" بھی کر رہے تھے۔

"پیارے پودوں... اپنے کٹنے کا غم نہ کرو' جلد بہت

جلد تم پر نئی کونپلیں پھوٹیں گی۔ تب تم مسکراؤ گے۔ شریر پودے۔"

☼ ☼ ☼

ککلی کلیر دی نی پگ میرے ویر دی۔

دائروں میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں کھیل رہی تھیں۔ دور پگڈنڈی سے دھول اٹھ رہی تھی۔ تانگے کی ٹاپوں کی آواز بتدریج قریب آتی جارہی تھی۔ تانگا دروازے پر رکا تھا۔ ٹوپی والے برقعے میں ملبوس پھپھی سکینہ ہانپتی کانپتی ٹرنک اٹھائے اندر داخل ہوئی تھیں۔

"آئے ہائے۔۔۔ میرا ویر۔۔۔ میرا کلیجہ۔۔۔ فاروق۔۔۔ سب راکھ ہو گیا۔" ٹرنک صحن کے بیچوں بیچ رکھ دیا گیا اور واویلا شروع ہو گیا تھا۔ اماں کے ہاتھ سے پرات چھوٹی۔ جیدی کے پاؤں کے نیچے آکر چوزہ کچلا گیا اور فاروق احمد کی ہتھیلی پر سرسوں کے تیل کی بوتل الٹ گئی تھی۔ فاروق احمد دوڑ کر باہر آئے تھے۔ سکینہ ان سے لپٹ گئی تھیں۔ پھپک کر رو دی تھیں۔ گہرا صدمہ تھا جیسے یا ظاہر کرتا تھا۔ "اتنا کچھ ہو گیا۔ ہائے مجھے تو جیسے خبر ہوئی ٹرنک اٹھایا اور چل پڑی۔ قسم لے لو فاروق' آلو کا سالن بنایا تھا۔ نوالہ منہ میں تھا۔ جیسے ہی تمہارا پتا چلا نوالہ الٹ دیا۔" اماں باہر آئی تھیں۔ سکینہ سامنے بیٹھی تھیں۔ چکن کے جوڑے میں ملبوس تھیں۔

"سکینہ باجی۔۔۔ جی آیاں نوں۔" اماں ان کے گلے لگ گئی تھیں۔ وہ چارپائی تک آئیں۔ جیدی قریب آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ سکینہ کی نظر پڑی تو پکڑ کر چٹاچٹ چوم ڈالا۔

"کیسا ہے میرا لال۔۔۔ دعا کر تیرے پیو کے رزق میں برکت ہو۔" اماں بھاگ کر شکنجبی بنالائی تھیں۔ سکینہ نے تین گلاس غٹاغٹ چڑھالیے تھے۔ فاروق احمد ٹرنک اٹھا کر اندر کمرے میں رکھ آئے تھے۔ "کیسے ہوا سب؟" پیٹ سیر ہوا تو اصل بات سوجھی تھی۔ موٹے موٹے آنسو ٹپک پڑے تھے۔

"بس باجی۔۔۔ جو اللہ کو منظور ہو گا وہی ہو گا۔ بس یہی ہوا' جانے کہاں سے آگ کی ایک چنگاری اڑی اور ساری فصل کھا گئی۔ راکھ کر گئی۔ بہت کوشش کی مگر آگ نہ بجھ سکی۔ اب صبر کر لیا۔ اسی میں اللہ کی مصلحت ہو گی۔"

"ائے ہے میرا بھرا اجڑ گیا۔ سب جل کر راکھ ہو گیا۔ ککھ وی نئیں بچا۔ سب میں اٹھک بیٹھک تھی۔ الگ ہی ٹور تھی اب تو سب کے درمیان شرمندہ ہوتا پھرے گا۔" فاروق احمد باہر آگئے تھے۔ صحن میں مرغیاں' چوزوں کو پروں میں چھپائے بیٹھی تھیں۔

"نئیں سکینہ۔۔۔ غم نہ کر۔۔۔ جو اوپر والے کی مرضی۔۔۔ ہم تو اپنے رب کی رضا میں راضی ہیں۔"

"فاروق۔۔۔ صبر تاں تیری گھٹی اندر ہے۔ پہاڑ جتنا حوصلہ ہے تیرا۔" وہ ململ کے دوپٹے سے آنکھیں پونچھنے لگیں۔ "بیلا کی پڑھائی پوری ہو گئی کیا؟" سکینہ نے بھائی' بھرجائی کو کرید اتھا۔

"جی باجی' بس ایک سال اور باقی ہے۔" اماں نے جواب دیا تھا۔

"ویسے بیلا کو پڑھانے کا فیصلہ غلط کیا تم لوگوں نے۔ اوپر سے اتنا خرچا ہوتا ہے پڑھائی کا۔ اب تو فصل بھی نہ رہی۔ مویشی بیچے گا کیا؟"

"اللہ کا دیا بہت کچھ ہے' سب ہو جائے گا۔" فاروق احمد نے انکساری سے جواب دیا تھا۔ چوزے' مرغی کے پروں سے نکل کر صحن میں مٹرگشت کرنے لگے تھے۔ مرغی نے کوے اور عقاب پر نظریں رکھ ہوئی تھیں۔ مائیں تحفظ کے لمحوں میں بھی غفلت برداشت نہیں کرتیں۔

"ارے ایسے کیسے سب ہو جائے گا۔ لاکھوں لگتے ہیں پڑھائیوں پر۔۔۔ اوپر سے لڑکی ذات ہے' جوان جہان اکیلی بھیج دی۔ ایسے ہی تو چاند چڑھتے ہیں۔ دھیاں تو چولہا چوکی کرتی ہی بھلی لگتی ہیں۔" سکینہ نے ناک سے جیسے مکھی اڑائی تھی' وہ ان لوگوں میں سے تھیں جو عورت کو بس گھر کی چار دیواری میں ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔

"دین عورت کو پڑھائی کا حق دیتا ہے' تو ہم کون ہوتے ہیں روکنے والے... بیلی کو بھی پڑھائی کا شوق تھا۔"

"بیٹیوں کی ایسی فرمائشیں پوری نہیں کیا کرتے۔ غضب خدا کا کیا زمانہ آگیا ہے۔" وہ غصہ ہو رہی تھیں۔ اماں نے ان کا دھیان بٹانا چاہا تھا۔

"باجی... آپ کے لیے کیا بناؤں کھانے میں؟"

"ارے زیادہ اہتمام مت کرنا بس دیسی گھی میں مرغی بھون دینا۔ میٹھے میں لچھے والی سویاں بنانا... تمہارے ہاتھ میں بڑا سواد ہے۔" آرڈر نوٹ کروا کر وہ فاروق احمد کو شاکر کے متعلق بتانے لگی تھیں۔ "خیر سے شاکر کا درزیوں کا کام چل پڑا ہے۔" فاروق احمد تاسف سے بولے تھے۔

"پڑھتا تو آج آگے نکل جاتا۔ کوئی نوکری ہی لگ جاتی۔" وہ منہ بنا کے چپ ہو گئیں۔ صحن میں گرد و غبار کا طوفان آیا ہوا تھا۔ اماں اور جیدی مرغی پکڑنے میں لگے تھے۔ چوزے دوڑے دوڑے ماں تک پہنچے اور پروں میں چھپ کر ساری کارروائی ملاحظہ کرنے لگے تھے۔ دوپہر پگھل رہی تھی۔

✵ ✵ ✵

"ہاسٹل کے ہال کلاک نے شام کے سات بجنے کا اعلان کیا تھا۔ چنبیلی گھومتی گھامتی فور اسٹار گروپ کے دروازے پر پہنچی تھی۔ دستک دی تو اندر سے بیلا کی ٹھہری ہوئی آواز آئی تھی' وہ اندر آگئی۔ صدف واٹر کلرز تھامے بیٹھی ان سے تجریدی آرٹ بنانے کا سوچ رہی تھی شاید۔ بیلا اوراق پر ہاشیے لگا رہی تھی۔ روشی مختلف کریموں کا فارمولا بنانے میں مگن تھی۔ جبکہ ریحانہ بے ترتیب نوٹس سٹیپل کر رہی تھی۔ چنبیلی نے اس مصروفیت کے عالم میں اپنا مدعا بیان کرنے کی ٹھانی تھی۔

"آئی نیڈ یور اٹینشن پلیز۔" سنجیدہ لہجے میں بولی گئی چنبیلی کی انگلش نے اٹینشن لے ہی لی تھی۔

"کیا بات ہے؟" بیلا نے پیمانہ پرے رکھ دیا تھا۔

"وہ مجھے ہیل والے جوتے چاہئیں۔"

"ایں... تم کہاں جا رہی ہو؟"

"میرے چچا کے بیٹے کی شادی ہے' کمینے نے مجھے مسترد کر دیا تھا' اسی ہفتے اس کی شادی ہے اور میں چاہتی ہوں کہ اس کی شادی کے دن اس کی دلہن سے بھی زیادہ خوب صورت لگوں۔" چنبیلی نے دوپٹے کا پلو منہ میں دبایا تھا۔

"اپنی دلہن سے زیادہ تمہیں خوب صورت دیکھ کر کیا وہ شادی توڑ دے گا؟" روشی نے ایکسائیٹڈ ہو کر دریافت کیا تھا' کیونکہ وہ ایسی ڈرامائی سچویشن کی دل دادہ ہے۔

"نہیں... نہیں... آئی وانٹ کہ اسے یہ لگے اس نے مجھ ہیرا کو چھوڑ کر کوئلہ پسند کر لیا۔" چبھی انگلی پر نزاکت سے لٹ لپیٹی گئی۔

"بے چارہ جوہری تھوڑی ہے... اور تم کہاں سے ہیرا ہو چنبیلی۔" روشی نے اس ہیرے کو بغور دیکھا تھا۔

"بندر کیا جانے ادرک کا سواد۔" چنبیلی نے ضرب المثل داغ دی تھی۔ "خیر... کوئی تو اپنی ہیل دے دو یار... سچی واپس کروں گی۔"

"میری پیاری' راج دلاری' ہیرا سی بہن ہیل کا اڈریس میں تمہیں دیتی ہوں آگے' اس کی مانگی تانگی کرنا تمہارا کام ہے۔" روشی نے احسان عظیم کرنے کی ٹھانی اور جب وہ ٹھان لیتی ہے تو کر گزرتی ہے۔

"کس کے پاس ہے؟"

"عابدہ چشماٹو کے پاس ہیلز کی بڑی ورائٹی ہے۔ اکثر لڑکیاں تو اس سے کرائے پر بھی لے جاتی ہیں' مگر تمہیں وہ مفت دے دے گی۔"

"سچی..." چنبیلی کو ذرا بھر یقین نہ آیا تھا۔ روشی نے چٹکی کاٹی تھی۔

"مچی... اب یقین آیا؟"

"ہاں... ہاں... روشی تم میرا میک اپ کر دو گی؟" چنبیلی دنیا بھر کی مسکین لڑکی بن گئی تھی۔ صدف کے واٹر کلرز الٹ گئے۔ وہ ہنس ہنس کر بے حال ہونے لگی۔

"چنبیلی ڈونٹ ٹیک رسک ڈیر۔ صوفی کی تو ایک آئی برو اڑائی گئی تھی۔ تمہاری دونوں اڑیں گی۔"

"ہائے نہیں۔۔۔ میں کہیں اور سے تیار ہو جاؤں گی۔" ہانپتی کانپتی چنبیلی باہر نکل گئی۔ وہ چاروں اپنے اپنے کام میں لگ گئیں۔

"اس دن نعمانہ نے گھونگھر ڈالنے والی مشین سے چنبیلی کے بالوں میں گھونگھر ڈالے اور ایسے ڈالے کہ انہیں سیدھا کرتے صدیاں لگتیں۔ عابدہ نے پرانی تین ہیلز کے جوڑے عطیہ کردیے۔۔۔ نیلی نے ایکسپائرڈ لپ اسٹک دان کردی۔ بیلا نے لیکن کا اپنا نیا سوٹ واپسی کی شرط پر پہننے کو دیا تھا۔ میچنگ جیولری ریحانہ کی سخاوت کی وجہ سے مل گئی۔ گولڈن پاؤچ اور ٹشو پیپرز عفت کے چرائے گئے اور صد شکر کہ اس بات کی انہیں کانوں کان خبر نہ ہوئی تھی۔ فائن آرٹس کی نور نے چنبیلی کو کتھک رقص کے تین چار اسٹیپ بھی سکھا دیے کہ کہیں لائیو پرفارمنس میں وہ مات ہی نہ کھا جائے۔ میڈورا کی نیل پالش اور پرفیومز روشی نے چنبیلی کے منت کرنے پر دے دیے۔

"جاؤ ہیرا لڑکی۔۔۔ کیا یاد کرو گی۔" اور جب وہ شادی سے ہو کر واپس آئی تو ہال میں شادی کی روداد سننے سارا ہجوم آگیا۔

"ارے اس کی جیسے ہی مجھ پر نظر پڑی پتھر ہو گیا۔ کہنے لگا۔ چنبیلی تمہیں ٹھکرانے کا قلق مجھے ساری عمر رہے گا۔" چنبیلی نے ہنس ہنس کر بتایا تھا۔ چنبیلی نے سب کی چیزیں واپس کردی تھیں۔۔۔ اور وہ بیلا کی چیزیں واپس کرنے آئی تو بیلا نے اسے پکڑ لیا تھا۔

"تم چاہے کتنی کوشش کرلو چنبیلی تم اچھی اداکارہ نہیں ہو سکتیں۔۔۔ تم جیسے لوگ تو بڑے شفاف ہوتے ہو' تمہارا وجود آئینہ ہے' سب خبر ہو جاتی ہے۔" چنبیلی پھپک پھپک کر رو دی تھی۔

"بیلا۔۔۔ روشی سچ کہتی ہے' میں کہاں سے ہیرا ہوں؟ ہیرے مجھ سے نہیں ہوتے۔ ہیرا تو وہ تھی جس کے ساتھ وہ جڑا بیٹھا تھا۔ اس نے تو ایک نظر پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ میں آٹھ گھنٹے بس ایک "نظر" کی آس لیے کھڑی رہی۔۔۔ یہ آٹھ گھنٹے مجھے کبھی نہیں بھولیں گے۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ واقعی۔۔۔ ہیرے مجھ سے نہیں ہوتے۔" وہ ہتھیلیوں کی پشت سے آنسو پونچھتی باہر نکل گئی تھی۔ اب باہر راہ داریوں میں چنبیلی کے قہقہے گونج رہے تھے۔ وہ ہنس ہنس کر فنانس والیوں کو شادی کی روداد سنا رہی تھی۔ بیلا کو چنبیلی کے قہقہے ایسا جیسے لگے تھے فنکار۔۔۔

زندگی میں دکھ سکھ سب کو ایک جیسے ملتے ہیں' بس ہر کوئی فنکاری سیکھ جاتا ہے اور جھوٹی ہنسی کا نقاب اوڑھے پھرتا ہے۔

☼ ☼ ☼

منعم علی نے چوتھی بار پلٹ کر ان دونوں کو دیکھا تھا جو کہیں سے بھی تو انجان نہیں لگ رہے تھے۔ جیسے صدیوں سے واقفیت تھی۔ اسے حیرت ہو رہی تھی۔ وہ گاڑی سے سامان نکال کر اندر رکھ رہا تھا۔ وہ دونوں پورچ میں کھڑے تھے۔ سرگوشیوں میں گفتگو ہو رہی تھی۔

"آپ کو دو مہینے پہلے والی وہ گفتگو یاد کرنا ہوگی جب آپ نے کہا تھا کہ فیریا کبھی پاکستان نہیں آئے گی۔۔۔ اور میں نے جواب میں کیا کہا تھا؟" فیریا نے ان سے دو ماہ پہلے کی گفتگو کے سوال کا جواب مانگا تھا۔

"تم نے کہا تھا فیریا پاکستان ضرور آئے گی۔۔۔ اور تم آگئیں۔" وہ مسکرائے تھے۔ وہ کب سے ان کے آنے کے منتظر تھے۔ تم جانتی ہو میں نے تمہاری پسند کی سب ڈشز بنوائی ہیں۔ میں سو بار رسٹ واچ دیکھ چکا ہوں اور سو بار ہی وقت رکا ہوا ملا۔" وہ خفا خفا سے نظر آئے تھے۔" وہ ہنسی دباتی سرگوشی میں پوچھنے لگی تھی۔

"وقت سے خفا ہو گئے ہیں؟"

"ہاں۔۔۔" اقرار کر لیا گیا۔ رکے ہوئے وقت کی دیواریں گواہ تھیں۔

"اتنا انتظار تھا میرا؟" فیریا نے اپنی آنکھوں کو نم ہوتا پایا۔

"بہت زیادہ....." منعم علی نے دور سے انہیں دیکھا تھا۔

"میں لگتی کیا ہوں آپ کی؟" نم آنکھوں والی نے ہولے سے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ کوشش ناکام رہی۔

"دوست ہو میری۔" نظر اٹھا کر دیکھا تھا۔

"میں اچھی دوست نہیں ہوں۔ میں تو بہت سیلفش ہوں' جسے اپنی غرض ادھر کھینچ لائی ہے۔ اچھی ہوتی تو صرف اپنے دوست سے ملنے یہاں آتی۔" غرض والی نے نگاہیں گھما کر دیکھا تھا۔

"تم اچھی دوست ہو فیریا۔ انوسینٹ..... پیاری....." علی صاحب نے اسے محبت سے دیکھا تھا... منعم ڈگی بند کرتا ان تک آیا تھا۔

"آپ دونوں کو باتیں کرتا دیکھ کر تو لگتا ہے کہ آپ صدیوں سے ایک دوسرے سے واقف ہیں۔"

"ہاں تو ہم ہیں....." علی صاحب کی زبان پھسلی..... فیریا گڑبڑائی..... وہ حیران ہوا تھا۔ "میرا مطلب ہے کہ تمہاری دوست فیریا ان لوگوں میں سے ہے جن سے مل کر پہلی بار ہی یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم ان سے پہلے مل چکے ہیں..... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا فیریا؟" شریر آنکھوں نے تصدیق چاہی تھی۔ وہ مسکرائی تھی۔

"یس....." علی صاحب نے آگے بڑھتے ہوئے کہا تھا۔

"آیے..... اندر چلتے ہیں۔"

☆ ☆ ☆

عاماں بے اخلاصاں کولوں فیض کسے نہ پایا
ککرتے انگور چڑھایا تے ہر گچھا زخمایا
خاصاں دی گل عاماں آگے تے نئیں مناسب کرنی
دودھ دی کھیر پکا محمد کتیاں اگے دھرنی
عیداں تے شبراتاں آسن روحاں جاسن گھر نوں
تیری روح محمد بخشا تکسی کیڑے در نوں
اول حمد ثناء الٰہی جو مالک ہر دا
اس دا نام چتارن والا ہر میدان نہ سہردا

وہ بے خودی کے عالم میں کھڑی علی صاحب کے منہ سے نکلتے الفاظ سن رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے پڑھ رہے تھے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ مگر سب سمجھ رہی تھی۔ انہوں نے اسے دیکھا تھا۔

"وہاں کیوں کھڑی ہو؟"

"آپ کیا پڑھ رہے تھے؟" وہ قدم قدم چلتی آکر صوفے پر ٹک گئی تھی۔

"محمد بخش کا کلام پڑھ رہا تھا۔" وہ مسکرائے تھے۔ نسیم سحر سی مسکان تھی۔

بہت پیاری تھی یہ۔ شاید اس کے لیے زبان سیکھنے کی نہیں' بلکہ فیلنگز کی ضرورت ہوتی ہے۔

"بالکل..... احساسات سے بڑھ کر کوئی زبان نہیں۔" فیریا نے نظریں دوڑائی تھیں۔ وہ سارا گھر دیکھ چکی تھی۔ مختلف قسم کی قدرتی مناظر کی پینٹنگز' کیلیگرافی' نوادرات' وہ سب دیکھ دیکھ کر رک رہی تھی۔

"آپ کا گھر بہت پیارا ہے۔" اس نے کھلے دل سے تعریف کی تھی۔

"تم یہیں آجاؤ..... گھر تمہارا ہو جائے گا۔"

"کس حیثیت سے؟" فیریا کا سوال برف ہو گیا تھا۔ ٹھنڈا..... وہ اٹھ کر گلدانوں کے پھول بدلتی رہی تھی۔ نیلے' زرد' لال' نارنجی..... "آپ کو پھول بہت پسند ہیں؟"

"مجھے کلرز بہت پسند ہیں اور ان کی خوشبو بھی کمال ہے۔" موبائل ایور اسپرنگ کی ٹیون سے بجنے لگا تھا۔ فیریا نے اٹھایا' ماریانا کی کال تھی۔

"ہیلو..... کیسی ہو فیریا؟"

"میں ٹھیک ہوں..... تم کیسی ہو؟" فیریا کو لگا ان کے درمیان صدیاں حائل ہو گئی ہوں۔ طویل سے طویل تر.....

"آئی مس یو فیری....." وہ رو رہی تھی۔

"آئی مس یو ٹو..... کیفے کیسا چل رہا ہے؟" فیریا نے بات بدلی اور ماریانا نے بدلی بات محسوس کر بھی لی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ منعم اور علی صاحب کیسے ہیں؟"

"سب اچھے ہیں۔ ماری جانے کیوں مجھے لگ رہا ہے پیرس اور بھکر میں کوئی فرق نہیں۔ سب اپنا اپنا ہے۔"

"اگر تم واپس آئیں اور تمہیں پیرس بدلا بدلا سا لگا تو میں تمہیں جان سے مار دوں گی۔"

"تم مجھے جان سے مار دینے کی دھمکیاں دینا کب بند کرو گی؟"

"فیری۔۔۔ بس تم جلد از جلد واپس آؤ۔ مجھے اور کچھ نہیں سننا۔" وہ اصرار کر رہی تھی۔ وہ دونوں یک جان دو قالب تھیں۔ ٹوں ٹوں کی آواز کے ساتھ ہی کال کٹ گئی تھی۔ منعم اس کی طرف آیا تھا۔

"کس کی کال تھی؟"

"ماریانا کی تھی۔ حال احوال پوچھ رہی تھی' پھر کال کٹ گئی' شاید نیٹ ورک پرابلم تھی۔" اس نے موبائل پاؤچ میں ڈال لیا تھا۔

"جھگڑا تو نہیں کر رہی تھی؟" وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"ہاہا۔۔۔ وہ کب جھگڑا نہیں کرتی۔" علی صاحب نے بانگ درا کو سینٹرل ٹیبل پر رکھ کر ان کی طرف رخ موڑا تھا۔

"تم دونوں سیر کو کیوں نہیں چلے جاتے؟ منعم تم فیریا کو گرین ٹاؤن اور دلکشا باغ لے جاؤ۔"

"شیور بابا۔۔۔ بٹ آئی تھنک' شام میں چلیں گے۔ کیوں فیری؟" فیریا جو اس پر نظریں جمائے کھڑی تھی' چونک کر گڑبڑا گئی۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ شام میں چلیں گے۔"

"آپ دونوں یہیں بیٹھیں' میں آپ دونوں کے لیے اسپیشل اپنے ہاتھوں سے کافی بنا کر لاتا ہوں۔" وہ انہیں وہیں بیٹھنے کا کہہ کر کچن کی طرف چلا گیا تھا۔ علی صاحب نے فیریا کو مخاطب کیا تھا۔

"وہ خاص لوگوں کے لیے ہی کچھ بناتا ہے۔"

"آخر آپ فادر ہیں اس کے۔" وہ اپنے بلیک برن سے سجے ناخنوں کو دیکھ رہی تھی۔ دیکھتی رہی۔

"تم اس کی کچھ نہیں لگتیں؟" وہ پوچھ رہے تھے۔

وہ گلدانوں میں لگے کاسنی پھول دیکھ رہی تھی۔

"کاش میرا اپنے دل پر اختیار ہوتا۔ تو میں کبھی بھی دوستی کے درجے کو محبت تک پہنچنے نہ دیتی۔ میں مجبور ہو گئی تھی۔ میں اب بھی مجبور ہوں۔"

"مجھے گلٹ (احساس جرم) ہو رہا ہے کہ میں تمہارے لیے کچھ نہ کر سکا۔ کیا تم نے منعم سے بات کی ہے؟" جھجک کر پوچھا گیا تھا۔

"کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا کہ بات کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور جواب پتا چل جاتا ہے۔ کھیل دیکھنے کے لیے ہر بار پردے اٹھنے کا انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ بس پس پردہ منظر ہی کھیل سامنے کر دیتا ہے۔ جیت اور مات کی بازی سامنے ہی ہوتی ہے۔"

"تم سب خود امیجن (تصور) مت کرو۔ بات کر کے تو دیکھو۔ معجزے ہو ہی جاتے ہیں۔"

"میں اچھی طرح جانتی ہوں' میرے ساتھ کبھی کوئی معجزہ نہیں ہو گا' مگر پھر بھی میں آخری بار بات ضرور کروں گی۔"

"میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکوں گا۔" علی صاحب نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتے۔ مگر جلد دیکھیں گے۔ پہلے ضبط کس کا ٹوٹتا ہے؟"

☼ ☼ ☼

"بیلی خبردار' جو ایک آنسو بھی تیری آنکھ سے نکلا' انہی قدموں پر واپس لوٹ جاؤں گا۔" وہ ان کے گھٹنوں سے لگی ہاسٹل کی انتظار گاہ میں رو رہی تھی اور وہ اسے چپ کروانے میں ہلکان ہوئے جا رہے تھے۔ گاؤں سے وہ اسے فیس کی رقم دینے آئے تھے۔

"کہاں سے آئے پیسے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کر رہے آپ۔ ایسا کیوں ابا؟" انہوں نے سوچا تھا وہ پہیلی ہو جائیں گے' وہ بوجھ ہی نہ پائے گی۔ مگر وہ ہر پہیلی بوجھ جاتی تھی۔ وہ بیلا فاروق احمد تھی۔ "آپ مجھے یہ تسلی' دلاسے مت دیں کہ آپ

خوش ہیں اور سب پہلے جیسا ہو جائے گا۔ آپ کا صبر مجھے بے یقین کر رہا ہے۔"

"جھلی نہ ہو تو... خزاں ہی بہار لے کر آتی ہے۔ اتنی دور سے آیا ہوں' کوئی دل کی گل ہی کر لے۔" حسرت اونچا مینار ہو گئی۔ وہ دوپٹے سے آنکھیں پونچھنے لگی تھی۔

"اماں اور جیدی کیسے ہیں؟" خیال والی کو اب خیال آیا تھا۔

"سب بہتر ہے۔ اللہ کا کرم ہے۔ تیری ماں نے پنجیری بھیجی ہے کہہ رہی تھی اس میں تیری سہیلیوں کا بھی حصہ ہے۔" وہ سر ہلا کر سامان دیکھ رہی تھی۔ ابا نے بغور اس کا جائزہ لیا تھا۔ گندمی چہرہ دوپٹے میں قید تھا۔ آنکھیں روشن تھیں۔ دل چاہ رہا تھا آنکھیں چوم لیں' مگر دل مسوس کر رہ گئے۔

"کیا دیکھ رہے ہیں؟" بیلا کو خبر ہو گئی تھی۔

"دیکھ رہا ہوں تو کتنی بڑی ہو گئی ہے' کل تک ویہڑے میں بھاگی بھاگی پھرتی تھی اور تیرے پیروں کی جھانجھر سے گھر گونجتا تھا۔ تیری ماں نے وہ جھانجھریں بکسے میں سنبھال رکھی ہیں۔ دھیوں کے بڑے ہو جانے کے بعد بھی ان کا بچپن گھر میں' بابل کے آنگن میں چلتا پھرتا رہتا ہے۔" وہ جیب سے کانچ کی چوڑیاں نکال کر ہتھیلی پر رکھے بیٹھے تھے۔ "تیری ماں لائی ہے' تیرے واسطے سلطان باہو کے مزار سے... پہن لے۔" وہ خوشی خوشی ایک ایک کر کے چوڑیاں کلائی میں پہنتی رہی۔ اور ابا اس کے چمکتے چہرے کو دیکھتے رہے۔

"اچھی لگ رہی ہیں نا ابا۔"

"ہاں... بہت اچھی۔"

"ابا' اماں کو کہنا کہ جلد آؤں گی' دس چھٹیاں ملنی ہیں۔"

"ارے ہاں' بیلا تیری ماں کہہ رہی تھی' اس واری اپنی سہیلیوں کو بھی اپنی بستی لے کر آنا۔" ابا کو یاد آیا تھا۔

"جی ابا... میں ان کے گھر فون کر کے اجازت لوں گی' پھر وہ بھی میرے ساتھ بستی آئیں گی۔"

"جی آیاں نوں... آنے سے پہلے ہمیں فون پر خبر کر دینا۔" تاکید کی گئی تھی۔ کوک منگوائی گئی تھی۔ ابا پینے لگے۔ اب وہ انہیں غور سے دیکھ رہی تھی۔ انہیں خبر ہو ہی گئی تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" وہ مسکرائے تھے۔

"آپ تو بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔" وہ فکر مند ہو گئی تھی۔

"عمر کا تقاضا ہے بیلا۔"

"ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے؟" وہ جیسے خفا ہوئی تھی۔

"بیٹیوں کو باپ کی عمر ہمیشہ زیادہ ہی لگتی ہے۔"

"جی نہیں... آج آپ واقعی بوڑھے ہوتے نظر آ رہے ہیں۔"

"فاروق احمد کو دنیا اس وقت بوڑھا ہوتا دیکھے گی جس دن تم رخصت ہو گی بیلا۔" وہ نم نم سے لہجے میں گویا ہوئے تھے۔

"میں کہیں جاؤں گی ہی نہیں آپ کو چھوڑ کر۔" وہ ان کے گلے میں بازو حمائل کر کے بیٹھ گئی تھی۔

"چھوڑ کر تو جانا ہی پڑتا ہے۔ بیٹیاں تو باپ کے پاس امانت ہوتی ہیں۔" انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی تھی۔ وہ تین گھنٹے گزار کر واپس آ گئے تھے۔ بیلا کو فیس کی رقم دی تھی۔ اماں نے سونے کے کڑے فاروق احمد کے سامنے رکھ کر کہا تھا۔

"شہر جا کر سنار کو بیچ دیجیے گا۔ اور جو رقم ملے بیلا کی فیس کے لیے دے دیجیے گا۔ ویسے بھی بھاری تھے کڑے پہنے پہنے کلائیاں درد کرنے لگیں۔"

"بیلا کی ماں یہ تو بیلا کے جہیز کے لیے رکھے تھے۔ یوں بیچنا ٹھیک رہے گا کیا؟" وہ متفکر سے کہہ رہے تھے۔

"ارے چھوڑیں... اوپر والا سبب بنا دے گا۔ فیس کا بھی تو انتظام کرنا تھا۔ انہیں بیچنے میں کوئی حرج نہیں۔" اور وہ جانتے تھے جب بھی بیلا آئی تو اماں کی خالی کلائیاں دیکھ کر سوال ضرور کرے گی۔ انہوں نے

سوچ لیا تھا کہ اسے بہلالیں گے۔ اور بیلا بنت فاروق احمد تو دلیلوں' بہانوں سے بہل ہی جاتی تھی۔ شاید ساری اولادیں بہل جاتی ہیں۔ سیہ پہر سنہری تھال کو شام کی چادر میں الٹنے کو تیار کھڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں یہ نہیں کہہ رہا کہ تم بری لڑکی ہو بلکہ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ فیریا تم سے زیادہ اچھی لڑکی ہے۔" **جیکسن باف** نے کافی کا سپ لیتے ہوئے اسے مطلع کیا تھا۔ ماریانہ ڈسٹنگ کررہی تھی۔ Jose (جوز) کی ہلکی ہلکی دھن بج رہی تھی اور کیفے میں بڑی نفیس سی خاموشی پھیلی ہوئی تھی' ایسی خاموشی جو ہلکے ہلکے شور کے ساتھ وقوع پذیر ہوتی ہے۔ خاموشیاں بھی کئی اقسام رکھتی ہیں' مسٹریاں.....

"میں صرف اتنا جاننا چاہتی ہوں کہ آپ میرا اور فیریا کا **کمپیریزن** (مقابلہ) کیوں کررہے ہیں؟" وہ واقعی الجھن میں تھی۔

"کیا مجھے تمہیں سب بتادینا چاہیے۔ رکو مجھے چند سیکنڈ سوچنے کا موقع دو۔" اور وہ سوچ میں پڑ گئے۔ وہ ڈسٹنگ کرتی رہی۔ وقت ذرا آگے سرکا تو ماریانا نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا' وہ جیسے کسی مراقبے میں گم نظر آتے تھے۔ کیفے کی دیواروں کا پینٹ چمکیلا تھا۔

"میں فیریا سے اچھی لڑکی نہیں ہوں' مگر قابل اعتماد ضرور ہوں۔ یو کین ٹرسٹ۔" وہ شرارت سے مسکرائی تھی۔ مراقبہ ٹوٹا..... سامنے وہ لڑکی کھڑی تھی۔

"میں مانتا ہوں کہ تم ایک ذہین لڑکی ہو۔" وہ مسکرائے تھے۔ وہ حیران ہوئی تھی۔

"کیا واقعی میں ہوں؟" سوال شک کے پانی میں گھل گیا تھا۔

"ہاں تم ہو....." Jose کی دھن Desert (ڈیزرٹ) میں بدل گئی۔

"مجھے زندگی میں اگر کسی سے محبت ہے تو وہ ڈیرک سے ہے..... میرا دل ان لوگوں کے منہ پر گھونسا رسید کرنے کو چاہتا ہے جو ڈیرک کو میرا اڈاپٹڈ چائلڈ (اپنایا ہوا بچہ) کہتے ہیں۔ مگر تم میری آنکھوں میں دیکھو تو خبر ہوگی' میری آنکھیں گواہی دیں گی اسے میں میں نے ہمیشہ سگے بیٹے کی طرح ہی پالا ہے اور راتیں جاگ جاگ کر گزاری ہیں۔ اسے کانٹا لگنے کا درد بھی میں نے سہا ہے۔ اگر اب بھی لوگ سوال اٹھائیں گے تو کیا میں انہیں گھونسا مارنے کا بھی حق نہیں رکھتا۔ ڈیرک کو فقط میں اپنا نام نہیں دیا ہے ماریانا..... میں نے اسے اپنی زندگی' اپنی خوشیاں دی ہیں' اکثر میں سوچتا ہوں کہ میرا ظرف کتنا بڑا ہے۔ وہ میرے لیے ایک ایسا بچہ ہے' جو کھیلنے کو چاند مانگتا ہے اور پیرنٹس اسے بہلا پھسلا کر چاند کو ناممکن کہہ کر چپ کروا دیتے ہیں۔ میں آج تمہیں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر ڈیرک مجھے چاند لانے کو بھی کہے گا تو میں چاند کی تلاش میں نکل کھڑا ہوں گا۔ میری آنکھوں میں دیکھو پیاری لڑکی۔ ان میں تمہیں محبت نظر آئے گی۔ کیا تم نے دیکھا؟" وہ بچوں کی طرح اشتیاق سے پوچھنے لگے تھے۔ چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔ ماریانا نے آج سے پہلے کبھی ایسا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔

"ہاں..... میں نے دیکھا۔" اس نے اعتراف کیا تھا' وہ دیکھ رہی تھی۔ **جیکسن باف** کی آنکھوں میں واقعی محبت تھی۔

"ہم ٹپیکل باپ' بیٹے کی سی زندگی نہیں گزار رہے۔ ہم دوستوں جیسی زندگی گزار رہے ہیں۔ جیسے پینڈولم وقت بدلتا ہے۔ تم نے پینڈولم کو وقت بدلتے دیکھا ہے؟ یقیناً دیکھا ہوگا۔ ویسے ہی ہم دونوں کا موڈ بدلتا ہے۔ یہ ایک اچھا لطیفہ ہے۔ ہمارے لڑائی جھگڑوں کی بہت ہی طویل فہرست ہے۔ ہم جب بھی کوئی گیم کھیلتے ہیں تو جان بوجھ کر ایک دوسرے سے ہار جاتے ہیں' تم سوچ رہی ہوگی کہ ایسے کھیل کا کیا فائدہ..... ہیں نا..... تم سوچ رہی ہو کیا؟"

"ہاں..... میں سوچ رہی ہوں۔"

"ہم ایک دوسرے سے جان بوجھ کر ہار جاتے ہیں' کیونکہ اس طرح ہم اپنے ریلیشن کو بچالیتے ہیں۔"

"دس از امیزنگ..... کتنی دلچسپ بات ہے یہ....." وہ

واقعی ایک دلچسپ سی بات تھی اور کردار تو دلچسپ ترین تھے۔

"ہم نے اپنے اردگرد بہت سی دوستیاں نہیں پالیں، مگر ہم نے جانور' پرندے ضرور پالے ہیں۔ جینٹ' موک' فریڈی ہماری پیاری بلیاں ہیں۔ میں نے پہاڑی طوطے بھی پالے ہیں' مگر وہ سب کے سب ڈیرک نے اڑا دیے۔"

"اوہ۔۔۔ کیوں اڑا دیے بے چارے پیرٹس۔۔۔"

وہ فریڈم۔۔۔ "آزادی" کا قائل ہے۔ وہ کہتا ہے پر رکھنے والوں کو پرواز سے محروم نہیں کرنا چاہیے۔

"تو کیا یہ ایک اچھی اور پیاری سوچ نہیں؟" ماریانا نے سوال اٹھایا تھا۔

"یقیناً" ہے۔۔۔ واقعی۔۔۔ یہ ایک بہترین سوچ ہے۔۔۔ میرا ڈیرک ایسا ہی ہے۔" سینہ پھلا کر کہا گیا تھا۔ وہ فخر محسوس کررہے تھے۔

"میرا ایک سوال ہے۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں؟"

"تمہیں اجازت کی ضرورت نہیں۔ تم پوچھ سکتی ہو۔" زور' زور سے سرہلا گیا تھا۔ ماریانا مشکور ہوئی تھی۔

"آپ فیریا کے بارے میں۔۔۔" ماریانا نے جان بوجھ کربات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ جیکسن باف نے پہلے تو قہقہہ لگایا' جس نے نفیس سی خاموشی کو بھگا دیا تھا۔

"سنو۔۔۔ غور سے سنو۔۔۔ پیاری لڑکی ماریانا۔۔۔ میرے بیٹے ڈیرک باف کو تمہاری دوست فیریا سے محبت ہوگئی ہے۔" ماریانا نے خوشبوؤں کو مرتا محسوس کیا تھا اور ہواؤں کو روتا دیکھا تھا۔ Desert کی آخری دھن وہیں مرگئی تھی۔ دلچسپ کرداروں کو اداس ہوتا نہیں دیکھا جاسکتا۔ افس۔۔۔ ماریانا انہیں کیسے دیکھے گی۔۔۔ کیسے؟

"مگر۔۔۔ فیریا تو۔۔۔" اس بار ماریانا نے جان بوجھ کر بات ادھوری نہیں چھوڑی تھی' بلکہ بات خود ہی ادھوری رہ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"فاروق میاں۔۔۔ میں کہے دیتی ہوں بیلا بس میرے شاکر کی ہی ہے۔ اب آئیں بائیں نہ کرنے لگ جانا۔ میں تو ہمیشہ سیدھی اور سچی بات کہہ دیتی ہوں۔" سکینہ نے دودھ کا گلاس خالی کرکے فاروق احمد تک اپنا مدعا پہنچایا تھا۔

"مگر ایسے کیسے؟" وہ متذبذب ہوئے۔

"آئے ہائے۔۔۔ تم تو یوں کہہ رہے ہو تمہاری بیٹی شہر سے ہی رشتہ لائے گی۔" وہ طنزیہ بولی تھیں۔ اماں کو بہت برا لگا تھا۔

"نہیں باجی۔۔۔ اب ایسی بات تو مت کریں۔ ہماری بیلا ایسی نہیں ہے۔"

"شہر کی ہوا جب اولاد کو لگتی ہے نا تب ماں پیو کی عقل ٹھکانے لگتی ہے۔"

"پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔"

"کبھی کبھی بھونچال آہی جاتے ہیں۔ اور میرا شاکر گھبرو جوان ہے' آخر کیا کمی ہے؟" انہوں نے ہاتھ نچائے تھے۔

"میں ایسے ہی اتنا بڑا فیصلہ نہیں کرسکتا۔ بیلا کی مرضی بھی تو معلوم کرنی ہے۔" انہوں نے رسانیت سے بات لپیٹی تھی۔ لپٹی ہوئی بات کو سکینہ نے پھول دیا تھا اور ماتھا پیٹ ڈالا۔

"اے۔۔۔ لڑکی ذات سے پوچھوگے۔ کیا زمانہ آگیا ہے' لڑکیاں خود بے دید ہو کر اقرار و انکار کا فریضہ انجام دیں گی کیا۔۔۔ نہ کوئی شرم اور نہ حیا۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی؟" ناک پر انگلی رکھی گئی۔

"اسلام حق خود ارادیت کا حق دیتا ہے تو ہم کون ہوتے ہیں روکنے والے۔"

"اے میاں۔۔۔ ہم سے تو کسی نے نہ پوچھا۔۔۔ لال دوپٹا اوڑھایا۔۔۔ قاضی بلایا اور ڈولی بٹھا کر تور دیا گیا۔"

"تب جہالت کا دور تھا۔ اب وقت بدل گیا ہے۔ شعور آگیا ہے۔"

"میرا بیبا بھرا۔۔۔ ایسے شعور سے بے شعور ہی بھلے۔۔۔ صاف صاف کہو' چٹا انکار کا لفظ کہہ کر میرے چونڈے میں سواہ ڈالنی ہے۔" وہ پھپک پھپک کررو دی

تھیں۔ فاروق احمد گھبرا گئے۔

"رونا تو بند کریں۔" اماں جھنجلا کر چپ سی بیٹھی تھیں۔

"تنا۔۔۔ میرے ویر۔۔۔ میرے شاکر میں کیا کمی ہے؟ لولا ہے' لنگڑا ہے۔۔۔ نکھٹو ہے؟" تابڑ توڑ سوال کر دیے گئے تھے۔

"سکینہ۔۔۔ بات برابری کی ہوتی ہے۔ خود دیکھو۔۔۔ کتنا زمین آسمان کا فرق ہے۔ کہاں بیلا اور کہاں شاکر۔ میری پڑھی لکھی بیٹی اور ان پڑھ شاکر۔ بھلا جوڑ بنتا ہے؟ اوپر سے کوئی نوکری بھی نہیں' بس درزی ہے۔ جوڑ کو جوڑ ہی بھلے لگتے ہیں۔ میں اپنی بیٹی کے ساتھ ناانصافی نہیں کر سکتا۔"

"اونہہ۔۔۔ ناانصافی نہیں کر سکتے۔ جانتی ہوں فاروق' آج تو کس کی زبان بول رہا ہے۔ بیوی کی زبان لگی تو ماں جائی کو سیدھا انکار کر رہا ہے۔ بتا رہی ہوں اماں ابے کی قبر پر جا کر وین (بین) کر کے رووں گی کہ فاروقے نے کیا' کیا ہے میرے ساتھ۔" وہ سخت غصے میں تھیں۔ رات کا سمے تھا۔ باڑے سے مویشیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ دور کہیں ریڈیو چل رہا تھا۔

"سکینہ۔ پٹھیاں (الٹیاں) گلاں نہ کر۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ماں جائی پٹھیاں گلاں ہی کرتی ہے۔ حیاتی بھر تجھے معاف نہیں کروں گی۔"

"سکینہ۔۔۔ ایک تو کوئی گل تجھے سمجھ نہیں آتی۔ خواہ مخواہ کی بحث کرتی ہے۔" انہوں نے حقہ پرے رکھ دیا تھا۔

"اکلوتی ماں جائی بحث کرتی ہے۔ جانے کس نے تیرا دماغ گھمایا ہے جادو ٹونے کر کے۔۔۔" وہ نئی بحث میں پڑ چکی تھیں۔ فاروق احمد اٹھ کر تکیے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ اماں کٹوریاں اٹھائے تھڑے پر رکھنے لگیں۔ جبکہ جیدی بے نیاز سا موبائل پر گیم کھیل رہا تھا۔ چاند کھجور کی چھال سا تھا۔ جو کہ اپنا سفر تمام کر رہا تھا۔ آوارہ کتوں اور گیدڑوں کی آوازیں وقفے وقفے سے سنائی دیتی رہیں۔ وہ رات جاگتے ہوئے فاروق احمد نے آنکھوں میں کاٹی تھی۔

☆ ☆ ☆

یونی ورسٹی میں جیت کا دوسرا نام "بیلا" تھا۔ ہر گزرتا سمسٹر اس کی جیت میں حصہ دار ہوتا گیا۔ واقعی وہ وہاں جیتنے آئی تھی۔ وقت نے دیکھا تھا یونی ورسٹی کے رزلٹ بورڈ پر اس کا نام نمایاں تھا۔ کمزور مرنج سی سانولی لڑکی وہ بہت ذہین تھی۔ ذہانت خاص جگہ کی خاص مٹی کی پیداوار نہیں ہوتی' بلکہ یہ تو ہر جگہ پھیلی ہوتی ہے۔ بستی کھوکھر بھی ذہانت کی بستی تھی جہاں ذہانت کے بیج' درخت ہوتے تھے۔ منٹو ہال کے سامنے والی گیلری میں وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ بیلا کو لگا وہ پہلے جیسا نہیں رہا' بدل گیا ہے۔

"ایک سال پہلے میں نے تمہیں غلط سمجھا تھا' مجھے لگا تھا کہ ایک چھوٹے سے گاؤں کی لڑکی جو صرف بڑی بڑی باتیں کرنا جانتی ہے اور کچھ نہیں۔ مگر تم نے مجھے غلط ثابت کر دیا۔ آئی وانٹ ٹو سے کہ جیت تمہارے لیے ہی بنی ہے۔" وہ رشک سے اسے دیکھتا ہوا بڑا بدلا بدلا سا لگا تھا۔ ایسے اعتراف آسان تو نہیں ہوتے۔ بیلا نے بھی اسے غلط سمجھا تھا' مگر وہ یہ اعتراف نہیں کر سکتی تھی۔ گیلری میں لوگ آتے جاتے نظر آرہے تھے۔

"بہت شکریہ۔۔۔ منعم۔۔۔ شاید آپ کو اندازہ نہیں ہو گا کہ میں نے کتنا طویل سفر کیا ہے۔ میں آج جہاں کھڑی ہوں اکیلی نہیں ہوں۔ اپنی بستی کی عزت اور وقار لیے کھڑی ہوں۔ اس سے بڑھ کر کچھ قیمتی نہیں اور اس سے بڑا کوئی بوجھ بھی تو نہیں۔" منعم علی ٹکٹکی باندھے اس عزت اور وقار والی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ اگر وہ "عام" تھی تو "عام" کیوں نہیں لگتی تھی۔ روشی' ریحانہ اور صدف گیلری میں بھاگتی دوڑتی بیلا تک پہنچی تھیں۔

"لڑکی۔۔۔ تم سے اس قدر کنجوسی کی توقع نہ تھی۔"

"میں نے کیا' کیا ہے؟" بیلا نے شہادت کی انگلی سینے پر رکھ کر پوچھا تھا۔

"تم ٹریٹ دے رہی ہو یا نہیں؟" روشی نے بازو

سے پکڑا تھا۔ منعم وہیں کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔

"دے رہی ہوں۔۔۔ روشی۔۔۔ چلو کینٹین کی طرف۔" بیلا نے انہیں چلنے کو مڑ کر کہا تھا کیونکہ اس کا رخ منعم کی طرف تھا۔

"آپ بھی آئیے پلیز۔" اس نے منعم کو کہا تھا۔ وہ حیران ہوا تھا۔ وہ اس بات کی کم از کم توقع نہیں کر رہا تھا۔

"نہیں۔۔۔ شکریہ آپ لوگ انجوائے کریں۔"

بلیک شرٹ اور بلیو جینز میں وہ دراز قد کے ساتھ بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔ ڈورم کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ گیلری میں چلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

"کتنا خوب صورت ہے یہ۔" روشی نے تبصرہ کیا تھا۔ وہ ہی یہ کر سکتی تھی۔ ریحانہ نے غور سے اسے جاتے دیکھا تھا۔

"کسی ماڈل کی طرح لگتا ہے۔ اسے تو فلموں میں ہیرو ہونا چاہیے۔" بیلا نے مڑ کر اسے گیلری کے آخری کونے سے مڑتے دیکھا تھا۔ اک پل کو لگا تھا کہ اس نیم تاریک گیلری میں گہری تاریکی چھا گئی ہو۔ اور بیلا بنت فاروق احمد وہاں اکیلی کھڑی ہو۔ کوئی دیا نہیں۔ روزن نہیں۔ روشنی بھی تو نہیں۔

☆ ☆ ☆

"تو تم نے آخر کار ہار تسلیم کر ہی لی۔ مجھے یقین نہیں آرہا۔ تم کیسے ہار مان سکتے ہو؟" اسد نے قائداعظم بلاک کی سیڑھیوں پر بیٹھتے ہوئے منعم کو مخاطب کیا تھا۔ انداز میں بہت افسوس تھا۔

"میں اس لڑکی سے شاید کبھی نہیں جیت پاؤں گا۔"

"اوہ مین۔۔۔ تم کیسے اتنی بڑی بات کر سکتے ہو۔ اور تمہیں اس سے راہ و رسم بڑھانے کا کہا تھا' تم سے وہ بھی نہیں ہو سکا۔"

"مجھے ضرورت نہیں اس سب کی۔"

"حیرت ہے' تم اب کیسے دودھ کے دھلے ہو گئے۔ تمہارے فلرٹ تو پوری یونی میں مشہور ہیں۔"

"اسد میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔"

"کول ڈاؤن ڈیر۔۔۔ غصہ مت ہو۔۔۔ تم نے پہلے ہمارے اتنے چیلنجز قبول کیے اور اب تم کنی کترا رہے ہو۔"

"جہنم میں جاؤ تم۔۔۔" وہ غصے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اسد نے بغور اسے دیکھا تھا۔ وہ پہلے ایسی باتوں پر خوش ہوتا تھا۔ ان کا ساتھ دیتا تھا۔ مگر اب ایسا نہیں تھا۔

"فائن آرٹس کی حرا تمہارا پوچھ رہی تھی۔"

"اب پوچھے تو کہہ دینا کہ مر گیا منعم علی۔" یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا چل دیا تھا۔ قائداعظم بلاک کی سیڑھیوں پر سایا سا رہتا تھا۔ وہاں فائن آرٹس اور انگلش والوں کے گروپ ڈیرہ جمائے رکھتے تھے۔

☆ ☆ ☆

منعم علی سکے کے دو رخوں کی طرح تھا۔ ایک بروکن فیملی کا ٹوٹا بکھرا ہوا لڑکا جو کہ ماں سے دور باپ کی بے اعتنائی کے سائے میں پرورش پا رہا تھا۔ بچپن سے جوانی تک وہ ایک پہیلی کی طرح رہا تھا۔ بچپن اس نے گھر کی بالکونیوں' دریچوں' مطالعہ گاہوں میں کچھ ڈھونڈتے' کھوجتے گزارا تھا۔ جوانی میں وہ کافی سوشل ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو "دنیا" کے ہنگاموں میں گم کر لیا تھا۔ سوشل ہوتا گیا اور دوستیوں کی قطار میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ وہ ہمیشہ سے ذہین رہا تھا اور اس نے اپنی ذہانت کو ثابت بھی کیا تھا۔ اردگرد سے ملنے والی تعریف اس کے گرد غرور کی دیواریں کھڑی کرتی گئی۔ دیواریں طویل سے طویل تر ہو گئیں۔ تب اسے اپنی ذات کے سوا کچھ بھی نظر نہ آیا تھا۔ کچھ دوست ایسے ملے جنہوں نے دماغ ساتویں آسمان تک پہنچا دیا تھا۔ وہ ان کے رنگ میں ہی رنگتا چلا گیا۔ مگر اس نے "حد" نہ پھلانگی تھی۔ وہ ایسا ہاٹ ٹاپک تھا جس پر بار بار بات کی جاتی تھی۔

جیت کے جنون میں مبتلا اسے دھچکا پہلی بار بیلا کی جیت نے دیا تھا۔ تب ہی اس نے بیلا سے بے انتہا نفرت کی تھی۔ وہ اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ بیلا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

جیسے لوگ اسے کبھی بھی پسند نہیں رہے تھے۔ مگر اس کے مزاج کا سکہ اکثر الٹ جاتا تھا۔ اسد کے کہنے پر وہ بیلا کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ اسے لگا تھا وہ بھی باقی لڑکیوں کی طرح ہی ہوگی۔ مڈل کلاس لڑکی جو ایک امیر زادے کی طرف کھنچی چلی آتی ہے۔ مگر زندگی میں وہ پہلی بار غلط تھا۔ وہ عام تھی مگر عام سی نہیں لگتی تھی۔ وہ عجیب سی تھی کسی مخمصے کی طرح، جسے کھوجتا کھوجتا وہ اپنا نشان کھودے۔

اسٹیچو ایکٹ پلے میں وہ پہلی بار آمنے سامنے ہوئے تھے۔ تب منعم علی کو لگا تھا وہ "خاص" تھی۔

☼ ☼ ☼

بیلا نے اپنے دل میں منعم علی کے لیے ہمدردی محسوس کی تھی۔ اسے سر عارف کی بات یاد آئی تھی۔

"منعم علی جیسے لوگ اوپر سے اخروٹ نظر آتے ہیں، مگر اندر سے ناریل جیسے ہوتے ہیں۔ وہ بروکن فیملی سے تعلق رکھتا ہے اور ایسے لوگوں کی پرورش زمانہ کرتا ہے اور زمانہ کیسی پرورش کرتا ہے، یہ ایک الگ بحث ہے۔ ایسے لوگوں سے نفرت نہیں کی جاتی، انہیں تو ایکسٹرا کیئر (اضافی خیال رکھنے) کی ضرورت ہوتی ہے۔" پھر بیلا نے اسے اپنی طرف متوجہ ہوتے دیکھا تھا۔ پھر وہ اسے نظر انداز نہیں کر سکی تھی۔ وہ ایک ذہین اور قابل لڑکا تھا۔ وہ بدل سا گیا تھا۔ روشی، ریحانہ اور صدف تو برملا کہتی تھیں۔

"منعم بدل گیا ہے۔" صدف سموسہ کیچپ میں ڈبو کر کھاتی۔

"اصل میں بے چارہ بروکن فیملی سے ہے۔ برا نہیں ہے، بس لوگ جیلسی میں کسی کی تعریف برداشت نہیں ہی نہیں کر سکتے۔" ریحانہ ٹشو سے ہاتھ صاف کر رہی تھی۔

"انعم بتا رہی تھی۔ اس کی ماں پیرس رہتی ہے، چھٹیوں میں ملنے جاتا ہے۔"

"ہاں... آنکھیں مغربی لوگوں جیسی ہیں اور نقوش بھی..."

"نہیں... تم لوگوں کو اتنے غور سے دیکھتی ہو؟" صدف کو حیرت ہوئی تھی۔

"اب بندے کی بائے چانس نظر پڑ جاتی ہے۔ اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ ہر کسی کا پوسٹ مارٹم کرتی پھرتی ہوں۔" روشی کو تاؤ آیا۔

"روش جادوگرنی... تمہیں تو غصہ ہی آ گیا۔" پانی پیتے پیتے طنزاً کہا گیا۔ روشی کو سخت صدمہ ہوا تھا۔

"میں اور جادوگرنی..." حیرت تھی کہ ختم ہی نہ ہوتی تھی اور قلق تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

"جن بلاتی ہو... جنتر منتر بھی تمہیں آتے ہیں۔"

"میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔"

"تم ویمپائر بھی ہوگی، مجھے یقین نہیں آ رہا۔" ریحانہ کی بے یقینی جان لیوا سی تھی۔

"دفع ہو... اب تو سچی... مکھی بنا کر دیوار پر چپکا دوں گی۔" روش جادوگرنی نے دھمکایا تھا۔ بیلا نے کانٹا ٹیبل پر پٹخا تھا۔

"اللہ کے واسطے چپ کر جاؤ... پہلے ہی سر کی اسائنمنٹ کا سوچ کر دماغ پنچر ہو رہا ہے۔"

روشی اور ریحانہ ٹیبل بجانے لگی تھیں۔ اک پھل موتیے دا مار کے۔ بیلا نے دونوں کو ایک ایک "چماٹ" رسید کی اور غصے سے جوہر بلاک کی طرف چل دی، وہ ہانپتی ہوئی پیچھے پیچھے تھیں۔

☼ ☼ ☼

ایک سال میں ہونے والے لڑائی جھگڑوں کے بعد وہ دونوں آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے قریب آئے تھے۔ یونی ورسٹی میں ہونے والے مقابلوں میں ان دونوں کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا تھا۔ یونی ورسٹی میگزین کے وہ مدیر تھے۔ ادبی پروگراموں کی میزبانی بھی ہمیشہ ان کے ذمے ہی ہوتی تھی جسے وہ احسن طریقے سے نبھاتے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☼ ☼

شعاع عید

القرآن

''اور جن لوگوں نے اپنے پروردگار سے انکار کیا ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔ جب وہ اس میں ڈالے جائیں گے تو اس کا چیخنا چلانا سنیں گے اور وہ جوش مار رہی ہو گی گویا مارے جوش کے پھٹ پڑے گی جب اس میں ان کی کوئی جماعت ڈالی جائے گی تو دوزخ کے داروغہ ان سے پوچھیں گے کیا تمہارے پاس کوئی ہدایت کرنے والا نہیں آیا تھا؟ وہ کہیں گے کیوں نہیں' ضرور ہمارے پاس ہدایت کرنے والا آیا تھا لیکن ہم نے اس کو جھٹلا دیا اور کہا خدا نے تو کوئی چیز نازل ہی نہیں کی تم تو بڑی غلطی میں (پڑے ہوئے) ہو۔

(سورۃ الملک آیت نمبر 6 سے 10)

عید

حضرت سعد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب عید الفطر کا دن آتا ہے تو فرشتہ راستے کے کناروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور آواز دیتے رہتے ہیں' اے مسلمانو! ایک ایسے پروردگار کی طرف چلو جو بھلائی دے کر احسان کرتا ہے' پھر اس پر بہت سا ثواب بھی دیتا ہے' تمہیں رات کو (تراویح) میں کھڑے رہنے کا حکم دیا گیا تھا' تم نے روزہ رکھا' اور اپنے پروردگار کی اطاعت کی اب اپنے انعامات وصول کر لو' چنانچہ جب لوگ نماز پڑھ چکتے ہیں تو ایک منادی آواز لگاتا ہے کہ سنو! تمہارے پروردگار نے تمہاری مغفرت کر دی ہے' اب اپنے گھروں کو ہدایت یاب ہو کر جاؤ تو در حقیقت یہ عید کا دن انعام کا دن ہے اور آسمان میں اس کا نام بھی (یوم الجائزہ) (روز انعام) ہے۔''

(طبرانی' ترغیب ص ۱۴۱' ج ۲)

ستارے

۱۔ تین چیزیں انسان کو تباہ کر دیتی ہیں حرص' حسد اور غرور (حضرت امام غزالی رحمتہ علیہ)

۲۔ بھوکے شریف اور پیٹ بھرے کمینہ سے بچو ۔۔۔(حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

۳۔ ہر چیز کے ثواب کا اندازہ ہے مگر صبر کے ثواب کا اندازہ نہیں ۔۔۔(حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

۴۔ جہاں روٹی مزدور کی تنخواہ سے مہنگی ہو جائے وہاں دو چیزیں سستی ہو جاتی ہیں۔ عورت کی عزت اور مردوں کی غیرت ۔۔۔(حضرت نظام الدین اولیا' رحمتہ اللہ)

ثریا شاہ۔۔۔ کھڈوریکا

وزیر کا چناؤ

ایک بادشاہ نے اپنی بہنوئی کی سفارش پر ایک شخص کو موسمیات کا وزیر لگا دیا۔ ایک روز بادشاہ شکار پر جانے لگا تو روانگی سے قبل اپنے وزیر موسمیات سے موسم کا حال پوچھا۔ وزیر نے کہا کہ موسم بہت اچھا ہے اور اگلے کئی روز تک اس طرح رہے گا۔ بارش وغیرہ کا قطعاً'' کوئی امکان نہیں۔ بادشاہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ شکار پر روانہ ہو گیا۔

راستے میں بادشاہ کو کمہار ملا اس نے کہا ''حضور! موسم کچھ ہی دیر بعد خراب ہونے اور بارش کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔''

بادشاہ نے کہا ''ابے او برتن بنا کر گدھے پر لادنے والے' تم کیا جانو موسم کیا ہے؟ میرے وزیر نے بتایا ہے کہ موسم نہایت خوشگوار ہے اور شکار کے لیے نہایت موزوں اور تم کہہ رہے ہو کہ بارش ہونے والی ہے؟'' بادشاہ نے ایک صاحب سے کہا کہ اس بے پر کی

چھوڑنے والے کمہار کو دو جوتے مارے جائیں بادشاہ کے حکم پر عمل ہوا اور بادشاہ شکار کے لیے جنگل میں داخل ہو گیا۔ ابھی تھوڑی دیر گزری تھی گھٹا شروع ہوئی اور پھر بارش ایسے میں خاک شکار ہوتا۔ بادشاہ نے واپسی کا سفر شروع کیا اور برے حالوں میں واپس محل پہنچا۔ واپس آکر دو کام کیے۔ پہلا یہ کہ وزیر موسمیات کو برطرف کیا اور دوسرا یہ کہ کمہار کو دربار میں بلا کر وزیر موسمیات بننے کی پیش کش کی۔

کمہار ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا "حضور کہاں میں جاہل اور ان پڑھ شخص اور کہاں سلطنت کی وزارت مجھے تو موسم کا رتی برابر پتا نہیں۔ ہاں البتہ یہ ہے کہ جب میرا گدھا اپنے کان ڈھیلے کر کے نیچے لٹکائے تو اس کا مطلب ہے کہ بارش ضرور ہوگی۔ یہ میرا تجربہ ہے اور کبھی بھی میرے گدھے کی یہ پیش گوئی غلط ثابت نہیں ہوئی۔" بادشاہ نے کمہار کے گدھے کو اپنا وزیر موسمیات مقرر کر دیا سنا ہے گدھوں کو وزیر بنانے کی ابتدا تب سے ہوئی۔

طاہرہ ملک ۔۔۔ جلال پور پیروالا

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

1 ۔ انسان ایک ایسا غافل منصوبہ ساز ہے کہ وہ اپنی ساری پلاننگ میں کبھی اپنی موت کو شامل ہی نہیں کرتا ۔(ابن بطوطہ)

2 ۔ اگر تم مضبوط بننا چاہتے ہو تو اکیلے لڑنا سیکھو۔ (محمد علی)

3 ۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم کتنا آہستہ آگے بڑھ رہے ہو۔ ناکامی آتی ہے جب تم رک جاتے ہو (کنفیوشس)

4 ۔ قابل رحم ہے وہ شخص جس کو مشورہ دینے والے جاہل ہوں۔ (سقراط)

5 ۔ دانش مند آدمی کبھی اپنی تکلیف کا رونا نہیں روتا بلکہ اپنی تکلیف کے رفع کرنے میں خوشی سے مصروف عمل ہو جاتا ہے۔ (شیکسپیئر)

صبا شریف ۔۔۔ ضلع ساہیوال

ابیات باھو رحمتہ اللہ علیہ

سے روزے سے نفل نمازاں' سے سجدے کر کر تھکے ہو

سے واری کے حج گزارن دل دی دوڑ ناں کے ہو

چلے چلہیے جنگل بھونا' اس گل تھیں ناں پکے ہو

سبھے مطلب حاصل ہوندے باھو' جد پیر نظر اک تکے ہو

فضہ نور ۔۔۔ روہڑی

دو قدم آگے

ایک خاتون خریداری کرنے مال میں گئی کیش کاؤنٹر پر ادائیگی کرنے کے لیے اس نے پرس کھولا تو دکان دار نے خواتین کے پرس میں ٹی وی کا ریموٹ دیکھا دکان دار سے رہا نہ گیا۔ اس نے پوچھا۔

"آپ ٹی وی کا ریموٹ ہمیشہ اپنے ساتھ لے کر چلتی ہیں؟"

"نہیں ' ہمیشہ نہیں ' لیکن آج میرے شوہر نے خریداری کے لیے میرے ساتھ آنے سے انکار کر دیا تو میں ٹی وی میں مذہبی چینل لگا کے آئی ہوں۔"

دکان دار ہنستے ہوئے بولا "میں تمام سامان واپس رکھ لیتا ہوں کیوں کہ آپ کے شوہر نے آپ کا کریڈٹ کارڈ بلاک کر دیا ہے۔"

نشا نورین جاوید ۔۔۔ رکھ بھروکی ڈھکی

خدا سے محبت

ہمیں خدا سے ایسی محبت ہونی چاہیے جیسے بہن اور بھائی کی محبت ہوتی ہے۔ یا ماں اور بچے کی محبت ہوتی ہے۔ ایسی محبت نہیں ہونی چاہیے جو عاشق و معشوق یا میاں بیوی کے درمیان ہوتی ہے پہلی قسم کی لوگ اپنی محبت کا اظہار برملا کر سکتے ہیں جلوت میں خلوت میں گھر میں سرائے میں محفل میں تنہائی میں لیکن دوسری قسم کی محبت کرنے والے صرف خلوت میں اور تنہائی میں اپنی محبت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں ہمیں ان لوگوں کی پیروی نہیں کرنی چاہیے جو کہتے ہیں ہم

خدا سے محبت کا اظہار صرف مسجد یا مراقبے میں یا درگاہ کے اندر کر سکتے ہیں۔ ہمیں تو اپنی محبت کا اظہار ہر جگہ کرنا ہے۔ اور ہر مقام پہ کرنا ہے ہر شخص سے کرنا ہے اور ہر موسم میں کرنا ہے۔ اس میں چھپنا یا چھپانا نہیں۔
(اشفاق احمد)

فوزیہ ثمرؤ ہانیہ عمران، گجرات

بیش بہا گوہر

1 - اس دنیا میں کروڑوں لوگ ہیں پھر آپ کے پیدا ہونے کی وجہ؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے وہ چیز توقع کر رہا ہے۔ جو کروڑوں لوگوں سے ممکن نہیں۔

2 - پانی کے ایک قطرے کی جھیل یا تالاب میں کوئی قدر و قیمت نہیں، کوئی پہچان نہیں، مگر یہ قطرہ اگر کسی پتے پر گرتا ہے تو ایک ہیرے کی طرح چمکتا ہے چنانچہ کسی ایسی درست جگہ کا انتخاب کریں جہاں آپ ہیرے کی طرح چمک سکیں۔

3 - کچھ رشتے "ٹام اینڈ جیری" کی طرح ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے کو اذیت دیتے اور لڑتے جھگڑتے ہیں۔ ایک دوسرے کو مارتے ہیں مگر ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔

4 - یقین کی پختگی اور اخلاق کا حسن جس بندے میں ہو گا وہ ایک ہی وقت میں خالق اور مخلوق دونوں کا محبوب بن جائے گا۔

ارم کمال..... فیصل آباد

انوکھے سوال، بہترین جواب

ایک شخص نے امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ سے پوچھا کہ "فرمایئے اس شخص کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جو یوں کہتا ہے کہ میں جنت کی خواہش نہیں رکھتا اور دوزخ سے نہیں ڈرتا اور مردہ کھاتا ہوں اور بغیر قرات کے بغیر رکوع و سجدہ کے نماز پڑھتا ہوں اور جسے میں نے نہیں دیکھا اس چیز کی گواہی دیتا ہوں، حق سے نفرت رکھتا ہوں اور فتنہ سے رغبت رکھتا ہوں۔"

امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ نے اپنے شاگردوں کی طرف مسکرا کر دیکھا اور دریافت فرمایا کہ تم بتاؤ "ایسا شخص کیسا ہو گا؟"

سب نے کہا کہ "ایسا شخص تو بہت ہی برا شخص ہے۔"

امام صاحب نے فرمایا "نہیں بلکہ یہ شخص تو بڑا ہی اچھا شخص ہے جو جنت کی خواہش نہیں رکھتا بلکہ جنت کے خالق اللہ تعالیٰ کی محبت رکھتا ہے اور دوزخ سے نہیں ڈرتا بلکہ دوزخ کے خالق سے ڈرتا ہے اور مردہ کھاتا ہے یعنی مچھلی یا ٹڈی کھاتا ہے اور بغیر قرات و رکوع سجدے کے نماز پڑھتا ہے یعنی نماز جنازہ پڑھتا ہے اور بغیر دیکھے گواہی دیتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو بغیر دیکھے کہتا ہے۔ اشہد ان لا الہ الا اللہ اور حق سے نفرت رکھتا ہے یعنی موت سے نفرت رکھتا ہے۔ جو حق اور مال و دولت جو دونوں فتنہ ہیں ان سے رغبت رکھتا ہے۔"

(غرائب البیان صفحہ 32)

اقصیٰ ماہ نور ہراج..... داؤد والہ تلمبہ

عورت

تین مختلف ممالک کی عورتیں ایک جگہ ہوئیں اور اپنے اپنے خاوند کے بارے میں بتانے لگیں۔

امریکن عورت: میں نے خاوند سے کہا آئندہ کھانا آپ بناؤ گے، پہلے دن خاوند نے کچھ نہیں کیا، دوسرے دن روسٹ کیا۔

جرمن عورت: میں نے خاوند سے کہا، آئندہ گھر کی صفائی تم کرو گے، وہ چپ رہا۔ دوسرے دن اس نے پورا گھر صاف کیا۔

پاکستانی عورت: میں نے ان سے کہا، اپنے کپڑے خود دھویا کرو اور اپنے کام خود کیا کرو اگلے دن مجھے کچھ نظر نہ آیا، دوسرے دن بھی کچھ نظر نہ آیا، تیسرے دن آنکھوں کی سوجن کچھ اتری تو تھوڑا تھوڑا نظر آیا۔

شائزہ سلطان..... لاہور

بشریٰ محمود

یاد دلاتی ڈائری سے

سائرہ راؤ، کی ڈائری میں تحریر
ساغر صدیقی کی غزل

چاک دامن کو جو دیکھا تو ملا عید کا چاند
اپنی تصویر کہاں بھول گیا عید کا چاند

ان کے ابروئے خمیدہ کی طرح تیکھا ہے
اپنی آنکھوں میں بڑی دیر چھپا عید کا چاند

دور ویران بسیرے میں دیا ہو جیسے
غم کی دیوار سے دیکھا تو لگا عید کا چاند

لے کے حالات کے صحراؤں میں آجاتا ہے
آج بھی خلد کی رنگین فضا عید کا چاند

جشم تو وسعت افلاک میں کھوئی ساغر
دل نے اک اور جگہ ڈھونڈ لیا عید کا چاند

نایاب جیلانی، کی ڈائری میں تحریر
شہزاد نیر کی نظم

حسن ناراض کو مشورہ،

محبت لوٹ سکتی ہے
اگر ہم ایک دوجے کو انہی معصوم نظروں سے پکاریں
جن سے پہلی بار دیکھا تھا
اگر مل بیٹھ کر دونوں
غلط فہمی کی کالی رات سے باہر نکل آئیں
تو گویا دن نکل آئے
ہم اب بھی خوبصورت ہیں
ہمارے زرد چہروں
دکھ بھری آنکھوں میں اب بھی حسن بستا ہے
جو ہم رخصت کریں ان تلخ باتوں کو
تو وہ شیریں بیانی خود بخود آئے گی
جو پہلے پہل دونوں کے لہجوں میں
محبت بن کے آئی تھی
ادھر دیکھو! یہ رستہ اب بھی پیارا ہے
نئے وعدوں کی انگلی تھام کر پھر چل پڑیں
محبت راستہ ہے
اس میں پھولوں، تتلیوں اور جگنوؤں کے قافلے
اب تک ہمارے منتظر ہیں
اب بھلا ڈالو گلے مل کر گلے
شکوؤں سے دامن جھاڑ لو
پہلے قدم پر ہی محبت لوٹ آئے گی

فوزیہ ثمریٹ، کی ڈائری میں تحریر
راشد ترین کی غزل

ایسے نہ اپنی زلف کی زنجیر کر مجھے
میں آسماں کا چاند ہوں تسخیر کر مجھے

مدت سے خستہ حال ہیں دیوار و در مرے
گرتا ہوا مکاں ہوں تعمیر کر مجھے

ویسے تو اس سے وصل کا امکان تک نہیں
مولا اسی کے ہاتھ کی تقدیر کر مجھے

تو شاعری کے سارے ہنر جانتا تو ہے
میں حرف حرف زخم ہوں تحریر کر مجھے

کوئی اجنبی نہیں ہوں میری آنکھ میں اُتر
میں عکس ہوں اگر کوئی تصویر کر مجھے

راشد تمہارے پیار کے قابل نہیں رہا
گر ہو سکے تو درد کی جاگیر کر مجھے

شگفتہ سلیمان

ملیحہ زہرا ——— کراچی

ابرِ رحمت بن کے چھا جاؤ پیامِ عید ہے
چاند سوا تک نور برساؤ پیامِ عید ہے

غزل ملک ——— ملتان

صبحِ عید کی دستک سن کر دروازے پر
روشن روشن کھل اٹھے پھول میرے آنگن میں

لبنیٰ خاور ——— فیصل آباد

تمام عمر کی وابستگی کی خواہش تھی
یہ کب کہا تھا میرا شہر چھوڑ جائے وہ
میرے بھی من کے دریچوں میں عید ہو جائے
میرے افق پہ اگر چاند بن کے چھائے وہ

ارم طاہر ——— ٹنڈو آدم

عید آتی ہے مسرت کی پیالی بن کر
وہ مسرت جو تیری دید سے وابستہ ہے
کیوں نہ ہو عید کی آمد سے مسرت دل کو
جب تیری دید، عید سے وابستہ ہے

افضال کرامت ——— شاہ

خوشیاں لے کر آ رہا ہے یہ تہوار
یہ دن بھی آتا نہیں ہے بار بار
خوش رہو تم عید کے لمحات میں
سارے جہاں کا مل جائے تمہیں پیار

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ——— کراچی

ہم پہ کب موقوف ہے رونق تمہاری بزم کی
ہم نہ ہوں گے تب بھی یہ آئے گی عید

ثمرہ، آفرا ——— کراچی

وفا کا سندیس لے کر اترے تمہارے آنگن میں
گواہ رفاقتوں کا، محبتوں کا بن کر ہلالِ عید

سائرہ راؤ ——— دنیا پور

عید کا چاند نظر آئے گا جس دم مجھ کو
میں تیرے وصل کی اے دوست دعا مانگوں گا
میں جو برسوں سے ہوں تنہائی کے صحرا میں مقیم
اب تیرے عہدِ رفاقت کی گھٹا مانگوں گی

رباب راجپوت ——— پھول نگر

جو شخص کھو گیا ہے اندھیری راہوں میں
اس کو ڈھونڈ کے لاؤ کہ عید آئی ہے

عائشہ شبیر ——— قصور

کب تیرے ملنے کی تقریب بنا عید کا چاند
تیری یاد آئی تو دیکھا نہ گیا عید کا چاند
غم کے بادل فضاؤں میں لیسے چھائے
دل کی دنیا میں منور نہ ہوا عید کا چاند

صباحت مغل ——— خیر پور

وہ جنہیں ہم اپنا بنانے کا سوچ بھی نہ سکے
ان ہی کے نام لکھا ہے ہم نے عید مبارک

اریبہ شمشاد ——— آزاد کشمیر

تحفہ دعاؤں کا تمہیں بھیجے میرا
سدا رہے تمہارے گرد خوشیوں کا گھیرا
مسرتیں تمہیں عید کی مبارک ہوں
تمہاری زیست میں نہ آئے کبھی غموں کا پھیرا

حنا کرن ——— پتوکی

کتنی مشکل سے فلک پہ نظر آتا ہے
عید کے چاند تے بھی انداز تمہارے سیکھے

گیلانی سسٹرز ——— کہروڑ پکا

صرف اسے اتنا کہہ دینا وصی
میں اس کے بغیر تنہا نہیں ادھورا ہوں

کچھ موتی چنے ہیں

ادارہ

صداقت اور امانت!

جس شخص میں صداقت اور امانت ہوتی ہے اور وہ واقعی قرآن حاصل کرنا چاہتا ہے تو قرآن اس کو دے دیا جاتا ہے اسکرین پہ وہ روشن چہرے والا شخص کہہ رہا تھا۔

"ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے عرب معاشرے کے بارے میں عمومی تاثر یہ رکھتے ہیں کہ وہ بہت جاہل گنوار لوگ تھے اور بیٹیوں کو زندہ دبانے والے وحشی تھے لیکن ان لوگوں میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں۔ وہ مہمان نواز تھے' عہد کی پاسداری کرتے تھے۔ جہاں تک بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے کا تعلق ہے تو یہ کام عرب کے کچھ غریب قبائل کرتے تھے اور اس وقت بھی انسانی حقوق کی تنظیمیں تھیں جو فدیہ دے کر ان بچیوں کو چھڑاتی تھیں اور رہی بات صداقت کی تو عرب معاشرے میں جھوٹ بولنا انتہائی قبیح عمل سمجھا جاتا تھا اور لوگ اس شخص پہ حیران ہوتے تھے جو جھوٹ بولتا ہو' اسی لیے ان لوگوں کو قرآن دیا گیا تھا اور اسی لیے ہم لوگ اس کی سمجھ سے محروم کر دیے گئے ہیں کیونکہ نہ تو ہم سچ بولتے ہیں اور نہ ہی امانت کا خیال رکھتے ہیں' بھلے وہ کسی ذمہ داری کی امانت ہو' کسی کی عزت کی' یا کسی کے راز کی۔"

(نمرہ احمد..... مصحف)
افضالہ کرامت۔ شاہ گھوڑا

محبت

محبت ہمیشہ سفید لباس میں عمرو عیار ہے ہمیشہ دوراہوں پہ لا کر کھڑا کر دیتی ہے اس کی راہ پر ہر جگہ راستہ دکھانے کو صلیب کا نشان گڑا ہوتا ہے۔ محبت جھمیلوں میں کبھی فیصلہ کن سزا نہیں ہوتی ہمیشہ عمر قید ہوتی ہے محبت کا مزاج ہوا کی طرح ہے کہیں ٹکتا ہی نہیں۔ محبت میں بیک وقت جوڑنے اور توڑنے کی صلاحیت ہوتی ہے محبت ہر دن کے ساتھ اعادہ چاہتی ہے۔ جب تک روز اس تصویر میں رنگ نہ بھرو تصویر فیڈ کرنے لگتی ہے اور سورج نہ چڑھے تو دن نہیں ہوتا ۔جس روز محبت کا سورج طلوع نہ ہو تو ہر طرف اندھیرا ہی رہتا ہے۔

(بانو قدسیہ..... راجا گدھ)
فوزیہ ثمر بٹ ہانیہ عمران..... گجرات

عشق

جس دل میں عشق مقیم ہو جائے اس دل میں ہمیشہ درد کا دھواں بھرا رہتا ہے۔ جو پوری جان کو سلگائے رکھتا ہے۔ وہ بھٹی اس کو جلا کر نیست و نابود نہیں کرتی بلکہ اس کو پکا کر مضبوط کر دیتی ہے پھر وہ ٹھنڈا میٹھا چشمہ بن جاتا ہے جس سے پیاسا اپنی پیاس بجھاتا ہے۔

(کنیز نبوی..... آتش عشق)

کچھ انسان کچھ جانور

ہر انسان میں جانور بستا ہے۔ تھوڑا سا انسان ذرا سا گدھ' کچھ کتے کچھ بلے' کچھ بھیڑیے سے ممیائے انسان' کچھ شیر سے دھاڑتے' کچھ اونٹ سے کینہ پرور' کچھ لومڑ سے مکار' کچھ کوے سے موقع پرست' کچھ کبوتر جیسے بزدل کچھ الو..... کچھ الو کے پٹھے۔
یہ انسان بھی نا!..... چولا پہن کر گھومتا فریبی' مکھوٹا لگائے بہروپیا ذرا جو وقت پڑے تو بتاتا ہے دراصل ہے کیا.....

(سائرہ رضا..... کچھ وقت گزرنے دو)
سدرہ بتول..... ملتان

شہادت جاریہ

انہیں یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ حلوائی اور بچے اس کتے کو ٹیپو! ٹیپو! کہہ کر بلا اور دھتکار رہے تھے۔ سرنگا پٹم کی خون آشام جنگ میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں نے کثرت سے کتوں کا نام ٹیپو رکھنا شروع کر دیا تھا اور ایک زمانے میں یہ نام شمالی ہندوستان میں اتنا عام ہوا کہ خود ہندوستانی بھی آوارہ اور بے نام کتوں کو ٹیپو کہہ کر ہی بلاتے اور ہشکارتے تھے.... یہ جانے بغیر کہ کتوں کا یہ نام کیسے پڑا۔

باستثنائے نپولین اور ٹیپو سلطان' انگریزوں نے ایسا سلوک اپنے کسی اور دشمن کے ساتھ روا نہیں رکھا۔ اس لیے کہ کسی اور دشمن کی ان کے دل میں ایسی ہیبت اور دہشت کبھی نہیں بیٹھی تھی۔ برصغیر کے کتے سو سال تک سلطان شہید کے نام سے پکارے جاتے رہے۔ کچھ برگزیدہ شہید ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی آزمائش عقوبت مطہرہ اور شہادت عظمیٰ ان کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہوتی۔ رب جلیل انہیں شہادت جاریہ کی سعادت سے سرفراز فرماتا ہے۔"

(مشتاق احمد یوسفی.... آب گم)

(صائمہ مشتاق.... بھاگٹانوالیہ)

غلامی کا رشتہ

"آپ پاکستانی ہو کر انگریزی میں درخواست کیوں لکھتے ہیں" اس نے میری جوابی طلبی کی۔

میں نے معذرت کی "مجھے عربی نہیں آتی' اس لیے درخواست انگریزی میں لکھنا پڑی۔"

"آپ کی زبان کیا ہے؟" افسر نے پوچھا۔

"اردو" میں نے جواب دیا۔

"پھر انگریزی کے ساتھ آپ کا کیا رشتہ ہے؟" افسر نے طنزیہ پوچھا۔

میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں یہ تسلیم کروں کہ انگریزی کے ساتھ میرا فقط غلامی کا رشتہ ہے۔

(قدرت اللہ شہاب)

صدف سمیع.... کراچی

مجھے اپنا آپ دکھاؤ

خواہش' مرضی' تمنا' طلب اور حرص' ان سب چیزوں سے ہٹ کر راہ پکڑنے کا نام فقیری اور درویشی ہے۔ جو حکم ہوتا ہے 'بلاچوں چرا اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ اندیشہ سود و زیاں دنیا کے بندوں کے دلوں میں ہوتا ہے' فقیروں کے ہاں محض تسلیم و رضا کی بات ہوتی ہے۔ یوں جانو کہ تم "جاننے" والے ہو اور ہم "ماننے" والے ہیں۔"

میرے منہ سے خود بخود نکل گیا۔ "جاننا اور ماننا؟"

"جان کر ماننا تو صرف ماننا اور اگر ایمان سے مانا تو بہت خوب مانا.... مومن اسے کہتے ہیں جو اللہ کریم کو بغیر دیکھے بغیر جانے' اس پر ایمان لائے اور کافر کہتا ہے کہ پہلے میرے سامنے آؤ مجھے اپنا دکھاؤ۔"

(محمد یحیٰ خان.... پیا رنگ کالا)

حافظہ رملہ مشتاق.... حاصل پور

اچھی ماں

اولاد کو صرف اچھی ماں چاہیے ہوتی ہے۔ ان کو اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ وہ کتنی اچھی مصورہ' کتنی اچھی مصنفہ یا کتنی اچھی اداکارہ ہے اور دنیا نے اس کو کہاں بٹھایا ہوا ہے اور ماما جان! ایک انسان اور جانور کی ماں میں یہی فرق ہوتا ہے۔ پیدا تو جانور بھی کرلیتا ہے بچہ۔ مگر جانور تربیت نہیں کر سکتا' وہ اولاد پیدا کر کے چھوڑ دیتا ہے اور مریم بھی یہی کر رہی ہے۔ اس کو زینب میں کوئی دلچسپی نہیں۔ گورلس اور میں اس کو پال رہے ہیں۔ ایسی ماؤں کے پیروں کے نیچے تو کوئی جنت تلاش کرنے نہیں جاتا اور جنت کسی دوسری دنیا میں نہیں ملتی۔ اچھی ماں اپنی اولاد کو اس دنیا میں جنت دے دیتی ہے۔ اولاد کو جینے کا گر سکھا دیا تو آپ نے اس کی زندگی جنت بنا دی۔

(عمیرہ احمد.... لاحاصل)

اقرا جٹ.... منچن آباد

روبینہ شریف

کاروباری ذہن

ایک فقیر کی لاٹری کھلتی ہے اور وہ ان پیسوں سے مسجد تعمیر کرواتا ہے دوسرا فقیر پوچھتا ہے "یار تم نے اپنے پیسوں سے مسجد ہی کیوں بنوائی؟"

پہلا فقیر "تاکہ اس مسجد کے باہر صرف میں ہی بھیک مانگوں۔"

ایک نہ شد

ایک بہرہ ایک دکان پر گیا اور ایک چیز کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگا۔ "کتنے کا ہے۔"

اتفاق سے دکان دار بھی بہرہ تھا اس نے کہا "پانچ کا"

گاہک نے کہا "میں یہ نہیں معلوم کر رہا ہوں کہ وہ کانچ کا ہے قیمت بتاؤ۔"

دکاندار نے جھنجلا کر کہا۔ پانچ کا ہے پانچ کا۔"

گاہک سمجھ کر بولا۔ تین کا ہوگا پانچ کا نہیں ہو سکتا

دکاندار نے غصے سے کہا "تین کا نہیں کانچ کا ہے۔"

فوزیہ ثمرٹ۔۔۔ گجرات

مشابہت

نوزائیدہ بچے کو دیکھنے کے لیے خاندان کے تمام افراد اکٹھے کھڑے تھے۔ کسی نے کہا یہ اپنی ماں جیسا ہے کوئی کہتا اس کا رنگ بالکل باپ جیسا ہے۔ کوئی بولا اس کی ناک اپنے نانا جیسی ہے۔ ایک چھوٹا بچہ یہ سب سن رہا تھا کہنے لگا۔

"امی! کاکے کے دانت تو بالکل دادا ابو کے دانتوں جیسے ہیں۔

صدف کنول۔۔۔ قصور

سرمائے میں اضافہ

ایک بچے نے معصومیت سے سوال کیا۔

"سر! کیا یہ بات درست ہے کہ بچے قوم کا سرمایہ ہیں اور ملک و ملت کا تابناک مستقبل ہیں۔"

"بالکل ٹھیک سنا ہے تم نے۔" سر نے جواب دیا۔

بچے نے معصومیت سے کہا۔

"سر! مگر حکومت اس سرمائے میں اضافے سے پریشان کیوں ہے؟"

نوشابہ۔۔۔ جہلم

پاس ورڈ

ایک آدمی اپنے دوست کی خبر لینے ہسپتال گیا' اس کی حالت انتہائی بری دیکھ کر بولا۔

"یار تمہارا ایکسیڈنٹ کیسے ہوا؟"

دوست نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"نہیں یار! بات یہ ہے کہ تیری بھابھی کو میرے فیس بک کا پاس ورڈ پتا چل گیا تھا۔ بس پھر جب ہوش آیا تو خود کو ہسپتال میں پایا۔"

حنا کرن۔۔۔ پتوکی

بے چارگی

ایک گھرانہ جو تنگ مکان میں رہتا تھا' ایک کشادہ مکان میں منتقل ہو گیا' ایک شخص نے اس مکان میں آنے والے بچے سے دریافت کیا۔

"تمہیں یہ مکان کیسا لگتا ہے؟"

بچے نے بتایا "مجھے یہ مکان بہت پسند ہے' میرا اپنا کمرہ ہے اور میری دونوں بہنوں کے بھی الگ الگ

کمرے ہیں۔" بچے نے یہ کہہ کر تھوڑا سا توقف کیا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔
"مگر بے چاری مما' انہیں اب بھی ڈیڈی کے کمرے میں سونا پڑتا ہے۔"

فردوس فہیم۔۔۔ کراچی

اسم شریف

ایک دیہاتی شہر میں ایک پارک میں سو رہا تھا کہ سپاہی نے جاکر اسے اٹھادیا اور بولا "تمہارا اسم شریف؟"
دیہاتی چپ رہا۔ سپاہی پھر بولا "تمہارا اسم شریف کیا ہے؟"
دیہاتی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔
"جناب اسم شریف تو مجھ کو یاد نہیں' اگر کہیں تو درود شریف سنا دیتا ہوں۔"

ارم طاہر۔۔۔ گجرات

ریس

سردار کے گھر چور آگیا۔ سردار نے دیکھا تو چور نے بھاگنا شروع کردیا سردار جی بھی جوش میں آکر اس کے پیچھے بھاگنے لگے۔ اور بھاگتے بھاگتے چور سے آگے نکل گئے اور پیچھے موڑ کر اونچی آواز میں بولے۔
"اک نے چوری اتوں سرداراں نال ریساں۔"

صبا خان۔۔۔ بھاولپور

تلاش گمشدہ

ایک دھوبی کا کھوتا گم ہوگیا وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا۔ آخر کار ایک درخت کے نیچے آکر بیٹھ گیا۔ اس درخت کے نیچے ایک لڑکا اور لڑکی بھی بیٹھے تھے۔
لڑکا لڑکی سے بڑی محبت سے بولا۔
"صنم تیری آنکھوں میں مجھے سارا جہان نظر آتا ہے۔"
دھوبی نے فوراً" کہا۔ دیکھو یار میرا کھوتا کہاں ہے۔"

آسیہ جاوید۔۔۔ علی پور چٹھہ

تیاری

لڑکی "پاپا نے کہا ہے کہ اس بار فیل ہوئی تو شادی کر دوں گا۔"
لڑکا "تو تم نے کتنی تیاری کی؟"
لڑکی "بس ولیمہ کا ڈریس رہ گیا ہے۔"

یہ عالم

ایک صاحب ٹرین میں بلا ٹکٹ سفر کر رہے تھے ٹکٹ چیکر جب بھی ان صاحب سے ٹکٹ کے متعلق پوچھنے کے لیے آگے بڑھتا وہ فوراً" نماز شروع کردیتے ' آخر ٹکٹ چیکر چھپ کر ان کے پیچھے کھڑا ہوگیا اور نماز ختم کرتے ہی ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ابھی ٹکٹ کے متعلق پوچھنے ہی لگا تھا کہ وہ صاحب بولے۔
"نیت ہزار رکعت نماز کی۔ اللہ اکبر۔۔۔"

ارم کمال۔۔۔ فیصل آباد

یک نہ شد

ایک ہیلتھ کلب میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی' کلب کے مالک باڈی بلڈر نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ "کیا آپ کے پاس 50 کلو کا ویٹ ہے؟"
باڈی بلڈر نے فوراً" کہا۔ "جی جناب ہے۔"
آواز آئی۔ "تو سوچ کیا رہے ہیں' اٹھا لیجیے!"
جواب سن کر باڈی بلڈر کو بے حد غصہ آیا' اس نے طیش میں آکر ٹیلیفون ایکسچینج سے اس کال کے بارے میں پوچھا۔ آپریٹر نے وجہ پوچھی تو باڈی بلڈر نے پورا واقعہ بیان کردیا۔
آپریٹر نے کہا۔ "ان باتوں کو کتنی دیر ہوگئی ہے۔"
"تقریباً" پانچ منٹ۔" باڈی بلڈر نے کہا۔
آپریٹر بولا۔ "بھائی صاحب! آپ تھک گئے ہوں گے لہٰذا ویٹ رکھ دیجیے۔"

(حنا فرحان۔۔۔ راجن پور)

مہوش ظہور مغل۔۔۔ گوپی پور

میں پہلی بار کرن میں شرکت کر رہی ہوں۔ 9 سال سے کرن پڑھ رہی ہوں۔ مجھے کسی کہانی نے مجبور نہیں کیا بس دل چاہا اور لکھ رہی ہوں۔ اصل میں کرن بہت لیٹ ملتا ہے۔ "گل کہسار" بہت ہی اچھی کہانی تھی بہت بہت ہی زیادہ پسند آئی۔ اتنی اچھی کے سالوں یاد رہنے والی۔ کرن کے ساتھ جو کتاب ملتی ہے اس وجہ سے کرن اور بھی خاص ہوجاتا ہے خاص طور پر جب کھانے یا کپڑوں کے بارے میں ہو۔ میرے پاس بہت زیادہ کتابیں ہیں۔ میرے خیال سے جیب خرچ کا سب سے بہترین مصرف کتاب خرید کر پڑھنا ہے۔ "من مورکھ" اچھا چل رہا ہے پر حازم کو کیوں مارا۔ حوریہ مجھے تو بہت مغرور لگتی ہے کوئی انسان اچھا ہے برا اس کا فیصلہ کرنے والے ہم کون ہوتے ہیں۔ آج کرن ملا تو فورا" "من مورکھ" اور مستقل سلسلے پڑھ کر خط لکھ دیا۔

میں نے "کرن کا دستر خوان" کے جوابات لکھے ہیں پلیز شائع کردیجیے گا۔ مجھے انعام کا بھی شوق نہیں۔ فاخرہ گل کے غم میں 'میں بھی برابر کی شریک ہوں۔

ج۔ پیاری مہوش! واقعی کتابیں بہت اچھی ساتھی ہوتی ہیں' آپ 9 سال سے کرن پڑھ رہی ہیں اور اب کرن میں خط لکھا یہ تو آپ نے اچھا نہیں کیا' مگر خوشی ہوئی اس بات پر کہ اب آپ تبصرہ کرتی رہیں گی۔ ان شاء اللہ "کرن کے دستر خوان" میں آپ کے جوابات بھی شامل ہوجائیں گے۔

ثمینہ اکرم۔۔۔ بہار کالونی لیاری۔۔۔ کراچی

کافی دنوں کے بعد کرن پر تبصرے کے ساتھ حاضر خدمت اور جب بھی میں نے "نامے میرے نام" میں خط لکھا ضرور شائع ہوا۔

کرن کا معیار بہتر سے بہترین ہو رہا ہے اور اب جب فشا محسن علی کا "بیلا" پڑھا اور مصباح علی سید کا ناول "مہجور نشیمن" پڑھ کر تو واقعی کرن کے پکے عاشق بن گئے ہیں سب اور اب تو نت نئے ناولوں نے قاری کو کرن سے باندھ دیا ہے۔ "کرن کا دستر خوان" نیا کارآمد سلسلہ ہے جس میں میری شرکت لازمی ہے' مگر یہ مستقل سلسلہ ہے تاکہ صرف رمضان کے لیے شروع کیا گیا ہے۔ نعمان اعجاز بہت باکمال اداکار ہیں اور میرے فیورٹ بھی۔ "مسکراتی کرنیں" اس مرتبہ اسود کو اتنی پسند آئیں کہ وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگیا۔ اس ماہ کی کرن کتاب بہت زبردست ہے۔ مومن صاحب نے ساری ریسپی پاس کردی ہیں اور کئی ایک تراکیب پر نشان بھی لگادیا ہے کہ امی جی رمضان میں یہ ضرور ضرور بنائیے گا۔ مدرز ڈے پر "ماں بننے کا احساس" شاہین رشید کی ایک اچھی کاوش ٹھہری۔ "من مورکھ کی بات" میں عباد گیلانی کے مرنے کے بعد یقینا" بابر کی زندگی چینج ہوجائے گی' حوریہ 'مشکل ہی ہے جو بابر کا کبھی اعتبار کرے۔ "راپنزل" میں جب سے نینا نے سمیع سے شادی کی ہے۔ مجھے کہانی میں الجھاؤ کی بنا پر کچھ سمجھ ہی نہیں آرہا۔ "مقابل ہے آئینہ" میں سوالات کی تبدیلی خوش گوار لگی۔ (اب فوزیہ ثمر خوش ہوجاؤ' کہ آپ کو ہی یہ سلسلہ دو کا پہاڑا لگا کرتا تھا۔) میرا خیال ہے کہ اب سب قارئین کو دوبارہ سے ایک بار پھر ان فنی سوالات کے جوابات کا موقع دینا چاہیے۔ (اسپیشلی مجھے....) "کرن کا دستر خوان" میں "کچن اور آپ" کے سوالات بہت دلچسپ ہیں' مگر ان کے جوابات سنجیدہ دینے ہیں کہ فنی ہیں...؟ مگر بہرحال یہ تبدیلی بہت اچھی لگی۔ میرے تو سب بچے کرن کے مختلف سلسلے بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ آپ کرن میں ہر ماہ ایک ایسا سلسلہ شروع کریں جس میں بیماری اور علاج کے بارے میں بتایا جائے جیسے کہ میگرین کا علاج اور احتیاط پر ضرور روشنی ڈالیں۔ بہت مہربانی ہوگی۔

ج۔ پیاری ثمینہ جی! شکریہ کی تو بات نہیں ہے آپ جب

جب ''نامے میرے نام'' میں شریک ہوں گئیں ہمیں خوشی ہوگی۔ سوالات کے جوابات سنجیدہ اور فنی دونوں ہوسکتے ہیں۔ آپ ''کچن اور آپ'' میں ضرور شریک ہوسکتی ہیں۔ کرن کی پسندیدگی پر بے حد شکریہ۔

حافظہ رملہ مشتاق..... حاصل پورہ

ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد پھر سے کاغذ قلم اٹھالیا ہے کیونکہ ہر ماہ تبصرہ نہ کروں تو کسی کمی کا احساس سا رہتا ہے۔

سب سے پہلے تمام کرن اسٹاف' رائٹرز' قارئین کو میری طرف سے رمضان المبارک کا مہینہ بہت مبارک ہو۔

کرن حسب معمول 15 کو ملا۔ ٹائٹل ورق ہمیشہ کی طرح اچھا لگا' ماڈل بے چاری کو دوپٹا لینے میں دقت ہو رہی ہے' آنکھیں خوب صورت ہیں۔ اداریہ پڑھا' حمد و نعت سے مستفید ہوئے۔ اس کے بعد یاد محمود ریاض ''تجھے روئے گا زمانہ'' بے شک بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ مرنے کے بعد لوگوں کے دلوں میں یادوں میں زندہ رہتے ہیں۔ ہماری پیاری رائٹر فاخرہ گل صاحبہ ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں بہت افسوس ہوا' لیکن یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ نظام قدرت یہی ہے۔

سلسلے وار ناول کو ''راپنزل'' کو نہ پاکر مایوسی ہوئی۔ ''من مورکھ'' ''آسیہ جی'' مجھے لگتا ناول اختتام کی طرف گامزن ہے یہ قسط بہت ہی اچھی رہی' لیکن عباد گیلانی کی موت پہ بہت افسوس کیا ایسا نہیں ہوسکتا تھا کہ مومنہ دو منٹ پہلے پہنچ جاتی اور وہ کیا بات تھی جو انہوں نے بابر سے کہنی تھی ویسے بات تو حوریہ کے متعلق ہی ہوگی۔ ''مکمل ناول'' ''مہجور نشیمن'' مصباح علی سید ٹاپ آف دی لسٹ ہی رہیں گی مکمل ہونے پر زبردست تبصرہ کروں گی ''بہت بیسٹ ناول بہت'' ''بشریٰ ماہا'' لگتا ہے کافی دیر بعد آئی ہیں اور آتے ہی چھا گئی ہیں۔ آخر میں غزل بہت زبردست اور اوپر سے احمد کے پڑھنے کا انداز ''ویلڈن'' ''حاصل زیست'' ابھی پڑھی نہیں۔ نادیہ جی سوری۔ ناولٹ میں ''ام ایمان قاضی'' کا ناولٹ پڑھا۔ زبردست رہا بے شک زمین پر خدا بننے والوں کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارا اصل حقیقی خدا تو اوپر بیٹھا ہے کہ ہماری ڈور اس کے ہاتھ میں ہے۔ ''مدرز ڈے'' میں ماؤں کے احساسات پڑھ کر بہت اچھا لگا خاص طور نازلی نصر نے بہت اچھی بات کہی اگر کوئی سمجھے تو۔ ''بیلا'' پورا ہونے پر تبصرہ کروں گی۔ افسانہ کوئی نہیں پڑھ سکی۔ باقی رسالہ پورا پڑھ لیا' ''مقابل ہے آئینہ'' میں سدرہ بتول کے جوابات پڑھ کر مزا آیا۔ خاص طور پر جب کتا پیچھے لگ جائے آپ کی چیخ اور میری چیخ کتنی ملتی جلتی ہے۔

ج:۔ پیاری رملہ! آپ میں سے جب بھی کوئی غیر حاضر ہوتی ہیں تو ہم کو بھی آپ لوگوں کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

طاہرہ ملک..... جلالپور پیروالا

آپ نے تو شاک پہنچایا ہے اس بار جیسے ہی کرن ہاتھوں میں آیا تو سب سے پہلے ''نامے میرے نام'' میں خود کو دیکھا تو نہ پاکر مجھے یقین ہی نہیں آیا کئی بار چیک کیا مجھے لگا مجھے دیکھنے میں غلطی ہوئی ہے کہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے میرا خط شائع نہ ہو اب کیا کہیں ہوگی کوئی وجہ۔

کرن اس بار لاجواب تھا ماں بننے کا احساس ''شاہین رشید'' کا سروے بہت اچھا رہا۔ نعمان اعجاز' مایا علی اور سدرہ بتول سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ''من مورکھ کی بات نہ مانو'' حوریہ کے لیے ہر بار افسوس ہوتا ہے۔ عباد گیلانی جو اس کے لیے سایہ دار درخت کی طرح تھے وہ داغ مفارقت دے گئے بابر گیلانی لگتا ہے اب سدھر جائے گا اور فضا کو بھی صبر آہی گیا۔ ''راپنزل'' کی کمی اس بار بہت محسوس ہوئی۔ ''ٹک ٹک ٹک'' انسان کی شخصیت میں جو کمی رہ جاتی ہے وہ اس کے ماحول کی بدولت ہوتی ہے یمنٰی رضا نے فازکی محبت کو سند قبولیت بخش ہی دی ''سنو مان جاؤ'' ''ام ایمان قاضی'' کا ناولٹ بہت دلچسپ رہا پتا نہیں زمین' جائیداد کی خاطر کب تک لڑکیوں کی قربانیاں ہوتی رہیں گی۔ ''مہجور نشیمن'' ازمیر اور مریم کو روائیہ کو ساتھ لے کے آنا چاہیے تھا۔ ''پرکھ'' صحیح کہا ہر چیز کی صحیح طریقے سے جانچ پرکھ کرنے والے بھی کبھی نہ کبھی دھوکا کھا ہی جاتے ہیں۔ ''مس بیل'' سنڈری تو بڑی تیز نکلی الٹرا ماڈرن گھرانے سے ہونے کے باوجود ماسی جیسے حلیے میں رہنا' کام کرنا اور اکیلے رہنا بھی ہمیں تو کچھ سمجھ نہ آیا۔ ''حاصل زیست'' نادیہ احمد ہم آپ سے ہنڈرڈ پرسینٹ agree کرتے ہیں کہ اولاد کے معاملے میں اس طرح کی لاپروائی ماؤں کو نہیں کرنی چاہیے عائدہ کا دکھ اپنے دل میں اترتا محسوس کیا۔ ''اہل کی کہانی'' ''تو تقریبا'' ہر گھر کی کہانی ہوگی بیویاں بے چاری گھر' بچے' سسرال' شوہر سنبھالتے سنبھالتے گھن چکر بن جاتی ہیں اور شوہروں کی قوم یہ سمجھتی ہے کہ گھر کا کام

ہوتا ہی کتنا ہے اور اگر خود سنبھالنا پڑے تو پورا تو دور کی بات اس کا آدھا ہی نہ سنبھال سکیں۔ "وقت وقت کی بات" میں تو پڑھ پڑھ کے حیران ہوتی ہوں کہ یہ ساس اتنی ظالم کیوں ہوتی ہیں اور اتنے ظلم کر کیسے لیتی ہے چلیں اچھا ہوا فضیلہ اچھی ساس بن گئی اور بہو بھی اچھی رہی۔ "چلو نئی شروعات کرتے ہیں" بہت ہی کمال کا ناول تھا شبینہ کے لیے اتنا دکھ ہوا کہ بتایا ہی نہیں جاسکتا۔ کرن کے سلسلے ہمیشہ کی طرح لاجواب تھے اور کرن کتاب میں بیوٹی اور کچن کے حوالے سے اور کرن میں آپ کا "پیغام سہیلیوں کے نام" شروع کر کے کرن کو مکمل کر دیا بہت خوشی ہوئی پلیز اس بار میرا خط ضرور شامل کرنا ہے پچھلی بار 5 ماہ کے بعد انٹری دی وہ بھی نہیں ہوسکی۔

ج۔ پیاری طاہرہ! ہمیں بے حد افسوس کہ پچھلے ماہ آپ کا خط شامل نہ ہوسکا۔ آپ کا کہانیوں پر بھرپور تبصرہ پسند آیا۔

ثنا شہزاد...... کراچی

کرن کی محفل میں ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد حاضر ہو رہی ہوں۔ پچھلے ماہ آپ کو میں "نامے میرے نام" میں نظر نہیں آئی ہوں گی وجہ یہ ہے کہ میری جان سے پیاری بہنوں جیسی دوست نوشین کے امی ابو کی ڈیتھ ہوگئی۔ ایک مہینے کے آگے پیچھے سے اپریل میں امی کا ہوا اور مئی میں ابو کا ہوگیا انتقال۔ وہ میرے لیے بھی بالکل سگے امی ابو جی تھے۔ آپ سب سے درخواست ہے ان دونوں کی مغفرت کی دعا کیجئے گا۔ اب آتے ہیں تبصرے کی طرف سرورق بہت پیارا لگا۔ اداریہ پڑھا محمود ریاض صاحب کے لیے دعائے مغفرت کی ان کی بدولت ہمیں اتنا اچھا کرن ملا۔ صدف آصف نے ان کے بارے میں بہت اچھا لکھا۔ "حمد و نعت" تو تھے ہی اپنی مثال آپ۔ ماں کے حوالے سے سروے میں سب کے جواب پسند آئے۔ "مقابل ہے آئینہ" میں سدرہ بتول سے ملنا اچھا لگا کرن کی یہی بات مجھے اچھی لگتی ہے کہ یہ اپنے قارئین کے لیے نئے نئے سلسلے شروع کرتا رہتا ہے۔ "دوستوں کے نام پیغام والا سلسلہ بھی بہت ہٹ جائے گا کرن کتاب بہت زیادہ پسند آئی مجھے بھی اس میں شامل ہونا ہے جوابات بھیج دوں ایک بات اور کہنا چاہوں گی کرن کا معیار وقت کے ساتھ ساتھ بہتر سے بہترین ہوتا جارہا ہے۔ ماشاء اللہ۔ اللہ پاک کرن کو ہمیشہ ایسے ہی درخشاں اور تابندہ رکھیں۔ آمین۔ افسانے اس بار چار تھے بشریٰ احمد کا "پرکھ" بہت اچھا لگا "امل کی کہانی" ماریہ یاسر نے بھی اچھی لکھی "وقت وقت کی بات" بھی اچھی تھی۔ "ٹک ٹک ٹک" میں آخر ثمرہ کو فائز مل ہی گیا۔ تنزیلہ جی کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ "من مورکھ کی بات نہ مانو" میں عباد گیلانی کو کہانی سے ہٹا دیا۔ بابر سدھر گیا حوریہ کی خاطر اچھا لگ رہا ہے۔ فضا اور نصیر کی کہانی اچھی ہوگئی ہے۔ "بیلا" ابھی تک نہیں پڑھا جلدی سے اینڈ کریں پھر ایک ساتھ پڑھ کر تبصرہ کروں گی۔ "مصباح علی" کا بہت منفرد لگا۔ امید ہے ان کی یہ اسٹوری بھی بیسٹ ہوگی۔ "مس بیل" ہنسی سے بھرپور ناولٹ ہونٹوں پر ہنسی لے آیا۔ "سنو مان جاؤ" اور "نئی شروعات" بھی اچھا لکھا ویل ڈن۔ اس ماہ کی جو سب سے اچھی کہانی تھی وہ نادیہ احمد کی "حاصل زیست" تھی۔ نوریا نے اپنی بچی کو ماں کے ساتھ بھیج کر غلطی کی جس کا خمیازہ بیٹی کے ساتھ ہوئے حادثے کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ "کچھ موتی چنے ہیں" میں سب کا انتخاب اچھا لگا۔

ج۔ پیاری ثنا! آپ کی دوست کے والدین کی وفات کا بہت افسوس ہوا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ ثنا آپ "کچن اور آپ" میں شامل ہونا چاہتی ہیں تو ضرور ہوں اور اچھے جوابات لکھ کر بھیج دیں۔ "آپ کا پیغام دوستوں کے نام" میں آپ بہنیں اپنے پیارے پیارے پیغامات بھیجیں تو یہ سلسلہ بھی ہٹ ہو جائے گا۔

عائش جنجوعہ...... تونسہ شریف

مئی کا شمارہ معمول کے مطابق ملا حمد و نعت کے بعد "نامے میرے نام" میں پہنچے اپنا خط نہ پاکر چند سیکنڈ سوگ منایا حالانکہ بروقت پوسٹ کروایا تھا۔ پلیز کچھ صفحات بڑھا دیجیے۔ "من مورکھ کی بات نہ مانو" اس بار پھر دکھی تھا۔ "راپنزل" پھر غائب بھئی یہ ظلم ہے ہمارے ساتھ.... "مہجور نشین" نام بھی اور ناول بھی دونوں زبردست ہیں۔ روائیبہ اور مسٹر اینڈ مسز از میر کا مزاحیہ طرز تخاطب اچھا لگا۔ "پرکھ" پڑھ کر بہت دکھ ہوا سعد اور اس کی ماں پر "وقت وقت کی بات" اچھی کہانی تھی۔ مس بیل، حاصل زیست، سنو مان جاؤ، نئی شروعات کرتے ہیں پرانے موضوع تھے لیکن بہت اچھے تھے۔ "بیلا" طویل ہوتا جارہا ہے اس مرتبہ شعر اور غزلیں سب ہی اچھے تھے اور موتی بھی سارے ہی قیمتی تھے۔ فوزیہ ثمرہٹ کا زیادہ مزاحیہ اور

اچھا لگا۔

ج۔ پیاری عابش! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا پچھلا خط شامل نہ ہوسکا۔ کرن کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔

اقراجٹ۔۔۔ منچن آباد

میں فرسٹ ٹائم شرکت کر رہی ہوں (میں نے سنا ہے آپ کے پاس ردی کی ٹوکری نامی کوئی بلا نہیں تو یقین جانیے بہت خوشی ہوئی (ہاہاہا) سرورق زبردست لگا۔ "کرن کا دستر خوان" یہ تبدیلی مجھے ہی نہیں بلکہ آئی ہوپ ہر خواتین کو بہت زبردست لگی۔ انعامی سلسلے میں ہم بھی شامل ہوئے ہیں دیکھتے ہیں کیا بنتا ہے؟ "حمد و نعت" سے دل کو مستفید کیا۔ "بیاد محمود ریاض" اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے (آمین) "نعمان اعجاز سے ملاقات" ٹھیک ٹھاک رہی۔ "میری بھی سنیے"۔ میں مایا علی کا انٹرویو بیسٹ رہا۔ "مقابل ہے آئینہ" ٹھیک ٹھاک جواب ملے ہوئے تھے۔ ناول "راپنزل" قسط غائب تھی دکھ ہوا" "من مورکھ کی بات" بہت اچھا جارہا ہے۔ بابر آگہی کی طرف لوٹ آیا ہے عباد گیلانی کو مرنا نہیں چاہیے تھا ابھی! "مجھور نشیمن" مصباح علی سید ویلڈن بہت اچھا لکھ رہی ہیں آپ! روائیبہ بھی آجاتی پاکستان تو اچھا ہوتا! کچھ سسپنس سا لگ رہا ہے۔ جس طرح مریم ڈر رہی ہے خیر نیکسٹ قسط تک ویٹ کرتے ہیں۔ "نئی شروعات" بشریٰ ماہا بہت اچھا سبق دیا ہے' جاہلانہ نضولانہ یہ رسمیں آج بھی ہمارے ماحول میں شامل ہیں زبردست موضوع پر لکھا آپ نے! ناولٹ میں "بیلا" منشا محسن علی بھی نائس جارہی ہے بیلا کا کردار مضبوط پیش کیا گیا ہے اور یہ کیا فاروق احمد کی ڈیتھ ہوگئی کچھ اچھا نہیں لگا "مس بیل" ہاہاہا وفی سیما بنت عاصم ہلکی پھلکی تحریر میں ایک پیارا سا پیغام لوگوں کی نظر کیا! "سنو امان جاؤ" ام ایمان قاضی ہر دفعہ کی طرح آپ چھائی ہی رہیں! برائی کا جواب ہمیشہ اچھائی سے دینا چاہیے۔ مہرنے آئی تھنک باپ کی لاج رکھتے ہوئے رائٹ فیصلہ کیا تھا۔ افسانے چاروں سپر ڈوپر تھے "امل کی کہانی" ہاہاہا (جب ہم اس دور میں جائیں گے ہم بھی یہی طریقہ اپنائیں گے ہی ہی ہی)۔ باقی تمام سلسلے لاجواب تھے۔

ج۔ پیاری اقراجٹ! آپ نے پہلی مرتبہ تبصرہ کیا اور بہت خوب کیا۔ آئندہ بھی اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیے گا۔

ثمر کاظمی۔۔۔ درابن کلاں ڈیرہ اسماعیل خان

ہمیں رسالہ اتنا لیٹ کیوں ملتا ہے مطلب آدھا مہینہ گزر جاتا ہے پھر کرن ہمارے ہاتھوں تک آتا ہے۔ آپ یقین کریں ہمیں بہت تکلیف اٹھانی پڑتی ہے گرمیوں کے موسم میں دوپہر کو ٹاہلی تلے چارپائی ڈال کر کرن پڑھنے کا اپنا ہی مزا ہے ٹائٹل بہترین تھا دوپٹا اوڑھے ماڈل بہت خوب صورت لگ رہی تھی نعمان اعجاز اور مایا علی سے ملاقات اچھی رہی۔ "مقابل ہے آئینہ" میں مجھے بھی شرکت کرنی ہے اس کے لیے سوالات بھی صفحے پر تحریر کرنے ہوں گے کیا؟ کہانیوں میں "راپنزل" کو غائب پاکر بہت مایوسی ہوئی لیکن اس کی کمی "بیلا" نے پوری کردی گاؤں میں رہنے والی بیلا مجھے اپنی اپنی سی لگتی ہے منعم علی اب بیلا پر محبت کا جال پھینکنے والا ہے مجھے روبی اور میڈیم کے مزاحیہ کردار بہت ہی پسند ہیں منشا محسن علی بہت اچھا لکھ رہی ہیں فیریا اور ڈیرک ایک دوسرے کے ہیں یہ اندازہ ہے میرا۔ "من مورکھ کی بات نہ مانو" آسیہ جی نے گویا ہمیں رلانے کا ارادہ پکا کر رکھا ہے حازم کے بعد اب عباد گیلانی۔۔۔ حوریہ بے چاری تو مرجائے گی اور بابر کو قطعاً" حوریہ کے ساتھ نہ جوڑیں ایک آنکھ نہیں بھاتا مجھے۔۔۔ مصباح علی اچھا لکھ رہی ہیں لیکن میں ان کا ناول ختم ہونے کے بعد تبصرہ کروں گی نادیہ احمد کا ناول پسند نہیں آیا افسانوں میں امل کی کہانی بازی لے گیا۔

ج۔ پیاری ثمر۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو کرن تاخیر سے ملتا ہے۔ آپ کی تکلیف کا احساس ہے ہمیں۔ آپ "مقابل ہے آئینہ" میں ضرور شرکت کرسکتی ہیں۔ جوابات کے ساتھ سوالات بھی پر کریں تو اچھی بات ہے۔ آپ کرن کے جس سلسلے میں چاہیے شرکت کرسکتی ہیں یہ سلسلے آپ بہنوں کے لیے ہی تو ہیں۔

خوشی۔۔۔ سرانوالی (سیالکوٹ)

پہلی بار کسی شمارے میں خط لکھ رہی ہوں۔ عرصہ تیرہ سال سے کرن کی باضابطہ قاری ہو۔ دراصل ڈائجسٹ پڑھنے کا شوق تو شروع سے ہے لیکن شادی سے پہلے بھائیوں سے چھپ چھپا کر پڑھے جاتے تھے تیرہ سال پہلے شادی کے بعد ہزبینڈ نے باقاعدہ لانا شروع کردیے۔ میں گھر پر ہی لڑکیوں کو پڑھاتی ہوں پہلے شمارہ آتے ہی خود پڑھتی ہوں پھر سب لڑکیاں باری باری لے جاتی ہیں۔

آج جس سلسلے نے قلم اٹھانے پر اکسایا وہ ہے "کرن کا دسترخوان"۔ ہے میں اس میں شرکت کرنا چاہتی ہوں۔

ج ۔ پیاری خوشی! ارے یہ کیا بات آپ نے سوچی کہ گاؤں میں رہنے والی بہنوں کے خطوط شائع نہیں ہوتے۔ پیاری بہن گاؤں۔ دیہات شہر یا ملک سے باہر سے بھی جو بہن خط بھیجنا چاہے بھیجے اور وہ خطوط شائع بھی ہوتے ہیں اور آپ آئندہ بھی خط لکھنا مگر کہانیوں پر اپنی رائے کا اظہار بھی کیجئے گا اور آپ "کچن اور آپ" میں ضرور شریک ہو سکتی ہیں۔

ہاجرہ اجمل...... لاہور

بہت عرصے سے آپ کی محفل میں شرکت کرنے کو دل چاہتا تھا۔ لیکن یہ کاروبار زندگی اس وضع سے متحرک رکھتا ہے کہ وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلتا۔ اور بہت سے افسوس میں یہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ کہ کاش ہم بھی شرکت کر پاتے، جس طرح رائٹرز اور ایڈیٹرز کی شبانہ روز محنت سے اتنا خوب صورت شمارہ نکل کر سامنے آتا ہے۔ بے ساختہ واہ کا درجہ پا جاتا ہے۔

اب آتی ہوں مئی کے شمارے کی جانب۔ تو جناب ہاتھ میں پکڑتے ہی نگاہوں نے اپنی پسندیدہ مصنفات کے دست قلم پر بے تابی دکھائی جہاں تنزیلہ صاحبہ کے "راپنزل" کی غیر موجودگی نے دل مسمار کیا۔ وہاں مصباح صاحبہ نے دل مٹھی میں بھر لیا۔ کسی خوب صورتی سے وہ تین مختلف کلچر کو قلم میں سمو رہی ہیں' دل بے ساختہ ان کی تعریف کے لیے دھڑکتا ہے' میں تو جنبل ذکاء کو ہی ہیرو سمجھتی رہی۔ یہاں تو از میر کا قصہ چھڑ گیا۔ ان کا جملہ جو بے حد پسند آیا۔ "ٹوٹے گھر کی عورت اس خوب صورت ٹوٹے برتن کی مانند ہے۔ جسے پھینکنے کو دل نہیں کرتا اور وہ استعمال کے قابل بھی نہیں رہتا۔" واہ کیا کہنے جناب کے۔ مجھ جیسی مصروف کو بھی خط لکھنے پر مجبور کر دیا۔ اللہ زور قلم کرے اور زیادہ......

"من مورکھ" آسیہ مرزا کا اچھا ہے۔ لیکن وہ جس طویل عرصہ دراز بعد آئیں۔ ویسا موسم نہیں لائیں۔ بہر حال بابر کا بدل جانا مجھے بے حد پسند آیا۔ اللہ جب چاہے جس کو چاہے ہدایت دے سکتا ہے۔ اور پھر ایک بیوہ کے لیے نرم گوشہ رکھنا' اس کے لیے حفاظت کا بندوبست کرنا قابل تعریف عمل ہے۔

ناولٹ میں منشاء محسن کے "بیلا" نے بہت اپنی طرف کھینچا' ہنستا مسکراتا' ہلکا پھلکا سا موضوع' مجھے' اس میں یقین کریں منعم پسند آیا۔

"حاصل زیست" بھی اچھا لگا "سنومان جاؤ" بہتر تھا۔ افسانے بس یوں ہی تھے۔ البتہ ماریہ یاسر کا "اہل کی کہانی" بازی لے گیا۔ مستقل سلسلے "ماں بننے کا احساس" سروے بہت اچھا لگا۔

ج ۔ پیاری ہاجرہ! بہت اچھا لگا کہ آپ نے کرن میں شرکت کی اور ہماری یہی خواہش ہے کہ آپ اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے وقت نکال کر کرن کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیں کیونکہ آپ بہنوں کی آراء سے ہی ہم کرن کو بہتر سے بہترین بنا سکتے ہیں۔

ماریہ طفیل...... تلمبہ

ایک ماہ کے بعد حاضر ہو رہی ہوں۔ لاسٹ ماہ اس لیے شرکت نہیں کر سکی ایک تو میرے پیپرز تھے دوسرے اس ماہ کے لاسٹ میں میرے کزن کی ڈیتھ ہو گئی تھی اس کا بہت غم تھا۔ تمام قارئین سے التجا ہے وہ میرے کزن کے لیے دعائے مغفرت کرے اور اس کی والدہ (یعنی میری ممانی) کے لیے صبر جمیل کی دعا کریں۔ اس ماہ کا کرن ہمیشہ کی طرح بیسٹ رہا۔ "من مورکھ کی بات نہ مانو" بہت بیسٹ جا رہا ہے اس میں بابر چینج ہو رہا ہے اور مکمل ناول میں "مہجور نشیمن" کی مجھے کوئی اتنی خاص سمجھ نہیں آ رہی خیر اگلی قسطوں میں آجائے گی "نئی شروعات" بہت زبردست تھی ایسی اسٹوریز مجھے بہت اٹریکٹ کرتی ہیں ناولٹ میں "بیلا" بھی اچھی جا رہی ہے "مس بیل" بہت انٹرسٹنگ لگی۔ باقی تمام افسانے بہت اچھے تھے "تجھے روئے گا زمانہ برسوں" پڑھ کر بہت اچھا لگا اور غم تازہ ہو گیا۔ باقی نعمان اعجاز سے ملاقات پڑھ کر مزا آیا میرا بہت دل کرتا ہے کہ میں "مقابل ہے آئینہ" میں شرکت کروں لیکن میں جانتی نہیں کہ کیسے شرکت کرنی ہے کیا آپ میری رہنمائی کر سکتی ہیں۔

ج ۔ پیاری ماریہ! آپ کے کزن کا بہت افسوس ہوا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور آپ سب کو صبر عطا فرمائے۔ ہماری دعا ہے آپ امتحان میں بہت اچھے نمبروں سے کامیاب ہو "مقابل آئینہ" کے سوالات کے جوابات تحریر کریں اور ہمیں بھیج دیں جیسے یہ خط بھیجا ہے۔

عظمیٰ شفیق۔۔۔ جڑانوالہ

میں پہلی بار کرن میں خط لکھ رہی ہوں کرن پڑھتے ہوئے ایک سال ہوا ہے کرن بھی معیاری ڈائجسٹ ہے۔ اب کچھ تبصرہ بھی کردیتی ہوں' تو جناب ٹائٹل گرل کی آنکھیں بہت خوب صورت لگیں۔ سب سے پہلے "مہجور نشیمن" پڑھا اس قدر کمال لکھا مصباح علی نے کہ نظر نہ ہٹی رسالے سے "ویڈنگ" "حاصل زیست" بھی بہت منفرد کہانی لگی اور شاندار رہا عذیر کا کردار بہت اچھا لگا۔ "مس بیل" زبردست سندری کے پنجابی بول مزا دے گئے اور ڈائجسٹ ہیرو کی ٹنڈ ہائے ہیرو بے چارے کی خوب صورتی خراب کرڈالی۔ ام ایمان کی تحریر خاص نہ لگی۔ اور "نئی شروعات" نے بھی امپریس نہیں کیا۔ افسانے سارے اچھے تھے۔ "اہل کی کہانی" میں اہل نے بالکل ٹھیک حربہ اپنایا۔ شوہر کے لیے۔ نعمان اعجاز سے ملاقات مختصر تھی پر اچھی تھی۔ "مسکراتی کرنیں" میں ارم طاہر نے بہت ہنسایا۔ "مقابل ہے آئینہ" بہت خوب سوالات تبدیل ہوئے۔ فوزیہ ثمریٹ کی غزل اچھی لگی۔ حال ہی میں ڈرامہ "پیا بے دردی" ختم ہوا ہے اس ڈرامے کے ہیرو عمیر رانا کا انٹرویو لیں پلیز۔

ج۔ پیاری عظمیٰ! کرن کی پسندیدگی کا شکریہ۔ امید ہے اب آپ کرن میں شریک ہوتی رہیں گی۔ آپ کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچادی جائے گی۔

عمارہ نثار۔۔۔ ڈونگہ بونگہ

کرن کا مطلب روشنی ہے واقعی ہی کرن ضوفشاں بن کر لوگوں کے قلب و جان پر اپنی تمام تر رونقیں لیے روشنی ڈال رہا ہے۔ اللہ پاک اس ادارے کو تاقیامت یوں ہی قائم و دائم رکھے۔ کرن جیسا جریدہ جو آپ کی توسط سے 15 تاریخ کو ہمیں ملتا ہے کسی درسگاہ سے کم نہیں ہے پورا رسالہ اپنی مثال آپ ہے۔ میں اپنے عمیر بھائی کی شادی کا احوال لکھنا چاہتی ہوں کیا آپ لوگ کرن میں اسے شائع کرکے مشکور ہونے کا موقع عطا فرمائیں گی؟ پہلی دفعہ کرن میں لکھنے کی جسارت کی ہے امید واثق ہے آپ سب لوگ پذیرائی ضرور فرمائیں گی۔

ج۔ پیاری عمارہ! کرن کی پسندیدگی کا شکریہ۔ ہمیں امید ہے کہ آپ آئندہ کہانیوں پر تبصرے کے ساتھ شامل ہوں گئیں اور آپ اپنے بھائی کی شادی کا احوال بھیجیں ضرور شائع کیا جائے گا۔ اگر شادی کی تصویر بھی بھیجنا چاہیے تو ضرور بھیج سکتی ہیں۔

سائرہ راؤ۔۔۔ دنیاپور

کرن مجھے بہت اچھا لگتا ہے' میں اس کا باقاعدہ مطالعہ تو نہیں کرپاتی مگر جب بھی موقع ملتا ہے ضرور پڑھتی ہوں۔ اس بار مئی کا ڈائجسٹ ایک دوست کے گھر سے لے آئی اور پڑھنے بیٹھی تو مزا آگیا۔ اب میں نے بھی اپنے بھائی سے کہہ دیا ہے کہ مجھے ہرماہ کرن لاکر دیا کریں۔ اب آتے ہیں مئی کے تبصرے کی طرف۔ انٹرویو میں نعمان اعجاز سے ملاقات کرنا اچھا لگا۔ مایا علی۔۔۔ "میری بھی سنیے" اچھا لگا۔ "مقابل آئینہ" مزے کا لگا۔

بیاد محمود ریاض "تجھے روئے گا زمانہ برسوں" صدف آصف نے اتنے اچھے انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کیا کہ میری آنکھیں بھی نم ہوگئیں۔ سلسلہ وار ناول شروع سے نہیں پڑھے تو رائے دینا مشکل ہے۔ بشریٰ ماہا کا ناول "نئی شروعات" اچھا لگا مگر نادیہ احمد کا "حاصل زیست" کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ مصباح علی سے معذرت کہ ابھی پڑھا نہیں۔ ناولٹ میں ام ایمان قاضی کا "سنو مان جاوا" اور سیما بنت عاصم کا "مس بیل" اچھے تھے۔ افسانے تو سارے ہی پسند آئے۔ باقی کے سلسلے بھی اچھے تھے خاص طور پر شاعری غضب کی تھی۔

ج۔ پیاری سائرہ! کرن کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ آپ اب ہرماہ کرن پڑھا کریں گی تو پھر ہرماہ اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

انوش ابصار۔۔۔ قائداعظم یونیورسٹی۔ اسلام آباد

ہم ہوسٹل کی اسٹوڈنٹس کیا کریں۔ ایک تو گھروں سے دور اور پر سے رسالے بہت مشکل سے منگواتے ہیں۔ اپنے کلاس فیلوز کی منتیں کرکے پھر پڑھائی سے وقت نکال کر انہیں پڑھنا۔ ہمارا بھی دل کرتا ہے ہم بھی کہانیوں پر رائے دیں جو رسالے میں جگہ بھی پائے۔

اس ماہ کا رسالہ بہت بہت پسند آیا' پہلے تو ہلکے پھلکے ٹائٹل نے دل موہ لیا' پھر بیاد محمود ریاض نے کچھ دکھی کیا' کتنی پیاری شخصیت بہت جلد دنیا سے منہ موڑ گئی۔ صدف آصف نے بہت ہی پیارے جملوں میں ترجمانی کی۔ ان کا پچھلے ماہ "جھنا" افسانہ بھی بہت پسند آیا تھا۔ صدف

آصف ناولز کے بجائے افسانے زیادہ خوب صورت لکھتی ہیں۔ "سنو مان جاؤ" "سو سو لگی" "بیلا" منشا محسن کی بہت اچھی جارہی ہے۔ بس کہیں کہیں مزاح پیدا کرنے کے لیے رائٹر اوور ایکٹنگ کا شکار لگنے لگتی ہیں۔ "مہجور نشیمن" مصباح کسی تعریف کی محتاج نہیں پہلی قسط سے ہی حنبل نے دل اپنی گرفت میں لے لیا ہے آگے کیا ہوگا شدت سے انتظار۔ افسانے سارے اچھے تھے پڑھ کے مزا آیا۔ پلیز عید نمبر میں کوئی جان دار سی مزے کی کہانی ہونی چاہیے۔

ج ۔ پیاری انوش! آپ کا تبصرہ لگادیا گیا خوش، بس آپ تمام اسٹوڈنٹس سے ایک درخواست ہے کہ پہلے پڑھائی پھر رسالے۔

شانزہ سلطان..... کے ای

پہلے نارنجی سرورق پر ہمارا دل بھی پھسل گیا فوراً "لسٹ دیکھی اور صفحہ نمبر چیک کرتے ہی اپنا فیورٹ "مہجور نشیمن" مصباح علی پر دوڑ لگائی، یہ بھی شکر اس مراتھن ریس میں حنبل زکا سے ٹکرکھا کر گر نہیں پڑی۔
آپی ایک بات پوچھنی تھی میں نے مصباح کو کئی بار کنگ ایڈورڈ میڈیکل یونیورسٹی میں دیکھا ہے گرے بلیک گاؤن پہنے۔ لمبی اسمارٹ سی۔ تھرڈ ایئر کلاس میں۔ کئی لڑکیوں نے بتایا ہے کہ یہ وہی اکسیر جاوداں والی مصباح ہیں مگر کبھی ان سے بات کرنے کی مجھے ہمت نہیں ہوئی۔ ان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ سیما بنت عاصم کا ناولٹ بہت اچھا لگا۔ ہنسا ہنسا کے مار دیا ظالم نے۔ ہم مشکل اسٹڈی کرنے والوں کو جب کوئی ایسی چیز مل جائے ساری ٹینشن اتر جاتی ہے۔ شاباش۔ افسانے بھی مزے کے تھے اچھے لگے۔ خاص کر شازیہ ستار کا "وقت وقت کی بات" بہت خوبصورتی سے لکھا۔

ج ۔ پیاری شائزہ! آپ کے ساتھ جو مصباح پڑھتی ہیں وہ مصباح علی سید نہیں ہیں کیونکہ مصباح علی سید رائٹر ہاؤس وائف ہیں۔

ارم بشیر..... اسلام آباد

اس بار پورے تین یا شاید چار مہینے کی غیر حاضری کے بعد دوبارہ خط لکھ رہی ہوں دراصل میرے ساتھ ایک بڑی ٹریجڈی ہوگئی ہے میں اسلام آباد میں جاب کر رہی تھی تو وہاں بک شاپ اور پوسٹ آفس بالکل پاس ہی تھے تو آسانی تھی بہت۔ اب میری جاب چھوٹ گئی تو ڈائجسٹ لینے اور پوسٹ کرنے میں مشکل ہونے لگی ہے۔ خیر پچھلے سارے ماہ کے شمارے بہت اچھے تھے اس ماہ کا ٹائٹل کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ شکریہ کہ آپ نے نعمان اعجاز کا انٹرویو لیا۔ سدرہ اور مایا کا انٹرویو پڑھ کر بھی اچھا لگا اب بات ہوجائے "من مورکھ" کی بھئی اس دفعہ کی قسط تو بہت ڈپریسو تھی اب عباد گیلانی کو بھی ماردیا آسیہ نے مومنہ کی کیفیت پڑھ کر مجھے تو بہت ڈپریشن ہورہی تھی۔ "مہجور نشیمن" مجھے اس ناول کا نام بہت پسند آیا کیا آپ مجھے اس کا مطلب بتادیں گیں باقی کہانی ابھی تو اسٹارٹ ہوئی ہے اس لیے کھل کر کوئی تبصرہ نہیں کرسکتے کافی پھیلے ہوئے کردار ہیں۔ یہ ناول اور مجھے اس طرح کی کہانیاں بہت پسند ہیں جس میں زیادہ سے کردار ہوں البتہ ایک شکایت ہے مصباح سے مانا کہ ہماری رائٹرز بہت مختلف قسم کے نام متعارف کرواتی ہیں لیکن جندب اور حنبل نام مجھے کچھ پسند نہیں آئے لیکن اسٹوری اچھی لگ رہی ہے۔ "حاصل زیست" بہت اچھی لگی "اصل کی کہانی" ماریہ یاسر نے بھی بہت اچھا لگا "نئی شروعات کرتے ہیں" کو پڑھ کر کچھ کمی سی لگی۔ کچھ باقی تمام افسانے اور ناولٹ بھی اچھے تھے "مس بیل" کے بارے میں مجھے سمجھ نہیں آرہی کیا رائے دوں کبھی کچھ سین تو مجھے بہت دلچسپ لگے کچھ کو پڑھ کر ایسے لگا ایسے ہی بونگی ماری ہے لیکن اور آل رائٹر نے جو میسج دینا چاہا وہ بہت اچھا تھا۔ فاخرہ گل کی والدہ کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔

ج ۔ پیاری ارم! بہت افسوس ہوا آپ کی جاب کا پڑھ کر ان شاءاللہ دوسری جاب مل جائے گی۔ "مہجور نشیمن" کے لفظی معنی فراق زدہ مسکن۔ ویسے ٹھکانوں سے دور دربدر بھٹکتے۔ علامہ اقبال کا شعر ہے۔

شوق پرواز میں ہوئے مہجور نشیمن

ارم آپ نے جس دوست کو بھی پیغام دینا ہے تو سلسلہ "آپ کا پیغام دوستوں کے نام" میں بھیجیں۔ "نامے میرے نام" میں نہیں۔

یاسمین کنول..... پسرور

سادہ سی ماڈل سرورق کو رونق بخش رہی تھی۔ بہت اچھی لگی۔
"ماں بننے کا احساس" بہت اچھا لگا۔ خصوصاً "اپنی

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

پسندیدہ ہستیوں کے تاثرات اور احساسات بہت اچھے لگے۔

ام ایمان قاضی کی تحریر "سنو مان جاؤ" بہت پسند آئی افسانوں میں "وقت کی بات" زیادہ اچھی لگی۔ آسیہ مرزا کی تحریر "من مورکھ کی بات نہ مانو" کی قسط نمبر 13 یعنی سولھویں قسط زبردست رہی۔ نعمان اعجاز سے ملاقات اچھی رہی تصاویر بہت پسند آئیں ان کے بچوں کی تصویر بھی ساتھ ہوتیں تو لطف دوبالا ہو جاتا بہرحال پھر بھی ان سے ملاقات پسند آئی۔

"نامے میرے نام" میں میرا خط تھا مگر نامعلوم جگہ سے یاسمین کنول کا خط تھا حالانکہ میں اپنے نام کے ساتھ پسرور ضرور لکھتی ہوں۔ خیر کوئی بات نہیں میں ایسے ہی بہت خوش ہوں۔

ج - پیاری یاسمین! ہم معذرت چاہتے ہیں۔ پچھلے ماہ آپ کے خط میں جگہ کے نام کی جگہ نامعلوم لکھا گیا۔ آئندہ جگہ کا نام پسرور لکھا جائے گا۔

اقراء ممتاز...... سرگودھا

میری طرف سے سب کو بہت بہت رمضان المبارک ہوں۔ اس دفعہ کی ٹائٹل گرل بہت اچھی لگ رہی تھی۔ کرن واحد رسالہ ہے جس کے ساتھ کوئی اور کتاب ملتی ہے۔ کرن (کتاب) ایک طرح سے رسالہ ہو گیا۔ میری چھوٹی بہن اسے بڑا شوق ہے پڑھنے کا میں نے اسے کرن (کتاب) پڑھنے کو دے دی۔ خربوزہ میں اتنی زیادہ افادیت ہے مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ نیا سلسلہ "آپ کا پیغام" دوستوں کے نام" بہت پسند آئے۔

انٹرویو میں "نعمان اعجاز اور ان کی مسز سے ملاقات بیسٹ رہی۔ ماں بننے کا احساس بہت لاجواب تھا۔ فاخرہ گل کی والدہ کی وفات کا دکھ ہوا۔ خدا ان کی فیملی کو صبر جمیل عطا فرمائیں۔ (آمین) "مقابل ہے آئینہ" میں سدرہ بتول کے جوابات کھٹے میٹھے لگے۔ مکمل ناول "مہجور نشمین" مصباح علی سید کی تحریر زبردست ہے کیا ضرورت ہے کہیں جانے کی گھر بیٹھے سیر کریں۔ ہماری رائٹر ہمیں آسٹریلیا کی گھر بیٹھے سیر کرواتی ہیں۔ ناولٹ سیما بنت عاصم کی تحریر بڑی جاندار رہی۔ اس تحریر نے دنیا سے بےزار لوگوں کو ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ فواد اور امجد صاحب کی نٹ کھٹ باتیں بڑی پسند آئیں۔ ناولٹ "ام ایمان قاضی کی تحریر بھی اچھی تھی۔ مجھے یہ شعر پسند ہے میں کراچی زیادہ ہی سیں چھا گیا۔ کرن (کتاب) "کرن کے بیوٹی بکس میں کچھ پوچھ سکتی ہوں۔

ج - پیاری اقراء! ہر دفعہ کی طرح اس مرتبہ بھی آپ کا تبصرہ اچھا ہے۔ نیا سلسلہ "آپ کا پیغام دوستوں کے نام" آپ بہنوں کے لیے ہی شروع کیا جا رہا ہے۔ آپ بہنیں اپنے پیغامات بھیجیں اور اس سلسلے کو بھی اپنے پیغامات سے سجادیں۔ بالکل آپ بہنیں بیوٹی بکس میں اپنے مسئلے کا حل پوچھ سکتی ہیں۔ یہ سلسلہ اسی لیے ہی تو شروع کیا گیا ہے۔

بلقیس عبدالحمید خان

سب کو دل کی گہرائیوں سے ماہ رمضان مبارک ہو۔ روزے گرمی کے ہے۔ ثواب بھی دگنا ہے۔ بھئی گھبرانا بالکل نہیں ہے۔ کرن کے ساتھ کرن کا دسترخوان' اس ماہ لاجواب کوشش ہے۔ بہت اچھا لگا۔ کرن کا سرورق اور رنگ کلر میں ملبوس لڑکی نیٹنگ کے ریپر کا تاثر دینے میں کامیاب نظر آرہی تھی۔ اللہ محمود ریاض صاحب کو جنت کے اونچے درجات نصیب کرے۔ انہوں نے جتنا ہم خواتین کے لیے کیا' شاید ہی کسی اور نے یہاں کیا ہو۔ ایک معیاری پلیٹ فارم ہمیں مہیا کیا ہے۔ آپ کی عظمت کو سات سلام' آسیہ مرزا کا ناول "من مورکھ کی بات نہ مانو" ٹھیک طریقے سے آگے جا رہا ہیں۔ تنزیلہ ریاض صاحبہ غیر حاضری اچھی چیز نہیں ہے صحت کے لیے مضر ہے۔ "مہجور نشمین" مصباح علی سید ارے واہ تیرا کیا کہنا' زبردست' عمدہ ہر کردار ایک دوسرے سے بڑھ کر' دوسری قسط کا مزا دوبالا ہو گیا۔ بیلا' منشا محسن علی' تیسری قسط جتنی لاجواب ہے آپ کا نام اتنا ہی پیارا اور خوب صورت ہے۔ ناولٹ "بیلا" دل سے قریب قریب لگا۔ تھینکس اتنی اچھی کاوش لکھی۔ باقی کا کرن بھی بہت زبردست عمدہ اچھا اور سویٹ سویٹ رہا۔ "امتل عزیز شہزاد" دوبارہ غائب بالکل نہ ہونا۔ اس ماہ آپ کا اور ماریا یاسر کا افسانہ بہت اچھا لگا۔ کچھ کرن کی کہانیاں ابھی پڑھنا باقی ہیں۔

ج - بلقیس جی! سب سے پہلے آپ کا بے حد شکریہ کے آپ نے "نامے میرے نام" کی محفل میں شرکت کی اور اپنی رائے سے آگاہ کیا۔ کرن کی کہانیاں آپ کو پسند آئیں ہمیں بے حد خوشی محسوس ہوئی۔ اپنی کہانیوں کے بارے میں آپ ٹیلی فون پر معلوم کیجیے اور جہاں تک سوال ہے کہ ایک ہی ڈائجسٹ میں کہانیاں بھیجنے کا تو خواتین اور شعاع کی ایڈیٹرز الگ ہیں اور کرن کی الگ۔ کرن کے لیے کرن ہی میں کہانیاں ارسال کیجیے۔